ادارۂ مصنفین پاکستان

جدید اردو نثر کی پہلی تصنیف .. آئین لشکری .. کا ایک صفحہ

ARTICLES OF WAR.

niſhed at the diſcretion of a Court Martial.

ARTICLE XII.

Whatſoever Officer or Soldier ſhall miſbehave himſelf before the Enemy, or ſhamefully abandon any Poſt committed to his charge, or ſhall ſpeak words inducing others to do the like, ſhall ſuffer Death.

ARTICLE XIII.

Whatſoever Officer or Soldier ſhall miſbehave himſelf before the Enemy, and run away, or ſhamefully abandon any Fort, Poſt, or Guard, which he or they ſhall be commanded to defend, or ſpeak Words inducing others to do the like; or who, after Victory, ſhall quit his Commanding Officer or Poſt, to plun-

mo,afiq murzee Court-martial kee. (1)

Barween a,een egarwen bab kee.

Jo ko,ee ohdedar, ya ſipahee, dooſhmun ke ſamne koochal kure, ya beghyrutee ſe kiſee t,hane ko jo nigahbanee ke waſte oos ke huwale hy ch,horjawe, ya baten kuhe ki jin ſe our log wyſeehee koochalee kuren, tou chahe,e ki weh jan ſe mara ja,ega.

Terhween a,een egarwen bab kee.

Jo ko,ee ohdedar, ya ſipahee dooſhmun ke ſamne koochal kurke, b,hage; ya beghyrutee ſe kiſee gurh ko, t,hane, ya chouke puhre ko, ki jiſke t,hamb,hne ko ooſe hookm hy ch,horjawe, ya baten kuhe ki jin ſe our log, wyſeehee koochalee kuren, ya futih ke bad, upne ſurdar, ya t,hane ko loot

any Perſon, who is not [illegible] to receive [illegible] to [illegible] Rules and Diſcipline of W[illegible] or ſhall preſume to give [illegible] Parole or Watch Word [illegible] rent from what he received, ſhall ſuffer ſuch Puniſhment as ſhall be ordered by the Sentence of a Court-martial.

ARTICLE XVI.

All Officers and Soldiers are to behave themſelves orderly in Quarters, and on their March; and whoſoever ſhall commit any Waſte or Spoil, either in [Walks of Trees,] Parks, Warrens, Fiſh-ponds, Houſes, * or Gardens, *Cornfields, [Encloſures, or Meadows,] † or ſhall maliciouſly deſtroy any Property whatever, unleſs by Order of the then Commander in Chief of the Forces (where the ſervice may require it) he or they

اس کتاب کے متعلق سید سبط حسن کا مقالہ
اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

ماہنامہ

ہم قلم

جلد ۳ نمبر ۱

ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ادارۂ مصنّفین پاکستان نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔ طابع، ناشر، مدیر جمیل الدین عالی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے، ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی جب وطن کی قدروں کی نشو ونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کیلئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں، دولت واقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا

فہرست

رائٹرز گلڈ کی مطبوعات

تیسری منزل
(ہاجرہ مسرور)

اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع کرداروں کو بڑی خوش سلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے، ہاجرہ مسرور کا مشاہدہ بہت وسیع ہے وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہیں جس کا اندازہ اس مجموعے کے ہر افسانے سے ہوتا ہے صفحات ۲۷۶ قیمت ۵ روپے پچاس پیسے

سورج بھی تماشائی
(انور)

"آگ کی آغوش" میں" اور "منزل کی طرف" کے بعد "سورج بھی تماشائی" انور کا تازہ ترین مجموعہ ہے جس میں تقریباً وہ سب افسانے شامل ہیں جو انور نے گزشتہ پانچ چھ برسوں میں لکھے ہیں۔ صفحات ۲۲۴ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

فصیل شب
(مرزا ادیب)

مرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "فصیل شب" تیسرا مجموعہ ہے جس میں نو ڈرامے شامل ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا ادیب کا فن روز بروز نہایت عمدگی اور خوبی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے صفحات ۲۰۰ قیمت ۴ روپے

اردو میں سوانح نگاری
(ڈاکٹر سید شاہ علی)

ڈاکٹر صاحب علمی و ادبی حلقوں میں خاصے معروف ہیں رسالہ "نگار" اور "اردو" میں جو لوگ ان کے مضامین پڑھ چکے ہیں وہ لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں زیر نظر کتاب دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ صفحات ۳۶۵ قیمت ۷ روپے۔

لال چادر
(رینڈولی اللہ مترجم یونس احمر)

عوام کی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں کو باطل اوہام اور عقائد کا مرکز بنا دینا کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے کردار جا بجا نظر آتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو مزار پرستی کا خوگر بنا دیتے ہیں اور مذہب کی تعلیم صحیح سے انھیں بیگانہ رکھتے ہیں۔ "لال چادر" ایک ایسے ہی مزار کا جادو ہے صفحات ۱۷۴ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

صدا بصحرا
(یوسف ظفر)

جدید شاعروں میں یوسف ظفر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے ان کی شاعری ان تمام صحت مند تجربوں اور رجحانات کی نمائندگی بھی کرتی ہے، جن سے ماضی قریب میں ہمارے ادب کو دوچار ہونا پڑا وہ بنیادی طور پر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ہاں ماضی کی ادبی روایات کے احترام اور رجحانات کو خوش آمدید کہنے کا شعور پایا جاتا ہے صدا بصحرا تقریباً اسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ صفحات ۱۹۹ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے۔

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

زیرِ نظر شمارے سے "ہم قلم" کی اشاعت کا تیسرا سال شروع ہو رہا ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں اس رسالے نے ادب کی جو بھی خدمت کی ہے اس کا اندازہ مضامین نظم و نثر کی اس فہرست سے ہو سکتا ہے جو زیرِ نظر شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔ "ہم قلم" نے صرف اچھے ادب کی ترویج اشاعت ہی کا فریضہ انجام نہیں دیا ہے بلکہ اس کے ذریعے ادیبوں کو ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے کا موقع بھی ملا ہے۔

مذکورہ فہرست مضامین سے یہ اندازہ بھی ہوگا کہ نگارشات کی اشاعت میں ادیبوں کے اراکین ادارہ یا غیر اراکین، ہندوستانی یا پاکستانی ہونے کی تفریق نہیں کی گئی۔ مقصد صحت مند ادب کی اشاعت تھا، سو وہ جس سے بھی ملا جہاں سے بھی ملا شائع کیا گیا۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی اسی طریقِ کار کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اس ماہ اردو کے منفرد غزل گو حضرت جگرؔ مراد آبادی کی دوسری برسی منائی جا رہی ہے۔ جگرؔ صاحب موجودہ دور کے بہترین شاعروں میں سے تھے، انہوں نے ہمارے ادب کو جو کچھ دیا، وہ سدا بہار ہے۔ ان کی شاعری ہمارے ادب کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ "ہم قلم" کے زیرِ نظر شمارے کا ایک حصہ جگر صاحب کی یاد سے وابستہ ہے۔ عکسِ تحریر، تصویر اور غیر مطبوعہ مکتوب کی اشاعت کے لئے ادارہ پروفیسر مرتضیٰ شفیع کا ممنون ہے کہ جن کی وساطت سے یہ نوادرات ہم تک پہنچے۔

اس شمارے سے "افکار و مسائل" کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ علمی کام کرنے والے اپنی مشکلات دیگر اہلِ علم کے سامنے پیش کر سکیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر علمی استفسارات کے جوابات "ہم قلم" کے توسط سے دئیے جائیں، اس طرح اہلِ علم کے افادات سے عام قارئین بھی مستفید ہو سکیں گے۔ (باقی صفحہ ۹۶ پر)

عبّاس احمد عباسی

جگر صاحب

"تمام عمر گزارنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زندگی سلیقہ سے گزارنی چاہیئے" ایک دفعہ بزرگ جگر صاحب نے برخوردار عباس احمد عباسی کو یہ نصیحت کی تھی کیونکہ برخوردار عباس احمد عباسی کی زندگی میں کوئی سلیقہ نہیں ہے۔ بزرگ جگر صاحب کی زندگی میں کوئی سلیقہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی نہیں تھا جب جگر صاحب کو اک گونہ بیخودی دن رات چاہیئے تھی اور اس وقت بھی نہیں جب عالم ہوش میں شعار وارفتگی تھا۔ یہ وارفتگی اختیاری نہیں تھی اس لئے کہ جب جگر صاحب انتہائی کوشش سے صاحب ہوش بننا چاہتے تھے اس وقت بھی یہ وارفتگی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ مگر یہ عجیب وارفتگی تھی جس میں وضع کی پابندی کا ہوش رہتا تھا مراتب کا خیال رہتا تھا اور گفتگو میں سنجیدگی رہتی تھی۔

جگر صاحب کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس میں جگر صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا میرا قصور نہیں تھا زمانہ کے ساتھ ساتھ اقدار تی رہتی ہیں نقطۂ نظر تبدیل ہوتا رہتا ہے الفاظ کے معانی اور اشیاء کا تصور بدلتا رہتا ہے۔ جگر صاحب کے زمانہ میں اور ج کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن یہ جگر کی اپنی شخصیت تھی جس سے وہ آج کے زمانے پر اثر انداز تھے۔ کم از کم اُن یوں کو ضرور متاثر کرتے تھے جن کے سلسلے کی کڑیاں تسلسل کے ساتھ پرانے زمانے سے ملتی ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں ایسے بھی گ ہیں جو آج کی پیداوار ہیں اور گزرے ہوئے کل یا آنے والے مستقبل سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے بکھرے ہوئے ل۔ چست پائجامہ، ہر غزل کی پیشانی پر بسم اللہ ایسی چیزیں ہیں جو آج کم نظر آتی ہیں اور چاہے آج کے رہنے والے انھیں اہمیت ں یا نہ دیں ان میں ایک حسن ایک ادا ضرور تھی اور بہت سے دل اسی کے نہ ہونے سے اداس اور مغموم ہیں۔ اور انھیں ہر شے ں کسی شے کی کمی معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۶۰ء میں آل انڈیا ریڈیو نے ایک روز نہایت افسوس سے اعلان کیا کہ اُردو کے واحد غزل گو حضرت جگر مراد آبادی انتقال فرما گئے۔ اخبارات میں تصویریں شائع ہوئیں، سیاہ حاشیے سے جلی حروف میں اس خبر کو شائع کیا گیا اداریئے نوٹ لکھے گئے۔ اسی دن شام کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ بھی اعلان کیا کہ رات کے نو بجے حضرت جگر کی یاد میں ایک پروگرام نشر کیا جائے گا جس میں اُن کی آواز کے ریکارڈ سنائے جائیں گے۔ گھر کے تقریباً تمام افراد ریڈیو کے گرد جمع تھے کہ آخری بار جگر صاحب کی آواز سن لیں۔ ریڈیو سے اعلان ہوا "حضرت جگر" اور پھر تین غزلیں اسی آواز اسی دھن اسی مستی اور اسی سرشاری میں نشر ہوئیں۔ چہرے ویسے ہی اشکبار تھے کہ ریڈیو نے معذرت کے ساتھ یہ خبر سنائی کہ حضرت جگر کے انتقال کی خبر غلط تھی یہ غزلیں خود حضرت جگر نے گائی تھیں۔ عجب بے یقینی و بے یقینی کا عالم تھا دل جگر کی کمی پر صبر کر چکا تھا۔ اور یہ اچانک خبر کہ پہلی خبر غلط تھی خوشی کا باعث ضرور تھی مگر

اس خوف کی کسک تھی کہ کہیں یہ خوشی کی خبر بھی جھوٹی نہ ہو۔ اور آج جگر صاحب کے انتقال کو ہفتہ سے زیادہ ہو گیا اور کہیں سے کسی ریڈیو سے کسی اخبار سے اس کی تردید نہیں آئی۔ دل آج بھی چاہتا ہے کہ اس وقت جب ہم ان کی یاد میں جمع ہیں وہ اپنے عالم سرشاری میں معصوم تبسم لئے شیروانی کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے یہاں ڈائس پر آکر بابائے اردو سے معانقہ کریں مجھے سینے سے لگائیں اور فضلی صاحب سے معانقہ کریں اور ہر ایک کو ہنس ہنس کر دیکھیں جیسے انھوں نے بڑی شرارت کی ہے اور پھر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی اچھوتی دھن میں گنگنائیں اور یہ گنگناہٹ ترنم بن جائے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں طبیہ کالج دہلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور شعراء شریک تھے۔ رات کے تقریباً نو بجے تھے کہ پنڈال میں ایک طرف سے چار پانچ آدمی داخل ہوئے بیچ میں جگر تھے ٹوپی ایک طرف کو رکھی تھی شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے پاؤں رکھتے کہیں تھے پڑتا کہیں تھا جھومتے ہوئے سیدھے سٹیج پر پہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ مشاعرہ نشر ہو رہا تھا تھوڑی ہی دیر بعد جگر صاحب کرسی سے اٹھے اور مائک کے سامنے چلے آئے حالانکہ کسی اور کے نام کا اعلان ہوا تھا جگر صاحب کے کان میں کسی صاحب نے کچھ کہا نہ جانے انھوں نے سنا یا نہیں میٹھی ہوئی آواز میں مصرعہ شروع کیا سانس اکھڑ رہی تھی۔ اک خطا پر سزائے بے میعاد اور مصرعہ ختم کر کے مائک سے دور چلے گئے اور اب یہ عالم کہ ایک صاحب مائک لئے ہوئے جگر صاحب کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر ہو رہے ہیں اور جگر صاحب جھوم جھوم کر ایک ہی مصرع کی تکرار کئے جا رہے ہیں "ہائے تقدیر ابن آدم کی۔ ہائے تقدیر۔۔۔" پھر ایک دم سے خیال آیا تو آگے چلے اس غزل کے شعر تو نہ جانے کتنے ہیں مگر اس رات جگر صاحب نے صرف پانچ سنائے اور وہ بھی اتنی مشکل سے کہ نہ آواز نکلتی تھی نہ سانس قابو میں تھا۔ اور جب ہمت جواب دے گئی تو اٹھ کر سیدھے پنڈال سے باہر چل دیئے۔ اور ساتھ ہی مجمع اٹھنے لگا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ صرف جگر کو سننے آئے تھے مشاعرہ کے منتظمین نے گھبرا کر اعلان کیا حضرات جگر صاحب ابھی واپس تشریف لاتے ہیں وہ کام سے گئے ہیں اور مجمع پھر جم گیا۔ اب یہ کیا بات ہوئی نہ پڑھے ہوئے شعر سمجھ میں آئیں نہ ترنم کا مزہ آئے نہ صورت ہی کچھ حسین اور شاعر اتنا مقبول پھر سب بڑے بڑے شاعر تو ابھی موجود تھے جن میں سے اکثر استادوں کے استاد تھے۔ اور جگر تو نہ فلسفی نہ انقلابی۔ رہا ترنم تو اس رات تو وہ بھی نہیں تھا۔

پھر معلوم ہوا جگر نے شراب چھوڑ دی۔ کئی دن کے لئے ارے جو اتنی پیتا ہو وہ کہاں چھوڑ سکتا ہے پھر شروع ہو جائیگی۔ ایک دن تانگہ آکر رکا۔ جگر صاحب کی شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے نہ بال الجھے ہوئے تھے سامان بھی قرینے کا ساتھ تھا جگر صاحب اپنے مخصوص کمرے میں آگئے مشک کی طرح دور دور تک لوگوں کو پتہ لگ گیا۔ ہر لمحہ ایک ہجوم ابھی کوئی گیا اور ابھی کوئی آیا۔ اس زمانے میں جگر صاحب کی محبوب غزل عالم والی تھی جسے وہ خود تو نہیں دوسرے شب عروسی کی داستان کہتے تھے۔ اور جگر صاحب نہایت لذت لے کر اسے سناتے تھے۔ معین جذبی کا خیال تھا اب جگر شعر وعر نہیں کہہ سکتے۔ شراب ان کی جولانی تھی اور شراب مولانا نے چھوڑ دی مگر یار غزلیں تو اب بھی اچھی کہی ہیں کسی نے لقمہ دیا بھائی اب یہ ریپوٹیشن پر چل رہے ہیں۔ پٹرول پر نہیں لیکن پٹرول نہ ہونے کے باوجود جگر شعر کہتے رہے اور وہی کیفیت سرشاری برقرار رہی۔ مگر اس دفعہ سب بات یہ ہوئی کہ جگر صاحب کا زیادہ وقت میرے والد کے ساتھ گزرنے لگا اور تصوف کے مسائل حل ہونے لگے جگر صاحب بدل گئے تھے۔ خوش طبعی باقی تھی مگر تقریر طویل ہو گئی تھی اکثر جی میں آیا کہ جگر صاحب سے کہوں آپ کے شعر آپ کی [illegible]

نیچے نہیں جاتے تھے یہاں تک کہ کالج کے لڑکوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ میں عربک کالج میں بزمِ ادب کا نائب صدر چنا گیا تو
میں نے سوچا کہ جگر صاحب سے اپنے زمانے کا آغاز کراؤں جگر صاحب کی محبت کے بل پر میں نے بغیر ان سے ذکر کیے ہوئے
جلسہ کا اعلان کر دیا اور اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ جگر صاحب نے افتتاح کرنا منظور فرما لیا ہے۔ جلسہ کے روز میں نے جگر صاحب
سے کہا کہ تشریف لے چلیے اور جگر صاحب خفا ہو گئے انتہائی برہم ہو گئے کہنے لگے میں ڈھائی سو روپے لیتا ہوں لیتا زیادہ
ہوں لیکن چونکہ یہیں ہوں اس لئے صرف اتنا لوں گا۔ آپ روپیہ لا دیجئے میں چلا چلوں گا ورنہ نہیں اور آپ کے خاندان
سے جو میرے مراسم ہیں ان کی وجہ سے میں چلا چلتا ہوں لیکن پھر مراسم ختم۔ میں نے کہا بھی کہ جگر صاحب یہ مشاعرہ نہیں صرف
ادبی سی تقریب ہے مگر وہ تو جلال میں تھے مجھے انتہائی ناگوار گزرا میں نے آنسو روکتے ہوئے صرف اتنا کہا جگر صاحب آپ کے
میرے بزرگوں سے تعلقات ہیں ان کا سودا کرنے والا میں کون۔ آپ کی مرضی آپ تشریف لے چلیں یا نہ لے چلیں میں آپ
کی خدمت میں روپیہ پیش نہیں کر سکتا السلام علیکم۔ اور جگر صاحب جو کچھ دیر پہلے غصہ میں تھے میں نے دیکھا بجھ سے گئے
میں رکا نہیں۔ جلسہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تمام انتظام کیا اور کسی سے ایک لفظ تک بھی نہیں
کہا سوچا وقت گزر جانے پر کہہ دوں گا بھئی شاعر آدمی ہیں کیا اعتبار۔ چونکہ اعلان جگر صاحب کے نام کا ہوا تھا ہال بھر گیا
میں نے اسٹیج پر آ کر صاف جھوٹ بول دیا حضرات جگر صاحب ابھی تشریف لاتے ہوں گے۔ اور ابھی میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ
جگر صاحب ایک ہجوم کے ساتھ مسکراتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ اور وہ آنسو جنہیں میں دوپہر کو پی گیا تھا بے اختیار
آنکھوں سے اُبل پڑے میں اسٹیج سے ہٹ گیا اس کے بعد میں نے کسی احسان مندی کا اظہار کیا اور نہ جگر صاحب نے کبھی یہ بات
بتائی اور نہ یہ بتایا کہ انھوں نے انکار کیوں کیا تھا اور پھر چلے کیوں آئے میں سمجھتا ہوں یہ ان کی محبت تھی اور اپنے سے چھوٹے
کی دلجوئی۔

جگر صاحب کی عمر نہ جانے کیا تھی کیونکہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بظاہر ان سے کم عمر کے نظر آنے والے ان کے بزرگ
تھے اور ان سے عمر میں بہت بڑے بھی ان کے چھوٹے تھے۔ جس کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اس کے سامنے قدیم روایات
کے مطابق نہایت ادب سے گفتگو کرتے تھے اور بالکل بچوں کی طرح ان کی صحبت سے خائف رہتے تھے ویسے بھی جگر صاحب
بہت سی باتیں بالکل بچوں کی طرح کی کرتے تھے۔ رمی کھیلنے میں بے ایمانی کرتے تھے اپنے نمبر کم گناتے تھے اور پھر ساتھ بیٹھنے
والوں کو خاص انداز سے مسکرا کر دیکھتے تھے جیسے شرارت کی داد چاہتے ہوں۔ پاکستان بن جانے کے بعد رمی ان کی کمزوری
بن گئی تھی۔ ہر وقت رمی کھیلتے رہتے تھے اور آخر میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ جگر جیسے نازک مزاج کی محفل میں وہ لوگ بھی راہ
پانے لگے تھے جن سے رمی سے پہلے جگر صاحب کی طبیعت متعفن ہو جاتی تھی۔ لیکن اس دعوتِ عام کے باوجود بھی وہ یہ پسند
نہیں کرتے تھے کہ میں بھی رمی کھیلنے والوں میں شامل ہوں ایک مرتبہ صرف حسرت ترمذی صاحب تھے اور انھوں نے مجھ سے
بھی کھیلنے کو کہا جگر صاحب نے انکار کر دیا نہیں صاحب یہ نہیں کھیلتے۔ لیکن ترمذی صاحب جو میری برخورداریت اور جگر صاحب
کی بزرگی سے ناواقف تھے اور میرے رمی کھیلنے سے واقف تھے کہنے لگے نہیں صاحب یہ تو کھیلتے ہیں جگر صاحب نے انتہائی
ناگواری سے کہا اچھا۔ اور یہ کھیل مجھے انتہائی مہنگا پڑا۔ ہر مرتبہ پتہ پھینکنے پر جگر صاحب کی ڈانٹ سننی پڑی اور جتنی مرتبہ جگر
صاحب جیتے انھوں نے مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھنٹوں انھیں رمی کھیلتا دیکھتا رہتا
اور کبھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ساتھ کھیلنے کا ارادہ بھی کر سکوں۔ جگر صاحب کی بھی ہمت بعض لوگوں کے سامنے رمی کھیلنے کی
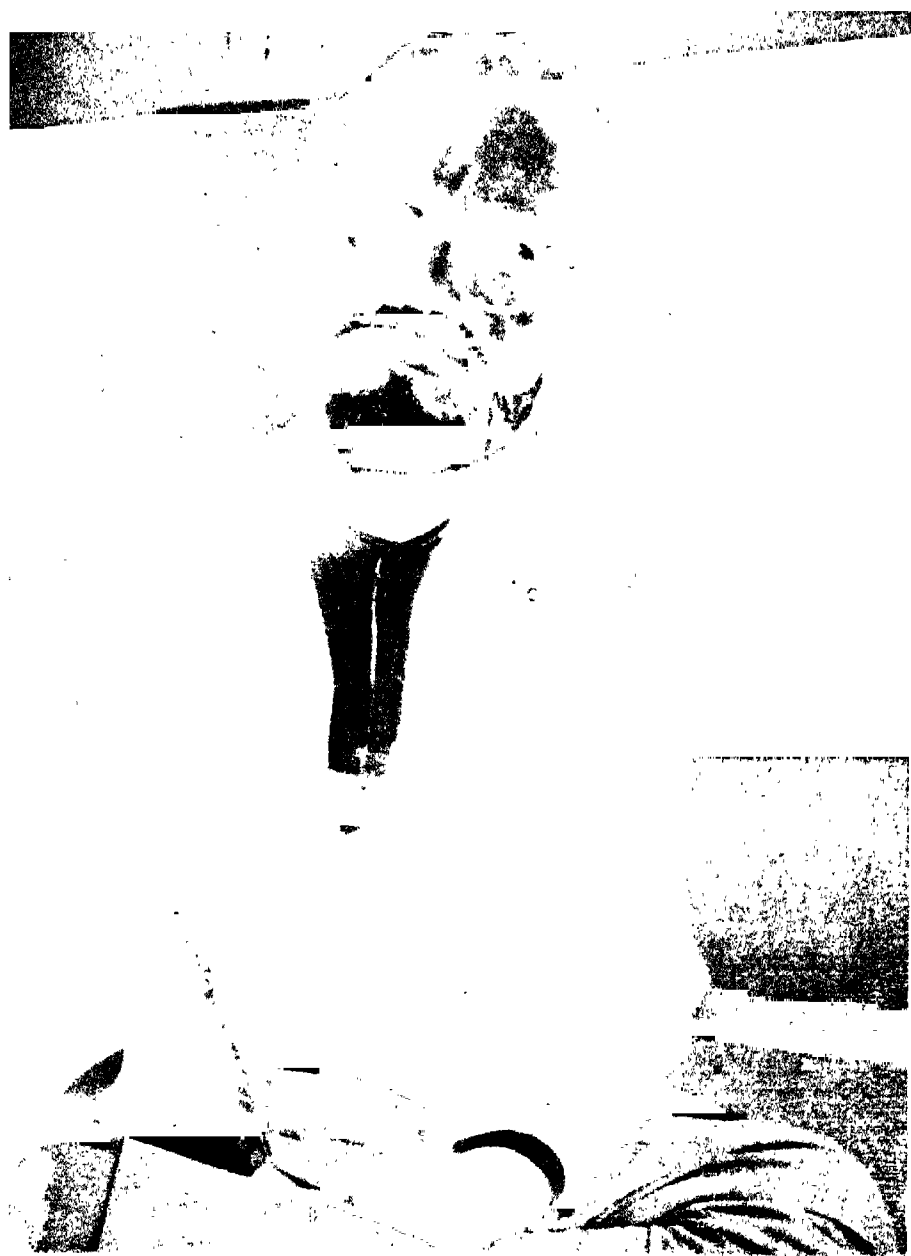
جان کر منجملهٔ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

کلام جگر به خط جگر

زندگی ہے مگر پرائی ہے
مرگِ غیرت تری دہائی ہے

جب مسرت قریب آئی ہے
غم نے کیا کیا ہنسی اڑائی ہے

ہنس کے بجلی شکست کھائی ہے
عشق کی جان پر بن آئی ہے

خاکِ منزل کو نہیں ملتا ہوں
یادگارِ شکستہ پائی ہے

ہائے وہ سبزۂ چمن کہ جسے
سایۂ گل میں نیند آئی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ہجر سے شاد وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

جگر مرادآبادی
لاہور ۵ اپریل ۱۹۵۱

نہیں ہوتی تھی حالانکہ وہ عمر کے اس مرحلہ میں تھے جہاں وہ خود بزرگوں میں شامل ہو چکے تھے۔

فضلی صاحب کے ہاں جگر صاحب مقیم تھے اور ان کے وہی شب و روز تھے۔ وہی مصروفیتیں تھیں اور وہی مشغلے۔ مجھے صرف دو تین مرتبہ حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ایک دن میں صبح پہنچا تو جگر صاحب باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے اسی خاص مسکراہٹ سے انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے پوچھا کہیں باہر تشریف لے جا رہے ہیں کہا جی ہاں ایک صاحب کا نام لیا ان کے دفتر میں ایک صاحب جو وہیں بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ ان کا ایک کام ہے میں ان سے کہنے جا رہا ہوں کہ ان کا کام کر دیں میرے دل میں فوراً خیال پیدا ہوا کہ شاید ان صاحب نے مجبور کیا ہو اور یہ بھی گمان گزرا کہ دفاتر میں بیٹھنے والے فراعین سے کم نہیں کہیں وہ جگر صاحب سے گستاخی نہ کریں۔ میں نے پوچھا آپ ان صاحب کو جانتے ہیں (وہ ایک بہت بڑے افسر ہیں) اپنے خاص انداز میں سر ہلا کر کہنے لگے جی نہیں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے بہت کچھ کہنا چاہا مگر جگر صاحب نے بات جاری رکھی۔ میں ان سے کہوں گا وہ کر دیں تو اچھا نہ کریں تو اپنے خدا کو جواب دیں گے۔ بس۔ ان کو میں جانتا ہوں یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ آپ بھی چلئے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ جگر صاحب کی سفارش مانی گئی یا نہیں مانی گئی لیکن میں نے یہ ضرور دیکھا کہ ان افسر صاحب نے جگر صاحب کو فوراً بلا لیا کھڑے ہو کر ملے اور جگر صاحب سے وعدہ بھی کر لیا اور ایک وعدہ بھی لے لیا کہ جگر صاحب ان کے ہاں تشریف لے جائیں گے یہ بات جگر صاحب کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی انصاف کے خلاف کیسے کر سکتا ہے اور شاید یہ بھی وہ جانتے تھے کہ ہر شخص انہیں جانتا ہے اور ان کا کسی شخص کو جاننا ضروری نہیں۔ جگر صاحب اس مقام پر تھے جہاں فیضان محبت کے ساتھ عرفان محبت بھی ہوتا ہے اور اسی عرفان کی وجہ تھی کہ ان کے چہرہ پر ایک اطمینان اور راضی برضائے الٰہی کی کیفیت تھی۔ اور ان کو غیروں کے ستم یاد تھے نہ اپنی وفائیں یاد تھیں بس محبت یاد تھی۔ محبت جس کی کوئی حد نہیں جو قیود کی پابند نہیں جو زمان و مکان سے بالا ہے۔

جگر لخت لخت

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
اک شاہد معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
میں اس کے نہ ملنے پر ہوں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں
عشق اور گوارا خود کر لے بے وجہ شکست فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے تنہا یہ نظر کا کام نہیں

احمد نظامی

جگر کا نظریۂ گریز

جگر کی شخصیت بیک وقت کئی دلکش اور رنگارنگ زاویوں کا مجموعہ تھی لیکن وہ خصوصی وصف جس نے ان کی انفرادیت کی تعمیر و تشکیل کی وہ ان کی خودداری اور وضعداری تھی۔ خودداری ہمارے یہاں ایک بندھے ٹکے معنی میں مستعمل ہے جس کا مطلب بالعموم ذاتی رکھ رکھاؤ اور نفسی وقار کے دائروں تک محدود ہے لیکن جگر کا نقطہ نظر اس سے قدرے مختلف تھا ان کی خودداری دراصل ایک ایسا تیکھا اور ہمہ گیر جذبہ تھا جو اپنی ذات سے علیحدہ بھی دوسروں کے جذبات و احساسات کا بعینہٖ اسی طرح احترام کرتا تھا جیسا کہ خود اپنی انفرادی کیفیات و حسیات کا۔ البتہ اس معاملے میں بھی وہ حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے جو ان کے وضعدارانہ رکھ رکھاؤ ہی کا اقتضا تھا۔

جگر نے اپنی غزل کی بنیاد تغزل کی مروجہ روایات ہی پر رکھی، اس لحاظ سے وہ تمام تصورات و خیالات جو اس صنف سخن کا جزو لازم ہیں جگر کے یہاں ایک طرفہ تنوع کے ساتھ ملتے ہیں البتہ خالص داخلی کیفیات کے بیان میں ان کے یہاں خصوصیت سے ایک قسم کی شدید جذباتیت پائی جاتی ہے جو صرف انھیں کا حصہ ہے، یہ صورت حال کچھ تو ان کی افتاد طبع اور بہت کچھ اس اضطراری سریع الحسی کے سبب سے ہے جو حالات کے زیر اثر بتدریج ترقی کرتی چلی گئی ہے، البتہ جس وقت وہ پیچ در پیچ اور گہرے معاملات قلب و نظر سے ہٹ کر غزل کے اور دوسرے موضوعات مثلاً واعظ و محتسب وغیرہ پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے یہاں وہ انتہا پسندی نہیں آنے پاتی جو بیشتر غزل گو شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے بلکہ اس کے علی الرغم ایک سنبھلا ہوا جذباتی توازن پایا جاتا ہے جو ان کے شائستہ شعور کی کارفرمائی کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے، یہ تضاد بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا مشہور ہے کہ جگر نے شراب پی ہی نہیں بلکہ ہمہ تن عرق شراب رہے اور اپنے آپ کو حافظ کا مقلد ہی نہیں بلکہ مقتول کہا ہے۔ بنابریں اس جذباتی تعلق کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اس قسم کے رندانہ موضوعات کی آڑ میں خوب کھل کھیل لیتے لیکن خلاف توقع ایسا نظر نہیں آتا، ان کے کلام کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جگر کی رندانہ سرخوشی بہ تمام و کمال ان کی خود فراموشانہ افتادِ طبع کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے اور انھیں بجز اس کے گویا کچھ خبر ہی نہیں ہے ؎

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اُچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

وہ محتسب کی زیادتیوں پر وہ کڑھتے تو ضرور ہیں لیکن ان کا احتجاج اس حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتا ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

کبھی کبھی ان دیرینہ تعلقات کے حوالے سے جو شاعر اور محتسب کے مابین کسی وقت قائم رہ چکے ہیں اسے یاد دہانی کرتے ہوئے ایک معصوم انکسار کے ساتھ اس سے خصوصی رعایت کے طلبگار نظر آتے ہیں ؎

اے محتسب نزاکتِ احساس کا لحاظ
دیرینہ دوستئ خوشِ انفاس کا لحاظ

محتسب جیسے سخت گیر کے معاملے میں لہجے کی یہ نرمی اور حلاوت جگر کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گی، اس معاملہ میں جگر کی شائستہ مزاجی اور شرافتِ نفسی کو بڑا دخل ہے لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ ان کی وضعداری اور خودداری کا وہی نفسیاتی رنگ یہاں بھی کارفرما ہے جو دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے میں کسی وقت ہلکا نہیں پڑتا اور یہ اسی پاکیزہ جذبے کی اثر اندازی ہے جو انہیں اپنے ہم مشربوں تک کے لئے یہ بات کہنے پر مجبور کر دیتی ہے ؎

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو ساقی نے کہا کس طنز سے آج
اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں، کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

بسا اوقات یہ جذبہ جب کسی خاص اندرونی تحریک کے زیر اثر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو محسوساتِ باطنی ایک نہایت ہی حسین اور قابلِ احترام شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس موقع پر جگر کی ایثار نفسی اپنا جواب نہیں رکھتی، اس روح پرور جذباتی کیفیت کا تجزیہ کرنا ہو تو اس صورتِ حال پر نظر کیجئے کہ ایک طرف شوقِ فراواں شاعر یا عاشق کو کشاں کشاں منزلِ مقصود کی جانب لئے جا رہا ہے کامیابی کے آثار بھی نمایاں ہو چلے ہیں اور قریب ہے کہ جذب و شوق کی ہنگامہ خیز مہم سر ہو جائے کہ یکایک وہ ایک اور ہی لطیف کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے ؎

حسن و بے چارگی، حسن الٰہی توبہ
میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو

جذب و شوق کی بے پایاں جد و جہد میں شاعر کا یہ دلپذیر احساس اسے یک لخت یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کہیں یہ کامیابی محبوب کے پندار و ناز کی شکست کے بعد کہیں خود اس کے عشق ہنگامہ خیز کی موت کا پیش خیمہ تو نہ بن جائے کہ یہ عشق ہی تو ہے جو باوجود اپنی تمام زہرناکیوں کے شاعر کو انتہا سے زیادہ عزیز ہے اور غالباً اس کا عین مقصدِ حیات ہو ؎

تجھے اے عشق سینے سے لگاؤں دیدہ و دل سے
ترے ہر درد میں پنہاں نشاطِ جاودانی ہے

شاعر محبوب کے پندار و ناز کو کسی بیجا گھمنڈ سے تعبیر نہیں کرتا اس کے نزدیک یہ احساسِ حسن کی ایک لازمی تحریک ہے، یہ وہ قابلِ احترام جذبہ ہے جو شوخی و حیا کی نیم ملتہب شعاعوں میں تحلیل ہو کر کچھ اور دلپذیر اور باوقار ہو گیا ہے یہ اس کی خودداریوں کا عکس جمیل ہے جس نے اس کے بے نیازانہ رکھ رکھاؤ میں کائناتِ حسن کی تمام تر دلفریبیاں سمو دی ہیں، جگر کے یہاں عظمتِ حسن کا جو واضح شعور پایا جاتا ہے اس کی تہہ میں براہِ راست اسی نقطۂ نظر کی کارفرمائی نظر آتی ہے

یہ رُوح پرور احساس جگر کے یہاں ایک ہمہ گیر شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی پوری شاعری کا مرکزی نقطۂ خیال ہو کر رہ گیا ہے۔

عظمتِ حسن کا گہرا احساس فانی کے یہاں بھی ہے لیکن جگر اور فانی کے زاویہ ہائے فکر و نظر میں بہرحال ایک بنیادی فرق موجود ہے، فانی نے غمِ محبوب کو زندگی سمجھ لیا اور اس پر قانع ہو کر رہ گئے، اس لحاظ سے ان کی زندگی ایک خاص قسم کی داخلی قنوطیت کا شکار ہو کر رہ گئی، برخلاف اس کے جگر نے غمِ محبوب اور غمِ روزگار کے لطیف امتزاج سے فکر و غم کے خصوصی محرکات کو برانگیختہ کیا اور ان محرکات نے بتدریج نشو و نما پا کر جہدِ مستقل کو اپنا شعارِ خاص بنا لیا۔

رہ گزارِ عشق میں جگر نے جو تجربات کئے ہیں ان کی نوعیت سرتا سر اضافی نہیں ہے بلکہ ان میں بیشتر معاملاتِ عشق و عاشقی کی پائیدار قدروں کے حامل ہیں البتہ ایک ہی قسم کی واردات کے بیان میں کہیں کہیں تضاد کی سی کیفیات پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ جذباتی اتار چڑھاؤ غزل کی ہیئتِ ترکیبی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، جہاں تک شاعر کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے اگر بحیثیت مجموعی ان کا جائزہ لیا جائے تو فکر و خیال کے ارتقائی تسلسل کا سراغ مل سکتا ہے، جگر کے یہاں یہ تسلسل بحسن و جوہ موجود ہے مگر اس کے پرکھنے کے لئے مرکزی سررشتۂ خیال کی کچھ منتشر کڑیاں ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں جگر نے ایک جگہ کہا ہے ؎

مل گئی عشق میں ایذا طلبی سے راحت
غم ہے اب جان مری درد ہے اب دل میرا

یہ توجیہہ روایتی اور صرف شاعرانہ نوعیت کی ہے، وجہ یہ ہے کہ اس وقت معاملات کی نوعیت اس درجہ اندوہناک نہیں تھی کہ مستقلاً غم سے نباہ کر لینے کا جواز بن سکتی بنا بریں اسے ایک قسم کا تکلف سمجھئے یا پھر اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ جگر اپنی فطرت کے اعتبار سے بڑے ہی زود رنج واقع ہوئے تھے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ خود کو حقیقتِ حال سے بے خبر رکھنے کے لئے انھوں نے یہ ایک نفسیاتی حیلہ تراش لیا ہو لیکن یہ کھوکھلا انداز خود فریبی کہاں تک کاربراری کرتا، قلبی شورشیں جو ہمہ وقت پیچ در پیچ تاثرات کی محرک بن چکی تھیں تا دیر کیوں کر ثابت قدم رہنے دیتیں یہی سبب ہے کہ جیسے ہی دراز نفسی کے مواقع میسر آئے تکلفات کے یہ ابریشمی پردے یکبارگی اٹھ گئے ؎

کیا کہہ دیا کسی نے کہ ملتے ہی چشمِ شوق
دونوں طرف سے دستِ تمنا دراز تھا

بایں ہمہ اس قسم کے خوشگوار مواقع کچھ کم ہی میسر آئے اور عاشق غالباً نالہ و شیون ہی پر کمربستہ رہا ہے ؎

سنیں تو وہ میرا قصۂ غم نہیں تو وہ دردِ دل کے محرم
کریگا ایک ایک اشکِ حسرت ہزار چشمِ پر آب پیدا

آنکھوں میں اس طرح سے مرا شوقِ دید تھا
گویا مری نظر میں دلِ ناامید تھا

ان سے تو عنایت کی نظر کی نہیں جاتی
اور دل کی یہ حالت ہے کہ دیکھی نہیں جاتی

یہ اشعار اس دور کی یادگار ہیں جبکہ جگر بادیہ پیمائی کرتے ہوئے گونڈہ آنکلے ہیں۔ قلب شورش پسند نے اپنی روش
کل تو نہیں بدلی البتہ اصغر کی پاکیزہ صحبت نے شاعر کے خیالات میں محبت کا ایک اعلیٰ و ارفع تصور پیدا ضرور کر دیا
ہے، جس کی جھلک جگر کے اس دور کے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا کلام میں اسی
ناسبت سے زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا ہوتا جاتا تھا غالباً یہ اصغر ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جگر کو پہلی بار واضح
در پر یہ احساس ہوا کہ صرف حسن ہی قابل احترام نہیں ہے عشق بھی ایک مقدس و محترم مقام کا حامل ہے اور یہ شیوۂ
یہودۂ آہ و فغاں "بہرحال شیوۂ عاشقی کی دلیل نہیں. بلکہ برخلاف اس کے اس طریق کار کی پے بہ پے تکرار عین ممکن
ہے کہ عشق کی فطری نقاہت و پاکیزگی کو بڑی حد تک مشکوک بنادے، اس دور کے اشعار میں جو نیا آہنگ ملتا ہے وہ
ی نقطہ نظر کی صراحت کرتا ہے ؎

محبت میں کہاں ممکن ذلیل و خوار ہو جانا
کہ پہلی شرط ہے انسان کا خود دار ہو جانا
وصال و ہجر کے جھگڑوں نے فرصت ہی نہ دی ورنہ
مآل عاشقی تھا روح کا بیدار ہو جانا

یہی وجہ ہے کہ قیام گونڈہ کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جذبات و خیالات کی ہیجان انگیز کیفیات میں رفتہ
تہ ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا، ذہن و خیال کی گرہیں بتدریج باز ہونا شروع ہوئیں اور عشقیہ موضوعات میں بیک وقت
یع اور رنگا رنگی کی بھرپور خصوصیات کا ظہور ہونے لگا، مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق،
ملحت عشق ہی کا نہیں، انداز نگاہ یار کا بھی ادا شناس ہو گیا ہے ؎

ہر قدم پر ہر روش پر ہر ادا پر ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے انداز نگاہِ یار کو
کچھ یہ کہ عرض شوق کی طاقت نہیں مجھے
اور کچھ یہ ہے کہ مصلحت یار بھی نہیں
یہ جانتا ہوں جانتے ہو میرا حال دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے

یہ انداز ایک خاص رنگ طبیعت، حالات اور کیفیت کا غماز ہے اس کے پس پردہ وہ ذہنی توازن کارفرما ہے
ں کی ایک باہوش انسان ہی سے توقع کی جا سکتی ہے، خیالات کی یہ رفتار ایک انقلابی نوعیت کی حامل ہے لیکن یہ
لاب شاعر کی دنیائے فکر میں ہنوز دبے پاؤں داخل ہو رہا تھا اس لحاظ سے اس میں اس وقت تک وہ شان، وہ
بن اور وہ رکھ رکھاؤ کی خصوصیات مکمل طور سے پیدا نہیں ہو سکی تھیں جو شاعر کے دور مابعد کی تخلیقات سے عیاں ہیں
ی اور خود شناسی کے جوہر بھی ہنوز پوری طرح کھلنے نہیں پائے تھے البتہ پیرایۂ بیان میں ایک طرفہ لطافت اور اظہار
ں کے باب میں ایک حسین قسم کا تکلف جا بجا پہلو بدلنے لگا تھا ؎

در فردوس نظر آنے لگا باز مجھے ؛ دیجئے دیجئے اک اور بھی آواز مجھے

یہاں عاشق ایک کیف انگیز جذباتی کشمکش سے دوچار ہے، ذوق وشوق کا دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے لیکن [illegible] رکھ رکھاؤ اس امر کا متقاضی ہے کہ حرفِ مدعا کے درمیان تکلف وتصنع کا باریک اور لطیف پردہ حائل رہنے ہی دیا جا[illegible]
شاید پھر ایسی ہی کوئی خوشگوار تقریب پیش آئی کہ شاعر و عاشق کو ان الفاظ کے اعادہ کا موقع میسر آگیا ؎

آؤ جہاں بہ ہم کریں پیدا نیا عالم کریں
تم جانِ جانِ حسن ہو، ہم جانِ جانِ عاشقی

حرفِ مدعا یہاں بھی درمیان میں ہے لیکن شعور نے خودشناسی کی راہ میں کئی قدم بڑھا لئے ہیں ذوقِ طلب، حسنِ طلب کا بانکپن لئے ہوئے ہے، شاعر نے یہاں جس انداز سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے وہ اس کی تخلیقات میں ایک روایت کا نقیب ہے۔ یہاں اس نے پہلی مرتبہ شعوری طور پر یہ جرأت کی ہے کہ عشق کو حسن کے ہم مرتبہ ثابت کیا جائے، عظمتِ عاشقی کا برگزیدہ تصور صحیح معنوں میں پہلے پہل اسی شعر کے پس پردہ جھلکتا ہے۔

خودی و خودشناسی کے قدم جب اس منزل پر پہنچ جائیں تو بعید نہیں کہ جذبۂ بے نیازی کا ظہور ہونے لگے یہ مواقع ہر اس عاشق و شاعر کو پیش آسکتے ہیں جس میں جذبۂ انا قدرے شدت لئے ہوئے ہو، عاشقانہ از خودرفتگی اور انانیت کا میل ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں غالب جیسے صاحبِ شعور کو اس قسم کی پرتکلف آزردگی کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔

فارسی شعراء کے یہاں بھی اس موضوع سے متعلق انتہائی پرلطف مثالیں مل جاتی ہیں خصوصیت سے ایسی صورت میں جبکہ محبوب معمول سے ذرا زیادہ شوخ اور ستم ظریف ہو تو یہ افتاد یقینی ہے جیسا کہ ایک فارسی شاعر حسرت و تأسف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ نوحہ کناں ہے ؎

رفتم دو روزے از درش از بہرِ مصلحت
دیگر مرا نہ خواہد و ہماں را بہانہ ساخت

لیکن جگر کی حیثیت اس معاملے میں منفرد ہے، ان کا عشق چونکہ حرص وہوس کی آلائشوں سے پاک تھا لہٰذا جیسے جیسے محبوب کی نازمندیاں حدِ اعتدال سے تجاوز کرتی گئیں، جگر کی طبعِ خودشناس اسی مناسبت سے اور زیادہ محتاط ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ خلوت و جلوت اور وصل و فراق کے جھمیلے ان کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ گئے، شاعر نے خیالات کی نئی دنیا سجائی اور اسی میں آباد ہو گیا ؎

منحصر خلوت و جلوت پہ نہیں وصلِ حبیب
خاص اک وقت ہوا کرتا ہے یکجائی کا

شاعر کا یہ دلپذیر احساس جذبۂ گریز کا نقیب ہے لیکن یہ گریز اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے، یہ محبوب سے قطعِ تعلق کا روادار نہیں ہے، یہ احساسِ قرب و احساسِ معیت کی لذت سے یکسر بے نیاز بھی نہیں، بلکہ یہ عشق کو اس کے اعلیٰ و ارفع مقام کے حصول میں پورے شدومد سے معاونت کرتا ہے، یہ ضبط کی صالح اقدار کو نکھارتا ہے اور عشق کو نیچی سطح سے اٹھا کر بالاتر کر دیتا ہے، ایک عام شاعر جس کا ذہن جامد، خیالات خام اور نظریات ناپختہ ہوں یہ شعر ہرگز نہیں کہہ سکتا ؎

تو نے جو آگ لگا دی وہ فروزاں ہی رہی
بجھ گئی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی

خیالات کی یہ ارتقائی رفتار ۱۹۲۵ء کے اختتام سے قبل کی بات ہے جبکہ جگرؔ کی شاعری شاہد پرستی اور مے نوشی و شباب پرستی، اس کے کچھ ہی عرصے بعد شاعر کو کچھ اور حوادثات قلب و نظر پیش آئے جن کے سبب کلام میں واقعہ نگاری کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس دور میں شاعر کو کچھ ایسے تجربات سے گزرنا پڑا جن کا ردّ عمل شاعر کے نظریۂ گریز کو تقویت عطا کرنے کا باعث ہوا، کہیں کہیں ان تجربات کا حسن و حسنِ بیان ہمیں چونکا دیتا ہے مثلاً

نگاہ شوق کی جذب و کشش ارے توبہ
وہ دل دیا کہ جسے قرب بھی عذاب ہوا

ایک دوسری جگہ کہا ہے ؎

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

بات قریب قریب وہی ہے جو پہلے شعر میں کہی گئی ہے البتہ پہلا شعر ایک خاص قسم کی اضطراری کیفیت کا حامل ہے بخلاف اس کے دوسرا شعر اس پُرسکون حالت کا مظہر ہے جو بالعموم اس قسم کے اتفاقیہ ہیجانات کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے، ایک جملۂ معترضہ تھا کہنا صرف یہ تھا کہ جذبۂ گریز بہرحال دونوں اشعار میں کارفرما ہے۔

شاعر کا یہ رجحان بتدریج ترقی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک وقت یہ اس کی کل ذہنی کائنات پر چھا گیا، شاعر کی نظریں حسن سے ہٹ کر صرف عشق کی رعنائیوں میں اُلجھ کر رہ گئیں اور صرف عشق شاعر کا منتہائے مقصود ہو کر رہ گیا ؎

تجھے اے عشق سینے سے لگاؤں دیدہ و دل سے
ترے ہر درد میں پنہاں نشاط جاودانی ہے

جگرؔ حسن و عشق کے باہمی رشتوں سے بے خبر نہیں تھے یہی سبب ہے کہ اس منزل پر پہنچ کر انھوں نے ان قدروں کا احترام کرتے ہوئے عشق کی تمام پاکیزہ سامانیوں کو اُبھارا اور حسن اور حسنِ طلب کے درمیان ایک امتیازی حدِ فاصل قائم کردی اور اس طرح اپنی شخصیت کے دلآویز خد و خال کو اُجاگر کرنے کی ایک شعوری کوشش کی۔ جگرؔ کا یہ رجحان ۱۹۳۲ء سے قبل ہی ایک قسم کے وضعدارانہ رکھ رکھاؤ کے ساز و سامان پیدا کر چکا تھا، جیسا کہ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے ؎

شوق نے بیخودی میں جب دستِ طلب بڑھا دیا۔ غیرتِ عشق نے وہیں پہلوئے دل دبا دیا[۱] لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد سے اس میں بتدریج تہذیب و ترتیب پیدا ہوتی گئی اور پھر جیسے جیسے استقامت و استواری کے قرائن پیدا ہوتے گئے تو جگرؔ شعوری طور پر اپنے اس دلپذیر مسلکِ عاشقی کی تبلیغ کرنے لگے ؎

اُٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی
مرحبا وہ جن کو تیرا غم گوارا ہو گیا

اک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

---

[۱] [illegible] یہ جذباتی [illegible] ایک [illegible] صورت اختیار کر جاتی ہے تو جگرؔ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں ؎
[illegible] تیرا [illegible] ❁ بڑھتا ہے اگر شوق تو رکھتے ہیں قدم اور

بجز شوقِ طلب جز ذوقِ طلب کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دُور نہیں

سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

"جگر نے عشق کی انانیت اور خودداری پر بار بار زور دیا ہے جگر کے یہاں کبھی کبھار عاشق خود محبوب بن گیا ہے، یہ در اصل ذہن کا وہ جادو ہے، تخیل کا وہ طلسم ہے جس میں کبھی کبھار عاشق اور شاعر اسیر ہو جاتا ہے اس قسم کے اشعار کافی ہیں مگر یہ جگر کا بڑا کارنامہ نہیں ہے" [۱]

میرے خیال میں جگر کے عشق میں انانیت کی شعبدہ گری نہیں ہے، وہ صرف نیاز عاشقی کی عظمت کے قائل ہیں جو ان کے جذبۂ خودداری ہی کا حسین ردِ عمل ہے اور ان کے کلام میں جابجا ایک حسن ترتیب کے ساتھ جلوہ فگن ہے، جگر کے نزدیک حسن اور عشق دونوں ہی قابلِ احترام ہیں، جگر کے یہاں تخیل کی طلسم آفرینیاں ضرور ہیں لیکن صرف ان کی متصوفانہ شاعری کی حدود میں۔ مثلاً ؎

جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں
مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے
یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

جگر کے وضعدارانہ رکھ رکھاؤ نے ان کی شخصیت کو باوقار بنانے میں خصوصیت سے مدد دی اور ان کی خودداری نے ان میں ایک قسم کی بے نیازانہ شان پیدا کر دی، یہ بے نیازانہ شان اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اچھوتی چیز ہے، یہ شاعر کو عزلت گزینی پر آمادہ نہیں کرتی، یہ اسے کم آمیزی نہیں سکھلاتی اور نہ ہی یہ اس کی ذاتی بڑائی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے، یہ در اصل ناآسودگیٔ شوق کا بے پایاں ردِ عمل ہے، یہ اس بے پناہ تشنگی کا اظہار ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتی چلی گئی ہے، یہ ایک جانب اگر اس کی پختگیٔ شعور پر دلالت کرتی ہے تو دوسری جانب اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ شاعر اپنے ارتقائے ذہنی سے ہنوز مطمئن نہیں ہے اس کی نظر بر شش جہت سے ماوراء کسی اور شے کی متلاشی ہیں اور اس کا دھڑکتا ہوا دل کسی ناشنیدہ نغمے کے زیر و بم میں بے تحاشا جھول رہا ہے ؎

یارب نگاہِ شوق کو دے اور وسعتیں
گھبرا اٹھے جمالِ جہت آشنا سے ہم
جسے سب لوگ حسن و عشق کی دنیا سمجھتے ہیں
بلند اس سے بھی ہم اپنا مقامِ دل سمجھتے ہیں

یہ اشعار جگر کے پانچویں دور کی تخلیقات میں سے ہیں لیکن اس سے بہت عرصے پہلے وہ کہہ چکے تھے

کوئی حسیں، حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر
باز آئے اس بلندیٔ ذوقِ نظر سے ہم

اس شعر میں بظاہر عشق کا کوئی اعلیٰ و ارفع تصور نہیں پایا جاتا بلکہ ایک سطح بیں اس میں ہرجائی پن کی جھلک بھی دیکھ لے

[۱] دیباچہ آتش گل

سے مانع نہیں رہ سکتا لیکن بغور دیکھا جائے تو اس میں بھی وہی وحدتِ شعور کارفرما ہے جو آگے چل کر زیادہ پاکیزہ انداز نمایاں ہوگئی ہے "جگر کی بعض مسلسل غزلوں میں شدت سے اسی نقطۂ نظر کی تکرار پائی جاتی ہے

سودا جو اب ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے — اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے
لیلائے آب و گل تو ہزاراں ہزار ہیں — مجنوں ہے جس کی روح وہ لیلا ہی اور ہے
جو حسنِ شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی — محسوس اب ہوا وہ تمنا ہی اور ہے
جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند — شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے
یہ حسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا مگر — کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

جگر کی شاعری کا یہ والہانہ پن اور یہ دلکش پاکیزگی ان کے شاعرانہ خلوص اور ان کی نفاستِ طبع کی روشن دلیل ہے اور ان کے بے مثال تصورِ عشق کی نقیب بھی، جگر کے یہاں عشق کا جو یہ برگزیدہ و پاکیزہ تصور ملتا ہے اس کے پس منظر میں ان کا نظریہ گریز ہی کارفرما ہے" ان کے تصورِ عشق میں اس خوامخواہ کی قناعت و فگندگی کا عنصر بھی شامل نہیں ہے جو اُردو غزل کی روایتی عاشقی کا خاصہ رہی ہے، ان کا عشق خود شناس ہے اور کہیں کہیں خود نگر بھی، وہ اپنی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور حسن کے سامنے غیر مشروط طور پر سپر نہیں ڈال دیتا، ہجر و وصال کے روایتی تصور سے بھی انھوں نے انحراف کیا ہے، وہ محبوب کے دلدادہ و پرستار ہیں وصلِ محبوب کے نہیں بلکہ ان کے لئے دوری قربت سے زیادہ پُر معنی اور زندگی بخش ہے" سلہ

حسن کو سمجھا ہے کیا اے بوالہوس
حسنِ معنی بھی ہے صورت ہی نہیں

حسن کے اسی معنوی احساس و ادراک نے جگر کے تصورِ عشق بالخصوص نظریۂ گریز کو ان کی شخصیت و شاعری کی ایک حسین و دلکش قدر بنا دیا ہے جو اُردو غزل کے لئے سرمایۂ افتخار ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

جگر لخت لخت

کس کا خیال کونسی منزل نظر میں ہے
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے
سمجھے تھے تجھ سے دور نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہگذر میں ہے

سید سبط حسن

جدید اردو نثر کی پہلی تصنیف

آئین لشکری

جدید اردو نثرنگاری کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ یہ کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی تھیں جو زبان تھوڑے فرق کے ساتھ دہلی، لکھنؤ اور شمالی ہند کے دوسرے تہذیبی مرکزوں میں بولی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی میں اردو شاعری کی زبان بھی قریب قریب یہی تھی البتہ اس زبان میں نثرنگاری کا رواج ہنوز عام نہ ہوا تھا۔ کیونکہ درباروں، سرکاری دفتروں حتیٰ کہ خط و کتابت کی زبان ابھی تک فارسی تھی۔ اگر کبھی اردو نثر میں کچھ لکھا بھی جاتا تھا تو فارسی کی تقلید کرتے ہوئے مقفیٰ نثر میں فارسی اور عربی الفاظ کی اتنی بھرمار ہوتی تھی کہ عام آدمی اس مصنوعی زبان کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مرزا سودا کے کلیات کا دیباچہ اسی زبان میں ہے اور ان کے اشعار کی عام فہم زبان سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ یہ مصنوعی نثر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی، سیاسی اور فوجی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے بالمقابل "ہندوی" تھی جو شمالی ہند کی قدیم بولی تھی۔ ہندوی کے بارے میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی رائے یہ ہے کہ "ہندوی فارسی کی ضد ہے۔ ناگری رسم الخط میں بائیں سے دائیں جانب کو لکھی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کے غلبہ سے پیشتر ناگری رسم الخط کی ہندوستان میں وہی حیثیت تھی جو یورپ میں اس وقت (۱۷۹۶ء میں) رومن رسم الخط کی ہے۔ لیکن مدت ہوئی کہ ناگری کی جگہ عربی اور فارسی نے لے لی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہر مسلمان اور ہندو منشی فارسی پڑھ سکتا ہے۔ حالانکہ ہندوی سے جو ناگری رسم الخط میں لکھی گئی ہو گنتی کے چند مسلمان واقف ہیں اور ان ہندوؤں کی تعداد بھی زیادہ نہیں جو ہندوی جانتے ہوں خواہ وہ نئے اختیار کردہ رسم الخط (فارسی) میں لکھی ہوئی ہندوی کے کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں۔" (ہندوستانی زبان کی گرامر بہ زبان انگریزی از ڈاکٹر گلکرسٹ صفحہ ۳۔۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۶ء) لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہی مناسب خیال کیا کہ اردو کے فارسی آمیز مقفیٰ طرز تحریر اور ہندوی دونوں سے گریز کیا جائے اور اس زبان کو اپنایا جائے جو شمالی ہند کے تہذیبی مرکزوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس زبان کو ہندوستانی سے موسوم کیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی رائے میں ہندوستانی زبان تین زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ ہندوی، عربی اور فارسی۔ اس زبان کا بالائی ڈھانچہ فارسی اور عربی کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ البتہ اس کی بنیاد ہندوی ہے۔ "ہندوی کا نئی زبان یعنی ہندوستانی سے وہی رشتہ ہے جو سیکسن کا انگریزی سے ہے اور فارسی اور عربی کا ہندوستانی سے وہی رشتہ ہے جو لاطینی اور فرانسیسی کا انگریزی سے ہے۔" (مشرقی زبان داں، بہ زبان انگریزی۔ دیباچہ از ڈاکٹر گلکرسٹ مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء) جدید اردو نثر کی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔

ہماری نظر سے اب تک فورٹ ولیم کالج سے پیشتر کی ایسی کوئی تصنیف نہیں گزری تھی جو جدید اردو نثر میں لکھی گئی ہو۔ مگر ڈاکٹر گلکرسٹ کی کتاب "مشرقی زبان داں" کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۱ء) سے پیشتر ہندوستانی یا جدید اردو میں لکھی گئیں۔ "آئین لشکری" غالباً ان میں سب سے قدیم تحریر ہے۔ اس لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ "آئین لشکری" جدید اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔

آئین لشکری وہ قواعد و ضوابط ہیں جن کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی سپاہیوں کو اپنی دیسی فوج میں بھرتی کرتی تھی۔ ابتدا میں یہ قواعد و ضوابط انگریزی زبان میں تھے مگر جب ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور بہار اور یوپی کے جوان پلٹن میں رنگروٹ بھرتی ہونے لگے تو کمپنی کے سپہ سالار میجر جنرل سر رابرٹ اے برکومبی نے اپنے فارسی ترجمان کرنل ولیم اسکاٹ کو حکم دیا کہ وہ فوجی قوانین کا ترجمہ فارسی اور ہندوستانی زبان میں کریں۔ کرنل اسکاٹ نے یہ کام اگست ۱۷۹۶ء میں مکمل کر لیا۔ مگر کرنل اسکاٹ کو ہندوستانی زبان پر پورا عبور نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے ترجمہ کی اصلاح کے لئے ڈاکٹر گلکرسٹ کو منتخب کیا۔ یہ اصلاح شدہ مسودہ کرنل اسکاٹ نے ۳۰ اگست ۱۷۹۶ء کو ایک خط کے ہمراہ سپہ سالار کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کرنل اسکاٹ اس خط میں لکھتا ہے۔

جناب والا

"آئین لشکری کی جن دفعات کو آپ نے منتخب کر کے مجھے بغرض ترجمہ عنایت فرمایا تھا، میں ان کے فارسی اور ہندوستانی ترجموں کو پیش کرنے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی ہدایت کے بموجب اس اعلان کا ترجمہ بھی منسلک ہے جو رنگروٹوں کو بھرتی سے پیشتر سنایا جائے گا اور وہ عہدنامہ بھی شامل ہے جس کا اقرار بھرتی کے وقت ان کو کرنا ہوگا۔ جہاں تک ہندوستانی گرامر کے مطابق ترجمہ کرنے کا تعلق ہے مجھے اپنی لیاقت پر پورا بھروسہ نہیں تھا اور اس خیال سے کہ حکومت کی منشا یہی ہے کہ ترجمہ حتی الامکان بالکل درست ہو میں نے مسٹر گلکرسٹ سے مشورہ کیا ہے۔ جن کی نہایت مفید گرامر اور لغت ان کی ہندوستانی زبان کی وسیع اور صحیح واقفیت پر شاہد ہیں۔"

کرنل اسکاٹ نے اس خط میں ایک اور اہم انکشاف کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس آئین لشکری کی بعض دفعات کا ترجمہ ۱۷۹۶ء سے بہت پیشتر میجر کرک پیٹرک ہندوستانی زبان میں کر چکے تھے۔ "آئین لشکری کے اکثر دفعات کے ترجمے کی بنیاد وہ ترجمہ ہے جو کئی سال گزرے میجر کرک پیٹرک کر چکے تھے۔ اگر میں نے بعض مقامات پر ان کے ترجمے سے انحراف کیا ہے تو میرا مقصد اس عظیم شخصیت کے ترجمے کو بہتر بنانا نہ تھا بلکہ اس خیال سے کہ پورے ترجمے کی عبارت میں یکسانیت ہو تو بہتر ہے۔" میجر کرک پیٹرک (۱۷۴۶ء تا ۱۸۱۲ء) بنگال کے سپہ سالار جنرل گائلیس اسٹیبرٹ کا فارسی ترجمان ۱۷۷۸ء میں بنگال آیا تھا اس نے آئین لشکری کا ترجمہ ۱۷۸۲ء میں کیا تھا مگر نیشنل بیوگرافی میں اس کے حالات زندگی کے تحت فقط فارسی ترجمے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستانی ترجمے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

کرنل اسکاٹ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آئین لشکری کے سب دفعات کا ترجمہ ہندوستانی میں نہیں کیا گیا بلکہ فقط ان دفعات کا جن کو کمانڈر ان چیف نے منتخب کیا تھا۔

آئین لشکری کے اس ہندوستانی ترجمے کا مکمل متن ڈاکٹر گلکرسٹ کی کتاب "مشرقی زبان داں" کے نئے ایڈیشن میں درج ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں کلکتہ سے چھپی تھی۔ "آئین لشکری" کتاب کے پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں کرنل اسکاٹ کا وہ خط (بزبان انگریزی) ہے جو موصوف نے میجر جنرل سر اے برکومبی کو لکھا تھا۔ آئین لشکری کی چھپائی دو کالمی ہے۔ پہلے کالم میں انگریزی متن درج ہے اور اس کے بالمقابل ہندوستانی ترجمے کی عبارت رومن رسم الخط میں ہے۔

آئین لشکری

دوسرے آئین دوسرے باب سے جو دنگے پر ہے

جو کوئی بڑا یا چھوٹا عہدے دار یا سپاہی بے ادبی یا حقارت کرے جنرل یا کسی بڑے سردار فوج کے حق میں یا بات کہے کہ جس سے بے قدری یا فساد

ان کا ہو سکے، تو وہ اپنی تقصیر کے موافق سزا پاوے گا۔ لشکری عدالت یعنی کورٹ مارشل کی تجویز سے۔

تیسری آئین دوسرے باب کی

کوئی عہدہ دار یا سپاہی جو اپنے رسالے میں یا کمپنی یا پلٹن یا رجمنٹ میں یا اور کسی رسالے یا کمپنی میں یا لشکر میں یا کسی تعیناتی پر یا تھانہ پر یا چوکی پہرے پر کسو سبب سے کچھ دنگا یا فساد شروع کرے یا مچاوے یا شریک کسی فتنے میں ہووے تو وہ مارا جاوے گا جان سے یا ایسی سزا پاوے گا، جیسی کورٹ مارشل ٹھہرا دے۔

چوتھی آئین دوسرے باب کی

جو کوئی چھوٹا بڑا عہدہ دار یا سپاہی کسی دنگے یا فساد میں حاضر ہو کر اپنی مقدور بھر اسی کو مٹا نہ دیوے۔ نہ کرے یا کسو دنگے یا اس کے ارادے سے واقف ہو کے ترنت اپنے سردار کو اس کی خبر نہ پہونچاوے تو سزا اس کی کورٹ مارشل کی تجویز سے قتل ہوگا یا اور طرح کی تنبیہ اپنی تقصیر کے لائق پاوے گا۔

پانچویں آئین دوسرے باب کی

کوئی عہدہ دار یا سپاہی جو اپنے سے بڑے یا قدیم عہدہ دار کو مارے یا تلوار اس پر کھینچے یا کھینچنا چاہے یا کسی ہتھیار کو اٹھا دے، یا کسی طرح کی زبردستی مزد کرے، کسو حجت سے، یا اپنے سے بڑے یا قدیم عہدہ دار کا کوئی واجبی حکم نہ مانے تو وہ مار ڈالا جائے گا یا اور کوئی ایسی سیاست جو اس کے گناہ کے موافق ہوگی سو کورٹ مارشل کی تجویز سے اس کو دی جائے گی۔

پہلی آئین پانچویں باب کی

سب کوئی عہدہ دار یا سپاہی جو طلب پا کے یا اپنے نام لکھا کر دستور موافق نوکری میں پھر اس سے جو بھاگیں اور یہ ثابت ہو تو ان کی سزا موت ہوگی یا اور کوئی سیاست جیسی کورٹ مارشل سے ٹھہرائی جائے گی۔

دوسری آئین پانچویں باب کی

جو حولدار یا اور کوئی چھوٹا عہدہ دار یا سپاہی اپنے سردار کی رخصت بنا اپنے رسالے یا کمپنی یا کسی تعیناتی سے اپنے تئیں غیر حاضر کرے اور یہ اس پہ ثابت ہو تو اپنی تقصیر کے موافق سزا پاوے گا۔ کورٹ مارشل کی تجویز سے۔

تیسری آئین پانچویں باب کی

جو حولدار یا اور کوئی چھوٹا عہدہ دار یا سپاہی جیتی برطرفی کی دستور موافق اپنے اگلے رجمنٹ رسالے یا کمپنی سے نہ پا کر اور کسی رجمنٹ رسالے یا کمپنی میں اپنا نام لکھا دے تو وہ بھگوڑا گنا جائے گا اور ویسی ہی سزا پاوے گا۔ تس پر جو کوئی عہدہ دار جان بوجھ کر ایسے چھوٹے عہدہ دار یا سپاہی کو رکھے یا نام لکھا دے یا اس کو بھگوڑا معلوم کرتے ہی ترنت اس کو قید نہ کرے اور اس کی خبر اس پلٹن میں کہ جس سے بھاگا ہے نہ پہونچاوے تو وہی عہدہ دار کورٹ مارشل کی تجویز سے عہدہ کھووے گا اور برطرف بھی ہوگا۔

چوتھی آئین پانچویں باب کی

جو کوئی عہدہ دار یا سپاہی کسی اور عہدہ دار یا سپاہی کو نوکری سے بھاگنے کی کہے یا سکھا دے اور یہ اس پر ثابت ہو تو اس کو ایسی سیاست ملے گی جیسی کورٹ مارشل کی تجویز سے ٹھہرائی جائے گی۔

پہلی آئین آٹھویں باب کی

جس وقت کسی عہدہ دار یا سپاہی پر بڑے گناہ کی نالش ہو یا کسو رعیت کے بدن یا مال کے کچھ بدعت، یا نقصان کرنے کی فریاد ہووے، جس

سزا موقوف ہے ملکی آئین پر، جس کسی رجمنٹ، رسالے، کمپنی یا تعیناتی میں وہ اسامی یا وے اسامی علاقہ رکھتے ہوں، جن پر فریاد ہوتی ہے تو اس پلٹن کے سردار اور عہدہ داروں کو چاہیے، اس آئین کے موافق، مناسب درخواست پر اس فریادی یا فریادیوں سے، یا ان کی طرف سے، کہ انہی مقدموں پر اس اسامی یا اسامیوں کو، جن پر نالش ہوئی ہے، ملکی حاکم کو سونپے، اور سوائے اس کے چاہیے کہ عدالت کے عہدہ دار کو مدد و سہارا دیوے۔ اس اسامی یا اسامیوں کے پکڑنے اور سلامت پہنچانے میں، واسطے تحقیقات، اس نالشی مقدمے کے، اگر کوئی سردار یا عہدے دار دیکھ سن کے نہ مانے، یا غفلت کرے اسی درخواست سے ملکی حاکم کو اس اسامی یا اسامیوں کے سونپنے میں یا اس اسامی یا اسامیوں کے پکڑنے میں عدالت کے لوگوں کی کمک نہ کرے تو وہ سردار یا وے عہدہ دار اپنے منصب عہدے اور نوکری سے برطرف ہوویں گے۔

دوسری آئین آٹھویں باب کی

چاہیے کہ کوئی عہدہ دار نہ بچاوے کسی قرض دار کو اس کے مہاجنوں سے، سپاہی ہونے کی حجت سے، جو عہدے دار اس بات کا تقصیر دار ٹھہرے مارشل میں نوکری سے جواب پاوے گا۔

پہلی آئین نویں باب کی

اگر کوئی چھوٹا یا بڑا عہدے دار یا سپاہی یہ سمجھے کہ اس نے اپنے سردار یا اور کسو عہدے دار نے اس پر کچھ ظلم یا بے جا کیا ہو تو اس کو اپنے نٹ یا رسالے یا کمپنی کے سردار سے اس بات کی نالش کرنی ہوگی، اور اس سردار کو چاہیے کہ اسی آئین کی رو سے کورٹ مارشل کو جمع کرے فریادی انصاف کرنے کے لیے۔

دوسری آئین دسویں باب کی

جو کوئی حولدار یا اور کوئی چھوٹا عہدے دار یا سپاہی بیچے یا جان بوجھ کر یا غفلت سے، خراب کرے، دبی بارود، گولی یا توڑے جو اس کے حوالے ہیں سرکار کے کام کو، اور یہ بات پلٹنی کورٹ مارشل میں اس پر ٹھہرے تو وہ جو چھوٹا عہدے دار ہو سپاہی کے درجے میں آ کے مار بھی کھاوے گا، جیسا اور سپاہی اب تقصیر دار موافق مرضی کورٹ مارشل کی مار کھاوے گا۔

تیسری آئین دسویں باب کی

ہر کوئی حولدار یا اور کوئی چھوٹا عہدے دار یا سپاہی جو اپنے گھوڑے، ہتھیاروں، کپڑوں یا سپاہیانہ سرانجاموں کو بیچے، کھووے یا اپنی غفلت سے ڑے اور یہ کورٹ مارشل میں اس پر ثابت ہو، تو ایسا ڈنڈ ہر آٹھوارے اس کی آدھی طلب سے لیا جاوے گا جیسا کہ کورٹ مارشل ٹھہرا دے اس نقصان لتی کے پورا کرنے کو، اور قید بھی ہوگا یا اتنی مار کھاوے گا جتنی اس کی تقصیر کے لائق ہوگی۔

پہلی آئین اگارویں باب کی

سب کوئی حولدار یا اور کوئی چھوٹے عہدے دار یا سپاہی جو لشکر کے مقام سے آدھ کوس پرے پائے جاویں بنا اپنے سردار کی رخصت کی ی، تو ان کو ایسی تنبیہ ملے گی جیسی کورٹ مارشل کی تجویز سے ٹھہرائی جاوے گی۔

دوسری آئین اگارویں باب کی

چاہیے کہ کوئی عہدہ دار یا سپاہی، اپنے سردار کی پروانگی بنا، کہیں باہر رات بھر نہ رہے، اپنے ڈیرے، قلعے یا لشکر کے مقام یا چھاؤنی سے، یں تو سزا پاوے گا، اپنی تقصیر کے موافق، کورٹ مارشل کی تجویز سے۔

تیسری آئین اگارویں باب کی

ہر ایک حولدار یا اور کسو چھوٹے عہدے دار و سپاہی کو چاہیے کہ شام کی توپ یا تنبور بجنے پر، اپنے اپنے ڈیروں میں یا ٹھکانوں پر جا رہیں نہیں

تو اپنی تقصیر کی بابت دیوان کے سردار سے پاوے گا۔

چوتھی آئین اگارویں باب کی

جو کوئی چھوٹا یا بڑا عہدے دار یا سپاہی قصور کرے بر وقت پہونچنے میں قواعدگاہ پر یا اور جگہ جمع ہونے کی کہ جو سردار نے ٹھہرائی ہو، لغیر بیماری یا
کوئی ضرورت ظاہری یا اسی جگہ سے، یا کسی چوکی پہرے سے اپنے سردار کے کہے بنا، یا اپنی بدلی یا چھٹی موافق دستور کے، آگے اٹھ جاوے، تو کورٹ
مارشل کی تجویز سے جیسی اس کی تقصیر ٹھہرے گی ویسی ہی سزا اس کو ملے گی۔

پانچویں آئین اگارویں باب کی

جو کوئی بڑا عہدہ دار اپنی چوکی پہرے پر یا لغنیاتی یا کسو اور خدمت پر، ہتھیار باندھے ہوئے متوالا پایا جاوے تو اس بات کے واسطے برطرف ہوگا
کوئی چھوٹا عہدیدار یا سپاہی جو ایسا گناہ کرے، اتنی مار کھائے گا جتنی کورٹ مارشل کی تجویز میں ٹھہرائی جائے گی۔

چھٹی آئین اگارویں باب کی

کوئی سنتری یعنی پہرے دار سپاہی جو اپنے پہرے کی جگہ پر سوتے ہوئے پکڑا جاوے یا اس جگہ کو چھوڑے باقاعدہ بدلی کے آگے، تو وہ قتل
یا اور کوئی سیاست جیسی کورٹ مارشل تجویز کرے ویسی پاوے گا۔

ساتویں آئین اگارویں باب کی

چاہیے کہ کوئی سپاہی اپنے عوض دوسرے کو اجورے پر اپنی لشکری خدمت کرنے کے واسطے نہ رکھے اور یہ خدمت کسو کو معاف نہیں ہونے کی ر
بیماری لاچاری یا رخصت کی حالت میں، اور ہر ایک سپاہی کی جس پر یہ ثابت ہوگا کہ وہ اپنی خدمت ٹھیکے پر کراوے ہے تو وہ اور عوضی جو غیر کی سپا
خدمت ایسے چکوت پر لیوے، سزا پاویں گے پہلے ملٹی کورٹ مارشل سے۔

آٹھویں آئین اگیارویں باب کی

اور ہر کوئی چھوٹا عہدہ دار جو ایسی ٹھیکے داری کی خدمت پر انکانی (CONNIVANCE) دیوے تو وہ اپنے عہدے سے نکالا جائے گا
ایک بڑا عہدے دار جو ایسی نامعقول باتوں کو جان کے منیاوے تو سزا پاوے گا، بڑے کورٹ مارشل کی تجویز سے۔

نویں آئین اگارویں باب کی

کوئی لشکری آدمی جو بندوق یا اس کے قسم کے چھوڑنے سے، تلوار کھینچنے سے، تنبور بجانے سے یا کسو اور طرح سے لشکر یا چھاؤنی یا قلعے میں
کمربندی یا تیاری دھوکے سے کراوے تو وہ تنبیہ پاوے گا کورٹ مارشل کی بچار سے۔

دسویں آئین اگارویں باب کی

کوئی عہدے دار یا سپاہی جو اپنی ٹولی کو چھوڑے، بنا لاچاری یا اپنے سردار کی رخصت کے تو اس کو ایسی سزا ملے گی جیسی کورٹ مارشل
[illegible] میں اس کے قصور کے لائق ہووے گی۔

اگارویں آئین اگارویں باب کی

چاہیے کہ کوئی عہدہ دار یا سپاہی آدمی کو نہ ستاوے جو رسد یا اور کوئی سرانجام لشکر قلعے یا چھاؤنی میں پہونچاتا ہے، نہیں تو سزا پاوے گا
موافق مرضی کورٹ مارشل کے۔

بارھویں آئین

جو کوئی عہدہ دار یا سپاہی دشمن کے سامنے کبل کرے (Misbehave) یا بے غیرتی سے کسی تھانے کو جو نگہبانی کے واسطے اس

کے حوالے ہے چھوڑ جاوے یا باتیں کہے کہ جن سے اور لوگ ویسی ہی کچالی کریں تو چاہیئے کہ وہ جان سے مارا جائے گا۔

تیرھویں آئین

جو کوئی عہدے دار یا سپاہی دشمن کے سامنے کچلی کرے، بھاگے یا بے غیرتی سے کسی گڑھ کو تھانے یا چوکی پہرے کو کہ جن کے تھامنے کو اسے حکم ہے، چھوڑ جاوے یا باتیں کہے کہ جن سے اور لوگ ویسی ہی کچالی کریں یا فتح کے بعد اپنے سردار یا تھانے کو لوٹ پاٹ کے واسطے چھوڑیں اور جو کوئی ایسا گنہگار تحقیق کی رو سے ٹھہرے گا تو وہ لشکری حکموں کا نہ ماننے والا گنا جائے گا اور وہ قتل ہوگا یا ایسی اور سیاست جیسی کورٹ مارشل میں ٹھہرے گی، پاوے گا۔

چودھویں آئین

کوئی لشکری آدمی جو اپنے ہتھیاروں یا بارود گولی وغیرہ کو پھینک دیوے ایسی سزا پاوے گا جیسی کورٹ مارشل کی تجویز سے حکم ہوگا۔

پندرھویں آئین

جو کوئی لشکری کسی آدمی کو بزدلی یعنی چوکی پہرے وغیرہ کا اشارہ سنا دے یا اس کے معلوم کرنے کے لائق موافق قاعدہ و دستور فوج کے نہ ہو یا کہ ڈھیٹ ہو کر جو بزدل اس نے پایا ہے سوائے اس کے اور کوئی بات یا اشارہ دیوے تو سزا پاوے گا جیسی کورٹ مارشل کی تجویز سے حکم ہوگا۔

سولھویں آئین

چاہیئے کہ سب کوئی عہدہ دار اور سپاہی اپنے بند و بست کی چال پہ چلے، اپنے ڈیرے یا چھاؤنی یا کوچ میں اور جو کوئی لشکری باغوں کو یا مچھلی تالابوں، گھروں یا بستیوں، کھیت یا کھلیانوں کو ستوڑا یا بہت لوٹے یا بگاڑے، یا کسی آدمی پر زیادتی کرے، یا قصد سے کسی مال کو خراب کرے اس وقت کے بڑے سردار کے حکم بغیر، تو وہ آدمی یا وے لوگ جو ایسی باتوں میں گنہگار ٹھہریں ایسی سیاست پاویں گے جیسی کورٹ مارشل کی تجویز ان کے گناہ کے موافق ٹھہرے گی۔

سترھویں آئین

جو کوئی دشمن کو نقد سے، بارود گولی یا رسد وغیرہ سے پشتی (*Relieve*) دے بچاوے یا جان بوجھ کر کوئی ایک دشمن کو ٹکا دے یا رکھے تو وہ ایسی تنبیہ پاوے گا جیسی کورٹ مارشل ٹھہرا دے۔

اٹھارویں آئین

جو کوئی دشمن سے کتابت کی رو سے یا زبانی علاقہ رکھے یا آپ کچھ خبر پہونچاوے یا کسو وسیلے سے اور یہ بات ثابت ہو تو جان سے مارا جائے گا یا کوئی سیاست جو کورٹ مارشل میں ٹھہرے گی سو اس کو ملے گی۔

بیسویں آئین

اگر کوئی عہدہ دار یا سپاہی اپنے تھانے یا نشان کو چھوڑ جاوے، لوٹ پاٹ کی تلاش میں، اور یہ بات اس پر کورٹ مارشل میں تحقیق ہو تو وہ قتل ہو یا ایسی سیاست پاوے گا جیسی کورٹ مارشل ٹھہراوے۔

اکیسویں آئین

اگر کوئی عہدے دار یا سپاہی جو کسی قلعے، گڑھی یا تھانے کے قلعے دار یا سردار کے حکم میں ہیں اس قلعے دار پر زبردستی کر کے وہی جگہ دشمن کو دلا یا چھڑا دیں تو وے چھوٹے بڑے عہدے دار یا سپاہی جو ایسے گنہگار ٹھہریں گے قتل ہوویں گے یا اور سیاست کورٹ مارشل کی تجویز سے پاویں گے۔

بائیسویں آئین

لشکر کے تمام بنیئے دکان دار، وغیرہ کنجڑے بھٹیارے، لگے لپٹے اور سب کوئی آدمی جن نے فوج کا ساتھ پکڑا گو کہ لکھے ہوئے سپاہیوں میں وے نہیں ہیں تو بھی لشکری آئین و قاعدے سے حکموں کو ماننا ہوگا انہیں۔

چوتھی آئین بارھویں باب کی

جو شخص کورٹ مارشل میں جج ایڈوکیٹ مقرر ہو اُس کو چاہیے کہ سب گنہگاروں کی تحقیقات پر بڑے کورٹ مارشل میں پاس عدالت کے ہر ایک آدمی کو اس طرح سے قسم کھلاوے۔

ڈھب قسم لینے دینے کا اور بیان اُس کا

جو مسلمان ہو چاہیے ہو ہاتھ میں سر پر پاس کے قرآن شریف دیکے کہیں: خدا کو واحد شاہد جان کر: اگر ہندو ہو گنگا کا پانی تانبے کے برتن میں لیکر اور پات تلسی کے اس میں ڈال کر اس کے ہاتھ میں دیں جب کہ گنگا جل و تلسی پات نہ ملے سانی گرام (Stone) کو برہمن کے ہاتھ سے کو ایک پانی کے ساتھ دھوکے وہی پانی تانبے کے برتن میں دے کر ہاتھ میں دلویں۔ جو وہ بھی میسر نہ ہو تو تانبے کے باسن میں پونہ پانی لے کر تلسی پات یا کسی قسم کا پھول جو مل سکے اس ہندو کے ہاتھ میں رکھ کر، د نام گنگا کا زبان پہ لے کے اس پات کو اسی پانی میں دے کر اس سے قسم لیں۔ جو کوئی پھول کے قسم سے کوئی پھول نہ ہاتھ آوے تو خالی کسی گھاس کو سر پر رکھ کر قسم کھلائی چاہیے۔ جس وقت یہ بھی نہیں ملے ہاتھ کی پسنی ہاتھ میں دے کر سوگند لیویں، ہری نبس پوتھی اور برہمن کے پاؤں کی بڑی کھٹن کر یا ہے۔ مبہم مقدموں میں اس سے قسم مناسب نہیں ہے۔ پھر سوگند لینے کے وقت اُس کو کہیں " پرمیشور کو جان مان کر" یہ کریا یا سوگند برہمن ہی کے ہاتھ سے سب ریت قسم اس کی کروا دلانی چاہیے۔

اور مذہب کے لوگوں کو جو کچھ ان کے دین و دھرم میں بڑے مان کی چیز ہو سو ہاتھ پر رکھ کر ان سے قسم لیویں۔

تم کو یہ مقدمہ جو در پیش ہے، خوب جانچنا اور سچائی سے ٹھہرانا ہو گا۔ گواہوں کی گواہی کے موافق۔

میں فلانا قسم کھاتا ہوں کہ طرف داری، رعایت اور مایا موہ کو چھوڑ کے جیسا چاہیے انصاف ویسا کروں گا۔ موافق آئین و قاعدے کے جو عہدہ داروں اور سپاہیوں کے بہتر بندوبست کے واسطے ہیں اور جو اب کوئی شبہ دکھائی دے کہ اس آئین سے نہیں کھلتا ہے تو میں اپنے دھرم ایمان کی رو سے اور عقل کے مقدور بھر امور لشکری رواج کے موافق ایسے مقدموں میں انصاف کی تجویز کروں گا۔ پھر بھی قسم کھاتا ہوں میں کہ اس عدالت کی تجویز ظاہر نہ کروں گا جب تک منظور نہ ہو گا بڑے سردار فوج کے یا اس شخص کے یا ان شخصوں کے جن کی سزا یا حکم سے یہ کورٹ مارشل جما ہوا ہو۔ د میں ہرگز کسو سبب سے کدھی نہ کہوں گا، نہ بتلاؤں گا اُس کورٹ مارشل کے کسی ایک آدمی کا بچن بچار یا قیاس، جب تک مجھ ضرورۃ پڑے نہ ان باتوں کی گواہی دینا۔ گواہ ہو کے ملکی عدالت میں انصاف جاری ہونے کے لئے۔

جب کورٹ مارشل کا ہر ایک آدمی وہ قسم کھا چکا تب ان کا پریسیڈنٹ یعنی پردھان (میر مجلس) جج ایڈوکیٹ یا اس کے عوضی کو قسم اب کھلا دے گا۔

میں فلانا قسم کھاتا ہوں کہ ہرگز کسو سبب سے کدھی نہ کہوں گا نہ بتلاؤں گا اس کورٹ مارشل کے کسی ایک آدمی کا بچن یا قیاس جب تک مجھے ضرورۃ پڑے ان باتوں کی گواہی دینا۔ گواہ ہو کے ملکی عدالت میں انصاف جاری ہونے کے لئے۔

پانچویں آئین بارھویں باب کی

چاہیے کورٹ مارشل کے تمام عہدے دار آدمیت اور ادب کی چال سے چلیں و آپس میں چھوٹوں سے شروع کر کے ہر ایک درجہ اپنی تجویز بیان کریں۔

چھٹی آئین

سب لوگ جو گواہی دیویں بڑے کورٹ مارشل کے روبرو تو ان کو قسم پر جانچنا اور پوچھنا ہوگا۔ وہ کوئی بڑا کورٹ مارشل کسی گناہگار کے
کی تجویز نہ کر سکے گا مگر اس صورت میں کہ جتنے عہدے دار بڑے کورٹ مارشل میں موجود ہوں ان میں سے دو حصہ یا اگر صرف پانچ آدمی ہیں ان میں سے
اس تجویز ON MEET پر ہو دیں۔
(دستور اور قاعدہ قسم کھلانے کا گواہوں کو جو کہ بڑے کورٹ مارشل میں گواہی دیں گے، یہ ہے) یہ مقدمہ جو درپیش ہے جو کچھ اس میں
پوچھا جاوے سو جواب اس کا سچائی سے کہنا اور اس مقدمے میں بھی جو تمہیں معلوم ہو بہت راستی اور درستی سے بلا لگاؤ سخن پرے
ت کے ظاہر کیا چاہئے۔

دسویں آئین بارھویں باب کی

ہر ایک رجمنٹ، رسالا یا کمپنی کے بڑے عہدے دار اپنے سردار کے کہنے پر چھوٹے کورٹ میں جج ہو سکتے ہیں، قصوروں اور تقصیروں کے
تحقیقات کے واسطے جو روبکار ہوتے ہیں وہ قصوروں کی سزا کی مار پیٹ کھلانے کے لئے وہ تجویز مقدمہ کی ان کے قیاس و مت کی کثرت اور فرمائی
پڑے گی لیکن اس کو عمل میں نہ لاویں۔ جب لگ وہاں کے سردار یا قلعہ دار جو کورٹ مارشل کی سبھا سے باہر ہے، منظور نہ کرے۔

تیرھویں آئین

چاہیئے کہ کوئی شخص جو کوئی ہو کورٹ مارشل کی مجلس کے حضور کچھ دھمکی نہ دے، باتوں، اشارہ یا حرکتوں سے، نہ وہاں ایسا غل یا
بڑا کرے کہ جس سے ان کی روبکاری میں خلل آوے نہیں تو کورٹ مارشل کی مرضی موافق سزا پاوے گا۔

چودھویں آئین

اس لئے کہ تقصیر وار سزا پاویں یہ حکم ہے کہ جس وقت کوئی عہدے دار یا سپاہی گناہ لائق تنبیہ کے کرے، جو بڑا عہدے دار ہو تو اپنے
سردار کی معرفت نظربند ہوگا اور جو چھوٹا عہدے دار یا سپاہی ہو تب قید کیا جائے گا جب لگ کورٹ مارشل میں تجویز نہ ہووے یا صاحب مختار
(Proper authority) کے حکم سے مخلصی نہ پاوے۔

سولھویں آئین

چاہیئے کہ کوئی عہدے دار، مختار چوکی پہرہ یا Provost Marshall رد نہ کرے کسو قیدی کے لینے اور رکھنے کو واسطے
نگہبانی کے حوالے ہو فوج کے، کسی عہدے دار کی طرف سے اس عہدے دار کی طرف سے، اس عہدے دار کو چاہیئے کہ اسی وقت اس گناہ کا احوال
جسے قیدی گرفتار ہوا ہے، لکھ کر اپنے دستخط سے سپرد کرے۔

سترھویں آئین

چاہیئے کہ کوئی عہدے دار، مختار، چوکی پہرہ یا Provost Marshall یہ گھمنڈ نہ کرے کسو قیدی کے چھوڑ سکنے کا جو سونپا گیا ہے اس کی
نگہبانی میں، بنا چھوڑنے کی پروانگی موافق دستور کے، اور چاہیئے کہ وہ کسی قیدی کو بھاگنے نہ دیوے، نہیں تو کورٹ مارشل کی تجویز سے سزا پاوے گا۔

انیسویں آئین

جو کوئی بڑا عہدے دار نظربند ہو کے اپنی نظربندی کی جگہ سے نکلے مخلصی کے آگے، اس بات پر برطرف ہوگا۔

بائیسویں آئین

کوئی بڑا عہدے دار جو بے غیرتی سے اپنی حرمت چھوڑے، ایسی بدچالی چلے کہ جس سے سردار وہ مرد آدمی (Gentleman)
کا نام روا نہ رکھے گا اسے ایسی باتوں میں بڑے کورٹ مارشل کے روبرو گناہگار ٹھہرے تو نوکری سے جواب پاوے گا۔

پہلی آئین تیرھویں باب کی

جس وقت کوئی بڑا عہدے دار نوکری میں اپنی موت مرے یا مارا جاوے، اس رجمنٹ، رسالے پلٹن یا کمپنی کے سردار کو کہ جس سے وہ علا رکھتا تھا چاہیے کہ تر نت تمام مال یا اسباب اس کا جو اس وقت لشکر یا چھاؤنی میں ہو اسے جتن سے رکھے اور اس کی ایک فرد بھی پہلے پلٹنی کور مارشل کے آگے لکھے اس لئے کہ ادا کرنے لشکری دین اور خرچ مردے کے جو باقی رہے، اگر کچھ ہو اس کے وصی پاویں گے اپنے یا اس کے حقدار واسطے۔

دوسری آئین

جس وقت کوئی چھوٹا عہدے دار یا صرف سپاہی نوکری میں اپنی موت مرے یا مارا جاوے تو اس رسالے یا کمپنی کے سردار وقت کو لازم کہ اور دو بڑے عہدے داروں کے روبرو سب مال کی تفصیل اس مردے کے لکھ رکھے، اس کی سپاہیانہ نیے و ہتھیار اور سرانجام چھوڑ کے کیونکہ اس مذکور کا واجبی حساب دینا ہوگا اس کے حقدار وارثوں کو جیسا کہ اوپر کے آئین میں لکھا گیا ہے۔

پہلی آئین پندرھویں باب کی

چاہیے کہ اوپر کی لکھی ہوئی آئینیں ایک بار ہر ایک دو مہینے کے عرصے میں پڑھی اور ظاہر کی جاویں، ہر ایک رجمنٹ، رسالے، پلٹن یا کمپنی سامنے جس کی گنتی ہوئی ہو یا ہونے کو ہو نوکری میں اور چاہیے کہ ور دلبست عہدے دار و سپاہی جو نوکری میں ہوئے یا ہوویں گے سب آئینوں عمل کریں اور حرف بہ حرف ان کو مانیں۔

دوسری آئین

ایسے سب گناہ کی جس سے آدمی کی جان نہ ماری جاوے ہر ایک بھول چوک خطا یا قصور جو لشکری بندوبست و دستور (ملاحظہ) میں نقصان لاویں اور جس میں عہدے دار اور سپاہی تقصیر دار ہو سکے اگرچہ انہیں آئینوں میں ان کا ذکر نہیں ہے تو بھی ان کی تجویز کورٹ مارشل ہوگی اور ان باتوں کی سزا اس عدالت کی مرضی پر موقوف ہوگی۔

پانچویں آئین

جب کبھی لشکر میں سے کوئی پلٹن، رسالہ وغیرہ ایسی جگہ کی تعیناتی پر ہو کہ جہاں کوئی ملکی عدالت نہیں ہے، جب انہیں لشکریوں کے آدمی نے خون، چوری یا رہزنی یا اور کوئی بڑا گناہ یا تقصیر کیا ہو، چاہیے کہ وہاں کا بڑا سردار، مختار اسی کے احوال کو جنچاوے وہ تجویز کراوے کورٹ مارشل میں کہ وہ قتل ہو یا اور کوئی سزا پاوے اسی لشکری عدالت کی تجویز سے۔

چٹھی بابت حکموں سے جو نکلے تھے انگریزی فوج کے لئے سپاہیوں کے واسطے اگست کی آٹھویں تاریخ 1796ء۔

ہر ایک نئے سپاہی کی اسم نویسی کے آگے چاہیے کہ اس کو سنائی و بجھائی جاویں انگریزی فوج کی یہی آئینیں یعنی دوسری، تیسری چوتھی و پانچویں آئینیں دوسرے باب کی، پہلی، تیسری و چوتھی آئینیں پانچویں باب کی۔ دوسری و تیسری آئینیں دسویں باب کی، پہلی دوسری چھٹی تیرھویں، سولھویں، بیسویں آئینیں اگارویں باب کی۔ تس پر بھی [illegible] کے نشان کے سامنے چاہیے کہ اس کو اس کا شرط نامہ ظاہر کیا جاوے اور آگے کی قسم اسے کھلائی جاوے اس کے دین دھرم کے اعتقاد کے موافق۔

شرط نامہ

ضلع کے وقت تین برس کی خدمت کرنے کے بعد نوکری سے جواب مانگنے پر اپنی کمپنی کے سردار کی معرفت تہدید [illegible]

مہینے کے بیچ میں تم کو ملے گا اس شرط سے کہ تمہاری کمپنی میں دس آدمی سے زیادہ کم نہ ہوں نہیں تو تم کو رہنا ہوگا جب تک یہ رکاوٹ جاتا نہ رہے۔ لڑائی کے وقت تمہارا کچھ دعویٰ نہیں ہے برطرفی کا بلکہ تم کو خواہ مخواہ رہنا ہوگا اپنی خدمت پہ جب تک تم کو نوکری میں رکھنے کی غرض توف نہ ہو۔

لشکری قسم نامہ

میں فلانہ، رہنے والا بستی فلاں کا، پرگنے فلانے کا، صوبہ فلانے کا، بیٹا فلانے کا، قسم کھاتا ہوں کہ میں ہرگز اپنے نشان کو نہیں چھوڑوں گا۔ دیکھ بھی کروں گا جہاں کہیں کا بھی حکم پاؤں یا کمپنی کے عمل پر ہو یا باہر اور اپنے سرداروں کے سب حکم تن من سے مانوں گا و ہر ایک بات میں اپنے تئیں تیار ہوں گا جیسا بھلے سپاہی اور کمپنی کے وفادار نوکر کو چاہیے۔ اور دلیا ہی ہوئے جو کو تھوڑی سی اپنی خدمت میں قصور کروں تو میں قبول کروں گا سزائیں جو لکھی ہوئی ہیں آئین لشکری میں اور میری روبرو پڑھی گئی ہیں۔

اطہر پرویز

ادب کی قدریں

ابتدا میں جب کہ انسان میں صحیح معنوں میں ادبی شعور پیدا نہیں ہوا تھا، وہ ہر عبارت یا تحریر کو ادب کہا کرتا تھا۔ اس وقت تحریر کا مقصد معلومات یا خیالات کی محض ترسیل یا ابلاغ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، طب، علم ہیئت، نجوم، رمل۔ یہاں تک کہ گرامر کو بھی کلام موزوں یا شاعری کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ نثر کا وجود تو بعد میں ہوا اور نثر تو بہت دنوں تک محض یہی فرائض انجام دیتی رہی۔

شروع شروع میں نظم یا نثر دونوں فلسفہ، مذہب، یا انسان کے دوسرے قسم کے خیالات کے اظہار کا آلہ تھیں۔ اس لئے اس وقت لکھی ہوئی تحریر یا عبارت، جسے ادب کا نام دیا جاتا تھا، اس کی کوئی اپنی خود مختار حیثیت نہ تھی۔ بلکہ ادب دوسرے علوم یا شعبوں کا تابع تھا۔ انسانی ترقی کے ساتھ معلوماتی تحریر اور تخلیقی تحریر میں فرق کیا جانے لگا اور اس طور پر فن کا تصور پیش کیا گیا۔ فن برائے فن کا بنیادی تصور یہ تھا کہ فن لطیف اور شعر و ادب، فلسفہ، سیاست اور زندگی کے دوسرے علوم یا شعبوں سے مواد حاصل کرتے تھے اور ان سے فیض اٹھاتے تھے، لیکن ان کے تابع نہیں بلکہ خود مختار ہیں اور ان کی اپنی شرطیں اور قدریں ہیں۔ ان قدروں میں پہلی قدر یہ تھی کہ ادب ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس تخلیقی عمل میں معلومات یا خیالات، تجربات و مشاہدات خود ادیب کی شخصیت اور اس کے تخیل سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی چیز کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ تخلیق علم یا معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ ہمیں مسرت بھی بہم پہنچاتی ہے۔ اس مسرت کا تعلق ہمارے جمالیاتی ذوق اور احساسات سے ہے۔ گویا علم یا خیالات کو خواہ ان کا تعلق مذہب اور فلسفے سے ہو یا سیاسیات اور تاریخ سے، مجرد صورت میں پیش کرنے کے بجائے محسوس صورت میں پیش کرنے کا نام ادب قرار دیا گیا۔ اس محسوس صورت کے بھی طرح طرح کے طریقے ہیں۔ مثلاً شاعری، ناول، کہانی اور ڈرامہ ان صورتوں کو ادب کی اصناف یا ہیئتیں کہتے ہیں۔ ان اصناف اور ہیئتوں کے بھی اپنے اپنے مطالبات ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی قدریں مشترک ہیں یعنی انہیں ہر صورت میں تخلیقی یا جمالیاتی ہونا چاہیے اور ان کی اپیل براہ راست ہمارے جذبات اور احساسات سے ہو۔ لیکن بعد میں یورپ کے بعض ادیبوں نے فن برائے فن یا ادب برائے ادب کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ ادب قائم بالذات اور اپنا مقصد آپ ہے اس لئے اس کا زندگی کے دوسرے مظاہر سے تعلق نہیں ہونا چاہیے، یا جمالیاتی قدروں کا مطلب صرف حسن و جمال سے متعلق اپنے جذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس طور پر یہ غلط نظریہ قائم کیا گیا کہ ادب ایک محدود اور خالص چیز ہے جو انسانی قدروں سے بے تعلق ہے اس نے میتھو آرنلڈ اور دوسرے نقادوں نے ادب اور زندگی کے باہمی تعلق پر زور دیا اور ادب برائے زندگی کا نعرہ نقادوں کی تحریروں میں گونجنے لگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں اصطلاحوں میں بنیادی فرق نہیں ہے۔ ادب برائے زندگی کا مطلب یہ ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر سے ادب بے تعلق نہیں اور ادب برائے ادب کا مطلب یہ تھا کہ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر تحریر ادب نہیں ہے بلکہ ادب کی اپنی قدریں ہیں، یہ ایک فن لطیف ہے اور موسیقی، رقص اور مصوری کی طرح اس کے اپنے مطالبات اور شرائط ہیں۔ گویا اگر کوئی تحریر اپنا مواد، زندگی کے مظاہر اور انسانی قدروں سے حاصل کرتی ہے تو وہ اپنی جگہ پر مفید ہو سکتی ہے لیکن جب تک وہ جمالیاتی اور تخلیقی شرائط کو پورا نہیں کرتی اس وقت تک ادب کے دائرے میں نہیں آسکتی۔ انہیں شرائط کا نام ادبیت یا ادبی قدریں ہیں۔

اختر اورینوی نے اپنے مضمون "ادب اور فن کی بنیادی قدریں" میں لکھا ہے کہ "فنون لطیفہ میں لطافت ہوتی ہے، یہی وہ خاص قدر ہے جو انہیں

اعت یا آرٹ کا درجہ عطا کرتی ہے ـــــ بدن کی ہر حرکت فن رقص نہیں، ہر آواز موسیقی نہیں، ہر رنگ و خطوط کا اجتماع مصوری نہیں ـــــ ہر عبارت نثر کا نمونہ نہیں ہوتی اور نہ الفاظ کے ہر مجموعے کو ادب کہتے ہیں۔ لطافت فنون کی بنیادی قدروں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطافت کی نوع ع جلوے فنون کی بنیادی قدریں ہیں۔ لطافت بالیدہ ہوتی ہے، ارتقائے لطافت ہی صناعت کی حسن کاری ہے۔ حسن و لطافت آرٹ کی جان ہے۔

حسن و لطافت کا احساس اور اسی کو فلسفیانہ طور پر سمجھنے کا نام جمالیات ہے۔ چنانچہ اگر ہم حسن کی قدروں کے بارے میں کوئی تعین کر لیں تو ہمیں ادب قدریں آسانی سے معلوم ہونگی کیونکہ ادب کی قدریں بھی تقریباً وہی ہیں جو حسن کی ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حسن کی حیثیت اضافی ہے۔ یعنی یہ کہ نفس حسن کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے اس لئے اس کا رشتہ زمانے اور مقام کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز آج حسین ہے ہو سکتا ہے کہ کل حسین علوم ہو بلکہ بدصورت نظر آئے اور جو چیز ایک مخصوص فرد کو خوبصورت معلوم ہوتی ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کے لئے اس میں کوئی کشش نہ ہو یا جگہ بدلنے س کی ماہیت میں فرق تو نہ آئے لیکن وہ چیز دل سے اتر جائے، اسی لئے اس نظریئے کو ماننے والے کہتے ہیں کہ حسن کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کے لئے کوئی ول مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا کی ہر حقیقت اضافی ہے۔ گویا اچھائی اور برائی کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں ہی جاسکتی۔ اس بات کو اگر مثالوں کے ذریعہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے، کیونکہ اس معیار کے مطابق سچائی کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص ز کھا کر مر جائے تو گویا یہ کہنا چاہئیے کہ زہر کی یہ خاصیت اضافی ہے کیونکہ زہر اس شخص سے متعلق ہو کر حقیقت کی ایک مخصوص شکل اختیار کرتا ہے جو اس آدمی کے موت ہے، لیکن جب ہم عام انسان میں یہ دیکھتے ہیں کہ زہر کھانے سے اس کی موت واقع ہوتی ہے تو ہم اس سے مخصوص نتیجہ نکالتے ہیں۔ اس مثال کے بعد اپنی بات کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ہر حقیقت کو اضافی کہنا غلط ہے۔ حقیقتوں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ حسن بھی ایک حقیقت ہے اسی طرح حسن کا تعین بھی سکتا ہے۔ اگر کوئی غمزدہ انسان کسی پھول کو دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتا یا اگر وہ اس پھول کے حسن سے متاثر نہیں ہوا تو اس میں پھول کا کیا نقص ہے اور پھول میں ایسی نی خارجی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ یہ دیکھنے والے کی داخلی کیفیت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے خود اس کا خارجی عمل متاثر ہوتا ہے۔ لیکن پھول کی خارجی حقیقت بے تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور پھول کی حقیقی ماہیت وہی رہتی ہے۔ اس خاص غمزدہ شخص کے علاوہ پھول کو سب خوبصورت کہتے ہیں۔ یہی ہماری روزمرہ زندگی کا تجربہ ہے۔ خوبصورتی کی تعریف اسی طرح کی گئی ہے کہ جو چیز ہماری پسندیدگی کے جذبے کو ابھارے اور آسودہ کرے اور ہم دیکھ کر اس سے مسرت حاصل کر سکیں وہ خوبصورت ہے۔ کسی چیز کی پسندیدگی کا یہ احساس جبلی نہیں ہے بلکہ ہزاروں سال کی انسانی تہذیب کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ تربیت کا نتیجہ اس لئے کہوں گا کہ حسن کا حساس اپنی جگہ پر کسی خارجی اثر کا نتیجہ ہوتا ہے اگر آپ کے کان موسیقی سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں تو استاد فیاض خاں کے نغمے میں آپ کو کوئی لطف نہیں ئے گا اور آواز کا وہ حسن جس پر موسیقی داں جھوم جاتا ہے آپ پر کسی قسم کا اثر نہیں کرے گا۔ موسیقی کے اس حسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی میں حسن سے لطف اندوز ہونے کی مجموعی طور پر کوشش کی ہے۔ جب ابتدائی انسان نے پہلے پہل پہاڑ دیکھے ہونگے و ان کی عظمت سے دہشت زدہ ہوا ہوگا، یا اس نے دریاؤں کی روانی سے خطرہ محسوس کیا ہوگا۔ لیکن جیسے جیسے پہاڑوں کے بارے میں اس کا علم بڑھتا گیا اس نے ان کا طول و عرض ناپ لیا۔ جب اس نے تیرنا سیکھ لیا کشتیاں بنالیں جن سے جان لیوا موجوں کو زیر کیا جانے لگا تو خوف کے بجائے ان سے لطف لینے کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور پھر وقت کے ساتھ اس جذبے کی تربیت ہوئی، اس نے ان پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا جسے خوف و دہشت نے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو یہ سمجھنا چاہئیے کہ انسانی تہذیب کا ورثہ اس کے حصے میں نہیں آیا۔

اس بات کی مزید وضاحت کرنے کے لئے نیکی اور بدی کی مثال دی جاسکتی ہے اگر کوئی یہ کہے کہ نیکی اور بدی بھی جبلی ہیں تو یہ بھی سراسر غلط ہوگا۔ ہمارا نیکی کا احساس سینکڑوں اور ہزاروں سال کے انسانی تجربے کا نچوڑ ہے ہزاروں سال کے تجربے نے یہ واضح کر دیا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کسے کہتے ہیں ونوں کو ایک دوسرے سے کیسے تمیز کیا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سچائی کا بار بار ثبوت دینے کے لئے انسان ہر بار زہر کا پیالہ پیئے۔ ایک بات تجربے کے ذریعہ عام طور پر واضح ہو جاتی ہے تو پھر لوگ کلیہ بنا لیتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم ہاتھ کو بار بار جلا کر آگ کے جلنے کی ماہیت کا علم حاصل کرنے کی کوشش

جوہیں کہتے۔ انسانی تجربے نے بتایا ہے کہ آگ کو چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے اور ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ حقیقتوں کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے لئے محض وجدان کی رہنمائی کافی نہیں ہے بلکہ اس میں عام انسانی تجربے سے مدد لینا چاہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ وجدان انسان کو کسی اور نتیجہ پر نہ پہنچا دے۔ وجدان سے اکثر فطرت کے بارے میں ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو محض فریب نظر آتی ہیں اور حقیقت ان سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ بعض ایسی حقیقتوں کو ثابت کرنے اور ان کا اظہار کرنے کے لئے لوگوں کو سزائیں بھگتنی پڑی ہیں۔ اس موقعے پر ہم ماضی کی ان عظیم شخصیتوں کی مدد لینا چاہتے ہیں جن سے ہماری دلیلوں کو تقویت ملتی ہے۔ مثلاً ہم محسوس کرتے ہیں کہ زمین چپٹی ہے اور یہ کہ ساکت ہے۔ اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے، لیکن یہ غلط ہے کیونکہ انسان نے تجربوں کی مدد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس کا اظہار جب گلیلیو نے کیا تو اسے مذہبی عدالت کے سامنے جواب دہ ہونا پڑا۔ لیکن آج یہ ایسی حقیقت ہے جس پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

چنانچہ ہم حقیقتوں کے دریافت کرنے کے سلسلے میں جبلّت کی مدد لینے کی بجائے انسانی تجربے کی مدد لیتے ہیں۔ جو لوگ محض جبلّت کی مدد لیتے ہیں، عموماً وہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔ حسن کے سلسلے میں یہی ہوتا ہے جو لوگ حسن کو جبلّی طور پر محسوس کرنے پر زور دیتے ہیں وہ غلطی کا شکار ہو کر کہتے ہیں کہ حسن کی قدریں اضافی ہیں۔ یونانیوں نے حسن کو زیبائش اور ظاہری آرائش سے علیحدہ رکھا اور ان کا کہنا تھا کہ کسی چیز کی بناوٹ، ہیئت، اور تناسب کا صحیح احساس پیدا کرنا اس ذوق کی تربیت کرتا ہے اس کی بدولت ہم حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک سیّاح کشمیر گیا۔ وہاں کے حسین مناظر دیکھ کر وہ عجیب و غریب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہاں کتنے حسین مناظر ہیں کہ وہ انھیں دیکھ کر بے خود ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں کے باشندوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس نے سوچا کہ انسان کا حسن سے متاثر ہونا جبلّی ہے۔ اس لئے یقیناً یہ لوگ بھی حسن سے متاثر ہوتے ہوں گے۔ لیکن یہ لوگ ان حسین مناظر سے متاثر نہیں ہوئے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں کوئی اس سے بہتر حسن موجود ہے۔ جس کے مقابلے میں اس کی خوبصورتی ان کے لئے ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔

اس واقعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیاح یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ کشمیر کے باشندے وہاں کے قدرتی حسن سے اس لئے لطف اندوز نہ ہو سکے کیونکہ ان کے ذوقِ حسن کی کوئی تربیت نہ تھی۔ یہ غلطی اس بنا پر ہوئی کہ سیاح کا خیال یہ تھا کہ حسن کا احساس جبلّی یا وجدانی ہے۔

اس تجربے کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن کی قدریں خارجی حقیقتوں میں مضمر ہیں اور ان کا احساس تہذیب و تمدن کی نشوونما سے وابستہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم حسن سے اور زیادہ متاثر ہوں یعنی ہمارا ذوقِ جمال وقت کے ساتھ ساتھ اور زیادہ تربیت یافتہ ہو جائے۔ کارل مارکس نے صحیح کہا ہے کہ انسان فطرت کو تبدیل کرنے کے دوران میں خود اپنی فطرت کو بھی تبدیل کرتا ہے، جس کی بنا پر فطرت کے مظاہر اور خصوصیات کو پہچان سکتا ہے۔ فطرت اور حسن کے یہ مظاہر ہی دراصل وہ قدریں ہیں جو وقت کے ساتھ نشوونما پاتی ہیں۔ ان کا وجود خارجی ہونے کے باوجود انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ انسان بھی اس کے وجود اور اس کی اہمیت سے اثر قبول کرتا ہے۔ اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

خارجی حقیقتوں کا وجود انسان کی اپنی ذات سے علیحدہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خارجی حقیقتیں اپنا کوئی مجرّد تصور نہیں رکھتیں بلکہ وہ ہمارے نظام کا مظہر اور اس کا عمل ہوتی ہیں۔ فنکار ان حقیقتوں کو جب داخلی طور پر محسوس کرتا ہے تو وہ ان سے اپنے نتائج خود مرتب کرتا ہے۔ یہاں وہ تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن بس پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے تصور کی بلند پروازی کے سہارے اپنے ذوقِ جمال کے معیار کے مطابق خود اپنے تجربات کو برابر پیش کرتا رہتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اسی میں ارتقا کا راز پنہاں ہے۔ تاہم یہ نئی نگاہ اور نیا [illegible] نہیں کرتا۔ پرانا بھی حسین معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی صفات وقت کی بدلتی ہوئی رفتار اور قدروں کے ساتھ نئی ہیئت اختیار کرتی ہیں جہاں [illegible] وہ سیاسی وقت کی تمام تعمیری اقدار کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ چنانچہ انسان کا فن، اس کا ادب، اس کی نقش گری کسی عہد میں یکساں نہیں رہتی بلکہ وہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے ارتقا میں ترمیم و تنسیخ — کسی نئی اور بہتر شے کی ترمیم اور کسی فرسودہ اور لمحاتی تصور کی تنسیخ۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے اور اس کے ذریعہ ہمیشہ نئی قدروں کی

تشکیل ہوتی رہتی ہے۔ ادبی قدریں نصرف چند گنے چنے پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں بلکہ پورا سماج ان سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عہد کی اپنی سچائی ہوتی ہے۔ اور ہر سماج کے اندر ایک آویزش ہوتی ہے جس کے سہارے وہ سماج آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہی سماج اور اس زمانے کی روح ہوتی ہے۔ اگر کوئی ادیب اس روح کو گرفت میں لے سکے تو پھر وہ جو بات پیش کرے گا یقیناً اس زمانے کی صحیح قدر کا حامل ہوگا۔ یہاں بعض لوگ شاید چونک پڑیں کہ پھر تو قدروں کی افادی حیثیت ہوگی۔ اس میں شبہ بھی کیا ہے اس لئے کہ ادب کے ذریعہ جن اقدار کا تعین ہوتا ہے اس میں افادیت ایک پیمانے کی حیثیت رکھتی ہے ممتاز حسین نے کسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس بات کو بڑی صفائی سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "قدیم اردو میں قدر کا لفظ نہیں تھا لیکن اردو زبان میں قدا قیمت کا لفظ بہت دنوں سے چلا آرہا ہے اور یہ دونوں لفظ دو مختلف معنی ادا کرتے ہیں۔ کسی چیز کی قیمت کیا ہے اور اس کا تعلق اس کی قدر سے نہیں ہے۔ ایک بہت ہی مفید اور کارآمد چیز سستی بھی ہو سکتی ہے اور مہنگی بھی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ قدر کا تعلق افادیت سے ہے۔ ایک چیز جس حد تک مفید اور کارآمد ہے اُم حد تک وہ قابل قدر بھی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی افادیت کا تعلق ہماری مادی زندگی سے ہے یا روحانی زندگی سے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ قابل قدر چیز وہی ہو سکتی ہے جس میں کوئی افادیت ہو۔ وہ تمام چیزیں جو ہماری ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہیں یا جو مرئی اور محسوس ہیں ان کی افادیت کو تو آسانی سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجرد تصورات کی افادیت کو متعین کرنے میں کچھ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

یہ مجرد تصورات حسن، سچائی، علم وغیرہ سے متعلق ہو سکتے ہیں اور اقدار کی ساری بحث اس کے مطالب اور ترجمانی پر مبنی ہے اور ہم ادب کے ذریعہ پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان سے کس طرح حقیقتوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دراصل خارجی اور داخلی احساسات کا توازن اسے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ادیب لہ وقت کی سچائی کو بھرپور طور پر پیش کرتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی سماجی حقیقتیں جو اس عہد کی صحت مند قدروں کی ترقی میں رکاوٹ بنی ہوں اس کا پردہ چاک کرے اور ان کو روشنی میں لانے کی کوشش کرے تاکہ ان میں مستقبل کے استقبال کی جھجک نہ ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادیب ان متضاد قوتوں کا ٹکراؤ بھی دکھاتا ہے اور بعض المیوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحت مند قدریں پسپا ہو رہی ہیں اور حق کے مقابلے میں باطل کی جیت ہو رہی ہے۔ لیکن یہ جیت ایک مخصوص کہانی میں ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کے سامنے اس کی شکل مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے میں اعلیٰ قدروں کے ساتھ جو وقتی طور پر اس طرح سرنگوں ہوتی ہیں جیسے ظالم کے سامنے مظلوم، لیکن حق اور سچائی کی فتح اس قصے کی تہہ میں ہے جس کی گرفت میں پڑھنے والا آتا ہے۔ جہاں وہ سچائی کی شکست پر آنسو بہاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اوتھیلو (شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ) کا المیہ عملی زندگی میں نہیں پیش آیا اور اس اب دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لم اس تخیل کا المیہ پڑھ کر گوشت پوست کا حقیقی انسان آنسو بہانے لگتا ہے۔ یہ آنسو ان کرداروں کے لئے نہیں ہیں جن کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ ان قدروں کے ہیں جو اس ڈرامے سے ابھر کر آتی ہیں۔ ہم یہ جانتے ہوئے کہ اوتھیلو اپنی معصوم بیوی کا قاتل ہے اس سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اسے بھی ڈسڈیمونا کی طرح معصوم سمجھتے ہیں اور اس کی موت پر اشکبار ہوتے ہیں۔ یہاں ایاگو کی فتح نہیں ہوتی جس کی سازش سے معصومیت کا گلا گھونٹا گیا بلکہ ان معصوم روحوں کی ہے جو اس سازش کا شکار ہوئیں۔ اس ڈرامے کو پڑھنے کے بعد وہی بنیادی ردعمل ہوگا جو شیکسپیئر کا ہوا ہوگا۔ اور جن اقدار کی ہمنوائی شیکسپیئر نے کی ہم بھی کرتے ہیں۔ ۳۴۔ وجہ یہ ہے کہ تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے مصنف پر وہی جذباتی کیفیت طاری ہوئی ہوگی جسے ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا عمل بھی کسی حد تک تخلیقی عمل سے ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ ادب کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جاتا جس طرح سائنسی و سماجی علوم کا کیا جاتا ہے یہاں پڑھنے والا مصنف یا شاعر کے ساتھ ذہنی ربط قائم کرتا ہے وہ ادب کے عقلی عنصر کے ساتھ شاعر سے جذباتی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اپنے خیال کو شاعر کی قوت متخیلہ سے منسلک کرتا ہے۔ اور ہر شاعر کے ذہن میں ان تمام اقدار کا واضح تصور ہوتا ہے جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے اور جب یہ قدریں ادبی روپ اختیار کرتی ہیں تو وہ ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم بھی متاثر ہوتے ہیں، شاعر کا تخلیقی عمل دراصل اس کی تخلیق کی بڑائی کی دلیل ہے۔ یہ اپنا مقصد اسی وقت پا سکتا ہے جب کہ شاعر کے ذہن میں قدروں کا احساس دھندلا ہونے کے بجائے واضح ہو اور اسی وقت وہ لوگوں کو متاثر کرتا ہے ادب سے روٹی حاصل کرنے کا کام نہیں جا سکتا اور نہ انسان ادب کے بل بوتے پر زندہ رہتا ہے۔ لیکن ادب انسان کو سلیقے سے جینے میں ضرور مدد دیتا ہے اور یہ مدد اس طرح ہوتی ہے کہ ا

میں اقدار کا حامل ہوتا ہے وہ صحت مند ہونے کی بنا پر انسان کے حوصلوں کو بڑھاتی ہیں اور اس کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور اسے صحیح معنوں میں جینے کا سلیقہ آتا ہے۔

دنیا کے کسی ادب نے کسی مظلوم کے مقابلے میں ظالم کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے بدصورتی کی اشاعت نہیں کی بلکہ دنیا کو زیادہ حسین بنانے کے لئے بدصورتی کی مذمت کی ہے۔ ادبی طریقہ کار یہ ہے کہ یہاں حقیقتوں اور اس سے متعلق قدروں کو سیدھے سادھے طریقے سے پیش نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ عمل فلسفہ یا دوسرے سماجی علوم کے لئے مناسب ہے۔ ادب میں قدروں کا اظہار محض جذباتی نہیں ہوتا بلکہ قوت تخیلہ کے ذریعہ اس میں تخیل کی گہرائی پیدا کی جاتی ہے ورنہ اگر محض جذباتی ہو تو اس کا اثر دیرپا نہ ہو۔ چنانچہ اسے خیال انگیز بنایا جاتا ہے۔ خیال انگیزی کا جذبہ بذات خود افادیت پر مبنی ہے۔ ادب میں افادیت کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی مسلم ہو جاتی ہے۔ یوں تو دنیا کا ہر ادب پروپیگنڈا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہر پروپیگنڈا ادب نہیں ہوتا۔

فارسی کے مشہور شاعر رومی نے اپنی مثنوی میں متصوفانہ خیالات کا پروپیگنڈا کیا ہے۔ مثلاً

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

بانس کی یہ نے اپنے اصل سے جدا ہو کر نغمہ زن ہے اور اس کے نالے کو سن کر ہر شخص متاثر ہوتا ہے۔ یہ نے بانس کی نے نہیں ہے بلکہ انسان کی روح ہے جو اپنے اصل یعنی خدا سے علیحدہ ہو کر اس دنیا میں اپنی جدائی کی شکایت کر رہی ہے۔

رومی کے پورے فلسفے کی بنیاد روحانی ہے اسی طرح انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کی مشہور نظم فردوس گمشدہ کا موضوع اور خیال مذہبی ہے اس میں خدا، شیطان اور زمین پر انسان کے آنے کی کہانی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے جد اعلیٰ آدم اور حوا خدا کو نہ ماننے کے جرم میں کس طرح جنت سے نکالے گئے اور پھر آخر میں کس طرح حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے اور انہوں نے سولی پر چڑھ کر انسان کو راہ نجات دکھائی۔

یہ شاعر مذہبی تھے اور ان کے خیالات کی چھاپ ان کی تخلیق پر پڑی ہے۔ لیکن ان تخلیقات میں ہمیں شاعر کے عقیدے سے غرض نہیں، بلکہ ان چھپی ہوئی قدروں سے واسطہ ہے جو انسانی تہذیب کا دین ہیں اور جنہیں شاعر نے بہت خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے اور ہم ان عقائد کو اگر نہ بھی تسلیم کریں تو بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی زندگی کو اپنے ادب کے ذریعہ اجاگر کرے اور اس طرح زندگی کی اقدار کا ادب میں پروپیگنڈا ملتا ہے، اور یہ اقدار جب فنی ہیئت اختیار کر کے ادب کی شکل میں منتقل ہوتی ہیں تو عام انسان ان سے متاثر ہوتا ہے اور اسے ایک قسم کی جمالیاتی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ادب میں متاثر کرنے والی ایسی قوت ہوتی ہے کہ آدمی کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ متاثر ہو رہا ہے یہی متاثر کرنے والی طاقت ہے کہ سیاستدان اور حکومت اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور ادب کی مملکت پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس طرح ادب مقید ہو جاتا ہے اور قیدی ہو کر مریض ہو جاتا ہے۔ اگر ادب پر کوئی ذہن کس کر سوار ہو جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف آزادی کی کھلی فضا میں پنپ سکتا ہے۔ یہ آزاد انسانوں کی امانت ہے غیر ذمہ داروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ادب انسانیت کا دماغ اور اس کا ضمیر ہے۔ وہ کسی ایک فرد کا سہارا نہیں، اس کے سامنے انسانیت کا مجموعی تصور ہوتا ہے۔ بڑے ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اس تصور کو پوری شدت اور جذبے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

(زیر طبع کتاب "ادب کا مطالعہ" کا ایک باب)

جوش ملیح آبادی

مآل اندیشی

کل تمکنتِ عقل پہ ہنستی تھی جوانی
اب شیب ہے آوارگیِ عشق پہ خنداں

کل شور تھا دستِ من و دامانِ معطر
اب غلغلہ ہے دوشِ من و گیسوئے دوراں

کل عشق بہاتا تھا مہ و سال کی دولت
اب عقل ہے ایک ایک دقیقے کی نگہباں

اصنام تھے کل خیمۂ عشرت میں اداکار
آفاق ہے اب مسندِ قرطاس پہ رقصاں

وہ دل جو پئے نقدِ بتاں گرمِ سفر تھا
اب جلوۂ تحقیقِ خدا پر ہے خراماں

پروفیسر اختر انصاری (دہلوی)

اے جانِ جاں!

چارۂ دردِ نہاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں
منزلِ مقصودِ جاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

گردشِ ایام و دورِ چرخِ گردوں کی قسم
نقطۂ پرکارِ جاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

عشق روحِ زندگی، روحِ جوانی ہے، مگر
عشق کی روحِ رواں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جان جاتی ہے تمہاری دل نوازی پر، مگر
وجہ سوز و سازِ جاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

شورش افزا ہے تمہاری یاد، لیکن سچ یہ ہے
غایتِ شورِ فغاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس زمین و آسماں کے دیکھتے ہیں خواب ہم
وہ زمیں، وہ آسماں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس بہارِ بے خزاں کی آس میں جیتے ہیں ہم
وہ بہارِ بے خزاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جو حریمِ فکر کی آغوش میں خوابیدہ ہے
وہ بہشتِ جاوداں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس یقینِ بے گماں پر ہے مدارِ آرزو
وہ یقینِ بے گماں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس سے رونق ہے جنون و فکر کے بازار کی
آہ! وہ جنسِ گراں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس کے دم سے منزلیں گرد و غبارِ راہ ہیں
وہ متاعِ کارواں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

دل کے کانوں کو گذر جاتی ہے جو چھوتی ہوئی
وہ اچھوتی داستاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

سازِ دل کو جو ملا دیتی ہے سازِ دہر سے
وہ نوائے دل ستاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

روح کے ویرانے تک جھونکوں سے جس کے رشکِ باغ
وہ نسیمِ گل فشاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

زندگی کے سارے لطف جس کی مستی پر نثار
وہ مئے عشرت چکاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

جس کے آگے دردِ ہستی ڈال دے اپنی سپر
وہ نشاطِ کامراں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

بن کے نشتر جو ضمیرِ تیرگی میں ڈوب جائے
وہ شعاعِ بے اماں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں!

جس کے طوفاں جو بہ جو، دریا بہ دریا، یم بہ یم
وہ فروغِ بے کراں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

وہ طلسمِ زندگانی، وہ فسونِ روزگار —
کرلیں جس کو حرزِ جاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

اخترِ جاں دادۂ عشق و جوانی کی قسم!
جانِ دل اور جانِ جاں اے جانِ جاں! تم بھی نہیں

رضی اختر شوق

بے نام تھکن

بعد مدت کے دبے پاؤں مرے صحرا میں
مجھ سے ملنے کو پھر آئی ہے ترے ہجر کی شام
بال بکھرائے ہوئے تیری ہی طرح آزردہ
منزل شوق پہ تیری ہی طرح نرم خرام
ہر دریچہ پہ ترا سایۂ مژگاں بن کر
مجھ سے ناراض مرے جرم فراموشی پر

دور تک نور سے خالی ہے فضا کا دامن
بزم خورشید سے رخصت ہوئی ایک ایک کرن
خاک نے چاٹ لیا راہ کا سارا کندن
دور تک سوچ میں اک دشمن جاں تنہائی
چار سو شہر کی دیوار پہ بے نام تھکن

شکیب جلالی

پاداش

کبھی اُس سبک رو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
تمہیں کیا خبر ہے
وہاں ان گنت کھردرے پتھروں کو
سجل پاپنوں نے ملائم رسیلے مدھر گیت گا کر
اَمِٹ چکنی گولائیوں کی ادا سونپ دی ہے

وہ پتھر نہیں تھا
جسے تم نے بے ڈول، ان گھڑ سمجھ کر
پرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا
اب اس کے سلگتے تراشے
اگر پاؤں میں چبھ گئے ہیں
تو کیوں چیختے ہو!

منیر فاروقی

اب صنم کوئی نہیں!

لہریں اٹھتی ہیں میرے قلب کی پہنائیوں میں
جیسے صحرا میں بگولوں کا خروشِ بے ساز
یا کسی صاحبِ زر کی نئی ہمسائیگی میں
ایک مجبور جوانی کی امنگوں کے چراغ
لہریں اٹھتی ہیں تو سو روپ نئے دیکھتا ہوں

حسن اور عشق کے کچھ گیت بنائے میں نے
دشت و صحرا میں بھی کچھ دیپ جلائے میں نے
ہمنوائی میں کئی زخم سجائے میں نے
مردہ افکار بھی سینے سے لگائے میں نے
موسمِ گل میں مگر خار ہی پائے میں نے

دوست احباب ملے ظلمتِ شب کی صورت
یار دلدار ملے، اپنی خدائی نہ رہی!
دل کی ویرانی ہوئی جشنِ طرب کی صورت!
دوستی ختم ہوئی شامِ جدائی بھی گئی
اور پھر ساتھ ہی وہ رسمِ گدائی بھی گئی!

اب صنم کوئی نہیں جس کا پجاری بن کر
وصل کی رات کا کچھ دیر مداوا کر لوں
چاندنی رات کی پھولوں کی تمنا کر لوں
تیرہ راہوں میں جنوں تنکے بھکاری بن کر
جیسے بیکار خداؤں کی تمنا کی تھی
میں نے بیکار خداؤں کی تمنا کی تھی

تیرہ راہیں گل و گلزار بھی بن جاتی ہیں
دھڑکنیں دل کی ہر اک سمت چمن دیکھتی ہیں
ہاں مگر! ذہن کا افلاس اگر دور ہوا
اپنے مجبور خداؤں کو سہارا دے دو
اپنی ہستی کا بھی کچھ پاس تمہیں ہے کہ نہیں
اپنی ہستی کا مگر آہ تمہیں پاس نہیں

ہستی و نیستی ہموار ہوئی جاتی ہیں!
چار سو آگ ہے طوفان ہے بے چارگی ہے
اپنی مفلوج فضاؤں کو بہاریں سمجھوں
ان کے زرتاب اشاروں کو سہارے جانوں
ایسی دیوانگی کس دیس میں ڈھونڈوں جاکر
ایسی دیوانگی اب ختم ہوئی جاتی ہے!

زیست کو موت کی آغوش سمجھ بیٹھے ہو!
فکر و احساس کو معراج پہ لاکر دیکھو
زندگی حسن کی تخلیق کا اک معجزہ ہے
یہ گرانبارئ اسباب تو اک لہر سی ہے
دُرِّ شہوار بھی ملتے ہیں اسی لہر کے ساتھ
اور پھر لہر تو اک لہر ہے طوفان نہیں!

فکر و احساس میں اب سوز بھی ہے ساز بھی ہے
بات سنبھلی ہے تو اب وقت میں آواز بھی ہے
اپنی مجبورئ افلاس پہ اب ناز بھی ہے
ہفت افلاک پہ گویا میری پرواز بھی ہے
جیسے بیکار خداؤں کی خدائی نہ رہی
آج بیکار خداؤں کی خدائی نہ رہی

کرشن چندر

دی گریٹ مون شائن تھیٹریکل کمپنی

(جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر کوئی نظر نہیں آتا۔ اسٹیج پر نہ کوئی اداکار ہے۔ نہ کوئی فرنیچر ہے۔ نہ سینری نہ کوئی دوسرا سامان۔ سب سے پیچھے کا پردہ بھی بالکل سفید چادر معلوم ہوتا ہے۔ اسٹیج سونا اور مکمل سناٹے میں ہے۔ ننگے اسٹیج پر خاموش روشنی برس رہی ہے)

پردہ اٹھنے کے بعد بھی کافی دیر تک اسٹیج پر کوئی نہیں آتا۔ چند منٹ تک تو اسٹیج کے سامنے تماشائی اپنی اپنی سیٹوں پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر اپنی سیٹوں پر کسمسانے لگتے ہیں۔ اگلے چند لمحے اسی حیرت اور پریشانی میں گزر جاتے ہیں اور کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے کہ ماجرا کیا ہے۔
جب سناٹے کا یہ وقفہ کافی لمبا ہو جاتا ہے اور پھر بھی اسٹیج پر کوئی نہیں آتا تو حاضرین میں پہلے تو سرگوشیاں بلند ہونے لگتی ہیں۔)

ایں یہ کیا ماجرا ہے؟

یہ لوگ کھیل شروع کیوں نہیں کرتے؟

کہاں مرگئے یہ سب لوگ؟

یہ کیا تماشہ ہے؛

(ہوتے ہوتے یہ سرگوشیاں بلند آوازوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور بے چین تماشائی زور زور سے چلّانے لگتے ہیں اور ہال کے مختلف کونوں سے آوازیں آنے لگتی ہیں)

اے کھیل شروع کرو کھیل۔

تماشہ۔ تماشہ۔ تھیٹر۔ تھیٹر۔

آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔

اے او! منیجر صاحب! ایکٹر لوگ کو باہر بھیجو۔

کوئی باہر نہیں آتا۔ حیرت ہے صاحب

یہ تھیٹر ہے یا قبرستان۔

یار تم سے کہا تھا کہ کوہ نور دیکھنے چلو۔ کم سے کم مینا کماری تو دیکھنے کو ملتی۔ تم کس سڑے ہوئے تھیٹر میں لے آئے۔ یہاں کھیل ہی شروع نہیں ہوتا۔ اس سے تو کوہ نور۔۔۔۔

اے سالے! اس فلم کا نام تو ٹھیک سے لے۔ کوہ نور نہیں۔ کوہ نور۔

اچھا کوئی حرج نہ سہی مرغ اعظم ہی دیکھ لیتے ۔

ابے ڈھولکی کے مرغ اعظم نہیں مثل اعظم بول۔

۔ اچھا مرغ اعظم ہی سہی ۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے یار ۔ مگر تو مجھے کہاں سے آیا۔

گھبرامت ۔ ابھی کھیل شروع ہوتا ہے۔

ابے کہاں مرگئے ایکٹر لوگ ؟

(ایک لمحے کے سناٹے کے بعد ایک مرد کی آواز آتی ہے۔ حاضرین میں سے)

ایک مرد ڈارلنگ تمہیں ٹھیک سے تو دکھائی دیتا ہے نا ۔

(جواب میں ایک نسوانی آواز)

ایک عورت یہاں دکھائی دینے کو ہے کیا ۔ ؟

(حاضرین میں سے بہت سے لوگ یہ جواب سن کر مسکرانے یا ہنسنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ تماشائی لوگ انتہائی بے چین ہو کر سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ اور غصے میں بھری ہوئی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔)

ابے کھیل شروع کرو کھیل ۔

نہیں تو یہ پردہ پھاڑ ڈالیں گے ۔

ونگ توڑ ڈالیں گے ۔

فرنیچر اٹھا کر باہر پھینک دیں گے ۔

کھیل شروع کرو ۔ ورنہ ہمارا پیسہ واپس کرو ۔

سالوں نے اپنی کمپنی کا نام کتنا بڑا رکھا ہے ۔ دی گریٹ مون شائن تھیٹریکل کمپنی ۔

اور نکلے بالکل فراڈ ۔

بوگس ۔

چار سو بیس ۔

کھیل شروع کرو ۔ ورنہ ابھی فرنیچر توڑے دیتے ہیں ۔

اٹھا بے کرسی اور پھینک دے اسٹیج پر ۔

(یکایک ایک آدمی گھبرائی ہوئی حالت میں ونگ سے نکل کر اسٹیج پر آتا ہے اس نے نہ تو کوئی میک اپ کر رکھا ہے نہ کوئی خاص لباس پہن رکھا ہے ۔ وہ گاڑھے کے ایک سفید کرتے اور پائجامے میں ملبوس ہے اس کے سر کے بال انتہائی الجھے ہوئے ہیں اور وہ شکل و صورت سے بے حد پریشان معلوم ہوتا ہے ۔ اور گھبرا گھبرا کر کبھی خالی اسٹیج کو دیکھتا ہے ۔ کبھی حاضرین کی طرف ۔)

(حاضرین میں سے ایک آواز)

آیا ۔ آیا ۔ خدا کا شکر ہے کوئی تو آیا ۔

مگر یہ کون ہے ۔

ہیرو معلوم ہوتا ہے ۔ دیکھ لینا ابھی ایکٹنگ کرے گا ۔

(گھبرایا ہوا آدمی اسٹیج پر کھڑا ہو کر کچھ بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا منہ تو کھلتا ہے۔ مگر اس کے منہ سے کوئی آواز تو نہیں نکلتی)

اے ہیرو! دلیپ کمار کے بچے۔ اپنے بال تو ٹھیک کر لے۔

(اسٹیج پر کھڑا ہوا آدمی جلدی سے اپنے بال ٹھیک کرتا ہے)

ارے دیکھ تیرا ازار بند نیچے لٹک رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے سیدھا باتھ روم سے یہاں چلا آیا ہے۔

(وہ آدمی جلدی سے اپنا ازار بند سنبھالتا ہے)

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب بول۔ کچھ تو منہ سے بول۔

(اسٹیج پر کھڑا ہوا ایکٹر کچھ بولنے کی کوشش کرتا ہے مگر پھر ناکام رہتا ہے)

ہائے۔ پارٹ بھول گیا بے چارہ۔

گھگھی بندھ گئی ہے۔ سالے کی۔

ابے جھاڑو پھرا لے اپنے حلق میں۔

(حاضرین میں سے کچھ لوگ ہنستے ہیں کچھ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ پریشان حال ایکٹر گھبرا کر ونگ کے اندر بھاگ جاتا ہے مگر پھر فوراً ہی ایک کرسی لئے نمودار ہوتا ہے۔ اسٹیج کے چاروں طرف دیکھتا ہے کہ اس کرسی کو کہاں رکھے۔ آخر ایک جگہ تلاش کر کے کرسی کو وہاں رکھتا ہے کہ حاضرین میں سے ایک آواز آتی ہے)

ارے وہاں نہیں۔ ذرا آگے رکھ۔

(ایکٹر کرسی کی جگہ بدلتا ہے۔ کہ دوسری آواز آتی ہے)

ارے اس کونے کے ونگ میں کیا تیری ماں کھڑی ہے۔ جس کو اپنی صورت دکھلائے گا۔ آگے بڑھ جا۔

(آدمی کرسی لئے آگے بڑھ جاتا ہے)

اور آگے۔

دائیں طرف۔

نہیں بائیں طرف۔

بالکل سامنے آ جا میرے یار۔

(اسٹیج پر ایکٹر حاضرین کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی کرسی کی جگہ بدلتا جاتا ہے۔ اب تماشائی کھیل کو بھول چکے ہیں۔ انہیں اپنی ہدایت کاری میں مزا آنے لگا ہے ایک صاحب کہتے ہیں)

ابے بیٹھ جا اس پر۔

(ایکٹر حاضرین کی طرف پیٹھ کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ابے گھن چکر اتنی جلدی پیٹھ دکھا گیا منہ سامنے کر۔

(ایکٹر جلدی سے اٹھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کراتے میں ایک آواز آتی ہے)

ارے تیرے سور کے سے تھوبڑے کو دیکھ کر کیا کریں۔ گھس جا کرسی کے نیچے۔

(ایکٹر کرسی کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتا ہے)

نہیں۔ کرسی کے نیچے لیٹ جا۔

(ایکٹر کرسی کے نیچے لیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کرسی اس پر گر جاتی ہے۔ لوگ ہنستے ہیں)

ابے اٹھ جا۔

(ایکٹر اٹھ جاتا ہے)

کرسی کو اپنے سر پر اٹھا لے۔

نہیں اپنے دائیں ہاتھ میں لے لے۔

نہیں اپنے بائیں ہاتھ میں لے لے۔

ناچ۔

بھاؤ دکھا۔

کولہے مٹکا۔

الٹا ہو جا میرے شیر۔

کرسی کو اپنی ٹانگوں پر رکھ کر سر کے بل چل۔

ابے جوکر کی اولاد۔ تو تھیٹر میں کیوں آیا۔ تجھے تو کسی سرکس میں ہونا چاہیئے۔

(اس پر بہت سے لوگ ہنستے ہیں۔ ایکٹر لوگوں کی ہدایت کے مطابق سر کے بل کھڑا ہو کر کرسی کو اپنے دونوں پاؤں پر رکھے ہوئے چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تین چار قدم چلنے کے بعد دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ اب کرسی اس کے اوپر ہے ایکٹر اس کے نیچے ہے۔ سب لوگ اندر سے ہنس رہے ہیں۔ اسٹیج پر گرنے کی آواز سن کر ایک جوان اور خوبصورت عورت گھبرائی ہوئی ونگ سے باہر نکلتی ہے۔ اس نے بھی نہ کوئی خاص لباس پہن رکھا ہے نہ کسی طرح کا میک اپ کر رکھا ہے۔ بس ایک معمولی سی ساڑی پہن رکھی ہے۔ وہ ایکٹر کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس کے قریب جاتی ہے۔ کرسی اٹھا کر پرے رکھتی ہے۔ سہارا دے کر ایکٹر کو کھڑا کرتی ہے۔ ایکٹر کے چوٹ آگئی ہے۔ اس کے ماتھے سے ذرا سا خون نکلتا ہے۔ مگر ایکٹر اپنے ماتھے کا خون ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے اسٹیج کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے۔ عورت ذرا ایک طرف ہو کر اس کے پیچھے آ رہی ہے۔ حاضرین میں سے ایک آواز آتی ہے)

ابے کون ہے یہ؟ تیری ماں؟

(ایکٹر انکار میں سر ہلاتا ہے)

تیسری بہن؟

(ایکٹر پھر انکار میں سر ہلاتا ہے)

تیسری چچی؟

(ایکٹر پھر انکار میں سر ہلاتا ہے)

تیسری محبوبہ؟

(ایکٹر پھر انکار میں سر ہلاتا ہے)

پھر کون ہے یہ؟

(ایکٹر خاموش رہتا ہے — یکایک ایک لمحے کے بعد حاضرین میں سے ایک نسوانی آواز آتی ہے)

عورت کی آواز :۔ میں سمجھ گئی۔ یہ اس کی بیوی ہے۔

(ایکٹر مثبت انداز میں سر ہلاتا ہے سب لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔ اسٹیج پر کھڑی عورت شرما جاتی ہے۔ ساڑی کے پلّو سے ایک رخ کو ڈھک دیتی ہے۔ پلّو سے بندھا ہوا چابیوں کا گچھا زور سے کھنکنے لگتا ہے۔ پھر وہی نسوانی آواز سنائی دیتی ہے)

ایک عورت :۔ میں چابیوں کے گچھے کو دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ یہ عورت اس کی بیوی ہے۔

(ساتھ کی مردانہ آواز)

اسکا شوہر :۔ جانم! تم کس قدر ذہین ہو۔

(کچھ لوگ ہنسنے لگتے ہیں، اتنے میں ایک آواز آتی ہے)

اب کیا ہوگا؟

اب عشق ہوگا۔ کیونکہ ہیرو اور ہیروئن دونوں اسٹیج پر موجود ہیں۔

ہاں بھئی، چلو ہو جانے دو عشق۔

محبت!

پریم!

بس — Love

ابے سالے دیکھتا کیا ہے، جلدی سے کر عشق۔

ابے تو بھی عجیب احمق ہے۔ بھلا اپنی بیوی سے کوئی عشق کرتا ہے؟

(حاضرین میں سے کچھ لوگ ہنستے ہیں)

— for a change کیا برائی ہے اس میں؟ کر لے اپنی بیوی سے عشق!

بٹھا دے اس کو کرسی پر اور گھٹنے ٹیک دے اس کے سامنے۔

(ایکٹر اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ کرسی سے ٹکرا کر پھر گرتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے۔ اور عورت کے پیچھے بھاگتا ہے۔ عورت آگے آگے۔ مرد پیچھے پیچھے۔ دونوں میں ریس ہوتی ہے عورت خالی

اسٹیج کے چاروں طرف گھومتے ہوئے طرح دیتی ہے۔ بلو بچاتی ہے۔ بدن چراتی ہے۔ مگر کسی طرح ہاتھ نہیں آتی۔ ایکٹر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تین چار بار گرتا ہے۔ حاضرین زور زور سے ہنستے ہیں۔ بالآخر حاضرین میں سے ایک صاحب مشورہ دیتے ہیں)

ایک شوہر کی آواز۔ اے دوست! دیکھتا کیا ہے۔ اٹھا کر پھینک کرسی اس کے سر پہ۔ خود بخود گر جائے گی۔

(ایکٹر عورت کو مارنے کے لئے کرسی اٹھا لیتا ہے۔ عورت گھبرا کر فوراً ہاتھوں کے اشارے سے اسے اس کام سے باز رکھنے کا اشارہ کرتی ہے اور بھاگتی ہوئی اس کے پاس آجاتی ہے۔ وہی مردانہ آواز سنائی دیتی ہے)

وہی شوہر۔ دیکھا۔ کیا کہا تھا میں نے!

(ساتھ کی آواز)

اس کا دوست۔ معلوم ہوتا ہے یار۔ تو یہ نسخہ گھر میں آزما چکا ہے!

(پہلی مردانہ آواز)

شوہر چپ رہ یار! کسی نے گھر والی کو بول دیا تو وہ جوتیاں پڑیں گی!

دوست یہ بات؟

شوہر ہاں صاحب! اب ہو جائے عشق۔ بٹھا دیجئے محترمہ کو کرسی پر اور شروع کیجئے اپنی بکواس۔

(ایکٹر کرسی کو کھینچ کر اسٹیج کے مرکز میں رکھتا ہے اور عورت کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے عورت اس پر شرماتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے۔ ایکٹر اس کے پاؤں کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھتا ہے اور دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر گویا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ اتنے میں ونگ سے ایک بچہ روتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ حاضرین میں سے ایک آدمی غصے میں کہتا ہے)

ایک۔ اُف! بیڑا غرق کر دیا عشق کا۔

دوسرا۔ یہ کس کا بچہ ہے؟

تیسرا۔ انہیں دونوں کا معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا۔ ابے! اسے چپ کراؤ۔

پانچواں۔ اور جلدی سے عشق شروع کرو۔

(مرد اور عورت دونوں اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور بچے کی طرف جاتے ہیں۔ جو اس دوران میں مسلسل روئے جاتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں بچے کے پاس آتے ہیں۔ اسے طرح طرح سے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے مرد بچے کو اپنی گود میں لیتا ہے۔ مگر بچہ اس کے منہ پر چانٹا مارتا ہے۔ تو مرد گھبرا کر روتے ہوئے بچے کو عورت کی آغوش میں دے دیتا ہے۔ وہ اسے اپنی گود میں اٹھا کر چابیوں کے گچھے کو ہلانے کی کوشش کرتی ہے مگر بچہ چابیوں کا گچھا عورت کے منہ پر مارتا ہے۔ عورت گھبرا کر بچے کو چھوڑ دیتی ہے۔ بچہ گر کر اور بھی زور زور سے رونے

لگتا ہے۔ مرد کچھ سوچ کر روتے ہوئے بچے کو کرسی پر بٹھا دیتا ہے۔ پھر مرد اور عورت دونوں اس کے دائیں بائیں دوزانو ہو کر اسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بچہ جو صرف ایک چڈّی پہنے ہوئے ہے اور بے حد دبلا ہے، اب اپنا پیٹ پکڑے ہوئے روتے ہوئے اسٹیج کے حاضرین کی جانب بڑھتا ہے۔ حاضرین میں سے ایک کہتا ہے)

اے چپ ہو جا بدتمیز!

بے سپیر کی اولاد۔

(بچہ اور بھی زور سے اپنا پیٹ پکڑ کر رونے لگتا ہے)

معلوم ہوتا ہے ابھی کچی نیند سے جاگا ہے۔

(بچہ روتے ہوئے انکار میں سر ہلاتا ہے)

معلوم ہوتا ہے اس کے پیٹ میں درد ہے۔

(بچہ پھر روتے ہوئے انکار میں سر ہلاتا ہے)

معلوم ہوتا ہے بے چارہ بھوکا ہے۔

(بچہ زور زور سے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا ہے)

(حاضرین میں سے آوازیں)

روٹی کھائے گا؟

دودھ پیئے گا۔؟

(بچہ اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ حاضرین میں سے ایک آدمی اسٹیج پر روٹی پھینکتا ہے)

یہ لے روٹی اور یہ لے لالی پاپ۔

یہ لے چوّنی۔

(یکایک اسٹیج پر سکوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ بچہ رونا بھول کر دونیاں چونیاں اٹھانے لگتا ہے اور حاضرین کو سلام کرتا ہے۔ اس پر حاضرین خوش ہو کر اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ اب تینوں مرد، عورت اور بچہ سکے اٹھا اٹھا کر اپنی جھولی میں بھرتے جاتے ہیں۔ آخر میں تینوں مرد، عورت اور بچہ مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اسٹیج کے مرکز میں آتے ہیں اور مرد حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا ہے)

دی گریٹ مون شائن تھیٹریکل کمپنی کے ایکٹر لوگوں نے ہڑتال کر دی تھی کیونکہ انہیں پگار نہیں ملی تھی۔ اور آج پگار تو کیا بہت مال کا کرایہ بھی نہیں تھا سو وہ آپ نے پورا کر دیا۔ جس کے لئے دی گریٹ مون شائن تھیٹریکل کمپنی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ اور ہم عمدہ کھیل دکھانے کے لئے ایک بار پھر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ کل رات آ کر آپ ہمیں اس سے بھی بہتر کھیل دکھائیں گے۔ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ خواتین و حضرات۔

(پردہ گرتا ہے)

بلراج مینرا

رفتار

اکتوبر کا پہلا ہفتہ بے پناہ گرمی سے جھلس رہا تھا کہ بھولے بھٹکے کالے بادلوں کا پرندہ ادھر آ نکلا اور پھڑ پھڑانے لگا۔ کیول گھر کی بالکنی میں کھڑا برف زدہ کوک پی رہا تھا کہ موسم کا رنگ بدل گیا ـــــ چند منٹ بعد وہ ٹی ہاؤس میں اپنے مخصوص صوفے پر تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد اس نے ٹی ہاؤس کا جائزہ لیا۔ اس کے برابر کے صوفے پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تک رہا تھا۔ کیول نے اس جانب دیکھا تو اس کے ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ سے پھیل گئے مگر کیول نے فوراً ہی ـــــ آنکھیں پھیر لیں۔ چند منٹ بعد کیول نے پھر کن انکھیوں سے اس نوجوان کو ایک لمحے کے لئے دیکھا اور فوراً ہی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا جیسے اسے جان بوجھ کر پہچانا گیا ہو۔ اور نظر انداز کر دیا گیا ہو۔

دوسرے ہی لمحہ نوجوان کیول کی ٹیبل پر سامنے کی کرسی پر تھا۔ کیول نے اس کی جانب بے رخی سے دیکھا تو اس نے اپنے وقار کو سہارا دیتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"میرا نام جالی ہے۔"

"بہت اچھا نام ہے" کیول نے بے تعلقی برتتے ہوئے جواب دیا۔

جالی کے ماتھے پر پسینہ آگیا اور اس کی ہڈیاں کھنچ گئیں۔ اس نے بڑے کربناک لہجے میں کہا۔

"میں بھی افسانے لکھتا ہوں"

"اچھا!" کیول نے تعجب کا اظہار کیا، جیسے وہ چارپائیاں ٹھوکتا ہو۔

جالی بوکھلا گیا اور ٹوٹے جملے کہنے کی سعی کرنے لگا۔

"آپ سے ۔ ۔ ۔ ۔ پچھلے سال ۔ ۔ ۔ ۔ تحریک کے دفتر میں ملاقات ۔ ۔ ۔ ۔"

سامنے کے دروازے سے جگدیش داخل ہو رہا تھا اور ایک اجنبی کی موجودگی کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا کیول کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب جگدیش صوفے کے قریب پہنچا تو جالی کے لرزتے ہوئے وجود سے اسے علم ہو گیا کہ بیچارہ کیول کے ہاتھوں ذبح ہو گیا ہے۔ جگدیش کی ناپسندیدگی ڈھے گئی اور اس نے جالی کو پانی کا خالی گلاس تھماتے ہوئے کیول سے کہا۔

"یار! آج غیر متوقع طور پر شپا آ گئی۔ تم جانتے ہو گزشتہ دو سال سے شپا میری نظروں کے سامنے ہے مگر آج تک میرے لب نہیں کھلے۔ میری آنکھیں اس معاملے میں بے کار ہیں، میں جو نہیں کہنا چاہتا وہ کہہ دیتی ہیں۔ کم و بیش یہی حال شپا کا ہے۔ یا یوں کہہ لو میں بیئر پی رہا تھا۔ اور بار بار کیدار شرما کا یہ گیت گنگنا رہا تھا کہ "آج پھر جینے کی تمنا ہے" رونے کو تھا کہ پردہ اٹھا، میں نے دیکھا شپا سامنے تھی، گو اس کا آنا غیر متوقع تھا مگر پھر بھی اس کی امید مجھے ہمیشہ سے تھی، وہ

"پیارے حالت بہت غیر ہے، اپن تو جیتے جی مارے گئے" راج نے دھیمے دھیمے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ذہن کے سمندر کی وسعتوں کو جاتے کے لئے جسم کی کاغذی کشتی کی Limitations کو بھول بیٹھا تھا۔ اب ذہن کا سمندر سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا ہے مگر جسم کی کاغذی کشتی زمین چھوڑ رہی ہے تم نے دیکھا ہے نا میرا ہاسپٹل؛ — ملک گنج سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جاتی ہے ہاسپٹل تک۔ ورنہ پکی سڑک کے راستے پہاڑی پر دیڑھ دو میل چڑھنا پڑتا ہے ہمارا معمول یہ تھا کہ بس سے اترنے کے بعد اس پگڈنڈی کے راستے ہاسپٹل جاتا۔ چھ سات دن ہوئے، پگڈنڈی کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ خاردار تاروں سے راستہ روک دیا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے ہاسپٹل پہنچا۔ شام کو واپسی کے وقت دیکھا کہ لوگ اس پگڈنڈی کے راستے نیچے اتر رہے ہیں کسی نے خاردار تاروں کی روک میں سے نچلی تار کو اوپر کی تار سے باندھ کر اس قدر اٹھا دیا تھا کہ جھک کر نکلا جا سکے — میں جھک کر نکل ہی رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور جب آنکھ کھلی تو میں میڈیکل وارڈ میں اسٹاف روم میں پڑا ہوا تھا چھ دن سے حالت بہت غیر ہے۔ ابھی تک بیماری Detect نہیں ہو پائی، ڈاکٹر صاحبان کا خیال ہے کہ جسم کا کوئی عضو نارمل حالت میں نہیں ہے۔ اور شاید یہ سب سگریٹ کافی بیئر کی زیادتی اور ہر وقت کی سوچ کی وجہ سے ہے اور اس کا علاج ہے مکمل آرام۔ ذرا سی حرکت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ . . . . . مگر یار! ہائے کیا موسم ہے! . . . . . میں نے کہا اب ذہن تو سو نہیں سکتا پھر جسم کا آرام، بات کیا بنی؛ — ادھر ہوا کا ٹھنڈا جھونکا پہنچا۔ ادھر میں وارڈ سے چپکے سے کھسک آیا اور پہلا کام میں نے پہاڑی اترنے کے بعد یہ کیا کہ سگریٹ سلگایا اور اب . . . . . کیا مذاق ہے یار! یوں ٹکٹکی باندھے کیا دیکھ رہے ہو؟ جناب کافی منگوائیے اور چلئے دہیں . . . . . دہیں . . . . . منگواؤ کافی . . . جوشی! ایک کپ خوب گرم کافی جو جلا کر خاک کر دے . . . . اور ایک گلاس پانی، خوب ٹھنڈا، جو جنم جنم کی جلن بجھا دے . . . . "

راج نے ایک کپ کافی پی، پھر تینوں نے ایک ایک کپ کافی اور پی۔ تینوں خاموش تھے۔ ٹی ہاؤس میں شور بڑھ رہا تھا کہ "ٹی ہاؤس کے لوگ۔ بالکل بے حد بیگانے پہچانے۔ اجنبی چہرے۔

ایک صاحب ان کے صوفے کے قریب سے گذرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو کہا۔

"یہ یہاں کے Typical لوگ ہیں!"

تینوں کے کانوں تک یہ بات پہنچی اور بیک وقت تینوں کے منہ سے ایک بھرپور قہقہہ سا گونا شور سے اٹھا اور چند لمحوں کے لئے قہقہے کی گونج میں سارا ٹی ہاؤس گم سم ہو گیا۔

ٹی ہاؤس کے لوگ انہیں Man Eater کہتے کہ کوئی وقت تھا اور یہ کوئی بہت پہلے کی بات نہیں جب تینوں شام کو کسی نہ کسی کو ذہنی طور پر Tolerate کرتے، کوئی مشکل ہی سے ان کے پاس بیٹھتا، اور کوئی بھول سے پاس کے صوفے پر بھی بیٹھ جاتا تو فوراً ہی اسے اپنی بھول کا احساس ہو جاتا اور بھاگ کھڑا ہوتا — اور سنجیدگی سے سوچنے کہ اسٹیشن پر جا کر شکار کی تلاش کریں۔ پھر انہوں نے خود ہی یہ دھندا چھوڑ دیا۔ اور اپنے آپ ہی میں سمٹ گئے اور صوفوں سے قطع تعلق کر کے مکمل ایک ہو گئے۔

گے لارڈ وائن شاپ سے انہوں نے دس بوتلیں بیئر کے لئے جب کاؤنٹر کلرک کو ۳۵ روپے دیئے تو اس نے مسکراتے ہوئے اتنا کہا۔

"جگدیش صاحب! آج تو موسم ٹھنڈا ہے۔ آج سرور کا کچھ اور ہی رنگ ہوگا"

"آپ بھی پی دیکھئے . . . " جگدیش نے مڑ کر کیول اور راج سے کہا۔

"یار! یہ منٹو سولن کا رسیا کیوں تھا، بس مجھے اس کے سارے کردار میں یہی بات اچھی نہیں لگتی . . . "

"پہلے وہ تو ستھرا بھی پینے لگا تھا . . . "

"ہائے افسوس ہے، ہم نہ ہوئے پاکستان میں ورنہ اسے پیاسا نہ مرنے دیتے . . . . اٹھاؤ کیول یہ تم اور راج؛ تم صرف بوتلیں، یہ بھی مفتی بنگی — پہلا پڑاؤ انڈیا گیٹ تھا۔ نیشنل اسٹیڈیم کے باہر سڑک سے ایک طرف ہٹ کر جامنوں کے پیڑ کے نیچے، کار میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے بیئر کی بوتلوں کے

اڑائے اور بوتلیں منہ سے لگالیں۔

"آہا ہا ہا۔۔۔" وسکی پیٹ میں کانپتے ہوئے راج کو بے پناہ لذت کا احساس ہوا۔

"ہائے! میں مر جاؤں، ابھی، اسی وقت، یہیں!"

جگدیش نے ایک ہی گھونٹ میں بوتل ختم کی اور راج کی طرف دیکھا۔

"خوشی کی تکمیل موت کے ہاتھوں میں ہے، نامکمل خوشی کے اظہار کے تو کوئی معنی ہی نہیں۔۔۔" اور اس نے زور سے خالی بوتل ہنستے ہنستے اسٹیڈیم کی دیوار پر دے ماری اور چابی گھما کر کار اسٹارٹ کر دی۔

کیول بوتل پر پھیلے شبنم کے ٹھنڈے قطروں کو انگلی سے اپنی آنکھوں کی جھیل میں اتار رہا تھا۔

او کھلا موڑ سے پرے پٹرول پمپ پر جگدیش نے کار روکی اور کیول اور راج کی طرف دیکھا۔ تینوں ہاتھ سے اوپیر کی بوتلیں اٹھائے کیبن میں چلے گئے، باہر پٹرول بھرا جانے لگا، اندر انہوں نے کاگ اڑائے اور بوتلیں منہ سے لگالیں۔

کیول نے غٹاغٹ آدھی بوتل ختم کرتے ہوئے لب کھولے۔

"واقعی نامکمل خوشی کے اظہار کے تو کوئی معنی ہی نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ خوشی کی تکمیل بھی ہو جائے تو بھی اظہار کی ضرورت نہیں، اظہار تو تکمیل سے زی ہے، ہائے، مزہ تو جب ہے کہ خوشی کی تکمیل کا وقت آ جائے مگر چند سانسوں کی مہلت نہ ملے!۔۔۔" کیول کی آنکھیں پھیل گئیں اور چند سانسوں کی حسرت بٹ کر سنجیدہ ہو گئیں۔

راج نے کہا۔

"یار! عجیب چکر چلا رہے ہو تم! خوبصورت جملے کہنے کی شرط باندھ کر آئے ہو کیا؟ خوشی، تکمیل، اظہار، مہلت ـــ! کیا بے تکی باتیں ہیں؟ غم؟ ابا جان کو تو بھول رہے آپ!"

جگدیش نے پٹرول کی سلپ پر دستخط کیے، آخری جرعہ اپنے اندر انڈیلا اور کہا۔

"چلو! غم کی بات نہ کرو، غم پٹرول ہے، بات آگ ہے، جل جاؤ گے!" کار پنجاب کی جانب بھاگنے لگی۔

کیول جگدیش کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور راج پچھلی سیٹ پر پاؤں پسارے نیم دراز تھا۔

"جگدیش! آج بڑا مزا آیا یار۔ ہمارے ہاسپٹل میں ایک نرس ہے کملا۔ مجھ میں [illegible] ہے اور جب سے میں بیمار ہوا ہوں، زیادہ مہر۔۔۔ رات بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اجمیر کی ہے۔ میں نے کہا آپ رات کو افیون کی گولی کھا لیجئے اور دلی سے راجستھان کے کسی رکے لئے گاڑی میں بیٹھ جائے، صبح جب آپ کی آنکھ کھلے گی آپ راجستھان میں ہوں گی، اور آپ کے منہ میں، ناک میں، کان میں، آنکھوں میں، یہاں تک کہ بالوں میں بھی ریت ہوگی اور اگر آپ پنجاب کے لئے گاڑی میں بیٹھیں گی تو صبح جب آپ کی آنکھ کھلے گی، آپ کو ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آئیں گے، ہوائیں آپ کو چوم رہی ہوں گی اور آپ کے دل میں عشق انگڑائیاں لے رہا ہوگا ـــ راجستھان بھی کیا علاقہ ہے یار! بیچاری خفا ہو گئی!"

کیول نے اپنی بات کہی۔

"یہ تو مجھے علم نہیں کہ راجستھان ایک علاقہ ہے یا نہیں، لیکن ادھر کی ایک لڑکی سے میرے تعلقات ضرور رہے ہیں، جتنا جسمانی خلوص مجھے وہاں ملا کہیں اور نہیں ملا۔"

"یعنی جتنا جسمانی خلوص تمہیں وہاں ملا، اس سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے تم نے کئی اور جگہ تعلقات قائم کئے مگر ناکام ہوئے۔ خلوص تو ہمارا مشن ہے ولی صاحب! میں نے صبح ہی عرض کیا تھا کہ آپ جسم کی لذت کے عادی ہیں، جیسے ہندو خون چکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔" جگدیش نے کیول کو کہا۔

کار پنجاب کی حد میں داخل ہوئی تو راج نے گہرا سانس لیا اور جگدیش نے رفتار بڑھا دی۔
کیول نے کہا۔
"پرتاپ سنگھ کیرون کے راج میں سڑکیں لاجواب ہیں۔ کالی، چکنی، دکن کی پہاڑی لڑکی کی پنڈلیوں کی طرح۔۔۔"
پہلا سنگ میل آیا تو جگدیش نے کار سڑک کے کنارے روکی، سنگ میل کے برابر پیلے سے بورڈ پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ہوا تھا

Life is short.
Do not make it shorter.

راج نے قہقہہ لگایا اور کہا۔
"یار! ایک طرف تو اتنی خوبصورت سڑکیں بنوا کر یہ سردار تیز رفتاری کی ترغیب دیتا ہے اور دوسری طرف ہر سنگ میل پر یہ نیم حکیموں کی طرح کا اشتہار لگا کر زندگی کا قاعدہ پڑھاتا ہے۔۔۔۔ یہ تضاد کتنا واہیات ہے۔"
"واقعی یار۔۔۔ یہ خوب ہے!"
"لکھا یہ ہونا چاہیے،

Life is short.
Make it shorter and beautiful."

راج نے کہا۔
"لوگ ہر لمحے مسلے جانے کا خوف دل میں سنبھالے چیونٹی کی رفتار سے زندگی گزارتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ ان کی درازیٔ عمر کی تمنا بھی بڑھتی جاتی ہے۔ خدا کی قسم! زندگی لطیفہ بنتی جا رہی ہے۔ کبھی کسی کے من میں عقاب کی سی تیزی سے آسمانوں کی بلندیوں میں گم ہو کر زندگی گزارنے کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے، ساتوں آسمانوں کو چیرتا ہوا خلاؤں میں گم ہو جاؤں اور جب تھک جاؤں تو نڈھال ہو کر گر پڑوں اور پھر نہ اٹھ پاؤں۔"
"جانِ من! جانتے ہو کہ عقاب آسمانوں کی بلندیاں سر کرنے کے بعد نڈھال ہو کر جب زمین پر گرتا ہے تو کتے اس کی بوٹیاں نوچتے ہیں۔"
راج نے پھر کہا۔
"مگر اس سمے تک جب تک کہ میرا دل دھڑکتا ہے میں کتوں کی سوچ کی اڑان سے بھی بلندیوں پر بسیرا کرنا چاہتا ہوں۔ ذہن کی موت کے بعد ذہن کی لاش سے ڈرنا بالجبر ممکن نہیں، مگر جسم۔۔۔ یہ المیہ ہے۔۔۔ یہ بھیانک تضاد ہے کہ زندگی میں جو آپ کو Touch نہ کر سکے موت کے بعد آپ کا جسم اس کا محتاج ہو۔ غالب کی خواہش کہ 'نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا'۔ ایک متوازن ذہن کی خواہش ہے۔۔۔"
جگدیش نے اتنا کہا۔
"زندگی کی شمع کو دونوں طرف سے روشن کیا جائے تو زندگی محسوس کی جا سکتی ہے، ورنہ تو جیو، جیو، نہ جیو' ایک ہی بات ہے" اور اس نے دھوئیں کا مرغولہ ہوا کے دوش پر چھوڑ دی۔
کیول نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہٹاؤ یار۔ کیا سنجیدہ باتیں لے بیٹھے ہو۔"
راج فوراً بولا۔
"کیا کہنے ہیں جناب کیول کرشن ایم اے کے۔ سچ ہم سنجیدہ باتیں کر رہے تھے، حضورِ والا جب سے آپ کا جنازہ کشکول نے، اسے کہیے کا!"
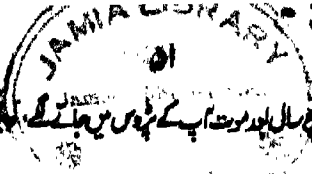
ں ۲۵ سال کا ہوں، پانچ سال لیڈنا، اور جب پانچ سال بعد موت آپ کے پڑوس میں جا بسے گی، تب آکر کہئے گا، جگدیش جی، ادھر کہاں ـــ؟ ـــ ادھر
سنجیدہ باتیں ایسی ہوتی ہیں:

جگدیش نے کہا۔

ـــ الو! کچھ نشے کی بات بھی کرو، تین تین بوتلیں چڑھا گئے ہو اور زبان میں لکنت تک کا نشان نہیں۔ . . . "

فرید آباد سے انہوں نے دس بوتلیں اور خریدیں اور وہیں دوکان پر ایک ایک پیگ اور چڑھائی اور پھر چل پڑے۔

فرید آباد میں فیر آباد سڑک کے کنارے جگدیش نے کار روک دی اور تین بار چند لمحوں کا وقفہ دے کر ہارن بجایا۔

سامنے بہت بڑا بنگلہ تھا جس کی چھت ایسی تھی جیسے عقاب پرواز کے لئے پر تولے۔ باوجود انہیں اندر جانے کا تو اتفاق نہیں ہوا تھا مگر وہ جب بھی ا
ان سے گزرے، انہوں نے ہمیشہ اس بنگلے کو جی بھر کر دیکھا اور سراہا ـــ بنگلہ ویران پڑا تھا، صرف چوکیدار تھا جو وہاں رہتا تھا اور جس سے انہیں علم ہو چکا
بنگلے کا مالک سان فرانسسکو میں رہتا ہے۔ ان کی تمنا اس شخص سے ملنے کی تھی جس نے زندگی کے لحاتی حسن کو اس بنگلے میں ڈھال کر ان کے تصور کو
چھو لیا تھا۔

جگدیش نے کہا۔

ـــ اس شاہکار کے خالق کو Howard Roark ہونا چاہئے:

ہارن کی آواز سن کر چوکیدار ان کے قریب آیا اور فوراً ہی اس نے کہا۔

ـــ بابو جی! ہمارے صاحب آگئے ہیں اور صرف دو دن کے لئے آئے ہیں اور وہ ابھی اس سڑک پر کار میں گئے ہیں۔ ان کی کار کا نمبر LB - 1304

جگدیش نے کار کو تیزی سے سڑک پر چھوڑ دیا۔

کیول اور راج خاموش تھے۔ کیول نے بوتلیں پھر کھولیں اور بانٹ دیں۔

جگدیش نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے بوتل منہ سے لگالی۔ اور بڑا گھونٹ بھرا۔ گھونٹ اس کے حلق سے ٹکرایا اور اس
پاؤں ایکسیلیٹر پر جم گئے۔ کار سڑک کی چھاتی چھیلتی ہوئی رک گئی۔

ـــ کیا ہوا؟" کیول نے پوچھا۔

ـــ یار اندھیرا آگیا سامنے"

اور یہ کہہ کر پھر جگدیش نے کار کو 50 کی رفتار سے چھوڑ دیا۔ راج بے خبری سے جھپکیاں لے رہا تھا اور مست تھا۔
سامنے کوئی کار نظر نہیں آرہی تھی۔ اور ہر سنگ میل پر پہنچنا اپ سنگھ کیون کے زندگی کے قاعدے کا ایک ورق تہہ کرنے کے لئے کھڑا تھا اس لئے جگدیش
ہر سنگ میل پر رفتار بڑھا دیتا۔

ـــ جگی" راج نے پکارا۔

ـــ شٹ اپ"

ـــ پیارے جیمز ڈین"

ـــ نہیں، پرنس علی خان"

ـــ نہیں، البرٹ کامو"

ـــ شٹ اپ ـــ شٹ اپ"

"جگی!"

"دیکھو!.... میری نظروں میں اندھیرا چھا رہا ہے اور مجھے وہ کار نظر نہیں آ رہی ہے... کیول! وہ دیکھو کچھ نظر آ رہا ہے تمہیں!.."

"نہیں! مجھے تو مزا آ رہا ہے۔"

"راج —"

"یار! میں نے یہ کیا کہا...؟"

"کیا؟"

"کہ آج پھر میرا جی چاہتا ہے مرنے کو۔"

"کیول!"

راج نے جگدیش کی جانب دیکھا اور کہا۔

"جگی! — دیکھو ادھر!"

کار تیزی کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جگدیش نے دیکھا اور تینوں مسکرا دیئے۔ راج نے کہا۔

"یار! ابھی ذہن کی رفتار غالب ہے۔"

کیول نے کہا

"شٹ اپ!"

جگدیش نے کہا۔

"اچھا!"

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اس کا ذہن پہیوں سے زیادہ تیزی سے گھومنے لگا۔

"رفتار... زندگی... موت... چیونٹی... جسم... آگ..."

"جگد... ی...." کیول چیخا۔

مگر اس کی چیخ بھیانک شور میں گم ہو گئی۔ پھر چند لمحوں کے بعد کچھ لوگوں نے سنسان، ویران سڑک پر چکنا چور کار اور دل ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔

ام عمارہ

بیچاری

میں نے انہیں پہلے پہل ناہید کے ہاں دیکھا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی منحنی سی خاتون تھیں جو زمانے کے نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑے آن بان گذار رہی تھیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس آن بان کو قائم رکھنے میں انہیں ناہید جیسی بھانجیوں تک سے مدد لینی پڑتی تھی۔ جی ہاں وہ ناہید کی خالہ جان تھیں ایسی ہی جیسی میں ناہید کی آپا تھی۔

اس دن ناہید کی اماں دانتوں کا قصہ لیے بیٹھی تھیں اور اپنے قبل از وقت گر جانے والے دانتوں کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں کہ وہ آ پہنچیں۔

"اللہ بچائے ناہید کی اماں آپ بھی کیا واہیات قصے لے بیٹھی ہیں۔ آپ کا دل کیسے ان باتوں میں لگتا ہے۔ میں جب بھی آتی ہوں آپ کی گفتگو کا موضوع اس سے مختلف نہیں ہوتا؟"

بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ ناہید کی اماں کو ہمیشہ ایسے ہی موضوع سوجھتے تھے۔ کبھی کسی کے بچے کی پیدائش کا مسئلہ اور کبھی کسی کے پاگل پن کا ذکر۔ میں سعادت مندی سے ان کی باتیں سنا کرتی۔ ویسے مجھے بھی ان کی باتوں میں مزا آتا تھا۔ اپنی طرف کا خاص سیدھا سادھا انداز تھا ان کا۔ نہ چھل نہ کپٹ۔ بڑی دانی بیوی تھیں بیچاری۔ لیکن ناہید کی خالہ جان کو بچوں اور ان کی پیدائش کے مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب کہ وہ خود اکٹھے نو بچوں کی ماں تھیں۔ وہ نو بچے تھے جن کی پے در پے آمد نے انہیں ایک دم بور کر کے رکھ دیا تھا اور اب وہ بقول خود "اس قسم کے ذکر سے بور ہونے کے لئے قطعی تیار نہیں تھیں" یہی کہ انہوں نے اپنی تمام نزاکت اور بیماریوں سمیت ایک نہ دو اکٹھے نو بچوں کو جنم دیا تھا جو سب کے سب ان کی طرح ذہین، طباع اور سمارٹ تھے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ یہ بھی قسمت کی خوبی ہی تھی کہ ان کے پانچ جو میاں پیدا ہوئے تھے وہ حد درجہ سمجھدار تھے۔ نہ صرف کردار کے، اور ان کی تو زبان تک پر وہ ٹرن کا دم تھا کہ لوگ ان کے گھر جھانک جاتے تھے ورنہ ان کے صاحب بہادر ... ان کا بس چلتا تو تمام دن گھر کو شطرنج کی بساط کی طرح بچھائے رکھتے اور تمام اپنے بچوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح سجاتے اور چلتے رہتے۔ یہ تو سچ مچ انہیں کا جگر تھا کہ اپنی تمام بیماریوں کو پس پشت ڈال کر بچوں کی نگہداشت کرتی اور اپنے گھر کی رہائش کو اونچے پیمانے پر پہنچا دینے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔ ویسے ان کے بچے تھے بھی بڑے سلیقے کے۔ اکیلے میں چاہے جو لے ہی کھا لیتے ہوں لیکن جہاں کسی کو دیکھا بڑے سلیقے سے ڈائننگ ٹیبل پر کر ڈٹ گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک اپنی تمام تر ناواقفیت کے باوجود انگریزی الفاظ استعمال اتنے اچھے انداز میں کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ کیا مجال کہ ایک لفظ بھی بے وقت یا نا موزوں کبھی بولے ہوں۔ خود وہ اپنی گفتگو میں انگلش الفاظ دھڑلے سے بولتی تھیں کہ وہ ان کی گفتگو کی خاصیت بن کر رہ گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بارہا تعجب ہوتا کہ آخر یہ بیوی کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ جن کے جسم کو کی بدولت قرار گیا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں زیادہ چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا لیکن ذہن کی بے چینی دیکھنے کی چیز تھی۔ زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی ایسی اٹلنے کا موضوع دیر بحث تھا کہ نظم موضوع سخن بن گئی۔ وہاں سے پہلیں تو آرٹ اور تجریدی آرٹ پر بحث کرنا شروع کر دی۔ عصمت نے اپنے بھائی بیگ کے بارے میں لکھا تھا "ان کی ساری طاقت جسم سے کھنچ کر زبان میں چلی آئی تھی" تو مجھے بڑا تعجب ہوا تھا اور میں نے اس جملے کو کئی مرتبہ دہرایا تھا۔ مگر میرا

اغ ہی سمجھنے سے قاصر تھا کہ کس طرح ایک انسان کی طاقت زبان میں چلی آسکتی ہے اور پھر زبان کیسے چل سکتی ہے۔ مگر یہاں دلی کا قصہ ہے جہاں آنکھ چلانا نہیں
ہوتا تھا۔ میں مشکل سے گیارہ بارہ سال کی تھی۔ لیکن اب انہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ زبان کے چلنے سے عصمت کی کیا مراد تھی۔ ویسے بیچاری کبھی بھی کسی کا قصہ
نہ کرتی نہیں بیٹھتی تھیں۔ ان کے اپنے ہی دکھ کیا کم تھے جو دوسروں کے ڈھکوسلوں کو سوچتیں۔ کس طرح انہوں نے اپنی عمر کانٹوں کی سیج پر سو کر گذاری تھی۔ یہ تو کچھ
میں کہا جاتا تھا۔ ہاں اور کیا عمر کا بیشتر حصہ تو بستر پر لیٹے لیٹے ہی گزر گیا۔ اچھا یہ بھی آیا۔ کل دو کر کی آمد آمد ہے۔ اوپر سے ان کے میاں حکیم شمیم آدمی تھے۔ بیچاری
ننھی سی انٹلکچوئل روح ان کی جہالت سے تو نہیں مگر میاں کی خود داغی سے ضرور کچل کر رہ گئی تھی ورنہ وہ اپنے وقت کی سیفو، ورجینیا وولف، قرۃ العین طاہرہ،
نہیں تو عصمت چغتائی کے اتنی بڑی ادیبہ تو ہوتیں ہی۔

مگر بقول اماں کے وہ تو جنم جنم سے ہٹی قسمت لے کر آئی تھیں ورنہ اس نامراد گھر میں کیوں پیدا ہوتیں۔ جس کا شفیق باپ ان کے سن شعور تک پہنچنے سے
پہلے مر گیا تھا۔ انہیں تو اپنے طور پر زندگی کرنے کی حسرت رہ گئی تھی۔ ورنہ وہ اپنے وقت کی کیا کچھ ہوتیں کسے پتہ۔ ان کے ابا انہیں بے حد مانتے تھے۔ دورے تک پر ہمیشہ
ہی ساتھ لے جاتے تھے۔ وہاں وہ مزے مزے سے اقبال کی نظمیں لہک لہک کر پڑھا کرتی تھیں۔ اور ان کے ابا ہنس ہنس کر اپنے کلیگز سے ایسے داد وصول کرتے
جیسے یہ نظمیں اقبال کی دماغ سوزی کا نتیجہ نہ ہوں۔ بلکہ ان کے اپنے ذہن کی اپج کا نتیجہ ہوں۔ وہ ترنگ میں کہا کرتے "میں اپنی بیٹی کو ولایت تک پڑھاؤں گا۔"

وہ بڑے فخر سے اپنے ابا کو دیکھتیں ان کے ابا سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہی تو ایک تھے جنہوں نے ایک ننھی سی انٹلکچوئل روح کو سمجھا تھا۔ ورنہ اماں،
راہ جانے ان سے، وہ تو بس بڑے اور چھوٹے بھیا پر مرتی تھیں جنہیں وہ اپنی دونوں آنکھوں سے کم نہیں سمجھتی تھیں اور اپنی پھوٹی آنکھوں کی روشنی، ساری زندگی
کی کمائی اور پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہتی تھیں۔ اور ان کا وجود تو ان کے لئے ایک حد فاصل تھا۔ دو لڑکوں اور اکٹھی چھ لڑکیوں کے بعد انہوں نے ان کی گود میں آنکھیں کھولیں
اماں نے منہ سکوڑ لیا تھا۔ پتہ نہیں نفرت سے یا کیا۔ لیکن اماں نے کبھی پلٹ کر بھی اس سے محبت نہیں کی۔ ہاں پیدا کئے کی لاج تھی کہ وہ اسے گھڑی دیکھ کر
پنج بار دودھ ضرور پلا دیا کرتی تھیں۔ اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ وہ تو ان کے ابا تھے جو انہیں اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے تھے۔ اور پھر ایک صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو
ان کے ابا بیچ آنگن میں پلنگ پر دھرے تھے اور اماں نے دونوں ہاتھ سے اپنا منہ پیٹ پیٹ کر لال کر لیا تھا۔ بڑی آپا اپنی ننھی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں ان کے چہرے
پر آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ "پھر اماں سے لڑائی ہوئی؟" انہوں نے زینت سے پوچھا تھا۔

"نہیں نانا ابا مر گئے۔" زینت نے اماں کو روتے دیکھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ اماں کے پاس چلی گئی اور اماں نے پہلی مرتبہ انہیں بے ساختہ
کھینچ کر سینے سے چمٹا لیا۔ اور بڑے زور سے رونے لگیں۔ وہ اداس سی اپنے ابا کے برف کی طرح سفید چہرے کو دیکھتی رہیں اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا تھا کہ انہوں نے بھی چلا چلا کر رونا
شروع کر دیا تھا۔ اور پھر سارے خیالات گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ ہوش سنبھالا تو بڑی آپا سے لے کر چھوٹی آپا تک سب ایک ایک کر کے اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ
چلی گئی تھیں۔ صرف وہ رہ گئی تھیں اماں کی جھڑکیاں سننے کو۔ بھیا اور چھوٹے بھیا کو بھابھیوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ کبھی کبھار گاؤں آ کر ان لوگوں کو پوچھ
لیتے اور اتنے بڑے سنسان گھر میں وہ اور اماں باؤلیوں کی طرح چکراتی پھرتی تھیں۔ کبھی اس محراب کے نیچے کبھی اس در پر ٹہل ٹہل کر وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی
دکھائی دیتیں۔

اب کے جو بڑی آپا، بڑے دن کی چھٹی میں اپنے بچوں کے ساتھ اماں سے ملنے آئیں تو ان سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی۔ مارے ہمدردی کے ان کا کلیجہ منہ
کو آگیا۔ اپنی بہن باؤلی ہو جائے اور وہ سکھ آرام کریں — اور جب جانے لگیں تو وہ انہیں اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ بڑی آپا کے یہاں پہونچ کر انہیں ایسا معلوم ہوا، جیسے
کھائی سے نکل کر گڑھے میں گر پڑی ہیں۔

کوئی بھی انہیں اور ان کے احساسات کو سمجھنے والا نہیں تھا ان سے تو اچھے اپنے گھر کے در و دیوار تھے۔ جن سے اور کچھ نہ سہی وہ مانوس تو تھیں۔ اور وہ انہیں اپنی
ہی طرح صابر نظر لگتے تھے۔ وہ ہر ایک کو پیاسی پیاسی آنکھوں سے دیکھتیں اور مایوس ہو جاتیں۔ انہیں زینت سے بڑی امیدیں تھیں۔ بھانجی ہوئی تو کیا ہوا تھی تو ان کی بچی
انہیں یقین تھا کہ زینت کے روپ میں انہیں ایک اچھی سہیلی مل جائے گی۔ وہ بڑے شوق سے انہیں چھوٹی خالہ پکارتی۔ زینت کا یہ تخاطب انہیں شروع شروع میں بھلا

گا لیکن بعد میں جل ہی گئیں۔ ایک طرف تو سخت خالہ تھیں اور دوسری طرف ان کی حیثیت زینت کی غریب سہیلی کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

چھوٹی خالہ بھی زیادہ ہی ٹوکا اٹھاتی ہیں ـــ "اللہ چھوٹی خالہ دیکھئے نا پیارا سا بٹن ٹوٹ گیا ہے اسے ذرا سی دیجئے نا ـــ میز سے وہ کتاب اٹھا دیجئے۔ یہ نیکر بڑی ہو گئی ہے اسے سی ڈالئے، وغیرہ۔

اگر وہ ٹال جاتیں تو زینت کی تیوری پر بل پڑ جاتے، جیسے۔ اے بیچاری میرا ہی کھاتی ہیں اور مجھی کو آنکھیں دکھاتی ہیں۔ ایک دن ان کے انکار پر زینت نے جل کر کہا تھا اور انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ان کی ننھی منی روح پر پتھر کی سل رکھ دی ہو۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لئے کمرے کی طرف جا رہی تھیں کہ کسی نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ان کا دبلا پتلا چہرہ سمیٹ لیا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا ڈبڈبائی آنکھوں میں ایک سانولا سادہ دھندلا چہرہ نظر آیا جس کی پیشانی پر بالوں کا گچھا پڑا تھا۔

"آپ ـــ آپ کون ہیں؟"

"میں نیاز ہوں ـــ تم اچھی ہو زینت؟"

"میں ـــ میں زینت نہیں ہوں ـــ میرا نام نکہت ہے۔" انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"یا اللہ مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔" وہ اپنے پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میں تمہیں پلنگ کی رسیاں توڑنے کے لئے نہیں لائی ہوں بیگم صاحب" بڑی آپا جلبلاتی ہوئی ان کے کمرے میں آئیں، "جاؤ باورچی خانے زینت کا منگیتر آیا ہے۔ وہ کیسے جا سکتی ہے چولہے کے پاس؟"

"آپا مجھے اماں کے پاس بھیج دیجئے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔" انہوں نے اپنی بڑی بڑی لہو کی بوند آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"کیوں بھلا وہاں جا کر کیا کرو گی؟"

ان جیسی بے قدر کنیز بڑی آپا کو کہاں مل سکتی تھی۔

"نہیں میں نہیں رہوں گی ـــ"

"بھابی ـــ" وہی سانولا سا چہرہ آپا کو پکارتے ہوئے کواڑ سے جھانک رہا تھا۔

"ارے نیاز ـــ آؤ ـــ آؤ ـــ" آپا کے آگ برساتے چہرے پر شگفتگی بکھر گئی۔

"بھابی یہ کون ہیں ـــ میں نے انہیں زینت ـــ"

"ارے نہیں یہ تو زینت کی خالہ ہے ـــ میری چھوٹی بہن نکہت ـــ بڑی پیاری ہے مگر کبھی کبھی دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اب یہ اس وقت جانے کے لئے کہہ رہی ہے ـــ بھلا بتاؤ تو کوئی تک ہے ـــ" آپا نے مکھن لگایا۔ وہ آپا کی مکاری سمجھ رہی تھی۔

"کمال ہے بھابی ـــ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا ـــ اتنی منی سی لڑکی آپ کی بہن نہیں ہو سکتی ـــ اور پھر کتنی خراب اور ساتھ مضحکہ خیز بات بھی کہ ـــ اب زینت کے رشتے سے یہ خالہ ہو جائیں گی ـــ خیر چھوڑئیے اس وقت ـــ کل میں ضرور آپ کو گاؤں پہنچا دوں گا" کہہ کر اور دیکھئے ـــ یک بیک ان کے زرد چہرے اور سرخ آنکھوں پر اس کی نظر پڑ گئی جو بہت خشمگیں انداز میں گھور رہی تھیں وہ گڑبڑا گیا۔

"اچھا بھابی میں جاتا ہوں اپنے کمرے میں ـــ" اور اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکلتا وہ اپنی ساری کا پلو سمیٹتی ہوئی باورچی خانے کو چلی گئیں۔

تب سے کچھ ایسا ہوا کہ انہوں نے ایک دن بھی اماں کے پاس جانے کا خیال نہیں کیا۔ اور بڑے اطمینان سے بڑی آپا کی ہانڈی چولہا اور نیاز کی خاطر جٹ گئیں۔

نیاز — جو پہلے دن بالکل اُلو بلا نظر آتا تھا اب اچھا لگنے لگا۔ گھر بھر میں وہ اکیلا آدمی تھا جس نے انہیں صحیح معنوں میں انہیں سمجھا تھا کم از کم ان کا اپنا خیال یہی تھا۔ اسے ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی تھی۔ ان کی ابتدائی بینڈی تحریروں میں فن کے ایسے ایسے نکات پیدا کرتا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ان کے ہاتھ کی لکیروں میں قسمت کا حال دیکھ کر ایک خوش آیند مستقبل اور ایک بڑے ادیب ہونے کی بشارت دیتا۔ اور ان کے دبلے پتلے چہرے سہم مارے خوشی کے دمک سی جاتی۔

اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن آپا کہنے لگیں۔

"شرم کرو نکہت — نیاز زینت کا منگیتر ہے اور اس رشتے سے تمہارا داماد بھی۔"

"اونہہ تو کیا ہوا — صرف منگیتر ہی تو ہے — اور منگنی تو کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتی ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

اور نیاز — اس کا کیا تھا — ہمدردی کے دو چار جملوں کے عوض اگر کسی نوجوان اور ساتھ ساتھ خوبصورت لڑکی کا پیار مفت ملے تو کیا برا تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے مزے سے نکہت کے ساتھ چولہے کے پاس بیٹھا خوش گپیاں کرتا رہتا۔ مگر کب تک آخر بڑی آپا کے بھی آنکھیں تھیں۔ انہوں نے ایک دو نہیں اکٹھے دس بچے پیدا کئے تھے۔ تین چھوٹی نندوں اور دیوروں کو عشق کرتے اور گل کھلاتے دیکھا تھا۔ انہیں یکبارگی اماں کے اکیلے پن کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا۔ اور ایک دن انہوں نے نکہت کو گماشتہ کملا پرشاد کے ساتھ گاؤں بھجوا دیا جو نکہت کی خیریت لینے آئے تھے۔

اب پھر وہی نکہت تھیں اور وہی اماں تھیں اور یہ بڑا ڈھنڈار گھر۔ پھر ایک بار وہ باؤلیوں کی طرح اس در سے اس دالان اس محراب سے اس محراب تک ٹہلتی رہتیں۔ اور ان کے لب آپ ہی آپ ہلتے رہتے۔ وہ جیسے سوتے جاگتے خواب سا دیکھا کرتیں۔ "کوئی بات نہیں نکہت — میں تمہارے گاؤں آیا کروں گا"

وہ اپنے انہیں ان دیکھے خوابوں میں گم تھیں کہ ایک صبح کملا پرشاد نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں اعلان کیا کہ بڑے دولہا بھائی آئے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پتہ چل گیا کہ وہ انہیں اور اماں کو لینے آئے ہیں۔ زینت کی شادی ہے۔ لیکن انہوں نے بڑی سختی سے جانے سے انکار کر دیا اور اماں بیچاری دوراہے میں پڑ گئیں۔ نکہت جس انداز سے یک بیک ان کے پاس آئی تھی اس سے ان کے دل میں بڑی بیٹی کے خلاف ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔ مگر اس پر بھی وہ شاید چلی جاتیں لیکن نکہت کے انکار پر انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جوان لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جائیں — وجہ معقول تھی — دولہا بھائی واپس چلے گئے۔

نکہت بیمار سی ہو گئیں — جب سب ایک ایک کر کے الگ ہو گئے اور دولت سچ مچ ڈھلتی چھاؤں ثابت ہو کر رہ گئی تھی تو انہیں نکہت کی قدر معلوم ہوئی۔ ان کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو منجھلی آپا کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

منجھلی آپا اور ان کے میاں کینٹ بھر میں بڑے کتب پرور مشہور تھے۔ مگر ان کا دل وہاں بھی جانے کے لئے نہیں چاہتا تھا۔ انہیں اپنے گھر کے در و دیوار پیچھے اور لمبی لمبی راتیں اب پیاری لگنے لگی تھیں۔ لیکن اماں کی مجبوریاں انہیں وہاں گھسیٹ کر لے گئیں۔ وہاں پہنچ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ تو جیسے ان کے خوابوں کا محل ان کے سامنے کھڑا تھا۔ بہت ہی خوبصورت ماڈرن بنگلہ اس کے چاروں طرف یہ بڑا باغ جس میں درخت اور پودے بڑی نفاست سے لگائے گئے تھے۔

منجھلی آپا نے جو کمرہ ان کے لئے اور اماں کے لئے مخصوص کیا تھا وہ تھا تو ایک دم کونے پر۔ نوکروں کے کمروں سے لگا ہوا۔ لیکن وہ انہیں بہت پسند تھا۔ کھڑکی کے سامنے یہ بڑے بڑے گلاب کا تختہ مہک رہا تھا۔ وہ تو جیسے ایک دم مست ہو گئیں ان کی شاعرانہ روح انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ ننھے ننھے خیالات بالکل اچھوتے انداز میں آ آ کر ان کو لبھانے لگے — ارے ہاں — اور کیا — یہ بھی کوئی بڑی آپا کا گھر تھا جہاں سارے دن باورچی خانے میں ناک جھاتے گزر جاتا تھا۔ یہاں تو ان کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ بچوں کے اسکول جانے سے پہلے ان کے کپڑے وغیرہ درست کر دیں انہیں وقت پر ناشتہ اور کھانا کھلا دیں۔ اور پھر منجھلی آپا کے بچے تھے بھی بڑے مہذب۔ بڑے تمیز سے ان سے باتیں کرتے۔ منع کرتے پر مان جاتے۔ سلیقہ مند تھے —

وہ تو سچ مچ نہایت ہی آزاد اور انٹلکچوئل روح تھیں جو صرف آزاد فضا میں پرواز کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ اور جب ان کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انہیں اس میں اپنا عکس نظر آیا۔ وہ تن دھن سے اس کی نگہداشت میں لگ گئیں۔

صاحب بہادر سے ان کا رشتہ صرف جسم تک رہ گیا تھا اور نتیجے کے طور پر ہر سال ایک بچہ آتا رہا اور وہ اپنی تمام کمزوری اور نزاکت کے باوجود ایک دو نہیں آٹھ بچوں کی اماں بن گئیں۔ اور ان کی نگہداشت ہی پر مرمٹیں۔ یہاں تو ویسے ہی دل سے اتر کر رہ گئے تھے انہیں کا خرد ماغ پن تھا کہ وہ اپنے intellect کو کام میں نہیں لا سکی تھیں۔ زبان کیا تھی خدا کی پناہ جو بولی نکلی تیر کی طرح دل میں جا کر ترازو ہو گئی۔ اور ایسے پھوہڑ باپ کے بچے ظاہر ہے اس سے بھی دو قدم آگے ہوتے۔ لیکن انھوں نے ان کی پرورش کی ساخت اپنے طور پر کی تھی۔ بڑا لڑکا ان کا آئیڈیل تھا۔ اس کے گھنگھریالے بالوں میں انہیں نیاز کی جھلک نظر آتی، لب و لہجہ میں ننھے میاں کا سا بانکپن اور شعر و سخن کا ذوق انھیں اپنا نظر آتا۔

اور پھر ایک دن ایسا آیا جب انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ دن ان کی زندگی کا یادگار دن تھا جب بیٹے نے پہلی مرتبہ ان کی حمایت میں باپ کے سامنے زبان کھولی تھی۔ ان کا کلیجہ بالشت بھر کا ہو گیا۔ انھوں نے سوچا آخر ان کی محنت سوارت لگی۔ یہ بیٹا یقیناً ان پر ایک چھتنار درخت کی طرح چھا جائے جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ سانس دہانت دے سکیں گی۔ کیا ہوا جو بیماریوں سے ان کی شکل پر مردنی چھا کر رہ گئی ہے۔ ان کی روح تو اب تک جوان ہے اب وہ ایک ایک سے گن گن کر بدلے لیں گی۔ انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ نیاز اور ننھے میاں جوان کے ازلی دشمن تھے جن کی بدولت وہ کسی زمانے میں خاک بدنام ہو کر رہ گئی تھیں۔ اپنے اپنے ٹھکانے پر بڑے خوش تھے اور ان کی زد سے باہر تھے۔ لے دے کے ہمیشہ بیری میاں ہی رہ گئے تھے۔ جن سے وہ بدلے لے سکتی تھیں۔ ویسے پہلے بھی وہ بے تکلف محفلوں میں اپنے میاں کی برائی کرنے نہیں چوکتی تھیں۔ انھیں سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کی بدولت صحیح مقام حاصل نہیں کر سکی تھیں جس کی وہ مستحق تھیں۔ ان کا اپنا خیال تھا کہ وہ ایلیٹ، سیفو۔ قرۃ العین طاہرہ نہیں تو نہ سہی کم از کم اپنے وقت کی عصمت چغتائی تو بن سکتی تھیں۔

لیکن بیچاری — ان کی تو قسمت ہی کھوٹی تھی — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے — ابھی ان کی ذہانت کھل کر بروئے کار آنے بھی نہ پائی تھی صاحبزادے صاحب نے ہری جھنڈی دکھا دی۔ مارے صدمے کے ان پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگے اور جب ننھے میاں انہیں دیکھنے آئے تو کہنے لگے "آپ بڑے آدمیوں کا مرض ہے آپ کبھی بھی اچھی نہیں ہو سکیں —"

اور بیچاری تباشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ انھوں نے صاحب بہادر، بیٹے، ننھے میاں — ایک ایک کو بڑی حسرت سے دیکھا، نگاہوں میں ہمدردی تلاش کی، مگر وہاں وہی ایک جواب تھا۔

"کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں" ان کی مایوس آنکھیں اپنی بیٹی پر ٹک گئیں۔ جو بڑی حسرت سے ان کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جہ میری اماں بیچاری" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اور انھوں نے محسوس کیا کہ اتنے دنوں تک انھوں نے صاحبزادے پر اپنا وقت بیکار ضائع کیا۔

اور پھر وہ ایک نئی امنگ سے کہتی ہوئی دکھائی دیں۔

"دراصل بھابی میں نے ہی سمجھنے میں غلطی کی تھی، ہمارے بیٹے صاحب تو بالکل اپنے باپ کا عکس ہیں۔ دراصل میں میرے انداز میں اگر کوئی ہو سکتا تو وہ بنّو ہے۔ بس اس سے ایک دم فرینڈلی ٹریٹ کرتی ہوں۔ کیونکہ وہی ایک ایسی ہے جو میرے دکھ کو سمجھ سکے۔"

اب انھیں کس منہ سے کہتی کہ آپ کے بچوں کو دوست سے زیادہ ایک اچھی ماں کی ضرورت ہے — ورنہ —

عبدالعزیز خالد

○

اے حسینو، گلعذارو، مہوشو!
عیش پرور ہوں بہاریں عمر کی
دشمنِ جاں بھی ہو جانِ مُدّعا
مشکِ نافہ بن کے مہکو دہر میں
سیج پھولوں کی بدن کی رازدار
زُلفہائے کاستہ، آراستہ
پھڑپھڑانے دو لباسِ پرنیاں
ہم گدائے کوچہ گرد و رہ نورد
بندہ پرور! عہدِ گُل ہے مختصر
یہ دمکتے جسم یہ گلنار لب
یہ خمار و خمر و آب و انگبیں
مرمر و مرجاں سے ہے جن کا خمیر
تارِ بربط کی طرح ہلتا ہے دل
بے ادب حدِّ ادب ملحوظ رکھ
راکھ کھائی میں نے روئی کی طرح
تیری خواہش حکم ہے میرے لئے
زندگی زقوم و حنظل ہی سہی
سیر ہے بیزار ہے ان کی نگاہ
کیا بچے گا زندگی کی آگ سے
وارد و صادر ہیں آیندہ و روند
چہچہا کرتی ہے بلبل باغ میں
سخت مستقی ہے جانِ عاشقاں

ہم دعاگو ہیں تمہارے، خوش رہو
نور پھیلاؤ، بڑھو، پھولو، پھلو!
دل کی دھڑکن، روشنی آنکھوں کی ہو
خرّم و خنداں، تر و تازہ رہو
بوستاں ہو، بوستاں بانی کرو
جامۂ چسپیدہ، خوش پیوست ہو
ملکہ آسا، فرشِ سندس پر چلو
حُسن کے غنچو، زکاتِ حُسن دو
بڑھ کے روکو، اشہبِ ایام کو
ہائے کس مُنہ سے انہیں فانی کہو
عارضی ہے عارضی اے غنچو
ان کو رو، اے ابرِ دریا بار رو!
دف بجانے والی مہرو لڑکیو
باولو! دامن لپک کر تھام لو
حکم تھا آنسو ملا پانی پیو
بندۂ بے دام ہوں، ارشاد ہو
جُرعہ جُرعہ نوشِ جاں کرتے رہو
بھوک سے پھر بھی بیاکل کیا کہو
کیا تمہارے پاس ہے، نو دولتو!
ہیں رباطِ زیست کے دروازے دو!
وصل مانع ہے فغانِ شوق کو!
گر گہے نوشاب لب پینے کو دو!

ایک ہے عیشِ دو عالم ہو کہ یا
درد ہو سارے جہاں کا دوستو

شہسوارو، یہ بھی ہیں پا در رکاب
مجلے کے پھولوں کی خوشبو سونگھ لو

(ب)

یہ ہے طول و عرضِ 'لا رہبانیت'
زندگی کے حسن کا منکر نہ ہو

لے گیا دم دے کے وہ جانِ عزیز
وہ جو حالِ دل کا مستفسر نہ ہو

پیشِ جابر، عاجز و مسکیں نہ بن
پیشِ مسکیں، جابر و قاہر نہ ہو

مت اسے زندہ کہو جس شخص کا
کوئی مستقبل نہ ہو حاضر نہ ہو

کچھ نہیں حاصل سخن سے جب تلک
آدمی پیدائشی شاعر نہ ہو

حل نہ ہوں عقدے نشاط و درد کے
جب تلک جمعیتِ خاطر نہ ہو

کس طرح ممکن ہے اے صیدِ ہوس
سوزِ پنہاں آنکھ سے ظاہر نہ ہو

یہ ہے اول شرط راہِ عشق کی
ذہن مومن ہو نہ ہو کافر نہ ہو

(ج)

الفت لیلۂ شوق کی کس سے کہوں
جب کوئی سننے پہ ہی مائل نہ ہو

ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے دنیا کا دھن
دھن ہے مایا جال ہے غافل نہ ہو

سیر کر تاروں کی اے اختر شناس
ان کے جادو کا مگر قائل نہ ہو

ہوں نہ اسرار نہانی منکشف
جب تک استعداد ذہن و دل نہ ہو

عادتِ فطرت نہیں اکراہ و جبر
دیکھ بیتابی نہ کر، عاجل نہ ہو

شے کوئی ملتی نہیں ہے تحفتہً
یا تو بن حقدار یا سائل نہ ہو

بند رہتے ہیں دریچے فیض کے
فیض کے جب تک کوئی قابل نہ ہو

اے طلبگارِ حیاتِ جاوداں
عمرِ فانی، صرف لاحاصل نہ ہو

صدق دل سے ہو کوئی خواہاں اگر
غیر ممکن، مدعا حاصل نہ ہو

لفظ و معنی کی دوئی مٹتی نہیں
کوئی جب تک شاعرِ کامل نہ ہو

زندگی اے زندگی کیسا یہ بھید
وحی کیوں بوجہل پر نازل نہ ہو

ہو گئے جل بل کے بھوبل شوق میں
وائے گر اس پر بھی قدرِ دل نہ ہو

ڈاکٹر وحید اختر

O

یہ آج لے کے ہمیں آ گئی کہاں تنہا — وہ جستجو کہ ہے امید دو جہاں تنہا

جلا کیا ہے یہ انداز دوستاں تنہا — وہی چراغ جو ہے آبروئے جاں تنہا

وہ زندگی کہ سبھی دنیا میں کر رہے ہیں نباہ — ہمیں تھا وہم ہمیں ہیں مزاج داں تنہا

ہیں ایسے گل بھی نہیں پا سکی جنہیں کا سراغ — صبا نہ جائیو تو سوئے گلستاں تنہا

جو ان کے در سے اٹھے تو کہاں کہاں پہنچے — بلا رہے ہیں سفر ہائے لا مکاں تنہا

کٹے تو کیسے کٹے مرحلہ نہ راہ نہ چھاؤں — یہ زندگانی کا صحرائے بے کراں تنہا

وہ ہم سفر جو کسی کا ہوا نہ مانِ وفا — یہ دشتِ تیرۂ ہجراں وہ جانِ جاں تنہا

ذرا سا قرب کا نور اور رات بے پایاں — سلگتا چھوڑ گئے ہمرہ وشاں تنہا

وہ لوگ بھی ہیں جو پھولوں سے بھی گزر نہ سکے — وہ لوگ بھی ہیں جو کانٹوں کے درمیاں تنہا

جو آج مہر بہ لب ہیں کبھی تو بولیں گے — کہ تم پہ دل میں بھی کھلتی نہیں زباں تنہا

خیالِ خاطرِ اغیار سے ہم اٹھ آئے — تمہیں نہ ہو خلشِ پاسِ دشمناں تنہا

ابھی تو اور ہیں رندانِ حوصلہ پیما — ہمارا جام نہیں شکوۂ مغاں تنہا

ہیں ساتھ اور بھی آوارگانِ دل زدگاں
وحید تم ہی نہیں ابر تشنہ جاں تنہا

محمد علوی

○

رات بیمار ستاروں سے بھری رہتی ہے
دن کی قسمت میں وہی دردِ سری رہتی ہے

پھول کھلتا ہے نہ پتّہ کوئی شرماتا ہے
شاخِ امید کی کانٹوں سے بھری رہتی ہے

ہم بھی غنچے ہیں، ہمیں بھی تو ابھی کھلنا ہے
دور کیوں ہم سے نسیمِ سحری رہتی ہے

جن کی راہیں بھی نہیں اور کوئی منزل بھی نہیں
ان بگولوں سے مری ہم سفری رہتی ہے

جام میں اپنا ہی چہرہ نظر آیا ہم کو
لوگ کہتے ہیں یہاں "لال پری" رہتی ہے

ہم بگڑتے ہی نہیں اور بگڑ جائیں تو ــ
ہیکڑی سارے زمانے کی دھری رہتی ہے

دور بھی ہوں تو ہمیں ہوش کہاں رہتا ہے
پاس بھی ہوں تو وہی بے خبری رہتی ہے

ہم بھی دیکھیں گے کہاں تک وہ چھپیں گے علوی
اور کب تک یہ پریشاں نظری رہتی ہے

اختر انصاری اکبرآبادی

○

روحِ آغوشِ محبت، نہیں آرام پسند
تیرا شاعر ترا اختر تو ہے آلام پسند

تیرے گیسو ترے رخسار کو دیکھوں کب تک
تا کجا ہو یہ سرورِ سحر و شام پسند

طنز آمیز تبسم کی نہیں تاب مجھے
ورنہ کر لیتا محبت میں ہر الزام پسند

تیرے کہنے سے میں واپس تو چلا آؤں مگر
کس کو آئے گا مرا جذبۂ ناکام پسند

ابھی پینے کا زمانہ ہی نہیں ہے ساقی
تیرے شیشے ترا بادہ نہ ترا جام پسند

مسکرائیں نہ حوادث سے ڈرانے والے
خود کچل دوں گا میں اپنا دلِ اوہام پسند

تیری محفل سے بہت دور رہی میری منزل
کس طرح ہوں مجھے اے دوست در و بام پسند

میرے دل پر اثرِ گردشِ ایام نہیں
میرے دل کو نہ کرے گردشِ ایام پسند

اب مرے ذوقِ نظر میں ہے بلندی اختر
مجھ کو آیا تھا کبھی جلوۂ اصنام پسند

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

دریائے لطافت — زیر طبع

ترجمہ مع مقدمہ از جمیل نقوی
لاہور اکیڈمی۔ لاہور

حفی کی شاعری — زیر طبع

شان الحق حقی کی شاعری پر مضامین کا مجموعہ اور انتخاب کلام۔ مرتبہ جمیل نقوی
لاہور اکیڈمی۔ لاہور

بابائے اردو فن اور شخصیت — زیر طبع

مختلف اہل علم کے مقالات کا مجموعہ۔ مرتبہ بدر عالم ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ
ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

فن اور فنکار — زیر طبع

میرزا ادیب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ
ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

جادہ و منزل — ایک روپیہ

مجموعہ کلام از پرکاش ناتھ پرویز۔ ص ۱۱۲
مکتبہ نگارش، کٹرہ باگھ سنگھ، امرتسر (بھارت)

اقبال نما — زیر طبع

علامہ اقبال سے متعلق کتب و مضامین کا اشاریہ
مرتبہ اکبر علی خاں۔

منـ یات اقبال — زیر طبع

اس کتاب میں علامہ اقبال کی وہ متفرق اور منتشر تحریریں یکجا کردی گئی ہیں جو اب تک یکجا نہ تھیں۔
مرتبہ اکبر علی خاں

.... افسانہ کردیا — زیر طبع

ڈاکٹر احسن فاروقی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
ناشر مکتبہ اسلوب ۲/۲۲۵ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی ۱۸

افکار و مسائل

فیسر مرزا حیرت

"چند ہم عصر" میں پروفیسر مرزا حیرت کے حالات پر ایک مضمون ہے جس کے بارے میں بابائے اردو کا بیان ہے: "یہ مضمون میرا لکھا ہوا نہیں میرے ایک ایرانی نژاد دوست مرزا حیرت کا بچا کھچا کلام لائے تھے اور اس کے ساتھ یہ مضمون انگریزی میں لکھا ہوا مجھے دیا۔ اس کا ترجمہ اور کا کلام دونوں رسالہ "افسر" میں شائع ہوئے۔ شیخ چاند مرحوم (مرتب "چند ہم عصر") نے یہ سمجھ کر کہ یہ میری تحریر ہے "چند ہم عصر" میں داخل یا۔" (دیباچہ اردو اکیڈمی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۹ء)

یہ مضمون رسالہ "افسر" کے اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا (جلد ۲ شمارہ ۱۰) یہ شمارہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اس میں کہیں یہ ت نہیں کی گئی کہ یہ مضمون کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ مضمون کے خاتمے پر لفظ "ایڈیٹر" لکھا ہے اور فہرست میں مضمون نگار کا نام مولوی حق ہی لکھا ہے ۔۔۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بابائے اردو کے "ایرانی نژاد" دوست کون حضرت تھے اور مذکورہ انگریزی مضمون کس کا لکھا ہوا تھا اور وہ کہاں چھپا تھا؟

اس سلسلے میں اگر اہل علم حضرات معلومات فراہم کرسکیں تو ممنون ہوں گا۔

ابن حسن قیصر
لائبریرین نیشنل لائبریری،
میری ویدر ٹاور۔ کراچی

گر مرادآبادی کے مکاتیب اور دیگر تحریریں

میں حضرت جگر مرادآبادی کے خطوط، غیر مطبوعہ کلام، تصاویر اور مضامین نثر جمع کر رہا ہوں۔ اب تک تقریباً ڈیڑھ سو خطوط، غزلیں، متفرق اشعار اور نثری تحریریں جمع کر چکا ہوں۔ "نوادرات جگر" کے نام سے ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس مجموعے کو بہتر سے بہتر بنا کر پیش کروں۔ اس لئے ان تمام حضرات سے جن کے پاس حضرت جگر مرحوم کے خطوط یا دیگر تحریریں ہوں، وہ مجھے مطلع فرمائیں۔

مرتضیٰ شفیع،
معرفت ایڈیٹر "قومی زبان"
انجمن ترقی اردو، اردو روڈ۔ کراچی

مؤلف "سرگذشت الفاظ" کے حالات

میں مولوی احمد الدین (مؤلف "سرگذشت الفاظ" اور "اقبال" وغیرہ) کے بارے میں ایک مقالہ مرتب کر رہا ہوں۔ ان کے حالات زندگی تصانیف کی مکمل فہرست مطلوب ہے۔ اس سلسلے میں اگر اہل علم میری رہنمائی کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔

بدر عالم، ریسرچ اسکالر
ترقی اردو بورڈ۔ اسعد منزل
جمشید روڈ۔ کراچی ۵

عزیز لکھنوی کی "تجلیات"

حضرت عزیز لکھنوی نے لکھنؤ کی مشہور شخصیت مفتی محمد عباس کی سوانح عمری لکھی تھی جس کا نام ہے "تجلیات"۔ یہ وہی مفتی عباس ہیں جن سے مرزا غالب کے مراسم تھے اور دونوں میں خط و کتابت بھی رہی ہے۔ جن صاحب کے پاس بھی "تجلیات" ہو، براہ کرم مطلع فرمائیں کہ اس میں غالب اور مفتی صاحب کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر شائع ہوئے ہیں تو ان کی تفصیل سے بھی آگاہی بخشیں۔

تحسین سروری
معرفت دفتر ٹائمز گلڈ،
اسٹریچن روڈ۔ کراچی۔

(بقیہ حرفے چند از صفحہ ۵)

گذشتہ سال ادارۂ مصنفین (مرکز) کی طرف سے "ہم قلم انعامات" تقسیم کئے گئے تھے، جو رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین نظم سے متعلق تھے۔ اس سال بھی یہ انعامات تقسیم کئے جا رہے ہیں اور ان سے متعلق تفصیلی اعلان اسی شمارے میں کسی دوسری جگہ شائع کیا جا رہا۔ گذشتہ سال پانچ پانچ سو روپے کے چار انعام تقسیم کئے گئے تھے اس سال انعامات کی رقم فی انعام ایک سو روپے کم کر کے انعامات کی تعداد چار سے پانچ کر دی گئی ہے، تاکہ زیادہ اہل قلم ان انعامات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

گذشتہ سال ادارہ نے سال بھر کی مطبوعہ نگارشات خود جمع کی تھیں۔ یہ کام خاصا دقت طلب ہے اور اس طرح بعض اچھی تخلیقات نظر انداز ہونے کا امکان رہتا ہے۔ لہٰذا اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اہل قلم حضرات خود یا عام قارئین ان انعامات کے لئے نگارشات روانہ فرمائیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کیا جائے گا۔

ہم قلم ادبی انعامات کے قواعد

یہ انعامات ادارۂ مصنفین پاکستان کی طرف سے دیئے جائیں گے۔

انعامات کے لئے صرف انہیں تخلیقات پر غور ہوگا جو مختلف پاکستانی (اردو) جرائد و رسائل میں یکم جولائی ۱۹۶۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء تک کے عرصے میں شائع ہوتی ہیں۔

یہ انعامات حسب ذیل اصناف ادب پر دیئے جائیں گے اور ہر انعام کی رقم مبلغ چار سو روپے ہوگی۔

ا۔ تنقید و تحقیق۔

ب۔ شاعری (جملہ اصناف)۔

ج۔ نثر (افسانہ، طنز و مزاح، انشائیہ)۔

د۔ ڈرامہ۔

ہ۔ علاقائی زبانوں کے اردو میں تراجم۔

شق "ہ" کے علاوہ تمام انعامات طبع زاد نگارشات پر دیئے جائیں گے۔

مقابلے میں حصہ لینے والے ادیبوں کا پاکستانی شہری ہونا لازمی ہے۔ البتہ ادارۂ مصنفین پاکستان کا رکن ہونا ضروری نہیں۔

مرحوم مصنفین کی نگارشات بھی مقابلے میں شامل کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان کی پہلی اشاعت کی تاریخ مقررہ میعاد یعنی یکم جولائی ۱۹۶۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء کے اندر ہو۔

تمام نگارشات کے تین تین نسخے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء تک مرکزی دفتر ادارۂ مصنفین پاکستان (اسٹریچن روڈ۔ کراچی) میں پہنچ جانا چاہئیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تینوں نسخے مطبوعہ صورت میں ہوں۔ ایک نسخہ مطبوعہ اور بقیہ دو نسخے نقول کی صورت میں بھیجے جاسکتے ہیں۔

مصنف کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی مصنف کی نگارشات بھجوا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں اسے یقین دلانا ہوگا کہ مصنف کی منظوری حاصل کرلی گئی ہے۔

انعامات کا اعلان گلڈ کی سالگرہ کے موقع پر ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء کو کیا جائے گا۔

اگر کوئی مصنف انعام کے اعلان سے پہلے انتقال کر جائے تو اس کا انعام اس کے قانونی ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

انعام کا فیصلہ ادارہ مصنفین کے مرکزی معتمد کے نامزد کردہ ججوں کی کمیٹی کرے گی۔

ترجمہ جلیل حشمی

ثقافتی ورثہ

پنجابی حرفی

انٹی سُوت کی بھاری مول والی، بندہ تار پہ بار م بار بکے
ایسا سودا کسے پسند نہیں یوسف بعد میں، پہلے خریدار بکے
یہی راستوں کی اونچ نیچ رہی، کبھی قافلہ کبھی سالار بکے
اپنا آپ بیچے کوئی خلوت میں اور کوئی بیچ بازار بکے
کبھی پھول رستے کی دھول بنے کبھی باغ کے بھاؤ میں خار بکے
سودا کوئی بھی باقی نہیں بچتا کوئی نقد تو کوئی اُدھار بکے

تصنیف و ترجمہ
زیتون بانو

ثقافتی ورثہ

پشتو غزل

پلکوں پر جو اشک جمے تھے اب آنکھوں سے بہتے ہیں
آہوں کے جلتے شعلے بھی اس دل پر ہم سہتے ہیں

تم کو یہ لالچ ہے کہ تم دیکھو گے اک بار ہمیں
لیکن ہم غیرت کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں

کس کس کے پاؤں کی خاک، یہاں تم بیٹھے چھانو گے
قافلے روز ہی ان راہوں سے آتے جاتے رہتے ہیں

امر ہوئے وہ لوگ کہ جن کے دل میں درد تھا دنیا کا
اپنی آگ میں جلنے والے روز ہی جلتے رہتے ہیں

وقت کے بہتے دریا میں ہر چیز یہاں بہہ جاتی ہے
دنیا دھول ہے بانو دنیا والے ٹھیک ہی کہتے ہیں

ہم قلم کا اشاریہ

"ہم قلم" کا پہلا شمارہ اگست۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر شمارے سے اس کی تیسری جلد شروع کی جا رہی ہے۔ گذشتہ دو سال کے پرچوں کا اشاریہ "مصنف وار" ترتیب سے شائع کیا جا رہا ہے۔

...مدعبداللہ المسدوسی
نئے آئین کی چند اہم خصوصیات — مضمون — دسمبر ۶۱ء
...ر، طاہر
۱۔ ریشمی فیتے (لی۔ فو۔ ین) ترجمہ — افسانہ — جنوری ۶۱ء
۲۔ — غزل — جون ۶۱ء
۳۔ شہد اور زہر — نظم — اگست ۶۲ء
...ر، یونس
۱۔ نہوا — افسانہ — اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔ کفن چور — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ بھیلیا — " ترجمہ — ستمبر ۶۱ء
۴۔ سید علاول — شخصیات — دسمبر ۶۱ء
۵۔ کراچی اور ملتان میں چند روز (ترجمہ) سفرنامہ — جون ۶۲ء
(جسیم الدین)
...تر الایمان
کتبہ — نظم — ستمبر ۶۱ء
...تر انصاری دہلوی
۱۔ — غزل — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ اردو ناول کا آغاز اور ابتدائی نشوونما — مضمون — مارچ ۶۱ء
۳۔ — غزل — جولائی ۶۲ء
...ترحسین رائے پوری، ڈاکٹر
نذرالاسلام کی یاد — مضمون — اکتوبر ۶۰ء
...تر رضوی
سہگل سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ — مضمون — مارچ ۶۱ء
...تر محمد خالد
شیخ قربان علی کار — مضمون — اکتوبر ۶۰ء
...تر وحید، ڈاکٹر
۱۔ اردو ادب کے ۳۰ سال — مضمون — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ بساط ہوائے دل — نظم — جون ۶۱ء
...یب، معمار نیموری

— غزل — ستمبر ۶۰ء
ادیب، سہیل
پھول جھڑی — نظم — اگست ۶۱ء
ادیب، میرزا
مادر قوم — (ڈراما) — نومبر ۶۰ء
اریب، سلیمان
۱۔ — غزل — مارچ اپریل ۶۱ء
۲۔ — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ — " — اگست ۶۱ء
اسلم فرخی
راقم کی شرح دیوان غالب — مضمون — دسمبر ۶۱ء
اسلم قریشی، پروفیسر (محمد)
غالب کی فارسی شاعری — مضمون — مئی ۶۱ء
اسلوب احمد انصاری
نثر کا آہنگ — مضمون — سالگرہ نمبر ۶۱ء
اشک، احسن احمد
۱۔ — غزل — اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔ تم آ گئے — نظم — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ ڈاکٹر شہید اللہ — مضمون — دسمبر ۶۱ء
۴۔ جاگتے جزیرے — نظم — جنوری ۶۱ء
۵۔ ڈراما — " — مارچ اپریل ۶۱ء
اصغر، سیّد
ایک گراں بار رات — افسانہ — اکتوبر ۶۱ء
اطہر نفیس
۱۔ — غزل — اگست ۶۰ء
۲۔ — " — نومبر ۶۱ء
۳۔ — " — جنوری ۶۲ء
اعجاز، اعجاز الحق
۱۔ فریب — نظم — اگست ستمبر ۶۰ء

عنوان	صنف	تاریخ
اعجاز اکرم		
دیدہ ور	نظم	مئی ۶۱ء
افتخار جھنوری		
پھول اور دیوتا	افسانہ	ستمبر ۶۱ء
افسر، حامد اللہ		
۱۔ اردو میں بچوں کا ادب	مضمون	نومبر ۶۱ء
۲۔ ادب کا مطالعہ	"	جولائی ۶۲ء
افضال شروانی		
دل جوئی	نظم	اکتوبر ۶۱ء
افضل صدیقی		
	غزل	اکتوبر ۶۱ء
اکبرالدین صدیقی، محمد		
بابائے اردو اور رسالہ افسر	مضمون	اگست ۶۱ء
امجد، مجید		
	غزل	دسمبر ۶۰ء
اُمّ عمارہ		
کون کسی کا	افسانہ	جون ۶۱ء
امیر حمزہ شنواری		
۱۔ پشتو زبان کے بعض پیش رفت رجحانات اور مسائل	مضمون	اپریل ۶۱ء
۲۔ پشتو عوامی گیت	"	اکتوبر ۶۱ء
۳۔ امیر حمزہ شنواری	خودنوشت سوانح	جنوری ۶۲ء
ا[illegible] الرحمٰن		
سائیں مرنا	شخصیت	دسمبر ۶۱ء
امین، سید اشرف		
	غزل	سالگرہ نمبر ۶۱ء
انتظار حسین		
۱۔ دامن کی آگ	افسانہ	جنوری ۶۱ء
۲۔ فرانسیسی ضمیر کی آواز (ترجمہ) (ژاں پال سارتر)	مضمون	" ۶۱ء

عنوان	صنف	تاریخ
۳۔ علامتوں کا زوال	مضمون	ستمبر ۶۱ء
انجم اعظمی		
۱۔ گناہ آدم خاکی	نظم	اکتوبر ۶۰ء
۲۔ شریک حیات	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ سورج	"	اپریل ۶۱ء
۴۔ تجدید	"	جولائی ۶۱ء
۵۔ مسافر	"	نومبر ۶۱ء
۶۔ چہرہ	"	جنوری ۶۲ء
انجم رومانی		
	غزل	مارچ ۶۱ء
انور		
۱۔ اٹھو فریڈا سنیا	رپورتاژ	جون ۶۱ء
۲۔ " " (دوسری قسط)	"	جولائی ۶۱ء
انور احسن صدیقی		
بابائے اردو کے نام	نظم	ستمبر ۶۱ء
انور خواجہ		
۱۔ زرنگار	افسانہ	اکتوبر ۶۰ء
۲۔ نئے افق	"	دسمبر ۶۰ء
۳۔ آواز آہنگ	"	مئی ۶۱ء
انور عنایت اللہ		
ارنیسٹ ہیمنگوے	مضمون	اگست ۶۱ء
اولیاء، محمد ایوب		
احسن مارہروی کی یادیں	شخصیت	اکتوبر ۶۱ء
ایاز، شیخ		
۱۔ رات کروٹ بدل رہی ہے دیکھ۔ ترجمہ	نظم	دسمبر ۶۰ء
۲۔ اک لمحہ تری محبت کا	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ سال گذشتہ میں سندھی ادب کی ترقی	مضمون	مئی ۶۱ء

٤۔ کافی (سچل)	ترجمہ	نظم	دسمبر ۶۱ء
٥۔ وائی (شاہ لطیف)	"	"	"
٦۔ شبنم روتی ہے	"	"	جنوری ۶۲ء
٧۔ سپھری یاد بہانا نے لگی (میر عبدالحسین سانگی)	"	"	"
٨۔ سنہ ۱۹۶۱ء کا سندھی ادب		مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء
٩۔ وائی (شاہ لطیف)	ترجمہ	نظم	جولائی ۶۲ء

الیاس

دوست	افسانہ	ستمبر ۶۱ء

ایم فرشوری

	غزل	ستمبر ۶۱ء

ط

نی رضوی، سجاد

١۔ اصغر گونڈوی	مضمون	دسمبر ۶۱ء
٢۔ پھیری والا	نظم	جنوری ۶۲ء
٣۔	غزل	اگست ۶۱ء
٤۔ زنجیر	نظم	ستمبر ۶۱ء

باقر دھلوی

١۔	غزل	نومبر ۶۱ء
٢۔ سیاح	نظم	اگست ۶۱ء

بانو قدسیہ

نوحہ شادی	افسانہ	نومبر ۶۱ء

بشیر نیاز

نیلے برقعے کی جالی	"	اگست ۶۱ء

بہزاد لکھنوی

١۔	غزل	ستمبر ۶۱ء
٢۔	"	جون ۶۲ء

بیتاب، شائستہ

	غزل	نومبر ۶۱ء

تابش دھلوی

١۔		غزل	اگست ستمبر ۶۲ء
٢۔ ایک جن ایک آدمی		نظم	سالگرہ نمبر ۶۲ء
٣۔		غزل	اپریل ۶۲ء
٤۔		"	ستمبر ۶۱ء
٥۔		"	دسمبر ۶۱ء

تاج سعید

١۔ پشتو لوک گیت	ترجمہ	نظم	جنوری ۶۲ء
٢۔		دوہے	مارچ ۶۲ء

تبسم، صوفی

پنجابی ادب کا ایک سال	مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء

تراب نقوی

	غزل	اکتوبر ۶۱ء

تمکین کاظمی

١۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی	مضمون	نومبر ۶۱ء
٢۔ دیوان غالب کی اول شرح وثوق صراحت	"	سالگرہ نمبر ۶۲ء
٣۔ انور دھلوی	شخصیت	جولائی ۶۲ء
٤۔ استاد جلیل	"	" "
٥۔ آذربائیگان	مضمون	" "

تحسین سروری

١۔ راقم اور غالب	شخصیت	اکتوبر ۶۱ء
٢۔ خواب آویزاں	نظم	دسمبر ۶۱ء
٣۔ عبدالحق طالب علم کے روپ میں	مضمون	اگست ۶۲ء

ثریا مہتاب

١۔ موسم سرما کی آمد پر	افسانہ	جنوری ۶۲ء
٢۔	غزل	جنوری ۶۲ء

جامی، خورشید احمد

	غزل	اگست ۶۱ء

جسیم الدین

۱. جمیم الدین کا مکتوب بنام عالی — مکاتیب — جنوری ۶۲ء
۲. کراچی اور ملتان میں چند روز — سفرنامہ — جون ۶۲ء
(ترجمہ یونس احمر)

جعفر شیرازی
— غزل — مئی ۶۱ء

جعفر طاہر
۱. ہفت کشور — نظم — دسمبر ۶۱ء
(اقتباس۔ پاکستان، الجزائر)
۲. — غزل — جولائی ۶۲ء

جگر مرادآبادی
نعت سرور کونین — اکتوبر ۶۱ء

جلیل حشمی
۱. پھول سے دھول تک — نظم — دسمبر ۶۰ء
۲. ایک نازک کرن — نظم — جنوری ۶۱ء
۳. شہر حلال — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۴. پنجابی نظم — ترجمہ — مئی ۶۱ء
۵. الحمرا کی بیٹی — ترجمہ نظم — جون ۶۱ء
(از واشنگٹن ارونگ)
۶. کوئی موج کوئی جھونکا — نظم — جون ۶۲ء

جمال پانی پتی
— غزل — جون ۶۱ء

جمالی، طفیل احمد
— غزل — اگست ستمبر ۶۰ء

جمالی نجمہ
رات — نظم — مارچ ۶۱ء

جمیل ایوبی
۱. — غزل — اکتوبر ۶۱ء
۲. — " — مارچ ۶۱ء

جمیل جالبی
۱. ادیب اور محب الوطنی — مضمون — اگست ستمبر ۶۰ء
۲. الجزائر اور ہمارے دانشور — مضمون — جنوری ۶۲ء

جمیل ملک
۱. — غزل — اکتوبر ۶۱ء
۲. کہی ان کہی — نظم — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳. — غزل — مئی ۶۱ء
۴. — " — ستمبر ۶۱ء
۵. — " — جنوری ۶۲ء

جمیل نقوی
۱. سگ جنوں سپر کبھی .... — نظم — نومبر ۶۰ء
۲. نیا نظام ہے پیرِ نو — " — مارچ اپریل ۶۱ء
۳. نکتہ چیں ہے غم دل — " — " ۶۱ء

جمیلہ ہاشمی
سونے مندر — افسانہ — دسمبر ۶۰ء

جوش ملیح آبادی
۱. میرے اجزائے فکر — نظم — اگست ستمبر ۶۰ء
۲. کچھ اپنے بارے میں — سوانح — دسمبر ۶۱ء
۳. رباعیات — جولائی ۶۱ء

جون ایلیا
نیم کے پتے — نظم — مئی ۶۱ء

جوہر میر
— غزل — مئی ۶۲ء

حافظ لدھیانوی
— غزل — مارچ اپریل ۶۱ء

حجاب امتیاز علی
۱. بارش — افسانہ — اگست ستمبر ۶۰ء
۲. دعوت نامہ — ڈرامہ — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳. میرے ایوانوں کے کھنڈر — سوانح — اگست ۶۱ء
۴. جینے کا حق — افسانہ — جون ۶۲ء

حرمان خیرآبادی

	غزل	جولائی ۶۱ء
ن لدھیانوی		
	غزل	جنوری ۶۱ء
اعرابی		
پگلیاں بستی کی	نظم	اپریل ۶۱ء
ن کاظمی (علیگ)		
۱۔ شیریں کلا	ایرانی افسانہ ترجمہ	دسمبر ۶۰ء
(آنلاتے۔ میر محمد حجازی)		
۲۔ سبک ہندی	مضمون	اپریل ۶۱ء
ہوشیار پوری		
۱۔	غزل	اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔ جگر مرادآبادی	نظم	دسمبر ۶۰ء
۳۔	غزل	سالگرہ نمبر ۶۱ء
ید احمد خان، پروفیسر		
بابائے اردو اسلامیہ کالج لاہور میں	شخصیات	اگست ۶۲ء
ید کاشمیری		
خودکشی	افسانہ	اگست نمبر ۶۰ء
ید رجعفری، سید		
میں خاموش ہوں ترجمہ	افسانہ	اپریل ۶۱ء
(گلزار سنگھ سندھو)		
لد جلیل حمیدی		
شکست زنداں	نظم	نومبر ۶۰ء
الد، عبدالعزیز		
گل نغمہ ترجمہ گیتانجلی ٹیگور	نظم	نومبر ۶۰ء
۲۔ دکان شیشہ گر	منظوم ڈرامہ	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ پردۂ چنار	"	اپریل ۶۱ء
ادر جبکانی، رفیق		

۱۔	غزل	اگست ۶۱ء
۲۔	"	مارچ اپریل ۶۲ء
خاور نگرامی		
۱۔ قصیدہ بہاریہ (میر عبدالحسین ساقی)	ترجمہ	دسمبر ۶۰ء
۲۔	غزل	مئی ۶۲ء
خزاں، محبوب		
۱۔ قطعات		اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔ ایک حادثہ۔ زردی	نظم	نومبر ۶۰ء
۳۔ ابھی جینا ہے بہت	"	جنوری ۶۱ء
۴۔ دل سے باتیں	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۵۔ شاید	"	جولائی ۶۱ء
خلیل الرحمن، اعظمی		
۱۔ برہا	نظم	اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔	غزل	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔	"	جولائی ۶۱ء
خورشید الاسلام، ڈاکٹر		
سراپے	نظم	سالگرہ نمبر ۶۱ء
دانش، احسان		
۱۔	غزل	اپریل ۶۱ء
۲۔	"	جون ۶۱ء
دیوندر اسّر		
۱۔ میں دنیں ادھ ہاتھ	افسانہ	جولائی ۶۲ء
دیوندر ستیارتھی		
۱۔ سقراط	افسانہ	اگست ستمبر ۶۲ء
۲۔ راجکماری پارل	"	جولائی ۶۲ء
ذکی، احمد صدیقی		
آگ وہی ہے	نظم	جون ۶۱ء
ذوالفقار، غلام حسین		

غزلیات ادباء	مضمون	جولائی ۶۱ء
ملا مہر لعل		
دو گھروں کی کہانی	افسانہ	مئی ۶۱ء
رب نواز اورکزئی، ڈاکٹر		
۱۔ پشتو لوک گیت	مضمون	نومبر ۶۰ء
۲۔ ترجمانِ حریت خوشحال خٹک	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
رشید لاشاری		
۱۔ سچل سرمست کی دو کافیاں	ترجمہ نظم	اکتوبر ۶۰ء
۲۔ کافی (خواجہ فرید)	" "	جون ۶۱ء
رعنا ہمدانی		
	غزل	جولائی ۶۱ء
رضیہ فصیح احمد		
۱۔ رفتار بے ادبی	افسانہ	نومبر ۶۰ء
۲۔ وحشت کہ ناشیوہ ہے	"	جنوری ۶۱ء
۳۔ کل بھی میں اکیلا تھا	ڈراما	اپریل ۶۱ء
۴۔ نکہ کا کانٹا	افسانہ	نومبر ۶۱ء
۵۔ کانٹوں کا ہار	"	مئی ۶۲ء
رفعت، سید احمد		
۱۔ کھڑکی	ڈراما	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ کسوٹی	"	ستمبر ۶۱ء
۳۔ بدصورت	"	جون ۶۲ء
ریاض الحسن		
۱۔ معنی کی تلاش	نظم	اگست ۶۱ء
۲۔ جسیم الدین ملتان میں	مکاتیب پوٹھوہار	جنوری ۶۲ء
ریاض فرشوری		
رات اور پتھر	افسانہ	ستمبر ۶۱ء
رئیس امروہوی		
۱۔ تاثرات	نظم	جنوری ۶۱ء
۲۔	غزل	جولائی ۶۱ء
[illegible]		

اذیت بند کرو	مکتوب	جنوری ۶۱ء
زاہدہ رضوی		
۱۔	غزل	جنوری ۶۱ء
۲۔ کیپر زنگ	نظم	اکتوبر ۶۱ء
ساقی فاروقی		
۱۔ کوئی اسرار ہے	نظم	اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔ ماتم میں ہم شریک ہیں	"	جنوری ۶۰ء
۳۔ ایک سنسان دوپہر	"	مئی ۶۱ء
۴۔ زنگ اور آگ	"	اگست ۶۱ء
۵۔ چراغ کی تلاش	"	نومبر ۶۱ء
سبط حسن، سید		
قومی اور علاقائی تہذیبوں کا رشتہ	مقالہ	جون ۶۱ء
سجاد حارث، پروفیسر		
جدید اردو شاعری میں لطافت کی روایت	مضمون	مارچ اپریل ۶۱ء
سحر انصاری		
۱۔	غزل	دسمبر ۶۰ء
۲۔	"	مئی ۶۱ء
۳۔ افریقا	نظم	جون ۶۱ء
۴۔ زمین	"	جون ۶۳ء
سردار جعفری، علی		
۱۔ پیار سفر	نظم	مارچ ۶۱ء
۲۔	غزل	اگست ۶۱ء
سرور، آل احمد		
	غزل	اگست ستمبر ۶۰ء
سرور بارہ بنکوی		
	غزل	سالگرہ نمبر ۶۱ء
سروش، رفعت		
عیش غم	نظم	جنوری ۶۱ء
سعدی، احمد		

۱۔ غزل — دسمبر ٦١ء
۲۔ لال بیگھ — (ترجمہ بنگالی افسانہ) — مارچ اپریل ٦١ء

سیدہ سبدر
نوردین — افسانہ — جون ٦١ء

لاہر مچھلی شہری
۱۔ زیب النسا — ڈراما — سالگرہ نمبر ٦١ء
۲۔ عظمت آدم — نظم — جنوری ٦٢ء
۳۔ غزل — جولائی ٦٢ء

سلیم احمد
۱۔ غزل — نومبر ٦٠ء
۲۔ " — سالگرہ نمبر ٦١ء
۳۔ " — جنوری ٦٢ء

سلیم حضور احمد
غزل — اکتوبر ٦١ء

سیف حسن پوری
کس نے روکا ہے تجھے — نظم — نومبر ٦٠ء

سیماب اکبرآبادی، علامہ
صبح کا چاند — نظم — اکتوبر ٦٠ء

شاد عارفی
۱۔ غزل — مئی ٦١ء
۲۔ " — جون ٦٢ء

شاذ تمکنت
۱۔ شہزاد — نظم — اکتوبر ٦٠ء
۲۔ غزل — جولائی ٦١ء
۳۔ آتشکدہ — نظم — اکتوبر ٦١ء
۴۔ فسون نیاز — " — جولائی ٦٢ء

شاعر، حمایت علی
غزل — دسمبر ٦١ء

شاعر، قزلباش دہلوی، آغا
خلق کا محسن جفاکش مزدور — نظم — مئی ٦١ء

شاعر لکھنوی
۱۔ غزل — مارچ ٦١ء
۲۔ " — دسمبر ٦١ء
۳۔ " — مارچ اپریل ٦٢ء

شاعر ندیم
غزل — جنوری ٦١ء

شاہد احمد دہلوی
۱۔ پنگھٹ — افسانہ — اگست ستمبر ٦٠ء
۲۔ جگر صاحب — شخصیات — اکتوبر ٦١ء

شاہد عشق
غزل — مئی ٦١ء

شاہد مجید
۱۔ غزل — جولائی ٦١ء
۲۔ " — " ٦٢ء

شبی نقوی
دیپ جلتا رہا — بنگالی افسانہ ترجمہ — اگست ستمبر ٦١ء

شبیر نعمانی، پروفیسر
خوشحال خاں خٹک کے افکار — (نظم ترجمہ) — مارچ اپریل ٦١ء

شفقت کاظمی
۱۔ غزل — جولائی ٦١ء
۲۔ " — جون ٦٢ء

شفیق حسن زیدی
تتلی، گل اور میں — افسانہ — اگست ٦١ء

شکیب جلالی
غزل — جنوری ٦١ء

شکیب حیدر
غزل — ستمبر ٦١ء

شمیم جاوید

نظر خیال، عمل — نظم — دسمبر ۶۱ء

شمیم علیگ، منظور حسین

۱۔ آہ نارسا — نظم — اکتوبر ۶۱ء
۲۔ الجزائر کی سرزمین — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ خون شہیداں — " — جولائی ۶۱ء
۴۔ ..... دیوی کے نام — " — ستمبر ۶۱ء
۵۔ آہنگ سحر — " — نومبر ۶۱ء

شوق، رضی اختر

غم عافیت — نظم — اکتوبر ۶۱ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر

۱۔ ادبی تنقید اور لسانیات — مضمون — مئی ۶۲ء
۲۔ دل کی باتیں جوان کی یاد آئیں (بابائے اردو سے متعلق تاثرات) — اگست ۶۲ء

شوکت صدیقی

سمجھوتہ — افسانہ — نومبر ۶۱ء

شہاب جعفری

۱۔ تلاش — نظم — جون ۶۱ء
۲۔ زمانہ — " — جولائی ۶۲ء

شہرت بخاری

غزل — نومبر ۶۱ء

شہریار

۱۔ — غزل — دسمبر ۶۱ء
۲۔ قبرستان — نظم — سالگرہ نمبر ۶۱ء

شہ[illegible] گیلانی

غزل — مارچ ۶۱ء

شیدا، مشتاق

نارسائی — نظم — جنوری ۶۱ء

صالحہ اعظم

سوربھدا اور رائے دیاس — افسانہ — مارچ اپریل ۶۲ء
(سندھی سے ترجمہ)

صبا اکبرآبادی

غزل — جنوری ۶۱ء

صلاح الدین، غازی

میرا گھر کہاں ہے — افسانہ — اگست ستمبر ۶۲ء

صمدانی نقوی

جگر کی غزل گوئی — مضمون — مئی ۶۱ء

ضمیر الدین احمد

۱۔ ..... جاکر نظر کہاں — افسانہ — اگست ستمبر ۶۱ء
۲۔ جگر صاحب — شخصیت — اکتوبر ۶۱ء
۳۔ چور کے پاؤں — افسانہ — دسمبر ۶۱ء

ضمیر علی بدایونی

فن اور لاشعور — مضمون — جون ۶۱ء

ضو کلیمی، مہدی ظہیر

غزل — جون ۶۱ء

ضیاء الحسن موسوی

۱۔ استاد ناظم — افسانہ — مارچ اپریل ۶۲ء
۲۔ ایک حمام میں — " — جولائی ۶۲ء

ضیاء الدین احمد برنی

کاپی رائٹ — مضمون — سالگرہ نمبر ۶۱ء

ضیاء جالندھری

۱۔ ایک منظر — نظم — نومبر ۶۱ء
۲۔ — غزل — نومبر ۶۱ء

ظفر خاں، ڈاکٹر (عمل)

صادق ہدایت کے افسانے — مضمون — جون ۶۲ء

ظفر یوسف

۱۔ تخلیق — نظم — اکتوبر ۶۱ء
۲۔ منزل جاں — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء

ظہیر فتح پوری

پریم چند کی شخصیت — (شخصیت) — جولائی ۶۱ء

عنوان	صنف	شمارہ
۳. کوی غلام مصطفیٰ کا مکتوب	مکتوب	جنوری ۶۲ء
فارغ بخاری		
۱. ردِ عمل	نظم	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲.	غزل	مئی ۶۱ء
۳. پشتو زبان کی اولین نظم ترجمہ (امیر کروڑ)	نظم	جون ۶۱ء
۴. مسافر	نظم	اکتوبر ۶۱ء
۵. شکایت	"	جنوری ۶۲ء
۶. جنگل	"	جولائی ۶۲ء
فراز، احمد		
۱.	غزل	نومبر ۶۱ء
۲. پشتو ادب کا گزشتہ سال	مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء
۳. اظہار	نظم	جون ۶۲ء
۴.	غزل	جون ۶۲ء
فرمان فتح پوری		
علاقائی زبانیں اور اردو	مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء
فرہاد، انور		
۱. سہلادا	نظم	دسمبر ۶۱ء
۲. سورج مکھی	"	مارچ ۶۲ء
۳. مستقبل	"	"
فصیح الدین احمد		
شعری آہنگ	مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء
فضا ابن فیضی		
ایک پھول اور کھلا	نظم	جولائی ۶۱ء
فضلی، فضل احمد کریم		
یادِ جگر	نظم	اکتوبر ۶۱ء
فطرت، عبدالعزیز		
۱. حصارِ عظمت ہے الجزیرہ	نظم	جنوری ۶۲ء
۲. چاندنی	نظم	مارچ ۶۲ء

عنوان	صنف	شمارہ
۳.	غزل	مارچ اپریل ۶۲ء
فیض، فیض احمد		
۱. فیض کیا جائیے	نظم	نومبر ۶۱ء
۲. کہاں جاؤگے؟	"	اکتوبر ۶۱ء
فیضی، معید		
۱. گہوارۂ جنوں	نظم	جنوری ۶۱ء
۲.	غزل	مارچ ۶۱ء
قتیل شفائی		
۱. رقص میں ہے تیرے جسم کے زاویے	نظم	دسمبر ۶۱ء
۲. غزل	غزل	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳. ابابیلوں کی یہ پرواز کیا ہے	نظم	جون ۶۱ء
۴. محسوسات	"	نومبر ۶۱ء
قدر، اقتدار		
	غزل	مئی ۶۱ء
قدوسی، اعجاز الحق		
۱. شاہ عبداللطیف بھٹائی	مضمون	ستمبر اگست ۶۱ء
۲. سندھ میں اردو کا پہلا شاعر ـ ملا حکیم عطا	"	نومبر ۶۱ء
قرۃ العین حیدر		
۱. رات کی بات (ترجمہ)	آسٹریلوی افسانہ	اگست ستمبر ۶۱ء
۲. کیرکٹر کراسس (ترجمہ)	انڈونیزین کہانی	اکتوبر ۶۱ء
قمر عثمانی		
التجا (ترجمہ) نذرالاسلام	نظم	نومبر ۶۱ء
قمر ہاشمی		
۱. جزیرے	نظم	مئی ۶۱ء
۲. رات	"	جولائی ۶۱ء
۳. گردش	"	ستمبر ۶۱ء
۴. کوہ ندا	"	دسمبر ۶۱ء
قیصر منصور		
سات پلوں کی ملکہ	"	جنوری ۶۱ء

...ل
غزل — نومبر ۶۰ء
" — جون ۶۰ء

...رشید
غزل — جولائی ۶۱ء

...پندر
...کرشن چندر کے دو خط — مکتوب — اکتوبر ۶۰ء
۱۔ ایک تازہ دھاندلی — " — " "
۲۔ بیوی کترا — افسانہ — نومبر ۶۱ء

...دین احمد
امیر مینائی۔ ایک مطالعہ — مضمون — دسمبر ۶۱ء

سید عطا حسین
غزل — ستمبر ۶۱ء

...ی
اسٹاف آرٹسٹ — مضمون — مئی ۶۲ء

...لقادری
۱۔ — غزل — اکتوبر ۶۰ء
۲۔ صبح چمن — نظم — اپریل ۶۱ء
۳۔ دور مغلیہ میں مینا بازار — " — جنوری ۶۲ء

...حیدرآبادی، اقبال
غزل — مارچ اپریل ۶۲ء

...ین، اقبال
چور — افسانہ — اکتوبر ۶۱ء

...نبی حسین
۱۔ حالی کی عشقیہ شاعری کا سرچشمہ — مضمون — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ موضوعات شاعری — " — ستمبر ۶۱ء
۳۔ ساسانوں کی پریاں — " — نومبر ۶۱ء
۴۔ جوش صاحب — " — دسمبر ۶۱ء

...سلطانپوری

غزل — مارچ اپریل ۶۲ء

محب عارفی
" — جنوری ۶۱ء

محشر بدایونی
۱۔ — غزل — اگست ستمبر ۶۱ء
۲۔ — " — اپریل ۶۱ء
۳۔ — " — اگست ۶۱ء
۴۔ — " — نومبر ۶۱ء

محمد تقی، سید
غالب کی ادبی تخلیقات کا مابعد الطبیعاتی پس منظر — مضمون — جولائی ۶۱ء

محمود ایاز
۱۔ گمشدہ خواب — نظم — ستمبر ۶۱ء
۲۔ دو ناول اور آدم جی انعام — مضمون — دسمبر ۶۱ء

محمود علی خاں جامعی
جگ کی انفرادیت — شخصیت — اگست ۶۱ء

مخدوم محی الدین
سناٹا — نظم — اگست ۶۱ء

مدہوش، صادق
غزل — مارچ ۶۱ء

مسعود مفتی
اصحاب کہف — افسانہ — جولائی ۶۲ء

مشفق خواجہ
۱۔ — غزل — اپریل ۶۱ء
۲۔ علم اقتصاد، اقبال کا پہلا علمی کارنامہ — مقالہ — دسمبر ۶۱ء

مصطفیٰ زیدی
۱۔ دنیا — نظم — اگست ستمبر ۶۱ء
۲۔ ایک بے نام سپاہی کی قبر پر — " — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۳۔ آدمی — " — مئی ۶۱ء

عنوان	صنف	تاریخ
۴۔ ہیر پرسش	نظم	اگست ۶۱ء
۵۔ ندی	"	مئی ۶۲ء
۶۔	غزل	جولائی ۶۲ء
مظاہر حسین، قاضی		
بنگالی ادب	مضمون	مارچ اپریل ۶۲ء
مظہر ممتاز		
میراجی کے مشن	شخصیات	جنوری ۶۱ء
ممتاز حسین		
۱۔ قومیت کے معمار۔ ادیب	مضمون	نومبر ۶۰ء
۲۔ قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت	"	اگست ۶۰ء
منیر نیازی		
۱۔ وصال کی خواہش	نظم	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ ساحلی شہر میں رات	"	مئی ۶۱ء
۳۔ ساتھیوں کی تلاش	"	جون ۶۱ء
۴۔ شام خوف اور رنگ	"	جولائی ۶۱ء
مہدی، باقر		
جب کبھی	"	اگست ستمبر ۶۰ء
مہندر ناتھ		
ایشیائی ادیبوں کے لئے نئی راہ	مکتوب	نومبر ۶۰ء
نارنگ، گوپی ناتھ، ڈاکٹر		
اردو نثر نگاری کے جدید رجحانات	مضمون	جولائی ۶۱ء
ناز اکبرآبادی		
	غزل	مئی ۶۲ء
ناز کاظمی، سیدہ		
دل کی مرضی	افسانہ	مئی ۶۲ء
نالش حیدری		
	غزل	نومبر ۶۰ء
ناسک منشا		
گیت پشتو (ترجمہ)	نظم	مئی ۶۲ء

عنوان	صنف	تاریخ
ناصر، آغا		
۱۔ ٹوٹتے ہوئے رشتے	افسانہ	اکتوبر ۶۰ء
۲۔ ماچس اور چور	ڈرامہ	مارچ ۶۱ء
۳۔ کھوئی ہوئی راہ گذر	افسانہ	اکتوبر ۶۱ء
ناصر کاظمی		
۱۔	غزل	اپریل ۶۱ء
۲۔	"	جون ۶۱ء
۳۔	"	نومبر ۶۱ء
نثار عزیز		
۱۔ فکر اور بے فکری	افسانہ	اکتوبر ۶۰ء
۲۔ ادب میں مکرر تالیکاری	مضمون	جولائی ۶۲ء
نجم فضلی		
چند بت، چند شیشے	افسانہ	مارچ ۶۱ء
نجمی قمر		
	غزل	جون ۶۱ء
ندیم قاسمی، احمد		
۱۔ اے مشیت تری قوت کو سلام	نظم	اگست ستمبر ۶۰ء
۲۔	غزل	مئی ۶۱ء
۳۔	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
۴۔	"	جولائی ۶۱ء
نسرین، شمیم		
۱۔ چاند	نظم	اگست ۶۱ء
۲۔ قوس قزح	"	جون ۶۲ء
نسیم الظفر		
	غزل	نومبر ۶۱ء
نسیم حمید		
۱۔	غزل	اگست ۶۱ء
۲۔	"	اکتوبر ۶۱ء
۳۔ اب مرا درد و نہ تیرا جادو	نظم	نومبر ۶۱ء

عنوان	صنف	تاریخ
ور داحدی		
١-	غزل	نومبر ۶۰ء
٢-	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
یر احمد زبیری		
چیکوسلواکیہ میں اردو ادب اور اس کی تعلیم	مضمون	مئی ۶۱ء
یرالدین هاشمی		
دیوان عیاش لکھنوی	مضمون	نومبر ۶۱ء
والله خاں		
١- ڈاکٹر مولوی عبدالحق	شخصیات	ستمبر ۶۱ء
٢- حضرت مولانا ظفر علی خاں	"	دسمبر ۶۱ء
ن حیدر آبادی		
١-	غزل	نومبر ۶۰ء
٢-	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
٣-	"	اپریل ۶۱ء
۴-	"	اکتوبر ۶۱ء
ر، ظہور		
١- بت جھڑ	نظم	اگست ستمبر ۶۰ء
٢- کافی (خواجہ فرید)	ترجمہ	اپریل ۶۱ء
٣- وقت کے جنگل میں	نظم	اکتوبر ۶۱ء
۴- میرے ہمدم میرے محسن میرے دوست	نظم	جون ۶۱ء
۵-	غزل	دسمبر ۶۱ء
۶- ڈھارس		مارچ اپریل ۶۲ء
۷- کافی (خواجہ فرید)	ترجمہ	جون ۶۲ء
۸- رت جگا	نظم	جولائی ۶۲ء
یر حسن نقی		
اسپین کے لوک گیت (ترجمہ)	مضمون	سالگرہ نمبر ۶۲ء
کار صہبائی		
	گیت	اگست ستمبر ۶۰ء
نور نیجتوری		

عنوان	صنف	تاریخ
١-	غزل	اکتوبر ۶۰ء
٢	"	مارچ ۶۱ء
٣- نومبا	نظم	اپریل ۶۱ء
۴- چاندنی	"	دسمبر ۶۱ء
نوید انجم		
١- ایک دن سو سال	افسانہ	جنوری ۶۱ء
٢- سورج مکھی	"	مئی ۶۱ء
وامق جونپوری		
١-	غزل	نومبر ۶۰ء
٢-	"	دسمبر ۶۰ء
٣-	"	جنوری ۶۱ء
۴-	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
وقار رشدی		
میر عبدالحسین سانگی کی اردو شاعری	مضمون	جون ۶۱ء
وقار عظیم، سید		
١- اکبر الہ آبادی کی غزل	مضمون	مئی ۶۱ء
٢- ۱۹۶۱ء کا اردو ادب	جائزہ	مارچ اپریل ۶۲ء
٣- جدید ہم عصر	تنقید	اگست ۶۲ء
ہوش ترمذی		
	غزل	ستمبر ۶۱ء
یوسف بخاری، سید		
١- میر ناصر علی دہلوی	مضمون	نومبر ۶۰ء
٢- دنمارک کا ادب	"	اپریل ۶۱ء
یوسف جمال انصاری		
١- عورت اور شاعر	نظم	نومبر ۶۰ء
٢-	غزل	مئی ۶۱ء
یونس رحزی		
١- مسز شرف	افسانہ	اپریل ۶۱ء
٢- طوفان اور طوفان کے بعد	"	اگست ۶۱ء

متفرقات

افضل صدیقی

ادب کا نوبل انعام (ممتاز شیریں) — مضمون — جنوری ۶۱ء

یونی اے۔ کراؤن

۱۔ مکتوب بنام عالی — خط — اکتوبر ۶۱ء

"صلائے عام ہے ..."

پاکستان رائٹرز کنونشن

۱۔ ابتدائیہ (جمیل الدین عالی) — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ ۴ر دسمبر کا اعلان — //
۳۔ کنونشن کا دعوت نامہ — //
۴۔ اسمائے مندوبین — //
۵۔ کنونشن کی کارروائی — //
۶۔ افتتاحی تقریر مرزا احمد سعید دہلوی — //
۷۔ خطبۂ استقبالیہ (شاہد احمد دہلوی) — //
۸۔ خطبۂ صدارت (حسیم الدین) — //
۹۔ اسٹیئرنگ کمیٹی کا انتخاب — //
۱۰۔ ذیلی کمیٹیوں کا انتخاب — //
۱۱۔ ذیلی کمیٹیوں کی سفارشات — //
۱۲۔ گلڈ کی تاسیس — //
۱۳۔ قدرت اللہ شہاب کی تقریر — //
۱۴۔ مولوی عبدالحق کی تقریر — //
۱۵۔ مقالہ نگاروں کے نام اور موضوع — //
۱۶۔ صدر مملکت کا خطبہ — //
۱۷۔ اراکین عبوری مرکزی عاملہ — //
۱۸۔ مرکزی عاملہ کا پہلا اجلاس — //
۱۹۔ عبوری علاقائی مجلس عاملہ حلقہ کراچی — //
مشرقی پاکستان
مغربی پاکستان
۲۰۔ مرکزی عاملہ کا دوسرا اجلاس — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۱۔ مرکزی عاملہ کا تیسرا اجلاس — //
۲۲۔ فہرست نئے اراکین — //
۲۳۔ گلڈ کی پہلی سالگرہ (قدرت اللہ شہاب کی تقریر) — //

پاکستان رائٹرز گلڈ

۱۔ علاقائی انتخاب — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ سالانہ اجلاس عام — //
۳۔ سالانہ رپورٹ سے اقتباس — //
۴۔ تجاویز — //
۵۔ انتخاب مرکزی مجلس عاملہ — //
۶۔ ذیلی علاقے — //
۷۔ مجلس عاملہ کے چوتھے اجلاس کی رپورٹ — //
۸۔ چوتھی کمیٹی کا ایجنڈا — //
۹۔ دستور — //
۱۰۔ صدر مملکت کے ذاتی وظائف — //
۱۱۔ آدم جی ادبی انعام کے قواعد — //
۱۲۔ چند اہم ادبی انعامات — //
۱۳۔ مرکز کے گذشتہ اعلانات — //
۱۴۔ صدر ایوب نے ہم سے کہا تھا — //

سالگرہ نمبر کی بعض اہم تحریریں

۱۔ صدر محمد ایوب خاں کے پیغامات — سالگرہ نمبر ۶۱ء
۲۔ دسمبر کا اعلان — //
۳۔ پہلے کنونشن کی کارروائی — //
۴۔ مرکزی عاملہ کا پہلا اجلاس — //
۵۔ مرکزی عاملہ کا دوسرا اجلاس — //
۶۔ پہلا اجلاس عام — //
۷۔ مرکزی عاملہ کا تیسرا اجلاس — //

٨۔ مرکزی عاملہ کا چوتھا اجلاس		سالگرہ نمبر ۶۱ء
٩۔ مرکزی عاملہ کا پانچواں اجلاس		"
١٠۔ مجالس عاملہ		"
١١۔ اجلاس عام میں منظور شدہ تجاویز		"
١٢۔ فہرست ذیلی کمیٹی کی سفارشات		"
١٣۔ فہرست بنیادی اراکین		"
١٤۔ آدم جی ادبی انعام		"
١٥۔ یوم عسلاول		"

١۔ مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں	اعلان	نومبر ۶۰ء
٢۔ " " " "	"	جنوری ۶۱ء
٣۔ " " " "	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء
٤۔ " " " "	"	مارچ ۶۱ء
٥۔ " " " "	"	دسمبر ۶۱ء

[illegible]

١۔ آدم جی ادبی انعام		نومبر ۶۰ء
٢۔ آدم جی ادبی انعام کے نئے قواعد		دسمبر ۶۰ء
٣۔ انعام کا پس منظر		نومبر ۶۱ء
٤۔ وعدہ خلاف ناشرین کے لئے مرکز کا فیصلہ		اکتوبر ۶۰ء
٥۔ نوبل پرائز		جنوری ۶۱ء
٦۔ "نقش، نقوش" اور "جائزہ"	اعلان	نومبر ۶۱ء
٧۔ ۴ دسمبر کا اعلان	"	سالگرہ نمبر ۶۱ء

صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی تقاریر

١۔ تقریر		نومبر ۶۱ء
٢۔ یقین دہانی		" "
٣۔ مژدۂ دستور	(آئین)	مارچ اپریل ۶۲ء
٤۔ جوابی تقریر (شہاب صاحب کے جواب میں)		" " "

مولوی عبدالحق مرحوم سے متعلق تحریریں

١۔ یوم بابائے اردو	خبر	ستمبر ۶۱ء
٢۔ صدر مملکت کا تعزیتی پیغام		ستمبر ۶۱ء
٣۔ قدرت شہاب کا پیغام		" "
٤۔ انجمن ترقی اردو کی تعزیتی قرارداد		" "
٥۔ ایک عالی دماغ تھا نہ رہا	(وفات)	" "

بین الاقوامی معاملات

١۔ فرانسوا ساگاں پر قاتلانہ حملہ	پیغام	ستمبر ۶۱ء
٢۔ داگ ہیمرشولڈ کی موت	"	اکتوبر ۶۱ء
٣۔ ژاں پال سارتر کا معاملہ		مارچ اپریل ۶۲ء
٤۔ افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس		" " ۶۲ء
٥۔ وزیر اعظم برما۔ اُدنو		نومبر ۶۱ء
٦۔ اقوام متحدہ اور پاکستان		" "
٧۔ پاکستانی ادب کے ترجمے		" "

کاپی رائٹ ایکٹ

١۔ کاپی رائٹ ایکٹ	اعلان	دسمبر ۶۰ء
٢۔ کاپی رائٹ ایکٹ۔ ایک وضاحت	"	جولائی ۶۱ء
٣۔ کاپی رائٹ کمیٹی کی سفارشات	"	اکتوبر ۶۱ء
٤۔ کاپی رائٹ	"	جنوری ۶۱ء

حالات زندگی و شخصیات انعام یافتگان آدم جی ادبی انعام

١۔ میر عبدالصمد خاں		دسمبر ۶۱ء
٢۔ جمیلہ ہاشمی		" "
٣۔ عبدالرزاق		" "
٤۔ رشید کریم		" "

گلڈ کی اطلاعات

١۔ لاہور میں گلڈ ہاؤس		اکتوبر ۶۰ء
٢۔ منشور		" "
٣۔ ناشرین اور مصنفین کے معاہدے		اکتوبر ۶۰ء
٤۔ ناشرین کے لئے مرکز کا فیصلہ		" "
٥۔ ادیب متوجہ ہوں		سالگرہ نمبر ۶۱ء
٦۔ اپیل		ستمبر ۶۱ء

۷۔ پاکستانی ادب کے ترجمے کی دعوت — ستمبر ۶۱ء

۸۔ ۳۱ جنوری ۶۱ء کو شامل ہونے والے اراکین کی فہرست۔ — اکتوبر ۶۱ء

۹۔ اکابر ادبا کو خراج تحسین — نومبر ۶۱ء

۱۰۔ حرفے چند — جولائی ۶۲ء

۱۱۔ مصالحت کا آغاز — جنوری ۶۱ء

۱۲۔ ایک معروضہ — " "

۱۳۔ "لٹریری پاکستان" — اکتوبر ۶۱ء

۱۴۔ فیس داخلہ اور چندے — دسمبر ۶۱ء

۱۵۔ نئی رکنیت — جنوری ۶۲ء

۱۶۔ گلڈ ہاؤس ملتان — جنوری ۶۱ء

۱۷۔ لاہور میں اردو تدریس کانفرنس (زبان خلق) — "

۱۸۔ ایوان ثقافت — مارچ اپریل ۶۲ء

۱۹۔ گلڈ کے چھاپے خانے — "

۲۰۔ گلڈ کے نئے ممبروں کی فہرست — "

۲۱۔ قومی ایوان کتب پاکستان — مئی ۶۲ء

۲۲۔ گلڈ کے دستور میں ترمیمات — جون ۶۲ء

۲۳۔ مرکزی دفتر کا پیش کردہ دو سالہ پروگرام — جون ۶۲ء

کاتب کی غلطی کی وجہ سے بابائے اردو کے مضامین کی فہرست مناسب جگہ پر درج ہونے سے رہ گئی ہے اس لئے وہ یہاں دی جاتی ہے۔

۱۔ حالی کی تنقید نگاری — اکتوبر ۶۱ء

۲۔ اردو شاعری میں ایہام گوئی — جون ۶۲ء

۳۔ گلڈ کی تحریک (خطبہ رائٹرز کنونشن) — ستمبر ۶۱ء

۴۔ بابائے اردو کی لغت نگاری (بابائے اردو کی لغت اردو کے چند صفحات کا عکس) — اگست ۶۲ء

۵۔ بابائے اردو اور راجندر پرشاد کا مشترکہ بیان — "

۶۔ ۶۲ سال پہلے کی چند تحریریں (اس عنوان کے تحت بابائے اردو کے چار مضامین دیئے گئے ہیں جو یہ ہیں)۔ — "

الف۔ ادیب کی آمدنی

ب۔ سنہ ہجری

ج۔ اب مردوں کی ضرورت نہیں رہی

د۔ اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کو نیک صلاح

(یہ مضامین رسالہ "افسر" حیدرآباد دکن سے نقل کئے گئے)

۷۔ اردو زبان اردو ادب — "

۸۔ طالب علم عبدالحق کے دو مضامین (اس عنوان کے تحت حسب ذیل دو مضامین نقل کئے گئے ہیں) — "

الف۔ گندم (مطبوعہ معمور گزٹ شمارہ ۲۵ اپریل ۱۸۹۲ء)

ب۔ مذاق (مطبوعہ محمڈن نیشنل میگزین شمارہ یکم ستمبر ۱۸۹۳ء)

خبرنامہ

(ادارۂ مصنفین)

ملقوں کے انتخابات

پنجابی اور پشتو لسانی گروپ کے انتخابات

۱۲ اگست کو شام کے ۷ بجے گلڈ کے دفتر میں پنجابی اور پشتو کے لئے موصولہ بیلٹ کھولے گئے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم رکن صوبائی عاملہ اور میرزا ادیب رکن
ملہ نے پنجابی کی اور میر عبدالصمد خاں نے پشتو کی پرچیوں کا شمار کرنے کے بعد نتائج کا اعلان کیا۔

پنجابی لسانی گروپ

پنجابی کے ایک سو دس بیلٹ جاری کئے گئے تھے جن میں سے ایک سو ایک (۱۰۱) واپس آئے۔ سکریٹری کے عہدے کے لئے تین امیدوار تھے کثرت مانے سے
نویر مرزا صاحب سکریٹری منتخب ہوئے۔

پشتو لسانی گروپ

پشتو کے لئے (۳۹) بیلٹ جاری کئے گئے جو سب کے سب واپس ہوئے۔ اس گروپ کے سکریٹری عبدالرحمٰن شباب بلا مقابلہ منتخب ہوگئے لہٰذا بیلٹ
ملہ کے چار اراکین کے لئے بھیجے گئے تھے۔ میر عبدالصمد خاں نے رائے شماری کی جس کی نگرانی صوفی تبسم اور میرزا ادیب صاحبان کررہے تھے۔ ایوب صابر،
غال جوہر، سفید شاہ ہمدرد، اور محمد احسان ظہیر آفریدی صاحبان ان چار امیدواروں کی کامیابی کا اعلان کردیا گیا۔ انتخابات کے نتائج معلوم کرنے کے لئے
انی تعداد میں موجود تھے۔

مر اور خیرپور میرس (سب زیجن) کے انتخابات

۲۶ اگست کو سکھر اور خیرپور میرس کے سب ریجن کے انتخابات ہوئے، حسب ذیل عہدیدار، جناب ریاض احمد رکن صوبائی مجلس کی نگرانی میں منتخب ہوئے
ی آفاق صدیقی۔ خازن شیخ عبدالرزاق راز۔ اراکین عاملہ رشید بھٹی، عمران صدیقی اور مبارک حسین۔

ن اور لائل پور کی شاخوں کے انتخابات

ملتان اور لائل پور کی شاخوں کے انتخابات ریجنل سکریٹری اور میرزا ادیب صاحب رکن مرکزی عاملہ کی نگرانی میں ۲۸ اور ۲۹ اگست کو علی الترتیب ہوئے

ملتان کے لئے عرش صدیقی سکریٹری، مسعود اشعر خازن منتخب ہوئے۔ اور ڈاکٹر مہر عبدالحق، کشفی ملتانی، ارشد ملتانی، اراکین عاملہ ــــ لائل پور کا
کے چودھری منظور احمد منظور سیکریٹری اور یوسف تنویر جیلانی، قمر لدھیانوی، نسیم سید اور علی محمد الہی صاحبان اراکین منتخب ہوئے۔

سیالکوٹ ذیلی حلقہ کے انتخابات

سیالکوٹ سب ریجن کی عاملہ اور سیکریٹری کا انتخاب بیلٹ کے ذریعہ ۵ راگست کو ہوا۔ نگرانی محمود اختر کیانی صاحب ریجنل خازن نے کی۔ سکریٹری شپ کے لئے تین امیدواروں میں مقابلہ ہوا اور اصغر سودری صاحب کا کثرت رائے سے انتخاب ہوا۔ خازن کے لئے بھی تین امیدوار تھے جن میں رشید نیاز صاحب منتخب ہوئے۔ مجلس عاملہ کے لئے سرور انبالوی، منظور احمد کیفی، اور امین میرزا صاحبان اراکین منتخب ہوئے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ کی ادبی سرگرمیاں

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ اور انجمن ترقی اردو کوہاٹ کا ایک مشترکہ علمی و ادبی اجلاس ۱۴ راگست بوقت سوا نو بجے شب جناح لائبریری کوہاٹ میں زیر صدارت پروفیسر سید وصی رضا صاحب منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بتقریب عید میلادالنبی صلعم اور جشن استقلال پاکستان پر شعرائے کرام نے اپنی بلند پایہ نظمیں اور سلام پیش کئے۔ اور الحاج میاں غلام حیدر صاحب اختر مدیر ہمدم کوہاٹ اور پروفیسر سید وصی رضا نے عید میلاد النبیؐ اور جشن استقلال پاکستان پر تقاریر کیں اور ان دونوں تقریبات کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اس دن کو شایان شان طور پر منانے کی تلقین کی۔ آخر میں ایک غیر طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں فیضی القادری، انجم پراچہ، فدا محمد ندا حجازی، عطوف شفیق، عزیز اختر وارثی، حیران رام پوری، شجاعت علی راہی، اور سید دلبر شاہ دلبر نے حصہ لیا۔

ذیلی حلقہ سکھر کی تعمیری سرگرمیاں

ادارۂ مصنفین پاکستان ذیلی حلقہ سکھر کے زیر اہتمام بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد میں ۸ ستمبر کو خیرپور ڈویژن کے اہل قلم اور شائقین ادب پر مشتمل ایک ادبی اجتماع کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر سب ریجن کے اشاعتی منصوبے کے تحت شائع کی ہوئی دو کتابیں "بابائے اردو وادی مہران میں" اور "رہگزار" کے موتی حاضرین کو پیش کی گئیں۔ ساتھ ہی نئے اشاعتی منصوبے کا افتتاح کیا گیا۔ اجتماع کا آغاز ذیلی حلقہ کے سیکریٹری جناب آفاق صدیقی کی تقریر سے ہوا۔ اس تقریر کے بعد گلڈ کی مرکزی عاملہ کے رکن جناب حسن حمیدی نے اپنی تقریر میں بابائے اردو کی یگانۂ روزگار شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا۔ حسن صاحب کی تقریر کے بعد سکھر کے ڈپٹی کمشنر جناب جمشید رضا الرحیم نے سب ریجن کے اشاعتی منصوبے کا افتتاح کیا اور اپنی صدارتی تقریر میں ان تمام تعمیری سرگرمیوں کی افادیت کا اعتراف کیا جن کی وجہ سے سکھر سب ریجن کے عملی منصوبوں کو مقامی حکام اور معززین شہر کی حمایت بھی حاصل رہتی ہے۔ موصوف نے گلڈ ہاؤس کے قیام اور اشاعتی منصوبوں کے سلسلے میں ہر ممکن امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔ جمشید صاحب کی تقریر کے بعد اسلامیہ کالج بورڈ کے چیئرمین مرزا فضل حسین نے سب ریجن کے تعمیری منصوبوں کے لئے ذاتی طور پر سو روپے کے عطیہ کا اعلان کیا۔ اجتماع کے اختتام کے بعد حاضرین نے عصرانہ میں شرکت کی۔ یہ عصرانہ جمشید رضا الرحیم صاحب کے اعزاز میں الوداعی دعوت کے طور پر ترتیب دیا گیا تھا۔ عصرانہ سے پہلے سب ریجن کے عہدیداروں نے موصوف کی ان تمام ہمدردیوں کا شکریہ ادا کیا جو آپ نے اپنے دوران قیام میں سکھر کے اہل قلم کے ساتھ روا رکھیں۔

اطراف عالم

سانتاہار میں یوم بابائے اردو

جمعرات ۱۶ راگست ۱۹۶۲ء کو سانتاہار (مشرقی پاکستان)، مدرسہ شمس العلوم میں فرینڈس ایجوکیشن ایسوسی ایشن اور نوجوان اردو دوست اور فنکاروں کی اشتر

ے ایک فیڈرل مشاعرہ لسبیلہ یوم بابائے اردو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت ادیب سہیل نے کی۔

اس مشاعرے میں ادیب سہیل، احمد سعدی، عمران فرحت، معزالدین معز، سیکش بناسی، حضرت جلیل، قسیم عثمانی، صابر عظیم آبادی، عاطف جدسی، ، تمر الحق شیدا، منزل بریلوی، ابن الحسن قمر، خلش عظیم آبادی، مضطر فاذی پوری، شہاب ثاقب، رہبر سہسرامی، مسافر صابری اور دیگر شعراء رکت کی۔ مشاعرہ کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوا۔ حافظ ابوالکلام نے قرآن کی ایک صورت کی تلاوت کی۔ اس کے بعد بابائے اردو جیسی شخصیت پر صابر عظیم آبادی ابی نے کیے بعد دیگرے مضامین پڑھے۔ دیگر شعرا حضرات نے بھی بابائے اردو سے متعلق قطعات، نظمیں اور غزلیں پڑھ کر ان کو خراج عقیدت یا۔

ترقی اردو مشرقی پاکستان کے انتخابات

ڈھاکہ (نامہ نگار) مجلس انتخاب نے مندرجہ ذیل اصحاب کو انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے عہدیداران و اراکین مجلس عاملہ کی حیثیت سے ۱۹۶۳ء کے ب قرار دیا ہے (۱) جناب جسٹس سید محبوب مرشد صدر (۲) جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر (۳) سید اقبال عظیم نائب صدر (۴) حبیب النصاری احمد اعزازی (۵) محترمہ آب معتمد (۶) جناب انور فرہاد نائب معتمد (۷) جناب سیم مشتاق احمد تبریزی اعزازی خازن (۸) جناب سلیم اللہ فہمی رکن (۹) سرور بارہ بنکوی رکن (۱۰) سید وحید قیصر ن (۱۱) سید غلام محمد بدالدین رکن (۱۲) خواجہ محمد عادل رکن (۱۳) افسر ماہ پوری رکن (۱۴) عابد دانا پوری رکن (۱۵) مودود احمد فاروقی رکن (۱۶) کلیم سہسرامی رکن خاں ملیح آبادی رکن (۱۸) سلامت علی خاں رکن (۱۹) صلاح الدین محمد رکن (۲۰) ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی رکن (۲۱) نظیر صدیقی رکن۔

ب اور شاعر کو اپنے عوام کے لئے لکھنا چاہیئے (جسیم الدین)

لندن۔ مشرقی پاکستان کے لوک گیت کہنے والے شاعر جسیم الدین آج کل اسکاٹ لینڈ میں شاعروں ادیبوں سے ملاقات میں مصروف ہیں وہ گذشتہ ہفتے بین ادبی اجلاس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے یہ اجلاس ایڈنبرا کے بین الاقوامی میلے کے دنوں میں منعقد ہوا ہے جسیم الدین نے اسکاٹ لینڈ پر ایک مذاکرہ میں گفتگو کرتے ہوئے ادب اور دیہی آبادی کے رشتے پر روشنی ڈالی انہوں نے کہا کہ اسکاٹ لینڈ کے مقامی باشندے اپنی زبان میں جب اظہار جذبات ب تو اس میں ترقی یافتہ انگریزی زبان کے مقابلے میں زیادہ نغمگی ہوتی ہے اور دائرہ اظہار بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے اس اظہار جذبات سے تغافل برتنا غیر دانشمندی کی لی۔ کسی ادیب یا شاعر کو یہ تاکید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کون سی زبان کو اپنے احساسات کے اظہار کے لئے منتخب کرے خود میں نے اپنے ملک کی دیہاتی زبان کو اپنی تحریر کیلئے منتخب کیا ہے اور میری یہ تحریریں خصوصاً لوک گیت دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ ادیب اور شاعر کو اپنے عوام کے لئے لکھنا چاہیئے۔ اس بیرون کا صرف وہ حصہ باقی دنیا میں پھیل سکے گا جو خود اس کے اپنے عوام کی پیاس بجھانے کے بعد ملک کے ساغر سے چھلک پڑے گا۔

جسیم الدین لندن روانہ ہونے سے پہلے کچھ عرصہ اسکاٹ لینڈ میں قیام کریں گے۔ لندن میں وہ اپنی چند ایک طویل نظموں کو انگریزی میں شائع کرانے کے لئے بات کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی طویل نظم "فیلڈ آف ایمبرائیڈرڈ کلاتھ" کی طباعت آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے بہت خوبصورت طریقے سے کی تھی۔ جسیم الدین نے اقوامی ادبی اجلاس کے اغراض و مقاصد پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ اس کی وجہ سے مجھے یورپ اور امریکہ کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا موقع ملا میں اس بڑی قدر اور میری میکارتھی۔ اسکاٹ شاعر میکڈائرڈ اور بعض نوجوان ڈرامہ نگاروں کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

دو زبان کے لئے سیاہ ترین دن

ئی دہلی ۲۰ اگست۔ مشرقی پنجاب میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء اردو زبان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہوگا۔ کیونکہ اس دن سے دفاتر اور سرکاری اداروں میں اردو کا استعما

مکمل طور پر ختم ہو جائے گا۔ حکومت مشرقی پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دن سے سرکاری اور عدالتی زبان اردو اور ہندی کے بجائے ہندی اور پنجابی ہو گی۔ حکومت نے ایک گشتی مراسلے کے ذریعہ تمام سرکاری ملازمین کو ہدایت کی ہے کہ وہ مقررہ تاریخ تک ہندی اور پنجابی پر دسترس حاصل کر لیں ورنہ بصورت دیگر ان کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔

فیض ماسکو میں

روسی خبر رساں ایجنسی تاس کی اطلاع کے مطابق فیض احمد فیض کو ماسکو میں ۲۷ اگست ۱۹۶۲ء کو لینن انعام دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے کریملن میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں روسی زعماء کے علاوہ سفیر پاکستان مسٹر ارشد حسین نے بھی شرکت کی۔ ارشد صاحب نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فیض احمد فیض کو پاکستان کا قابل فخر فرزند قرار دیا۔

کرنل ملک اردو ترقیاتی بورڈ کے ڈائرکٹر مقرر کر دیئے گئے

لاہور، ستمبر حکومت پاکستان کے سابق پرنسپل انفارمیشن افسر کرنل مجید ملک کو اردو ترقیاتی بورڈ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بورڈ مرکزی حکومت نے تعلیمی کمیشن کی سفارش پر قائم کیا ہے کرنل ملک مذکورہ عہدے سے سبکدوشی کے بعد کولمبو پلان میں ڈائرکٹر تعلقات عامہ تھے وہ اکتوبر سے اپنا نیا عہدہ سنبھالیں گے۔ کرنل ملک کراچی پہونچ چکے ہیں اور یکم اکتوبر کو لاہور پہنچیں گے یہ بورڈ گذشتہ جولائی میں قائم کیا گیا تھا اس کے صدر مسٹر جسٹس ایس اے رحمان اور اراکین حمید احمد خاں (لاہور)، مولانا عبدالغفار (پشاور) اور پیر حسام الدین راشدی (حیدر آباد) ہیں موخر الذکر صاحب اس بورڈ کے کل وقتی ملازم ہوں گے بورڈ کے ارکان کی تعداد ایک درجن ہے۔ عبوری طور پر پروفیسر حمید احمد خاں کو ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ کرنل ملک کی آمد کے بعد اکتوبر میں بورڈ کا اجلاس ہوگا جس میں پروگرام مرتب کیا جائے گا۔

پیسترنیک کے نغماتی کلام کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جائیگا

ڈھاکہ، ستمبر۔ ڈھاکہ کی بنگالی اکیڈمی روس کے مشہور شاعر بورس پیسترنیک آنجہانی کے نغماتی کلام کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر رہی ہے پیسترنیک کو ڈاکٹر ژواگو لکھنے پر ادب کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ اکیڈمی کے ڈائرکٹر مسٹر علی احسن نے بتایا کہ اکیڈمی اردو، عربی، فارسی، انگریزی، یونانی اور روسی زبان کی مشہور کتابوں کا ترجمہ کرا چکی ہے ان ترجموں میں غالب کا کلام، البیرونی کی تاریخ ہند، غزالیؒ کی تصانیف، ابن خلدون کا مقدمہ اور عربی کے افسانے شامل ہیں جن کا اس وقت ترجمہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ بنگالی اکیڈمی ساتویں صدی کے بنگالی کے مسلمان شاعر الاول کے متعلق بھی ریسرچ کر رہی ہے اور اس کے مشہور شاہکار "پدماوتی" کا مسودہ مرتب کر لیا ہے۔

شاعر مشرق کے نجی استعمال کی اشیا اقبال میوزیم کو دینے کی اپیل

لاہور۔ محکمہ آثار قدیمہ اقبال میوزیم کے لیے حکیم الامت کی نجی استعمال کی اشیا تلاش کر رہا ہے محکمہ نے اس سلسلے میں عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس معاملہ میں تعاون کریں۔ بتائیں اقبال میوزیم میکلوڈ روڈ پر واقع ہے جہاں علامہ اقبال ۱۳ برس (۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء) تک مقیم رہے اس عمارت کو اس کی اصلی شکل میں برقرار رکھا گیا ہے جس پر ۸۶ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں محکمہ آثار قدیمہ کے ایک ترجمان نے بتایا کہ عجائب گھر کو علامہ اقبال کی زندگی کا نمونہ بنانے کے لئے فرنیچر کے علاوہ ان کے لباس، قالین، بستر اور دوسری اشیاء کی ضرورت ہے محکمہ نے ایک فہرست تیار کر رہا ہے اور قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ حکیم الامت حضرت اقبال کی نجی اشیا فراہم کرنے میں مدد کرے۔ میوزیم کے ساتھ لائبریری بھی قائم کی جائے گی جس میں علامہ کے مخطوطات، ان کی اصل تصانیف اور اس قسم کی دوسری کتب رکھی جائیں گی جن کی بنا پر علامہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کو مدد مل سکے گی۔

آدمجی

پارچہ جات

آخری انتخاب

بابائے اردو کی چند لافانی کتابیں

اردو صرف نحو

اردو صرف نحو یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جو سائنٹیفک بنیادوں پر لکھی گئی۔ بابائے اردو مرحوم سے پہلے اس موضوع پر جن مصنفین نے قلم اٹھایا انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کی قواعد کو مشعل راہ بنایا اور اردو زبان کے مزاج و منہاج کو نظر انداز کر دیا۔ بابائے اردو نے عربی فارسی قواعد کو مشعل راہ صرف حد تک پیش نظر رکھا ہے جہاں تک اس کی ضرورت تھی۔ انہوں اردو کی خصوصیات کو پوری طرح سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی اور پہلی بار اس حقیقت کا احساس دلایا کہ اردو قواعد عربی و فارسی کا چربہ نہیں ہے بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو صرف اسی سے مخصوص ہیں، قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

انتخاب داغ

"داغ اک آدمی ہے گرما گرم" داغ کی اپنے متعلق یہ رائے سو فیصدی درست ہے، اس پر اتنا اضافہ ضرور ہونا چاہیئے کہ وہ آدمی ہی نہیں شاعر بھی "گرما گرم" قسم کا تھا۔ داغ نے زندگی کے رومانی پہلو کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں نمایاں کیا ہے اس سے خود غزل کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ داغ حسن کا شاعر تھا، اس نے زندگی بھر حسن کی پرستش کی اور وہ بھی اس انداز سے کہ "مٹی" اور "سونے" کو برابر۔ بابائے اردو نے داغ کے کلام کا یہ انتخاب اپنی زندگی کے اس حصے میں کیا تھا جب انسان دنیا پر ایک تماشائی کی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے۔ لیکن اس بابائے اردو تماشائی نہیں بلکہ خود تماشا نظر آتے ہیں، اس وجہ سے یہ داغ ہی کے کلام کا بہترین انتخاب نہیں بلکہ بابائے اردو کے ادبی ذوق کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

چند ہم عصر

"انسان کا بہترین مطالعہ خود انسان ہے" ۔ یہ کتاب اسی اجمال کی تفصیل ہے جس میں بابائے اردو نے اپنے ہم عصروں کی شخصیت کے نقوش گئے ہیں، یہ خاکے اردو کے سوانحی ادب کی آبرو ہیں۔ قیمت چھ روپے۔

افکار عبدالحق : ۔ مرتبہ : ۔ آمنہ صدیقی (ایم اے بی ایڈ)

جس میں بابائے اردو کی وہ تمام تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جن میں ادب اور زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بابائے اردو کے نظریات اور ذہنی رجحانات پوری وضاحت اور تفصیل سے سامنے آتے ہیں ۔ مرتبہ نے کتاب کے شروع میں طویل اور فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں بابائے اردو کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب بڑے اہتمام سے ٹائپ میں اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر شائع کی گئی ہے ۔ قیمت دس روپے۔

اردو اکیڈمی سندھ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

ایک روپیہ
ONE
RUPEE

جلد ۳ نمبر ۲-۳

اکتوبر - نومبر ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہے)

ادارۂ مصنفین پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی حب وطن کی قدروں کی نشوونما بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت واقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم وسائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

رائٹرز گلڈ کی مطبوعات

تیسری منزل
(ہاجرہ مسرور)

اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع کرداروں کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے، ہاجرہ مسرور کا مشاہدہ بہت وسیع ہے وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہیں جس کا اندازہ مجموعے کے ہر افسانے سے ہوتا ہے صفحات ۲۷۰ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

سورج بھی تماشائی
(انور)

"آگ کی آغوش میں" اور "منزل کی طرف" کے بعد "سورج بھی تماشائی" انور کا تازہ ترین مجموعہ ہے جس میں تقریباً سب افسانے شامل ہیں جو انور نے گزشتہ پانچ چھ برسوں میں لکھے ہیں۔ صفحات ۲۴۲ قیمت ۵ روپے ۵۰۔

فصیلِ شب
(مرزا ادیب)

مرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "فصیلِ شب" تیسرا مجموعہ ہے جس میں نو ڈرامے شامل ہیں اس مجموعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا ادیب کا فن روز بروز نہایت عمدگی اور خوبی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے صفحات ۲۰۸ قیمت ۴ روپے

اردو میں سوانح نگاری
(ڈاکٹر سید شاہ علی)

ڈاکٹر صاحب علمی و ادبی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ رسالہ "نگار" اور "اردو" میں جو لوگ ان کے مضامین پڑھتے ہیں وہ لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا حق ادا کرتے ہیں زیر نظر کتاب دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ صفحات ۴۶۵ قیمت ۷ روپے

لال چادر
(سید ولی اللہ، مترجم یونس احمر)

عوام کی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں کو باطل اوہام اور عقائد کا مرکز بنا دینا کوئی بات نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے کردار جا بجا نظر آتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو مزار پرستی کا خوگر بنا دیتے ہیں۔ اور مذہب کی صحیح تعلیم سے انہیں بیگانہ رکھتے ہیں "لال چادر" ایک ایسے ہی مزار کی چادر ہے صفحات ۱۷۴ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

صدا بصحرا
(یوسف ظفر)

جدید شاعروں میں یوسف ظفر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے ان کی شاعری ان تمام صحت مند تجربوں اور رجحانات کی نمائندگی بھی کرتی ہے، جن سے ماضی قریب میں ہمارے ادب کو دوچار ہونا پڑا وہ بنیادی طور پر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ہاں ماضی کی ادبی روایات کے احترام اور رجحانات کو نو آمدید کہنے کا شعور پایا جاتا ہے۔ صدا بصحرا تقریباً ۸۰ نظموں کا مجموعہ ہے۔ صفحات ۱۹۹ قیمت ۴ روپے

گلڈ اشاعت گھر، اسٹریچن روڈ۔ کراچی

"ہم قلم" اور "قلم کار"

بہت جلد ہمارا دفتر لاہور بڑے پیمانے پر لاہور سے سہ ماہی "قلمکار" کا اجراء کر رہا ہے جو صرف ادب پر مشتمل ہوگا۔ "قلم کار" کا آغاز مشرقی پاکستان کے اُردو ادیبوں کی محنت کا نتیجہ تھا، اس کا پہلا شمارہ گلڈ نے ڈھاکے سے شائع کیا تھا، جو آج بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈھاکہ میں اُردو کتابت و طباعت کی دشواریوں کی وجہ سے اس پرچہ کا دوسرا شمارہ نکلنے کی نوبت نہ آئی۔ لہٰذا اب مرکز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "قلم کار" لاہور منتقل کر دیا جائے۔ یہ رسالہ فی الحال سہ ماہی ہوگا۔ اس کے مرتب اُردو کے مشہور ادیب اور ایک پرانے مدیر جناب میرزا ادیب مقرر ہوئے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ جریدہ گلڈ کے شایانِ شان ثابت ہوگا۔

"قلم کار" کی اشاعت سے "ہم قلم" کے نقشے میں تھوڑی بہت تبدیلیاں عمل میں آئیں گی، اس جریدے کا بنیادی مقصد اور کردار پاکستانی ادیبوں اور ادب کی بہبودی ہے اور رہے گا۔ "ہم قلم" کے ذریعے ہم نے اب تک کئی معرکے لڑے اور سر کئے ہیں۔ کئی اور معرکے باقی ہیں۔ اب چونکہ ہمیں مہلت مل جائیگی کہ اچھا ادبی مواد "قلم کار" کے لئے جمع کر سکیں اس لئے "ہم قلم" کے بیشتر صفحات ہمارے پروگراموں اور منصوبوں کی تکمیل، ادبی روابط اور دیگر اہم مسائل پر گفتگو کے کام آئیں گے، اس کے معنی یہ نہیں کہ "ہم قلم" ادبی چاشنی سے محروم رہے گا بلکہ یہ کہ اس کے اور "قلم کار" کے تعاون سے ہم گلڈ کی معرفت زیادہ سے زیادہ تخلیقی ادب پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ہاں طویل تخلیقات نظم و نثر ادارہ "ہم قلم" کی بجائے ادارہ "قلم کار" کو بھیجی جائیں تو بہتر رہے گا۔ اس سلسلے میں معاونین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات ہماری درخواست پر ہی ارسال کریں۔ امید ہے کہ وہ صورت حال کو سمجھتے ہوئے تعاون فرمائیں گے۔

تحقیقی مسائل

گزشتہ مہینے "ہم قلم" میں علمی مباحث کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اس سے ہمارے پڑھنے والوں نے خاصی دلچسپی لی ہے، اس سلسلے کی بعض چیزیں "تحقیقی مسائل" کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہیں۔ اس باب میں ایسی چیزیں شائع کی جائیں گی جن کا تعلق کسی ادبی شخصیت یا تحقیقی مسئلے سے ہو۔ یہ سلسلہ ابھی آزمائشی ہے اور اس کا مقصد ان دور دراز کے پڑھنے اور کام کرنے والوں کا رابطہ ان حضرات سے قائم کرنا ہے جو مسائل متعلقہ سے واقفیت رکھتے ہوں۔ یہ واضح رہے کہ یہ باب نزاعی ادبی موضوعات یا شخصیات کے لئے نہیں ہے، ہماری پالیسی اور حالات اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ "ہم قلم" کے صفحات اس قسم کے مباحث کے لئے وقف کر دیئے جائیں۔

ادبی کنونشن

گزشتہ دورہ میں شمالی مغربی پاکستان نے ادبی سرگرمیوں میں خاصہ حصہ لیا ہے، پہلے نواب شاہ میں یوم بابائے اُردو منایا گیا جس میں اہم

ادبی مسائل پر مذاکرات ہوتے اس کے بعد اکتوبر میں میرپور خاص کے کارکنوں نے ایک ادبی کنونشن منعقد کیا۔ ان ادبی تقریبات کی کاروائیاں اسی شمارے میں کسی دوسری جگہ شائع کی جارہی ہیں، ایک کنونشن نوابشاہ اور خیرپور میں بھی منعقد ہونے والا ہے۔ بڑے شہروں میں رہنے والے عام طور پر چھوٹے شہروں اور دور دراز علاقوں کے ادبی حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہو پاتے۔ روزنامے سیاسی خبروں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں اور ثقافتی خبروں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ادبی رسائل بھی زیادہ تر بڑے شہروں سے جاری ہوتے ہیں اور وہیں کے ادبی حلقوں سے اشاعتی مواد حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے شہروں کے ادبی معاملات سے بڑے شہروں کے لکھنے اور پڑھنے والے ناواقف رہتے ہیں۔ کئی چھوٹے علاقوں میں گلڈ کی شاخیں بہت فعال اور سرگرم ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بے شمار محدودات کے باوجود اعلیٰ پیمانے پر کنونشن منعقد کئے اور کر رہے ہیں۔ ہم قلم میں ان ادبی تقاریب کی تفصیلات باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں گی، اس رسالے کے صفحات مختلف علاقوں اور افراد کے مابین رابطہ قائم کرنے کے لئے ہمیشہ سے حاضر ہیں

کیا دوانوں نے موت پائی ہے

گزشتہ دو ماہ میں اردو دنیا کو تین ادیبوں کی دائمی مفارقت کا صدمہ سہنا پڑا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ایک وسیع النظر نقاد، محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہمارے ادب میں بلند مقام رکھتے تھے انہوں نے اردو زبان کی خدمت جس وسیع پیمانے پر کی اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اگر کسی ایسے شخص کا نام لیا جائے کہ جس نے عملی اور علمی دونوں محاذوں پر اردو زبان کے لئے معرکہ آرائی کی ہے تو بلاشبہ ڈاکٹر زورؔ ہی کا نام زبان پر آئے گا۔ انہوں نے اپنی متعدد تصانیف اور ادارہ ادبیات اردو (دکن) کی صورت میں اردو دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس لئے اردو زبان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زورؔ کا نام بھی زندہ رہے گا۔

حضرت نوحؔ ناروی اردو کے بزرگ شعراء میں سے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں استاد فن تھے اور انہوں نے قدیم شاعری کی جملہ روایات کو زندہ رکھا، حضرت نوحؔ کی ذات گزشتہ دور کی ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتی تھی۔ افسوس کہ یہ یادگار بھی موت کے ظالم ہاتھوں نے مٹادی۔

جواں مرگ شاعر قابلؔ اجمیری وادیٔ مہران کے خوش فکر غزل گو تھے، انہوں نے کم عمری ہی میں اپنی شاعرانہ حیثیت منوالی تھی۔ افسوس کہ موت نے ایک ہونہار شاعر ہم سے چھین لیا۔

قدرت اللہ شہاب

ہم اور بابائے اردو

(یہ پیغام یوم بابائے اردو میں پڑھا گیا جو ادارۂ مصنفین پاکستان ذیلی حلقہ نواب شاہ کی طرف سے ۱۸؍ستمبر کو منایا گیا)

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نواب شاہ کے ادب دوست بابائے اردو کی یاد میں ایک جلسہ کر رہے ہیں۔ بابائے اردو کو ہمارے درمیان سے اٹھے ابھی ایک سال ہوا ہے لیکن ہماری احسان ناشناسی کا عالم یہ ہے کہ کراچی میں ان کا یوم اگر منایا بھی تو اسکول کے بچوں نے مولوی عبدالحق ہر معنی میں بڑے آدمی تھے۔ وہ آسان اور بول چال کی اردو کو رواج دینے کے قائل تھے۔ وہ اسے پنساری کا انگور نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی نظر اردو کے ماضی اور حال پر بھی تھی اور مستقبل پر بھی۔ وہ پاکستان بھی فقط اردو کے لئے آئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب دلّی اور لکھنؤ میں اردو کا خط پڑھنے والا مشکل سے ملے گا، کوہاٹ اور کوئٹہ، ملتان اور نواب شاہ اردو کی ٹکسال ہوں گے۔ پاکستان میں جو جو لوگ اردو کو باہر کا پودا کہتے ہیں وہ یا تو متعصب ہیں یا بے علم یا دونوں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اردو کا مولد ہی کنار رود سندھ ہے یہی دیبل اور منصورہ۔ یہی نواب شاہ اور ڈوگری۔

مولوی عبدالحق ادب میں برہمنیت کے خلاف تھے۔ محمد شاہ نے جب نادر شاہ کا نسب پوچھا تھا تو اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ نادر شاہ ابن شمشیر، ابن شمشیر۔ ہمارے ہاں جو ادب کے بچے کچھے صاحب عالم ہیں ان کو بھی قلم اور محض قلم کی سیادت کا اعتراف کرتے ہی بنے گی۔ بابائے اردو کی ایک بڑائی ان کی خاکساری اور فروتنی تھی اور کسی معاملے میں نہیں ادب اور اردو کے معاملے میں وہ نئے لکھنے والوں کی تحریر میں کیڑے نہیں نکالتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں جب پاکستان کے ادیبوں کا اجتماع ہوا تو انھوں نے عہدے اور صدارت کی شرط عائد کئے بغیر اس میں شرکت کی اور معمولی اراکین کے رجسٹر پر دستخط کئے۔

اردو، اب گملے کا پودا نہیں ایک تناور درخت ہے۔ یہ کسی کی متروکہ جائداد نہیں، ہم لکھنے والوں کی میراث ہے۔ ہم بابائے اردو سے اتنی بات بھی نہ سیکھ سکے تو ہم پر حیف ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

یہ جو اردو زبان ہماری ہے

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اس میں ہزاروں سال سے قسم قسم کی زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں رائج رہی ہیں۔ اس کے مختلف حصے اپنی آب و ہوا، رسم و رواج اور لباس و طرزِ معاشرت کی رنگارنگی کے باعث ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد حالات و کیفیات کے آئینہ دار رہے ہیں لیکن ان تمام رنگینیوں کے باوجود ایک خاص مشرقی شان اور تمدنی آن اس پورے برصغیر میں شروع ہی سے جلوہ گر رہی ہے اور اس تمام ملک میں طرزِ خیال کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے پہلے سنسکرت زبان اس کے بعد پالی اور سب سے آخر میں اردو نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

اردو زبان دراصل سنسکرت اور پالی کی جانشین ہے جس طرح سنسکرت اور پالی کا ایک خاص کلچر تھا ایک خاص رنگ تھا جو کشمیر سے کماری تک اور سندھ و گجرات سے آسام تک پھیل گیا تھا اور پورے ہندوستان کے رہنے والوں کو خواہ وہ نسل کے لحاظ سے دراوڑی ہوں یا آریائی، منڈ ہوں یا منگول اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اسی طرح اردو نے بھی تمام ہندوستان کو متاثر کیا اور اس وسیع سرزمین کے گوشے گوشے میں پہنچ کر وہاں کی زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور خود بھی ان کا اثر قبول کیا۔ جس طرح سنسکرت اور پالی نے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کو اپنے اثر و اقتدار کے زمانے میں ختم نہیں کیا اسی طرح اردو نے بھی "جیو اور جینے دو" کا عملی ثبوت پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے اردو زبان و ادب کے جو مرکز رہے اور جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعر و ادیب اور سرپرست بادشاہ اور مربی امیر پیدا ہوئے وہاں کی مقامی زبانیں بھی برابر سرسبز و شاداب رہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئیں۔

گجرات میں مظفر شاہیوں کے دور میں اردو کے بڑے بڑے شاعر شاہ علی جیو گام دھنی اور میاں خوب محمد چشتی جیسے پیدا ہوئے اور اردو کی بیسیوں مثنویاں اور کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن گجراتی زبان برابر قائم رہی اور وہاں کی اردو گجراتی کے لفظوں اور محاوروں سے شاداب ہوتی رہی۔ بیجاپور میں جو کنڑ زبان کا مرکز تھا اردو کے ایسے شاعر اور فنکار پیدا ہوئے جن پر اردو آج بھی ناز کرتی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نورس، نصرتی، علی عادل شاہ ثانی شاہی، ہاشمی اور رستمی کے اردو کارناموں میں کنڑ زبان اور کرناٹکی قوم کے الفاظ و خیالات بھی موجود ہیں اور وہاں خود کنڑی زبان بھی پھلتی پھولتی رہی۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں جو آندھرا قوم اور تلگو زبان کے وسط میں واقع ہے، گذشتہ پانچ سو سال سے اردو کا راج رہا اور یہیں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی اور بیسیوں شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جن کے شاہکاروں میں تلگو الفاظ بھی موجود ہیں مگر تلگو بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہی اور اس طویل دور میں اردو دوست بادشاہوں اور امیروں نے تلگو کی بھی فیاضانہ سرپرستی کی۔ احمد نگر اور اورنگ آباد (علاقہ مہاراشٹر) کے دل تھے۔ اور یہاں صدیوں اردو کا طوطی بولتا رہا اور ولی و سراج جیسے عظیم الشان

یہ مضمون مرحوم ڈاکٹر زور نے وفات سے چند روز قبل "ہم قلم" کے لئے ارسال فرمایا تھا۔

ادارۂ مصنفین نواب شاہ (ادبی حلقہ) کی سرگرمیاں

"جدید اردو شاعری" سے متعلق مذاکرے میں ڈاکٹر
شوکت سبزواری صدارتی تقریر کر رہے ہیں۔

بزم بابائے اردو کے موقع پر عقیدت مندوں کا اجتماع
پہلی صف میں مصطفیٰ زیدی، ظہور نظر اور بیگم طفیل احمد جمالی

کل پاکستان مشاعرہ

(زیر اہتمام نواب شاہ ذیلی حلقہ)
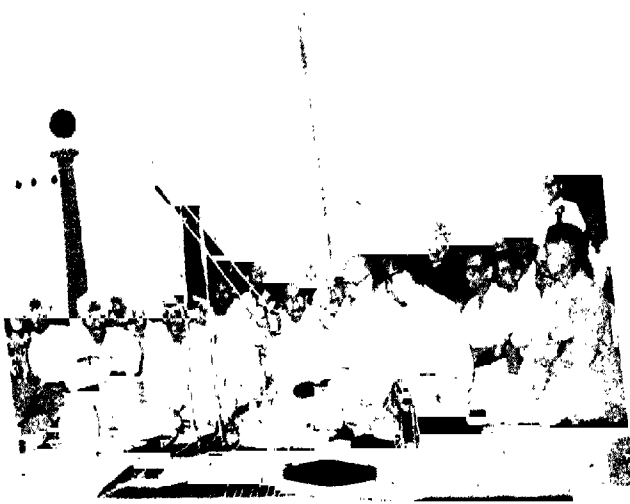
حضرت جوش اپنا کلام سنا رہے ہیں جلیل قدوائی، مصطفیٰ زیدی،
حمایت علی شاعر، اختر انصاری اکبر آبادی، م، م، فرشوری
اور دوسرے شعرا بھی نظر آ رہے ہیں

ذیلی حلقہ سکھر کی سرگرمیاں

ادارۂ مصنفین سکھر کے اشاعتی منصوبے کے افتتاح کے موقع پر
ڈپٹی کمشنر سکھر جمشید رضاء الرحیم صاحب تقریر کر رہے ہیں۔

اق صدیقی معتمد ذیلی حلقہ سکھر ادارے کی کتابیں جمشید رضاء الرحیم صاحب

ذیلی حلقہ ملتان کی سرگرمیاں

جناب قتیل شفائی معتمد ادارۂ مصنفین حلقہ مغربی پاکستان، ذیلی حلقہ ملتان کے انتخابات سے قبل اراکین ادارہ سے مخاطب ہیں۔

ذیلی حلقۂ ملتان کی لائبریری کے افتتاح کے موقع پر تقریر کرنے والے - بائیں سے

شاعر پیدا ہوئے۔ مگر مرہٹی بھی برابر یہاں پھلتی پھولتی رہی۔ آگرہ جو برج بھاشا علاقہ کی رگِ جاں تھا میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی، اور مرزا غالب کو جنم دیتا ہے جو اردو شعر و سخن کے مزاج سمجھے جاتے ہیں مگر اکبر اعظم کے عہد ہی سے برج بھاشا بھی وہاں شعر و ادب کا مخزن بنی رہی اور بڑے بڑے ہندو شاعروں کے علاوہ عبدالرحیم خان خاناں جیسے شاعر بھی اس زبان میں پیدا ہوئے۔

غرض اردو نے جہاں کہیں اپنا ڈیرا ڈالا خود بھی وہاں پھلی پھولی اور مقامی زبان کو بھی آگے بڑھایا۔ اس کی تازہ مثال کشمیر کی لیجئے کہ یہاں اردو ڈیڑھ سو برس سے روشناس ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی پیشرو زبانوں سنسکرت اور فارسی کے مقابلے میں کشمیری زبان کے ساتھ صرف فیاضانہ سلوک کیا بلکہ اہل کشمیر کو کشمیری کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنی۔ سنسکرت اور فارسی کے دور میں زبان علم و ادب اور شعر و سخن کے لئے اتنا زیادہ استعمال نہیں کی گئی جتنا اردو کے دور دورے کے دوران پروان چڑھ رہی ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ کشمیر میں اب اردو کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اردو بھی پھیل رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے اور کشمیری اور اس کے ساتھ ڈوگری بھی ریاست جموں و کشمیر میں تازہ و توانا ہو رہی ہیں۔

اردو کے اس صدیوں کے طریقۂ کار اور مسلسل رواداری انداز میں اس کی تاریخ کا وہ راز چھپا ہوا ہے جس کی بنا پر یہ عالم وجود میں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے اردو کا آغاز ہی قومی یک جہتی کے احساس اور باہمی ہم آہنگی کی ضرورت کا نتیجہ تھا۔ اس کی بنیاد ایک ایسے زمانے میں پڑی جب کہ پورا ہندوستان مختلف ریاستوں اور علاقائی ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور سنسکرت بولنے والے آریاؤں کی طرح ایک نئی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر اس سرزمین کو اپنا وطن بنا رہی تھی۔ اور اپنے ساتھ ایران، توران اور عراق و عرب کی تہذیبی اور تمدنی خصوصیتیں لا رہی تھی۔ اس قوم کے افراد پہلے پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے اور ۱۱۹۳ء کے بعد دلی اور دوآبہ گنگ و جمن میں داخل ہوئے اور گنگا جمنا کی زرخیز وادیوں کو ایک نئی تہذیب و تمدن سے اور زیادہ مالا مال کر دیا۔ ایک ایسی رنگا رنگ تہذیب جس نے آخر کار قطب مینار، تاج محل اور لال قلعہ جیسے اعلیٰ ثقافتی شاہکاروں کو جنم دیا۔

جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ سمرقند و بخارا، اصفہان و شیراز، بغداد، بصرہ اور شام و لبنان کی قدیم ترین تہذیبوں اور شائستگی کا عطر لیتے آئے جس کی خوشبو اہل ہند کے لئے نئی بھی تھی اور روح پرور بھی۔ اس کے علاوہ اس ملک کی قدیم اور بنیادی خصوصیتوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی تھی۔ مہاتما بدھ کی اہنسا کی تعلیم کے ساتھ اسلام کا تصورِ تسلیم و رضا میل بھی کھاتا تھا اور مختلف بھی تھا۔ اہل ہند اس نئے رنگ کو تعجب و تجسس کی نظر سے دیکھنے لگے۔ نو واردان بساط ہندوستان کے فلسفہ، علوم اور سماج کی رنگا رنگی میں دلچسپی لینے لگے۔ اور دونوں طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس لین دین اور قرب و اتصال کے لئے ضروری تھا کہ اشاروں کنایوں سے آگے بڑھ کر ایک ایسی بولی اختیار کریں جس میں یہاں والوں کے شبد ہوں اور کچھ نو واردوں کے الفاظ۔ انہی رنگا رنگ الفاظ کی آمیزش کو بعد میں ریختہ یا ہندوی کہا گیا۔

یہ ہندوی سب سے پہلے پنجاب میں بنی اس لئے کہ وہیں دو سو سال تک قومی یک جہتی کی کوششیں ہوتی رہی تھیں اور اس کے بعد دلی و آگرہ میں۔ لیکن دلی و آگرہ کی زبان کا اثر اس نئی بولی پر پوری طرح پڑنے نہ پایا تھا کہ اس کے بولنے والے علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کے زمانے میں فوجوں میں دکن چلے گئے اور دکن میں یہی نامکمل کھڑی زبان سات سو سال تک وہاں کی بھانت بھانت کی زبانوں کے درمیان پروان چڑھتی رہی۔ جو لوگ دوآبہ گنگ و جمن میں رہ گئے ان کی زبان برج بھاشا، ہریانوی اور مغربی ہندی کی دوسری شاخوں سے متاثر ہونے لگی اور آخر کار وہ زبان بن گئی جس کو کھڑی بولی کہتے ہیں، اور اب اردو اور ہندی کے دو جداگانہ روپوں میں الگ الگ نام اور رسم الخط کے ساتھ پورے ہندوستان اور پاکستان میں جاری و ساری ہے۔ پنجاب میں اردو قومی یک جہتی کے جو کامیاب تجربے کئے ان کے بارے میں اگرچہ تفصیلی معلومات تقاضائے زمانہ کے باعث مفقود ہو گئیں لیکن جب سلاطین تغلق کے دور میں دلی میں اس قسم کے مساعی شروع ہوئے اور فیروز شاہ تغلق نے بطور خاص اس کی طرف توجہ کی تو اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور موسیقار حضرت امیر خسروؒ اردو ہی کو قومی یک جہتی کا آلہ کار بنایا۔ انہوں نے ہندوستانیوں اور ان کے حکمران ترکوں کو ادب و شاعری و موسیقی ہی کے ذریعے سے ہم رنگ و ہم خیال بنانے کی کامیابی حاصل کی۔ اور اپنی مدھر غزلوں اور مدھر پہیلیوں سے تہذیب و شائستگی کی نئی قدروں کو جنم دیا ان کے سوز بھرے گیت گھر گھر پہنچے،

اور ان سے لطف اندوز ہونے والوں کے آپس میں ہندی یا ہندوستانی کا امتیاز باقی نہ رہا۔ یہ دراصل خسرو کے دل کا سوز اور روح کا نور تھا جس نے اس زبان کو بہت جلد مقبول عام بنا دیا۔

ساتھ ہی امیر خسرو کی ادبی دیانت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس قومی یک جہتی کے آغاز کا سہرا اپنے ہی سر باندھ لیں۔ انہوں نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں صاف صاف لکھ دیا کہ میں پہلا شخص نہیں ہوں جو اس زبان میں غزل اور گیت لکھ رہا ہوں بلکہ مجھ سے پہلے لاہور میں ایک شاعر مسعود سعد ابن سلمان نے بھی اس زبان میں گیت گائے ہیں۔

امیر خسرو کے بعد اردو کے ذریعہ سے قومی یک جہتی کی کوشش کرنے والوں کا کارواں آگے چل پڑا۔ اور ہندوستان کے ہر خطے میں اس کے علم بردار کھڑے ہو گئے۔ بہار میں حضرت شمس الدین یحییٰ منیری، دکن میں حضرت صدر الدین، محمد حسینی بندہ نواز، گجرات میں حضرت شاہ علی جیو گام دھنی ایسے بزرگ نظر آتے ہیں جو ۱۰۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۵۹۰ء سے قبل ہندوستان کی قومی یک جہتی میں اس زبان سے کام لے رہے تھے۔ یہ بزرگ ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں سوچتے ہی نہ تھے اور ان کے نزدیک خلق خدا کے مسائل ایک سی نوعیت اور یکساں اہمیت پر مبنی تھے اور اسی لئے وہ اپنی فارسی و عربی زبان کی مسند سے نیچے اتر کر ہندی یا اردو کے فرش پر آ بیٹھے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے فیض پانے والوں کو نسل و رنگ یا زبان و لباس کے تفرقوں میں الجھائیں۔

صوفیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کے بادشاہوں اور امیروں نے بھی اردو کی غیر معمولی قوت کو تسلیم کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ صوفی اس کے ذریعہ سے فقیری میں بادشاہت کرنے لگے ہیں اور عوام و خواص جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے ہیں اور ان کے خیالات و ارشادات فرمانوں اور احکام شاہی سے زیادہ عوام میں مقبول اور رائج ہو رہے ہیں۔ اب انہوں نے بھی ترکی و فارسی کے دفتروں اور دیوانوں کو رفتہ رفتہ خیر باد کہنا شروع کیا اور اردو کے لئے ایسے ایوان اور شبستان تعمیر کئے جن میں اردو کے علاوہ مقامی زبانوں کے قلم کار اور ادیب بھی بار پانے اور انعام و اکرام سے سرفراز ہو کر جانے لگے۔

ایک ایسے ہی شگفتہ ماحول میں بیجاپور اور حیدرآباد جیسے شہروں کی تعمیر ہوئی۔ بیجاپور کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عوام میں صدیوں تک "جگت گرو" کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا اور آخر حیدرآباد کا محمد قلی قطب شاہ آج تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں یاد کیا جاتا ہے اور اردو کے ذریعہ سے اس کی قائم کی ہوئی روایات اس ملک کے گوشے گوشے میں اب تک زندہ و پائندہ ہیں۔ چنانچہ انہی کی بنا پر آندھرا میں تلگو کے ساتھ اردو کو بھی علاقائی زبان مان لیا گیا حالانکہ ہندوستان کے کسی اور صوبے یا ریاست میں سوائے کشمیر کے اس کو یہ حیثیت باوجود جد و جہد کے آج تک حاصل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر ریاض الحسن

جدید ترکی ناول

جب سترھویں صدی کے اختتام پر عثمانی ترکوں نے ویانا پر یورش کی اور اس پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تو پہلی بار ان کو اپنی افواج کو یورپی انداز میں
ئے سر پر ڈھالنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ انھوں نے ابتدائی نوعیت کی کچھ تجرباتی اصلاحات ۱۸۱۶ء میں کیں۔ لیکن سو سال تک کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی
ک جانب سے روس کی زبردست طاقت کا اثر' اور دوسری طرف آسٹریا کا دباؤ تھا۔ امیر البحر خلیل بے نے روس میں سفر کرنے کے بعد ۱۸۳۰ء
ہر کیا تھا کہ اگر ہم نے یورپ کی تقلید نہ کی تو ہم ایشیا میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

سلطان محمود ثانی جو ایک بہت ہی باعمل سلطان تھا، اس نے گذشتہ صدی کے شروع میں فوجی اصلاحات نافذ کیں، اس نے ینی چری (نئی فوج)
رکی فوج کی از سر نو تنظیم کے لئے پروشیا سے ایک فوجی وفد فان مولتکے کی قیادت میں بلایا۔ اگرچہ اس کی بے وقت موت کے باعث اس کے تمام
ں پر سرکاری طور پر نفاذ کا اعلان نہ ہو سکا۔ تاہم اس کے بیٹے سلطان عبدالمجید خاں نے پورا کیا۔

مات" یا مغرب کا اثر

۱۸۳۹ء میں سلطان نے گل خانہ خط شریف" کے ذریعہ اصلاحات کی پہلی قسط کا اعلان کیا۔ گو ان کا اثر چند داخلی تبدیلیوں تک محدود رہا مثلاً
روسے سلطان نے غیر مسلموں کو بھی شہریت کے مساوی حقوق دیئے اور ان پرسے جزیہ اٹھا دیا، نیز فوجی ملازمت کے لئے غیر مسلموں کو بھی اہل قرار
ا۔

اصلاحات کا دوسرا دور ۱۸۵۶ء میں "خط ہمایوں" کے اعلان سے شروع ہوا۔ اس کی رو سے نہ صرف ۱۸۳۹ء کے اصلاحات کی توثیق کی گئی بلکہ
لیمی اصلاحات بھی کی گئیں۔

ترکی تاریخ کا یہ دور "عہد تنظیمات" یا اصلاح اور تنظیم کا دور کہلاتا ہے، لیکن اہل مغرب اس کو مغربیت کے دور کا آغاز بتاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے
ت بھی ہے۔ کیونکہ اس سے ترکی عوام میں بہت دور رس نتائج پیدا کرنے والے اقدامات ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور سائنس، مغربی
اور ادب کو بھی ترکی میں داخل ہونے کا موقعہ ملا۔ اس طرح بہتر قسم کی مغربی وضع کی تعلیم گاہیں جن کو رشدیہ کہا جاتا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں وجود میں آئیں۔
۲ء میں علم سیاست کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ گاہ قائم ہو گئی اور ۱۸۵۹ء میں فرانسیسی طرز تعلیم کا ایک ہائی اسکول جس کا نام "غلطہ سرائے" تھا
لیا۔ یہ وہی سال ہے جس میں استانبول یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

اٹھارویں صدی کے خاتمے پر فرانس کے انقلاب اور اس کے بعد نپولین کی یورپ پر فوج کشی نے ترکوں کو خواب غفلت سے جگایا، اور ان کے
کو جھنجھوڑا۔ وہ سائنس اور علوم میں فرانس کی ترقی سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی لئے انھوں نے فرانس کو وہ مثالی ملک بنایا جس کے سائنسی اور ادبی
ں کو وہ قابل تقلید سمجھنے لگے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ مغربیت کی وہ تحریک جس کا آغاز گذشتہ صدی کے وسط میں ہوا تھا اب تک ترکی میں جاری
ونکہ اس صدی کے ذہین ترکوں کے انتہا پسندانہ کمال اتاترک کی اصلاحات کو تنظیمات کا براہ راست نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح حریت ۔ مساوات اور اخوت کے نظریات نے جو انقلاب فرانس کی حرکت اور حرارت کا باعث تھے ترکی دانشوروں کی توجہ کو اپنی جانب مرکوز کر لیا ۔ نیز جب انھوں نے جمہوری حکومت کی حمایت میں سلطان کی مطلق العنان بادشاہت کے خلاف آواز بلند کی تو یہ نظریات ان کے مددگار ثابت ہوئے ۔ دستور، آزادی اور وطن، تنظیماتی دور کے ادیبوں کے نصب العین بن گئے جن کے اثرات سطر فہ پڑے ۔ پہلے تو اس نے لوگوں میں اپنے ماضی قریب سے نفرت کا احساس پھیلایا جو ان کے زوال اور انحطاط سے متصل تھا ۔ دوسرے اس سے کسی حد تک مذہب کے خلاف بھی خیالات کی اشاعت ہوئی جو فرانسیسی ادیبوں نے اپنی روشن خیالی کے دور میں پیدا کئے تھے ۔ تیسرے اس نے مغرب پسندی کو عشق کی حد تک بڑھا دیا ۔ کیونکہ مغرب ان کی نظر میں وہ سب قدریں رکھتا تھا جو "بہترین اور مکمل" ہوتی ہیں ۔

مغرب پسندی ترکی میں تین راستوں سے آئی ۔ غیر ملکی اساتذہ کی ترکی میں درآمد سے ۔ ترک طلبا کی فرانس میں تعلیم سے اور آخر میں یورپی ادب کے ترکی زبان میں تراجم سے ۔ مغرب پسندی کے ابتدائی دور میں جن فرانسیسی ادیبوں کے ترجمے کئے گئے ان میں فونتن ریطہ ۔ والٹیئر ۔ فینی لون ۔ وکٹر ہوگو ۔ برنارڈین ۔ ڈی سینٹ پیری ۔ لامارٹن ۔ ڈوما (باپ اور بیٹے) دونوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں ۔

شناسی کا درجہ

ابراہیم شناسی ان طلبا میں پہلے گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو فرانس میں مالیات کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے گئے تھے لیکن اس کی جگہ انھوں نے لسانیات اور سائنس کا مطالعہ شروع کیا ۔ شناسی نے ترکی واپس آکر ۱۸۶۹ء میں ایک ترکی روزنامہ "تصویر افکار" جاری کیا اور اس کے پہلے مدیر ہوئے ۔ وہ ایک بہت بڑے فرہنگ نویس تھے ، جنھوں نے تن تنہا ایک ضخیم ترکی لغت کی تیاری کا کارنامہ سرانجام دیا ۔ اس کے قلمی نسخے آج پیرس اور ویانا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔ وہ جدید ترکی ادب کے بانی تھے ۔ فرانسیسی ادب کی روح ان کے رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی اور اس کے اثر سے انھوں نے ترکی نثر کے لئے ایک بہت سیدھا سادھا طرز اختیار کیا جو قدیم طرز سے بہت مختلف تھا اور جو "دیوان ادبیات" کے مصنفوں کے لئے بہت مناسب تھا ۔ اس طرح شناسی نے ترکی ادب میں ایک نئی روح پھونکی ، جس کی وجہ سے حقیقت نگاری اور سادگی نے راہ پائی ۔ اس کے برخلاف قدیم ادب لفاظی اور تصنع سے پُر تھا اور اس میں عربی ، فارسی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی ۔ لفظ اور قواعد کی باریکیوں اور صنائع بدائع پر سارا زور صرف ہوتا تھا ۔ اس لئے قدیم ادب اپنا اثر اور انفرادیت کھو کر صرف اونچے طبقے میں روایتی خیالات کا مظہر بن گیا تھا ۔ ایک شاعر نے قدیم ادب کی بابت یوں لکھا ہے :۔

"اگر آپ آج کے اکثر شاعروں کے کلام پر غور کریں تو اس میں آپ خوبصورت زلف ، شراب ، ساغر اور بلبل کا بیان پائیں گے ۔ یہ شاعری محبوب کے حلقے سے باہر نہیں آئی اور خوبصورت عارض اور چشم پُرنم کے ذکر سے کبھی تھکتی نہیں"

اس میں شبہ نہیں کہ اس ادب میں تخیل کی سحرکاری تھی لیکن یہ حقیقت اور انفرادیت سے معرا تھا ۔ چنانچہ جیسے جیسے ترکی کی ذہنی زندگی یورپ سے قریب تر ہوتی گئی یہ قدیم طرز روزمرہ زندگی سے ہٹتا گیا ۔

پہلا جدید ناول نگار

تنظیمات ادیبوں کی پہلی نسل کے گزرنے کے بعد ترکی معاشرہ میں فرانسیسی کلچر کا یہ اثر ہوا کہ کم از کم ظاہرہ طور پر اس پر فرانسیسی رنگ چڑھنے لگا ۔ دوسری نسل میں وہ ادیب آگے آئے جنھوں نے ناول اور افسانے لکھنے میں فرانسیسی تصنیفوں کو اپنا نمونہ بنایا ۔ پہلا بڑا ناول نگار خالد ضیا عشاق لی گل تھا ؛ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا اور ۷۹ برس کی عمر میں فوت ہوا ۔ وہ فرانسیسی ادب پر خاصا عبور رکھتا تھا ۔ اور اس کی تحریروں میں ڈوما فرزند کا گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ اس کے پہلے ادبی کارنامے "مغرب سے مشرق تک ایک ادبی سفر" کو سنسر نے ضبط کر لیا کیونکہ یہ خیال تھا کہ اس میں جمہوریت پسندی کے نظریات کی پیروی کی گئی ہے ۔ خالد ضیا ایک بڑا جید عالم تھا ۔ اس نے سنسکرت ادب پر بھی کتابیں لکھیں ، لیکن سنسر نے یہ سمجھ کر پھر اس کو ضبط کر لیا کہ ادب کے پردے میں سیاسی نوعیت کی کوئی چیز لکھی گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ ایک پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کی وہ تحریریں جن میں جمہوری خیالات

ہ عائد ہوتا ہے سنسر کی فہم میں نہیں آتیں تو خالدہ ضیا نے جواب دیا کہ اگر وہ سنسر کی سمجھ میں نہیں آتیں تو یہ خطرناک کیسے بن سکتی ہیں، کیونکہ عوام انکو
بی نہیں سکتے۔ ایک مرتبہ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی اور اس کے کچھ مکتوبات ضبط کر لئے گئے۔ اس کے بعد اس نے تین سال تک لکھنا بالکل بند کر دیا
نا پھر مشہور ادبی جریدے "ثروت فنون" میں جو گذشتہ صدی کے خاتمے پر شائع ہوتا تھا کام لکھنے لگا۔

اس رسالے میں اس نے اپنا مشہور ناول "نیلا اور سیاہ" قسط وار شائع کیا۔ اس میں نیلا امید اور مسرت کی نمائندگی کرتا ہے اور سیاہ
کے ہیرو کے المناک انجام کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے ادیب کی کہانی ہے جو جلدی دولتمند بن جاتا۔ جلدی شہرت پانا اور جلدی اپنی محبوبہ سے شادی
چاہتا ہے جس زمانے میں ہیرو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انتھک کوشش کرتا ہے، ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کے سارے حسین منصوبوں
اک میں ملا دیتا ہے یعنی اس کی معشوقہ ایک فوجی افسر سے شادی کر لیتی ہے اور وہ ان مسودات کو نذر آتش کر دیتا ہے جن کے ذریعے اس کو شہرت
ل ہونے والی تھی۔ اور پھر وہ المناک دن شروع ہوجاتے ہیں جو اس کے لئے آخر تک سوہان روح بنے رہے۔ اس افسانے میں اس زمانے کے ترکی ادیب
بدوجہد کا بے مثل خاکہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باسفورس کے قدرتی مناظر کی دلکش داستان کے ساتھ ساتھ ان ادیبوں کی حسرت دیاس کا بھی ذکر ہے۔
وں نے شہرت کے سراب کا پیچھا کیا۔

ایک اور ناول "عشق ممنوع" میں ایک نوجوان عورت کی داستان ہے جو ایک بوڑھے دولتمند سے شادی کر کے دولت مند بننا چاہتی
۔ اس بوڑھے آدمی کی پہلے ہی سے دو نوجوان لڑکیاں ہیں جو اپنی سوتیلی ماں کے خلاف سازش کرتی ہیں اور اس طرح اپنے باپ کی تباہی کا باعث
جاتی ہیں۔ وہ اپنے باپ کے خیالات کو نوجوان بیوی کی طرف سے زہر آلود کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اس کو طلاق دیدیتا ہے اور وہ
ان عورت خودکشی کر لیتی ہے۔ اس داستان سے مصنف ایک طرف بے جوڑ شادی کے خراب نتائج سے اور دوسری طرف شادی کے ذریعہ دولتمند بننے
واہش سے اپنے قارئین کو آگاہ کرتا ہے۔ اور یہی دونوں واقعات ایک المیہ کی شکل میں بالآخر پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں۔

اگرچہ خالدہ ضیا کردار نگاری میں بے مثل مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ لیکن نقادوں کی مانے ہے کہ اس کے کردار اس زمانے کے ترکی معاشرہ میں حد سے زیادہ
رب زدہ افراد کو پیش کرتے ہیں اور چونکہ ان کی تعداد معاشرہ میں بہت کم تھی اس لئے ایسی کردار نگاری قومی زندگی کی اصلی توانائی کو ظاہر نہیں کرتی۔ اس بنا پر آج کے
ی نقاد اس کو رجعت پسند ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ مغربی نقاد اس کی بے حد تحسین و آفرین کرتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے خاتمہ پر پیرس میں لیو کاہون کی مشہور کتاب "تاریخ ایشیا کا ابتدائی دور" شائع ہوئی۔ فوراً ہی اس کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔
یہ ترک دانشوروں میں مقبول ہوگئی۔

اس سے کچھ پہلے "اورخون" کے مخطوطات شائع ہو چکے تھے۔ ان مخطوطات میں جو منگولیا میں دریافت ہوئے تھے ابتدائی ترکی معاشرت کا حال ہے اور
ان کی بدولت ترک ادیبوں کو اپنی تاریخ کے قدیم دور میں اپنے عوام کی زندگی کے عمیق اور وسیع مطالعے کا موقعہ ملا۔
درحقیقت تامپسن۔ ہیوبر۔ بانگ۔ فان لی کاک۔ پیلیٹ اور اسٹائن وغیرہ کی تحقیقات نے ان کی قدیم زمینوں کی جو نئی معلومات
اہم کیں۔ اس سے قدیم ترک معاشرہ کے وحشی ہونے کا نظریہ بدل گیا اور اب یہ سمجھا جانے لگا کہ ترک ایک مہذب قوم ہے اور اس کی قدیم تاریخ کا سلسلہ قدیم
بابیت کے زمانے تک پہنچتا ہے۔ اس طرح کے ایک بین التورانی تصور کا آغاز ہوا اور اس کا اثر پہلی جنگ عظیم سے ذرا قبل ترکی ادب پر خاصا گہرا تھا۔

ضیا گیوک آلپ

ضیا گیوک آلپ جو استانبول یونیورسٹی میں علم تمدن کے پروفیسر تھے تورانی نظریہ کے سب سے بڑے مبلغ ہوئے ہیں۔
وہ عثمانیوں کو مائل بہ انحطاط قوم سمجھتے تھے اسی لئے ان کو اس قوم سے نفرت تھی۔ مگر اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ وہ ترکی نسل کے ان افراد کی اس قوت او
رکت کے مداح تھے جب وہ جنوبی اور مغربی ایشیا کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے وسطی ایشیا میں رہتے تھے۔ گیوک آلپ ایک ممتاز شاعر بھی تھے اور انہوں نے اپنی

شاعری میں ان نظریات کو پیش بھی کیا۔ وہ اپنی ایک نظم "قومان" میں جو سب سے پہلے جریدہ "گنج قلم" (نئے قلم) میں شائع ہوئی۔ قومان کی بابت کہتے ہیں:

"اٹیلا اور چنگیز کے سر اگرچہ ہماری نسل کی فتوحات کا سہرا بندھا ہے، لیکن پھر بھی تاریخ کے صفحات پر وہ قابلِ نفرت اور شرم دکھائے گئے
ہیں۔ جبکہ قیصر اور اسکندر قابلِ احترام ہستیاں مانی گئی ہیں لیکن میرا دل اوغوز خان کو اچھی طرح جانتا ہے حالانکہ تاریخ اس کو نہیں جانتی
وہ اپنی قوت اور شوکت کے ساتھ میری رگوں میں زندہ ہے کیونکہ وہ میرے دل میں جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے۔"

اس کے بعد وہ بین التورانی تحریک کا تجزیہ کرتا ہے اور دو سطروں میں جو بہت مشہور ہوئیں اس طرح کہتا ہے:۔

"ترکوں کا وطن نہ ترکی ہے اور نہ ترکستان بلکہ یہ ایک لافانی ملک ہے، جس کا نام ہے توران"

وسط ایشیا کی قدیم جنم بھومی سے ترکوں میں دلچسپی پیدا کر کے ضیا گیوک آلپ وسط ایشیا سے جنوبی ایشیا اور ہندوستان کو ہجرت کرنے والے ترکوں کے درمیان پرانے تاریخی رشتے کو زندہ کرنے کا باعث بھی تھا۔ یہ امر ہماری تاریخ کے لئے خاص اہم ہے اس لئے کہ تیموری نسل جس نے برصغیر پر دو سو سال سے زیادہ حکمرانی کی ہے عام دسیع ترکی تاریخ کا ایک حصہ ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہماری وضع ثقافت کی تشکیل میں جو چار عناصر یعنی عرب۔ ایران۔ ترکی اور ہندوستان شامل ہیں، ان میں ترکی عنصر بالکل پیچھے رہا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری ثقافت اور تاریخ کے ترکی عنصر پر اب تک کچھ تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اردو شاعری میں انشاء اللہ خان بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے ترکی نظم اتنی آسانی اور خوبی سے لکھی، جیسا وہ اُردو میں شعر کہتے تھے لیکن بحیثیت ترکی شاعر ان کو کوئی نہیں جانتا۔ اب وقت ہے کہ ہماری ثقافت کے ترکی عنصر پر تحقیق کے لئے کوئی ادارہ بنایا جائے اور اس میدان میں تحقیق کے لئے محققوں کی ہمت افزائی کی جائے۔

خالدہ ادیب اوار

خالدہ ادیب (اوار) ایک بڑی ادیبہ ہیں۔ وہ نہ صرف داستان وافسانہ لکھتی ہیں بلکہ سیاسی تاریخ اور تاثرات کی مصنف ہیں۔ وہ نوجوان ترکوں کے انقلاب کے وقت ضیا گیوک آلپ کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئیں۔ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے ناول "نیا توران" لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی، اس میں ضیا گیوک آلپ کے نظریات کی جھلک تھی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کے ناول "خاندان" میں وہ عوام کی آزادی کے نظریہ پر زور دیتی ہیں اور یہی وہ نظریہ ہے جو تنظیمات کے ادیبوں کو بے حد عزیز تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران اور جنگِ آزادی کے وقت وہ اسکولوں میں بطور معلمہ کام کرتی تھیں۔ شام میں بھی ہسپتالوں کی دیکھ بھال کی اور مادرِ وطن کے دفاع کے لئے تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کیا۔ پھر کچھ عرصے کے لئے ترکی یونانی جنگی محاذ پر ایک کارپورل کی حیثیت سے کام بھی کیا۔ اس کا مشہور ناول "آگ کی قمیص" جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ترک عوام کے جذبۂ دفاع اور آزادیٔ وطن کی خواہش کو پیش کرتا ہے۔ استانبول پر اتحادیوں کے قبضے کے خلاف مظاہرہ کرنے والے امڈتے ہوئے بے پناہ عوام کے مجمع کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:۔

"چوک میں انسانوں کا ایک خوفناک سمندر شور وغل سے گرج رہا ہے۔ اس انسانی مجمع عظیم کا صرف مرکز ہی ناقابلِ جنبش ہے
اس انسانی سمندر کے اوپر سلطان احمد مسجد کے سفید مینارے اور زندان کی دیواریں سایہ کناں ہیں، جیسے وہ اس سمندر
میں جھٹکے کھا رہی ہوں۔ گھروں کی چھتوں پر، اور مسجد کے صحن میں درختوں کی پھننگوں پر ان گنت لوگ لٹکے ہوئے ہیں اور
میناروں پر سیاہ پرچم لہرا رہے ہیں۔ ان تمام انسانوں کے ہونٹوں پر صرف ایک ہی ماتمی آواز سنی جا سکتی ہے۔ جو دبی ہوئی
آہوں کی مانند تھی کیونکہ انہوں نے ماتم کا سیاہ جھنڈا لہراتا ہوا دیکھ لیا تھا۔"

خالدہ ادیب نے یورپ اور امریکہ کے سفر کئے اور ۱۹۳۵ء کے قریب وہ ہندوستان بھی گئیں۔ اس سفر کے تاثرات انہوں نے اپنی کتاب "ہندوستان میں" قلم بند کئے ہیں۔ "مسخرہ اور اس کی بیٹی" ان کا دوسرا ناول ہے جو پہلے انگریزی میں شائع ہوئی۔ ان میں وہ ترکی کی مشرقی روح کو مغرب سے ملنے کی

کوشش کرتی ہیں۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ترکی لڑکی جو مشرق اور مغرب کے فنون کی تعلیم پا چکی ہے۔ شادی کے لئے ایک اطالوی کا انتخاب کرتی ہے جو اسلام قبول کر لیتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ایک اطالوی نوجوان کو کیوں منتخب کرتی ہے جبکہ ترکی کلچر کا رجحان جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے فرانس کی جانب تھا۔ شاید وہ ان سیاسی بحرانات سے متاثر ہوئیں جو لکھتے وقت ترکی میں موجود تھے۔

یعقوب قدری ۔ روشن اشرف اور پیام صفا دیگر بڑے ناول نگار ہیں۔ جن کو شہرت حاصل ہوئی۔ یعقوب قدری اپنے ناول "نور بابا" کی بدولت شہرت کی بلندی پر پہنچے۔ جس میں بکتاشی فرقہ کے ایک بزرگ کے گناہوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ یہ حضرت نفسانی خواہشات کے لئے نوجوان لڑکیوں کی آبروریزی کیا کرتے تھے۔

یہ ناول اس فرقہ کی زبردست مخالفت میں لکھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر آتاترک نے ۱۹۲۵ء میں اس فرقہ کو خلاف قانون قرار دیا۔
جنگ بلقان اور خاص طور پر جنگ آزادی نے ثابت کر دیا تھا کہ اناطولیہ ترکی عوام کے لئے زبردست قوت کا مرکز بن سکتا ہے۔ اپنے ناول "یابانجی" (اجنبی) میں قدری جنگ آزادی کے بعد اناطولیہ کے کسانوں کی حالت زار کا نقشہ پیش کرتا ہے، جب ان کے مکان جل کر راکھ ہو گئے اور وہ بغیر کسی ٹھکانے کے وحشی جانوروں کی طرح بھٹکتے پھرتے تھے۔ یہ اجنبی جو استانبول کا ترک ہے اناطولیہ کے دیہاتوں میں جاتا ہے۔ جہاں اسے ایک روزنامچہ ملتا ہے۔ جو وہاں کے لوگوں کی دردناک حالت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ لوگ زندگی کی سطح پر آ گئے ہیں اور تہذیب سے یکسر معرا ہو گئے ہیں۔ اور جنگ کے اثرات کی وجہ وہ بربریت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ قدری نے اناطولیہ کے باشندوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ اس کا رویہ ذرا سخت اور بے رحمانہ ہے اور اس نے ان کی حالت کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ حالانکہ ان کی کیفیت اتنی خراب نہیں تھی جیسی کہ اس نے بیان کی ہے۔
رشد نوری بھی ان مصنفوں میں سے ہیں جو اناطولیہ کے متعلق لکھتے ہیں انھوں نے اپنے ناول "گانے والی چڑیا" اور "[illegible]" ناول میں اناطولیہ کے کسانوں کی حالت کا نقشہ تخیل اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔
اگر ہم دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ جدید دور کی طرف آئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اناطولیہ سے ترکی مصنفین کی دلچسپی جو ۵۰ سال قبل شروع ہوئی تھی اب شدت اختیار کر گئی ہے۔ محمود مقال کے ناول "ہمارا گاؤں" اس کو بین الاقوامی شہرت عطا کی ہے۔ مقال ایک ترکی گاؤں کا نقشہ تفصیل سے پیش کرتا ہے اور ان مسائل پر روشنی ڈالتا ہے جن کو حل کر کے گاؤں میں صحت مند زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ اس طرح محمود تیغ کا ناول "غم کا کنواں" ایک گاؤں میں طبی سہولتوں کے فقدان کا ذکر کرتا ہے، جس کی وجہ سے گاؤں کے باشندے علاج کے لئے حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

اگر ہم ان ناولوں کا ایک عام جائزہ لیں جو "دور تنظیمات" اب تک لکھی گئی ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کی اس شاخ نے اس دور کے خاص رجحانات کو بڑے خلوص سے پیش کیا ہے۔ آج ناول گاؤں اور اس کی بہبود پر حقیقت آگیں روشنی ڈالنے کا ایک موثر ذریعہ بن گیا ہے کیونکہ ترکی کے اخلاقی اور مادی اقدار کا دارومدار اس کے گاؤں کی تندرستی پر ہے۔

اشتیاق حسین اظہر

ناطق لکھنوی

گذشتہ دنوں ایک شاعر سے گفتگو ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ناطق لکھنوی کا یہ شعر زبان پر آگیا۔

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

انھوں نے اس شعر کی بڑی تعریف کی اور پوچھا کہ یہ کس کا ہے۔ میں نے بتایا کہ ناطق لکھنوی کا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یایہ کے تا
معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے یہ سُن کر افسوس بھی ہوا اور اس تلخ حقیقت کا احساس بھی ہوا کہ آج کے دور میں جو صحیح معنوں میں اخبارات اور رسائل کا دو
جو لوگ کم چھپتے ہیں یا جن کے بارے میں اخبارات اور رسائل سکوتِ بے محل میں مبتلا ہوتے ہیں وہ خواہ کتنے ہی بڑے ادیب یا شاعر کیوں نہ ہو
حشر وہی ہوگا جو ناطق جیسے قادر الکلام شاعر کا ہوا۔

جنابِ ناطق نے اپنی زندگی کے طویل دور میں اُردو زبان، ادب، صحافت اور خاص کر اُردو غزل کی جو خدمت کی ہے، اس کی بنا پر
اساتذہ کی صف میں جگہ ملنی چاہیے تھی اور ان کی حیات میں ان کا شمار اساتذہ میں کیا بھی گیا، لیکن ان کی خلوت پسند طبیعت اور بے نیازی
باعث اور کچھ ادیبوں اور ناقدروں کے سکوتِ بے محل کی وجہ سے عوام تو عوام خواص بھی ان کے نام اور کلام دونوں سے قریب قریب ناآشنا ہو
اور ایسے اہلِ ذوق بھی جنھیں ہزاروں شعر ازبر ہیں جب ان کا نام سُنتے ہیں تو چونکتے ہیں۔

ناطق صاحب ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے نحو، فلسفہ، ادب، فقہ، نجوم، طب اور خوشنویسی میں اپنے وقت کے مشہور ا
سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اُردو غزل کا انحطاطی دور تھا۔ یعنی غزل کا دور دورہ تو تھا مگر عام طور پر شا
کے خیالات اور مضامین، الفاظ و معنی میں بے احتیاطیوں کا رواج روز افزوں تھا۔ کوئی رعایتِ لفظی کا دلدادہ کوئی چاہ ذقن میں ڈوب مر
آمادہ، کسی کو صنائع و بدائع پر فخر اور کسی کو مبالغہ آرائی پر غرور۔ خود ان کے والد جو آتش کے شاگرد تھے اپنے حلقۂ تلامذہ میں بیٹھ کر اس وقت کی
غزل سرائی میں مصروف تھے۔ ایسے عالم میں شعر کہنے پر مائل نہ ہونا ان کے لئے امرِ محال تھا۔ چنانچہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا، البتہ یہ ان کی خ
کہ انھوں نے اپنے فہم و فراست کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ اگر غزل کو زندہ رہنا ہے تو اس کو اپنی ڈگر بدلنا ہوگی۔ یہ ایک بڑا مشکل کام تھا، اس لئے کہ ما
مزاج کے خلاف کسی نئی اُپج کو اختیار کرنا کار سے دارد تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں ایسے احباب میسر آگئے جو ان کے ہم نوا تھے۔ یہ احباب بعد
سبعہ سیارہ کے نام سے مشہور ہوئے انھوں نے روایتی لکھنوی شاعر کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ آثر لکھنوی کے لھنے کے
ناطق صاحب اس تحریک کے قائد تھے۔ اس تحریک کا پس منظر خود ان کی زبان سے سنئے۔

شاعری میں انقلاب پیدا کرنے کی لگن میرے دل و دماغ میں بیدار ہوکر مجھے ضبط و خاموشی پر مجبور نہ کرسکی اور پہلے تو میر و غالب کی ہم طرح غزلوں پر
ری مضامین لکھنا شروع کئے - پھر اخبار زندہ دل، صیاد اور خدنگ نظر میں غلط اشعار و شعرا پر اعتراضات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کردیا - سوا مخصوص
ین اور اپنے استادوں کے کسی کی بھی رعایت نہیں کی - اور سب کو ایک ہی میدان میں لے آیا - میرے تمام اعتراضات کی نوعیت اس اصول پر تھی کہ خود اپنی
لہ اصول سے جو غلطیاں ان سے لفظی یا معنوی سرزد ہوتی تھیں، ان پر میں نکتہ چینی کرتا تھا تاکہ اردو ادب میں بے اصولی نہ پیدا ہو - اب رہا یہ امر کہ مجھ کو
بتہ سے مذاق شاعری قابل اصلاح اور ایک سخت انقلاب کا محتاج تھا اس کے لئے میں نے علیحدہ مضامین لکھنا اور جلسوں میں تقریریں کرنا اور زبانی
ں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا - میرے خیالات کا ماحصل یہ تھا کہ شعر کا معیار ایسا ہو کہ باپ بیٹی اور بہن بھائی کے روبرو غزل کے اشعار پڑھ سکیں
معاملہ میں لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے اکثر شاعروں نے مدد دی - مثلاً، جناب سائل دہلوی - جناب وحشت کلکتوی - دل شاہجہانپوری شفق
پوری - ریاض خیرآبادی اور بہت سے شعرا نے اس مذاق سلیم کا خیر مقدم کیا - اور اپنی مہذب اصول یہاں سب اساتذہ کا کلام شائع ہوتے دیکھا - دقیانوسی
ت بے کیف مبالغے، اعضائے نسانی کے بکھان، گریہ و مرگ کے مضامین کم ہونا شروع ہوگئے - رعایت لفظی کی بھرمار کم ہوئی - یہ بھی ممکن ہے کہ
خیالات اوروں کے دل میں بھی آئے ہوں بلکہ تعجب نہیں کہ کچھ اساتذہ ہم لوگوں کے اظہار خیال سے پہلے اس پر کاربند ہوں مگر جہاں یاد پڑتا ہے اس کی
یک قبل ازیں دیکھنے میں نہیں آئی ۔"

اس تحریک کے علاوہ اور بھی لوگ تھے جو اردو غزل کے احیا کے لئے بے چین تھے - مثلاً حسرت - اصغر اور فانی، لیکن بعد کے تنقید نگاروں نے
تحریک کی افادیت اور اس کے قائد کی ادبی خدمات کو یکسر نظرانداز کردیا - اور تو اور میں نے گزشتہ دنوں ایک رسالہ میں آثر لکھنوی کا ایک انٹرویو
جس میں انھوں نے اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے جن لوگوں کا نام لیا ہے ان میں ناطق صاحب کا نام شامل نہ تھا - حالانکہ خود انھوں نے تاریخ نظم اردو
ایک مضمون کے ذریعہ اس تحریک کی قیادت ناطق لکھنوی سے منسوب کی تھی -

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں ناطق لکھنوی کی شاعری کا آغاز لکھنؤ سے ہوا - اس کے بعد وہ کانپور - حیدرآباد - اجمیر - لاہور، اور
سر کی خاک چھانتے رہے، اس تمام عرصہ میں انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور مضامین بھی لکھے - ناولیں بھی تحریر کیں اور کئی اخبارات اور رسائل کی
ت کے فرائض بھی انجام دیئے تقسیم کے وقت وہ کلکتہ میں تھے - لیکن تقسیم کے بعد جب کلکتہ میں وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے تو وہ ہجرت کرکے
تی پاکستان چلے گئے اور چاٹگانگ کو انھوں نے اپنا وطن جدید بنایا - لیکن طائر بے نوا کو یہ نیا آشیانہ راس نہیں آیا اور وہ چند ماہ چاٹگانگ میں رہنے
ند ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرگئے اور محلہ بدرپٹی عقب مزار بدرشاہ میں دفن کئے گئے - ان کا انتقال کیا
ن کے ساتھ ایک پورے دور کی تہذیب، روایات اور معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی دفن ہوگیا - وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جب وہ نہیں تو انجمن
کیسے قائم رہ سکتی تھی - ان کے صاحبزادے سید رشید احمد کی کوششوں سے جو آجکل نواب شاہ میں مقیم ہیں - اکتوبر ۱۹۵۱ء میں ان کا دیوان شائع ہوا اور
بات کی توقع پیدا ہوئی کہ شاید زندگی میں ان کے ساتھ بعض خود ساختہ اور تنگ نظر ناقدین نے جو زیادتیاں کی تھیں - ان کا استحصال ہوسکے گا - اور
دیوان کے ذریعہ انھیں اہل علم اور سخن فہم حضرات سے دوبارہ روشناس کرایا جاسکے گا - لیکن اب تک یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی - ایسا محسوس ہوتا
کہ اس دور کے اکثر ادیب اور شاعر ہر اس چیز کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو انھیں ان کے شاندار ماضی کی روایات کو تازہ کرنے پر مجبور کرسکتی ہے -

اس دیوان کی خصوصیات کا خود ناطق صاحب نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے -

۱- اپنی شاعری میں میں نے اکثر موقعوں پر چند امور کا لحاظ رکھا ہے - کوئی پیغام یا کسی حقیقت کا اظہار یا کسی راز کا انکشاف یا حسن و عشق کے
نے میں کسی مسئلہ کا حل یا حسن تخیل کا ضروری اور اہم مظاہرہ -

۲- میں نے کسی بے بنیاد بات پر جو محض شاعری اور خیالی ہو کسی شعر کی عمارت نہیں کھڑی کی اور بات کا بتنگڑ نہیں بنایا -

۳۔ میں نے باوقار اور شاندار الفاظ سے شعر کو بھاری بھر کم نہیں بنایا بلکہ معنی کو دسیع اور الفاظ کو سادہ مگر برمحل استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ مخصوص مقام اور اہل زبان کے مخصوص محاورے زیادہ استعمال نہیں کئے ہیں کیونکہ ایسی زبان کی عمر کم ہوتی ہے اور اپنے قیاس کے موافق اظہارِ خیال کے لئے ایسی زبان رکھی جو کئی صدیوں کے بعد بھی باوجود قدرتی لسانیاتی تغیرات کے ناقابلِ فہم اور بے لطف نہ ہو۔

۵۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ جن اقسام کے مضامین نظم کرنے میں غالب کو اردو زبان کی طرف سے بے پروائی کرنا پڑی تھی اس قسم کے باریک و دقیق خیالات کا اضافہ کروں جن کی جگہ ہنوز خالی ہے اور جن کی کمی کی وجہ سے اردو ادب فارسی ادب سے پیچھے ہے۔

۶۔ اس دیوان کے اشعار و الفاظ نہ تو عامیانہ ہیں اور نہ بازاری ہیں اور نہ عالمانہ اور دقیق، اور غالباً کسی شعر میں کوئی نقص یا کمزوری صرف عزت شعری کے لئے نہیں اور نہ وہ متروکات لفظی و معنوی ہیں جن کو سبعۂ سیارہ اور اس کے ہم خیال اہلِ فن نے رخصت کر دیا ہے۔ بلکہ علاوہ ان کے دوران میں بہت سے قابلِ ترک الفاظ اور خیالات اپنی طرف سے متروک کئے ہیں۔

۷۔ اس دیوان کے اشعار سطحی و خوش نما ہو کر دن بھر کے تھکے ہوئے کلرک اور ایک پیالی چائے کی طرح صرف تفریح پہو نچانے اور تھکن اتارنے کے لئے کارآمد نہیں ہیں اور نہ اس لئے کہ چند آدمی جمع ہو کر شعر کے مضمون کو مفہوم تک پہونچنے کے لئے مباحثہ کیا کریں۔

۸۔ سادہ مزاج شعرا کی طرح میں زیادہ تحسین طلب اور شہرت پسند نہیں ہوں اور دعوے کی دلیل ضروری ہو تو یہ واقعہ ہے کہ شعر کہنے کے لئے کبھی مجھ کو یہ غور نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے۔ مگر پڑھنے کے لئے صدہا مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ طبیعت حاضر نہیں ہوئی اور نہیں پڑھ سکا اگر لوگوں نے بہت مجبور کیا تو طوعاً و کرہاً نہایت بد دلی سے تین چار شعر پڑھ دیئے۔ اب رہی شہرت طلبی تو اس کی بابت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہندوستان بھر کے شعرا میں جن حضرات نے اپنے کلام کو رسالوں میں شائع کرنے سے پرہیز کیا ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔

۹۔ مجھ کو نسبتاً اپنے سب ساتھی شعرا سے شاعری کے لئے بہت کم وقت ملا ہے۔ اس لئے میرے کلام کے عیوب و نقائص کو جھنڈے پر چڑھانا ناانصافی ہوگی کیونکہ مجھ کو دعوے کمال بھی نہیں ہے۔ اور سہوِ بشری بھی ساتھ ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں کو آج تک اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ کلام ناطق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔

ناطق لکھنوی نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال زبان و ادب کی خدمت میں صرف کئے اس صلاحیت اور استعداد کا اندازہ صرف ان کے دیوان سے نہیں لگایا جا سکتا انہوں نے مضامین بھی لکھے اور مقالات بھی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ انھوں نے تاریخ نظم اُردو کے ذریعہ اردو کی تاریخ کے بارے میں معلومات کا ایک خزانہ جمع کر دیا لیکن خود ہمیشہ وہ اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی سمجھتے رہے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ ان کا یہ دیوان جو ان کے انتقال کے ۷ برس کے بعد شائع ہوا، اس سے پہلے بھی شائع ہو سکتا تھا۔ خاص کر اس زمانے میں جب ان کا طوطی بولتا تھا مگر وہ خود اس کے خلاف تھے اس لئے کہ وہ اپنے کلام کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتے تھے۔ وہ کہنہ مشقی سے حاصل ہونے والی سہل نگاری کے باوجود اپنے شعروں کے ظاہر و باطن سنوارنے اور ان کی نوک پلک درست کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے وہ اپنے شعر کو سہل ممتنع بنانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے ان کا کلام مناسب وقت پر شائع نہ ہو سکا۔

ناطق لکھنوی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی گہرائی اور پاکیزگی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی خوبی ان کو اپنے دور کے شعرا میں ممتاز کرتی ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے غزل کے میدان میں قدم رکھا تو یہ صنفِ شاعری ارزاں قسم کی معاملہ بندی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ناطق لکھنوی نے غزل کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں ان کا کلام نقشِ اول کی حیثیت رکھتا ہے صحیح ہے کہ ان کی شاعری میں فلسفہ اور تصوف کے مضامین کی بہتات ہے مگر یہ چیزیں اس دور کی پیداوار ہیں جن سے ناطق لکھنوی کا تعلق تھا، لیکن

ی شاعری کا بنیادی عنصر نہیں کہہ سکتے ۔ وہ غزل کو ایک گلدستہ بنانا چاہتے تھے جس میں رنگا رنگ مضامین کی نمائندگی ہو۔ جس طرح انسانی
بہت سے شیشے اور گوشے ہیں ۔ اسی طرح ان کی شاعری میں بھی مختلف قسم کے جذبات اور خیالات موجود ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں زندگی کی
ک صحیح عکاسی کرتی ہے جہاں تک تصوف کا تعلق ہے ناطق لکھنوی کے کلام میں تصوف موجود ہے لیکن یہ رواتی تصوف نہیں وہ تصوف میں
ذاتی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ناطق لکھنوی موجودہ دور کے تمام ادیبوں اور شاعروں کے پیش رو ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جو لکھنؤ سے
ہونے کے باوجود زبان کو لکھنوی اسکول یا دہلوی اسکول تک محدود کرنے کے قائل نہ تھے ۔ وہ ایک عام زبان کے قائل تھے ۔ ایسی زبان جو پورے
بولی اور سمجھی جائے وہ ایسی زبان کے قائل تھے جس پر کسی ایک شہر یا ایک طبقہ کی اجارہ داری اور چھاپ نہ ہو ۔ یہی چیز لسانی جمہوریت ہے اور
ے بارے میں جدید سائینٹفک نظریہ ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں لکھنؤ کے مخصوص محاورات اور فقرے نہیں ملتے ۔ زبان کے بارے میں
تصور میر تقی اور میر انیس کے نظریات سے مختلف ہے ۔

انھوں نے آج سے پچاس برس پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اُردو کو کسی ایک شہر یا ایک صوبہ تک محدود کیا گیا تو یہ ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی
وقت کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی نہ سنی اور آج ہم اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں ۔ ناطق لکھنوی کی یہ رباعی ان کے جذبات
ترجمانی کرتی ہے ۔

اُردو جو نہ ہوتی تو سب ہی سر دھنتے
ملتے نہ انہیں پھول یہ کانٹے چنتے
ہر صوبے کے لوگ اپنی اپنی کہتے !
سنتے نہ ہماری نہ ہم ان کی سنتے

اس اظہارِ خیال سے میری مراد یہ نہیں کہ میں میر تقی یا میر انیس کو بُرا بھلا کہوں ، ان حضرات نے جس زمانے میں یہ نظریات قائم کئے
زمانے میں واقعتاً اُردو دہلی اور لکھنؤ تک محدود تھی اور سارے ملک کی زبان نہیں تھی ۔ ہمیں ان حضرات کو الزام نہیں دینا چاہیئے ، لیکن وہ
ور موردِ الزام ہیں جنھوں نے اس زمانے میں بھی جب اُردو کا غلبہ پشاور سے کلکتہ اور کشمیر سے راس کماری تک ہو چکا تھا ، میر انیس کی تقلید
غلط رہے اور زبان کو اپنی دانست میں صرف دلی اور لکھنؤ کا پابند سمجھتے رہے ۔

ناطق لکھنوی کی یہ دُور اندیشی انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی ۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جتنے گمنام تھے اتنے ہی آج بھی گمنام ہیں ۔ لیکن
ری نہیں کہ یہ چیز آئندہ بھی باقی رہے گی ۔ اس لئے کہ تمام تنقید نگار تنگ نظر نہیں ہو سکتے ۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور آئے گا جو تعصب سے
ہوگا ۔ اور وہ جب اُردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرے گا تو ان تمام محرکات کو سامنے رکھیگا ۔ جو ہماری زبان و ادب کے ارتقاء کا
ہوئے ۔ ایسے موقع پر ناطق لکھنوی کی خدمات اور تحریک کا ضرور احترام کیا جائے گا ۔ اور یہی اعتراف ان کی خدمات کو صحیح خراجِ
ہوگا ۔

لکھنؤ میں کوئی ہستی ہے تو ناطق کی جگر
ورنہ معلوم ہے سب اصل و حقیقت مجھ کو
(جگر مرادآبادی)

ربیعہ فخری

علی پور کا ایلی

ایک جائزہ

ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" باوجود اپنی چند ایک خامیوں کے ادب میں ایک قابل قدر اور خوشگوار اضافہ ہے۔ یہ ایک ایسے بچے کی داستان ہے جسے نہ تو باپ کی شفقت میسر آسکی اور نہ ماں کا پیار۔ اس لئے نہیں کہ خدانخواستہ وہ اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ بلکہ اس لیے کہ باپ اس قدر تعیش پرست تھا کہ اس کی دنیا میں سوائے عورت کے کوئی اور داخل ہی نہیں ہو سکتا تھا اور ماں مظلوم تھی اور اس حد تک مظلوم کہ اس کی دنیا میں مظلومیت کے سوا کچھ باقی ہی نہ رہا تھا اس کے لئے بچے ایک ضمنی حیثیت رکھتے تھے اور مظلومیت ایک ایسی ٹھوس اور پائیدار حقیقت جسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مظلومیت کو سینے سے لگا لیا اور بچوں سے بے نیاز ہو گئی۔

ایلی (وہ بچہ) یہ سب کچھ دیکھتا اور بنا سمجھے بوجھے ان حالات سے متاثر ہوتا رہا۔ اس کی طبیعت اس ماحول سے ابا کرتی تھی۔ وہ اپنے حالات سے بیزاری محسوس کرتا اس کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی۔ اسے غصہ آتا۔ مگر وہ کر کیا سکتا تھا۔ وہ ان حالات کو بدل تو دیتا مگر اس کی اس گھر میں کوئی حیثیت بھی ہوتی، اور اسی پر کیا موقوف وہاں تو اس کی ماں کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایلی احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ اور پھر عمر بھر اس سے نجات حاصل نہ کر سکا۔

اس ناول کا مرکزی کردار "ایلی" ہے۔ اور اگر مصنف کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تصنیف کا مقصد وحید یہی ہے کہ ان عوامل و اسباب کا احاطہ کیا جائے جنہوں نے احساس کمتری کے مارے ہوئے اس بچے کو اس ناول کا مصنف بنا دیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے تو ناول اپنے مقصد میں ناکام نظر آتا ہے ایلی شروع سے آخر تک ایلی ہی رہتا ہے۔ نہ تو وہ ماہر نفسیات بنتا ہے اور نہ مصنف۔ وہ جرأت و ہمت اور وہ خود اعتمادی اور خود آگاہی تو رہی ایک طرف، جو اس ناول کی تصنیف کے لئے لابدی ہیں۔ البتہ اس کی شخصیت میں کہیں کہیں رنگ جھلکتا ضرور ہے مگر وہ بھی ردعمل کے طور پر۔ کہیں یہ ردعمل واضح ہے اور کہیں ڈھکا چھپا۔

اس ناول کا آخری واقعہ جو ایلی کے کردار کو سامنے لاتا ہے وہ ہے جہاں شہزاد کی طرف نفیسہ کو طلاق دلانے کے اصرار پر گھر سے بھاگ جانا اور اپنے کسی عزیز کے یہاں جا مقیم ہوتا ہے۔ اور وہاں جا کر بھی پندرہ بیس روز تک اس حادثہ سے اس قدر پریشان رہتا ہے کہ اسے یہ ہوش تک نہیں رہتا کہ وہ کہاں ہے اور وہاں کیوں آیا ہے۔

مصنف نے اس واقعہ کو ایلی کی خودداری اور خود اعتمادی کا گواہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے خودداری کا کوئی پہلو مترشح ہوتا ہو لیکن خود اعتمادی کا تو اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ گھر سے بھاگنا خواہ وہ عزت نفس ہی کے لئے کیوں نہ ہو، خود اعتمادی نہیں۔ وہ تو احساس کمتری ہی ہے۔ جو خودداری اور ہٹ دھرمی کا روپ دھار کر سامنے آکھڑا ہوتا اور حقائق سے روپوشی کی راہ سجھا دیتا ہے۔ ایلی حقائق کا مقابلہ نہیں کرتا ان سے فرار اختیار کرتا ہے اس کی شخصیت میں وہ بات ہی نہیں جو شہزاد سے اپنی بات منوا سکے۔ وہ آگے بڑھ کر شہزاد سے یہ نہیں کہہ سکتا: "دیکھوں گا تم نفیسہ کو طلاق کیسے دلاؤ گی" "دیکھوں گا وہ طلاق کیسے لیتی ہے"۔ وہ تو صرف یہ کر سکتا ہے کہ ایک ضدی بچے کی طرح پوری چیز نہ ملنے پر آدھی بھی پھینک دے اور رو رو کر خود کو ہلکان کرے۔ وہ تو ایذا پسندی کے جذبے سے سرشار ہے خود اعتمادی کے جذبے سے نہیں۔ خود اعتمادی کی تصویر تو شہزاد ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اس کے گھر آئی ہے۔ اس نے ایلی کو اپنے بچوں کے بوجھ

ارکھا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس کی احسانمند [illegible] نہیں۔ یہ سب اپنا حق سمجھتی ہے۔ آخر اس نے بھی تو مہربانی کی ہے۔ اس نے بھی تو محبت کی
پچ جوا کھیلا ہے۔ اس نے محبت کی ہے اپنی [illegible] میں لگا یا جس لمحہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی محبت سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے وہ بھوکی شیرنی
ح بپھر جاتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر گھر سے نہیں نکلتی اس لئے کہ وہ اس کو خطا سمجھتی ہی نہیں۔ وہ تو صرف اس بے انصافی کا ازالہ
چاہتی ہے جو اس کی محبت کی توہین کر کے اس کی بیٹی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کے سامنے ایک واضح نصب العین ہے۔ وہ بوکھلائی ہوئی نہیں ہے۔ اس میں وقار
سنجیدگی ہے، جلال ہے، تحکم ہے۔ وہ یہی نہیں سوچتی کہ اب کیا ہوگا۔ وہ یہ نہیں سوچتی کہ ابلی کے گھر سے بھاگ کر کہاں جائے، اس کی نظروں میں دنیا
برائی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ یک لخت ایک فیصلہ کرتی، راہ عمل متعین کرتی اور اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہے۔ لیکن جونہی اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلط راہ پر گامزن تھی وہ
چھوڑ دیتی ہے۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ وہ لوگ جو ابلی کے خلاف اس کی مدد کر رہے تھے، اسے یہ بھی خیال نہیں آتا کہ خود ابلی کیا کہے گا جب
بکا دل جاتا ہے وہ ہاتھ پکڑ کر اسے گھر لے آتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ماں اپنے روٹھے ہوئے بچے کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لاتی ہے اور وہ اس کی ٹانگوں
پٹا ہوا اندر آجاتا ہے۔

اس کے بعد کے واقعات میں صرف ایک ہی واقعہ ایسا ہے جو ابلی کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے اور وہ اس کی دوسری شادی ہے۔ جو عورت کے متعلق اس کے
نگاہ میں انقلابی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ یوں کہنے کو تو وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ایک فلم پروڈیوسر کو متاثر کر کے اس سے پانسو روپے ہتھیا لیتا اور فلمی کمپنی
پرساور ہو کر بمبئی بھی چلا جاتا ہے۔ مگر وہ باتیں اس کی اپنی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ چمک اس کی شخصیت میں سے نہیں پھوٹتی بلکہ محسوس کچھ یوں
ہے جیسے وہ ایک طفیلی سیارہ ہو جو کسی دوسرے سے روشنی حاصل کر کے چمک رہا ہو۔ بلکہ اس کی چمک میں بھی شوخی یا سادگی و پرکاری کی بجائے پراسراریت کا انداز
نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر یہ تو کم ہی کہیں محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنی چرب زبانی یا شوخ کلامی کا احساس یا ان کی تاثیر پر اعتماد ہے بلکہ عام طور پر معلوم
ہوتا ہے جیسے اس نے بلا سوچے سمجھے یا جانے بوجھے ایک بات کہدی جو بن گئی، بلکہ یہ کہ وہ کسی غیر مرئی طاقت کے تحت کچھ کہہ رہا ہو۔ جیسے وہ خود نہ بول رہا
کوئی اور اسے کہلوا رہا ہو۔ بسا اوقات تو ابلی میں اور اس بابا میں کم ہی فرق رہ جاتا ہے جو دو گز زمین کے قطعہ میں چکر لگاتا اور کہتا ہے "ہم کیا ہیں کچھ بھی نہیں۔ وہی ہے سب
ی ہے"۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت کوئی بھرپور تاثر نہیں چھوڑتی۔ اس کی بوکھلاہٹ نہ تو قاری کو ہنسنے پر مجبور کرتی ہے اور نہ اس کی انوکھی باتیں اسے متحیر کرتی ہیں۔ اسے
کے کردار سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔ انتہا یہ ہے کہ اس وقت بھی، جب وہ سادی سے بھرپور عشق کر رہا ہوتا ہے اور زندگی میں پہلی بار اس کی شخصیت میں چمک پیدا
ہے، قاری اس کی اس تبدیلی سے بے نیاز رہتا ہے وہ صفحے پلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے کہ دیکھئے کہیں شہزاد کا بھی ذکر ہے کہ نہیں۔ اور جب اسے پچیس تیس صفحات کے
میں "شہزاد" کا نام نظر آجاتا ہے تو وہ یہ تمام صفحات پڑھتا اس توقع پر کھولا کر لیتا ہے کہ شاید ان میں کوئی ایسی تفصیل ہو، جسے جانے بغیر شہزاد کا کردار ادھورا رہ جائے۔

شہزاد کے مقابلے میں اس کی دوسری دونوں معشوقائیں پرکاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تسلیم کا کردار اگرچہ بہت ہلکا پھلکا اور پھیکا سا ہے تاہم ایک خوشگوار
اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس قسم کے کردار عام طور پر ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں اور اس طرح کے واقعات بالعموم محلوں میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن سائیکل کا
اس قصہ کو نہ صرف بھاری بھرکم بنا دیتا ہے بلکہ اس رومانیت کو بھی کم کر دیتا ہے اور اس کے حقیقی ہونے کے متعلق شبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں بہت سی باتیں فرض کر لی گئی
ثلاً یہ کہ وہ سائیکل لینے ضرور آئے گا۔ مثلاً یہ کہ وہ اس مکان کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا اور اسے وہ مل جائے گا، وغیرہ۔ وغیرہ۔

سادی کا قصہ اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس قسم کا کردار ہمارے معاشرے میں تو ملتا نہیں۔ خط و کتابت تک تو بات ٹھیک رہتی ہے مگر ان کا ملنا
پھر روزانہ ملنا۔ اور یہی نہیں سادی کا اعوار کی درخواست کرنا سب بعید از قیاس باتیں ہیں۔ یہ کردار نہ صرف ہمارے معاشرے میں اجنبی معلوم ہوتا ہے بلکہ خود اپنے خاندان
احول میں بھی کھپتا دکھائی نہیں دیتا۔ منصور جیسے متعلق اور اس کی ماں جیسی سنجیدہ باوقار اور سمجھدار خاتون کے خاندان میں سادی جیسی چھچھوری لڑکی کا کیا کام۔

ویسے تو یہ تمام قصہ ہی ایک بہت بڑا گھپلا ہے۔ جس وقت بخشی اور بخاری ابلی سے رابطہ قائم کر کے اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو محسوس کچھ یوں ہوتا ہے کہ
سادی کے بھائی ہوں گے جو یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ تم یا ابلی سنجیدگی سے محبت کر رہا ہے یا محض دل لگی۔ اور اگر وہ ابلی کو سنجیدہ پائیں تو بدنامی سے بچنے کے لئے خاموشی

کے ساتھ سادی کا ایلی سے نکاح کر دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ وہ اغوا کرنے میں ایلی کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ موقعہ واردات پر پہنچتے ہیں اور سادی کے نہ آسکنے پر ایلی کو ساتھ کر اس طرح فرار ہو جاتے ہیں جیسے ان کا مقصد اغوا کرنے میں ایلی کی مدد کرنے کے بجائے خود ایلی کو اغوا کرنا ہو۔ اور پھر نہ جانے کیوں وہ ایلی کو ملک زیدہ یا وہ سادی کے معاشرے پر چھوڑ جاتے اور خود پردۂ سیمیں سے ایسے غائب ہوتے ہیں کہ جیسے کبھی آئے ہی نہ ہوں۔

ایلی کی سادی سے شادی کو جس انداز سے ختم کیا گیا ہے وہ بھی اپنی نوعیت کا واحد طریقہ ہی ہے۔ جب شہزاد کی ماں کو سادی کے بھائی کی شادی میں لے جایا گیا تھا تو خیال ہوا تھا کہ اس سے اس سلسلے کو ختم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ مصنف نے یہ سلسلہ شروع بھی کیا ہے اور سادی کے دل میں ایلی کی طرف سے شکوک بھی پیدا کئے ہیں، مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ وہ پیدا بھی ہوتے اور بغیر کوئی ہنگامہ کئے مر بھی جاتے ہیں۔ ساری شکایت کے ساتھ ہی ایلی کے ساتھ شالامار چلی جاتی ہے۔ وہاں جا کر بھی وہ اس کا تذکرہ نہیں چھیڑتی۔ پھر وہ اور اس کے گھر والے اصفی محلے بھی آتے ہیں مگر بظاہر بغیر کوئی تاثر لئے واپس چلے جاتے ہیں لیکن جب ایلی ان سے ملنے جاتا ہے تو وہ پر اسرار طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ منصر ایلی کو بلا کر اس سے کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اصل حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ نوکری چھوڑ کر مکان بیچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن منصر کے اس اقدام کے باوجود بھی سادی کی محبت جوں کی توں رہتی ہے۔ عرصہ دراز کے بعد وہ وہاں سے پھر خط لکھ بھیجتی ہے کہ اپنے ابا کے ہاتھ پیغام بھجواؤ۔ حیرت کی بات ہے کہ منصر اپنی بہن کی شادی ایک ایسے شخص سے کرنے پر تو رضامند ہو جاتا ہے جو اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ہونے والے بہنوئی کو کبھی جورو کے قفل کی زبان سے بات کرنا جانتا ہے اور بس، رام کر لیتا ہے لیکن وہ اپنے باپ کو اس امر پر رضامند نہیں کر سکتا کہ وہ لڑکے کے والدین کی خواہش کے خلاف اپنی بیٹی کی شادی صرف لڑکے کے کہنے پر کر دے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کا باپ اس سلسلے میں بہت ضدی واقع ہوا تھا تو اسے ایلی کو خود لکھنا چاہئے تھا۔ ویسے بھی منصر جیسے با وضع انسان کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ ایلی سے وعدہ کر کے پھر بلا وجہ بالکم سے کم ایلی کو وجہ سے آگاہ کئے بغیر اس سلسلے کو اس طرح ختم کر دے۔

اس سلسلے میں ایلی کا رد عمل بھی عجیب اور ناقابل فہم ہے۔ وہ سادی کو اغوا کرنے پر تو تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنے باپ کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ پیغام لے کر جائے اور باپ کو رضامند نہیں کر سکتا تھا۔ تو نہ سہی وہ اس کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ اور بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ تو ایک بار سادی کے باپ سے مل کر اسے رضامند کرنے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔ آخر . . . .
سادی کا باپ کیا کر سکتا تھا یہی نا کہ اسے گھر سے نکال دیتا۔ تو اس صورت حال کا تو وہ پہلے بھی مقابلہ کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے اغوا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو بھی علی اور سادی کا باپ اس سے ناراض ہی رہتے۔ اس صورت میں بھی زیادہ سے زیادہ وہ ناراض ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار نے علی احمد کی زبان سے یہ دلچسپ جملہ کہلوانے کی خاطر کہ "محلے کی لڑکیاں وقت پر کام نہ آئیں تو پھر کب آئیں گی" یہ سب پھیلاوا پھیلایا ہے۔

مصنف نے سادی سے چند کام لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلا تو یہ ہے کہ اس واقعہ سے اس نے یہ دکھایا ہے کہ ایلی اب پہلا سا ایلی نہیں ہے۔ اب اس کی باتوں میں جادو اور اس کی شخصیت میں سحر ہے جس کے اثر سے کوئی بچا نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، مگر قاری تو اس سے صاف بچ نکلتا ہے۔ اور کچھ اس طرح نکلتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کسی کے سحر کی زد میں تھا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایلی شہزاد کی شخصیت سے اس درجہ متاثر ہے کہ اکثر جگہ اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن چونکہ طبعاً وہ اس سے بالکل مختلف بلکہ اسی کی ضد ہے لہٰذا اس کی اور شہزاد کی باتوں میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔

دوسرا کام جو اس واقعہ سے لینے کی کوشش کی گئی ہے ایلی کی خود اعتمادی کا اظہار ہے اس کے لئے دو واقعات کا سہارا لیا گیا ہے ایک جب وہ ضد کر کے سادی کو سگریٹ منہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور دوسرا جب وہ اس کا دوپٹہ لے کر بھاگتا ہے۔ یہ دونوں واقعات ہی اس قدر بعید از قیاس اور بھونڈے ہیں کہ ان پر اظہار خیال لاحاصل ہے۔

تیسرا مقصد جو مصنف کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے اور جو کامیابی کے ساتھ حاصل ہو گیا ہے شہزاد کے دل میں آتش رقابت کو بھڑکانا اور اس کے لئے ایلی کے سامنے گھر کی راہ ہموار کرنا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ناول نگار نے سادی کے کردار کو بہت بھڑکیلا اور شوخ بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ راست سے ہٹ

رہ گیا ہے۔ بھلا یہ ماننے کی بات ہے کہ ایک لڑکی کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ شالامار باغ جائے۔ اس کے ساتھ گھومے پھرے، چھچھوری باتیں کرے۔ وہ سردار کی تو[جہ]
اپنی طرف منعطف کرائے۔ لیکن ان کے گھیرا ڈال کر بیہودہ حد میں لنگوٹے کے آوازے کسیں اور وہ ان کا تنکا بہ ترکی جواب دے اور پھر اپنی عزت و عصمت سمیت
تانگہ میں بیٹھ کر واپس گھر آ جائے۔

چونکہ مقصد ایلی کا یہ نفسیاتی ردعمل دکھانا ہے کہ وہ ہر بات برداشت کر سکتا ہے لیکن یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اسے بے وفا کہے۔

اس ناول کی سب سے بڑی خامی اس کی ضخامت ہے۔ یہ ضخامت اگر ناول کے چند ایک بنیادی کرداروں کو ابھارنے کے لئے استعمال ہو جاتی تو کوئی [مضائقہ]
نہ تھا۔ مگر اس میں یہ ضخامت برائے ضخامت کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوسٹل کے کسی لڑکے کے کمرے سے نیم برہنہ تصویر برآمد ہو تو اسے ہوسٹل سے نکال دیا جاتا ہے
خواہ وہ کوئی ہوسٹل ہو، کوئی لڑکا ہو۔ وہ ایلی سے قریب ہوتا ہو یا نہ ہو۔ کوئی وارڈن ہو، خواہ فارسی پڑھاتا ہو یا حساب، خواہ حمیدی لے کر ملتا ہو یا قطعاً نہیں پھرتا ہو
لڑکے اس کی عزت کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، خواہ ہوسٹل کا ہر لڑکا اپنی پگڑی باندھتا ہو یا ایک لڑکا سب کی بوتا ہو۔ تو پھر ان سب تفاصیل بیان کرنا اور قاری کا وقت
ضائع کرنے کا فائدہ۔

بعض ایسے واقعات کو بھی جو ناول کے بنیادی کرداروں کو ابھارنے کے لئے از بس ضروری تھے بہت غیر ضروری طوالت دے دی گئی ہے۔ ہر چند کہ ایلی کے کر[دار]
ابھارنے کے لئے اسے بازار حسن لے جانا بہت ضروری تھا۔ لیکن اتنی بار نہیں جتنی بار اسے لے جایا گیا ہے۔ ایک آدھ بار تو اس کا نہایت عمدہ جواز پیش کر دیا گیا ہے لیکن
بعد میں تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب بھی ایلی گھر سے نکلتا ہے بازار حسن میں جا کر دم لیتا ہے۔ اگر ایلی کو تعیش پسند دکھانا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن ا[یسا]
بھی نہیں۔ اسے تو صرف یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک اصلی و حقیقی عورت چھپی ہوتی ہے۔ یہ احساس تو ایک دفعہ میں بھی ہو سکتا تھا اصرا[ر]
کا تعلق کثرت سے نہیں واقعہ کی نوعیت سے ہے۔ پھر جن حالات میں وہ وہاں جاتا ہے ان میں سے اکثر ناقابل یقین ہیں۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر جاتا ہے کہ میں ایک
کے سلسلے میں امرتسر جا رہا ہوں۔ پیسے ماں سے لیتا ہے اس کی اپنی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن وہاں جا کر وہ چوبارے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پا[س]
پیسہ کہاں سے آتا ہے اس کا ناول میں کوئی تذکرہ نہیں۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ وہ پیغام رساں بن کر کوٹھے پر جا پہنچتا ہے ممکن ہے کہ وہاں پہنچ[نے]
یہ بھی کوئی ترکیب ہو، لیکن جن باتوں سے وہ بائی کو رام کرتا ہے اور اس کی شخصیت کے جس طلسم کو وہاں آلۂ کار بنایا گیا ہے قاری اسے محسوس نہیں کر پاتا۔

حقیقتاً ناول میں دو ہی کردار ہیں ایک شہزاد اور دوسرے علی احمد۔ شہزاد کو تو ہمارے افسانوی ادب کے نسوانی کرداروں میں ایک منفرد مقام حاصل ہ[ے]
ہے ہر چند کہ اس کے فعل کو کوئی شخص نظر استحسان سے نہیں دیکھ سکتا پھر بھی وہ سب سے الگ ایک اونچے چبوترے پر ایک عجیب شان استغنا [کے]
ساتھ کھڑی نظر آتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔ "دیکھتے کیا ہو، یہ میں ہوں۔ میں ۔۔۔ میں قلوپطرہ نہیں۔ اینا کرینا نہیں۔ ربیقہ کوئی نہیں۔ میں تو
ہوں۔ شہزاد۔" اور قاری ہکا بکا منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہے۔

اس کے کردار میں ایک ذرا سا جھول ہے اور وہ اس کے صفدر کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے شہزاد کے جذباتی انتش[ار]
ایلی کے جذبۂ رقابت کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ لیکن اس جذباتی انتشار کی جھلک اتنی ہلکی ہے کہ بسا اوقات قاری غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور شہزاد کے م[تعلق]
غلط فہمی ۔ یہی ایک چیز ہے جو قاری کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔

علی احمد کا کردار اپنی گوناگوں خامیوں کے باوجود دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ نہ صرف ناول کے ہر کردار کو متاثر کرتا نظر آتا ہے بلکہ قاری کو بھی ا[پنی]
میں الجھاتا ہے اور اسے اپنی دلچسپ باتوں سے محظوظ کرتا ہے۔

ان کے علاوہ ارجمند، بالا اور شریف کے کردار ہیں جنہیں نہایت چابکدستی سے بنایا گیا ہے۔ یہ سب کردار قاری کی توجہ جذب کرتے اور اپنے اپنے
سے ایلی کی شخصیت کو ابھارتے ہیں ہر چند کہ مصنف کی طوالت پسندی اور ناول کی ضخامت میں اس بات کی گنجائش تھی کہ وہ شہزاد اور ارجمند کی صفات کا
ذکر کرتا۔ لیکن مصنف نے اچھا ہی کیا جو ان سے اجتناب کیا۔ غالباً اسے احساس تھا کہ آج کل کے دور میں صرف موٹی کتاب اور خصوصاً طویل ناول

ہیں۔ اس لئے اس نے ایسی باتوں سے اجتناب کیا جو ان کے لئے پڑھنا مشکل ہوجائے۔

عام طور پر ایسے ناولوں میں جن کا نام ان کے کسی کردار پر رکھا جاتا ہے وہی کردار مرکزی کردار ہوتا ہے جس کے نام پر ناول کا نام رکھا جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ شہزادی مصنف کا آئیڈیل ہے۔ وہ اپنے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر اس میں رنگ بھر گیا ہے۔ یہ باعث ہے کہ رنگ ایسا نکھرا کہ سبحان اللہ! اس کے برخلاف مصنف خود ایلی ہے وہ اسے غیر جانبدار نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے خد وخال کا جائزہ خود نہیں لے سکتا۔ اسے یہ اندازہ نہیں کہ کس خط کو ابھارے اور کس کو مدھم کرے کہ اس کی تصویر ابھر کر سامنے آئے اور کھڑی ہو کر قارئین سے باتیں کرے۔ اگر ممکن ہوتا انسان خود اپنا آئیڈیل بن جایا کرے۔ جس طرح آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور اسے نظروں میں تولتی ہے اسی طرح مصنف ہر کردار کو لیتا اور اپنے موئے قلم سے اس میں رنگ بھرتا ہے۔ لیکن جس طرح آنکھ خود کو سوائے آئینہ کے کسی طرح نہیں دیکھ سکتی اسی طرح مصنف ایلی کو نہیں دیکھ پاتا۔ البتہ جب کبھی اس کا عکس شہزادی آئینے میں نظر آتا ہے تو اس کے خد وخال ابھر آتے ہیں۔

انداز بیان کے اعتبار سے ناول بہت کامیاب ہے لیکن نظر ثانی کا محتاج ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصنف کو بعد کے چھ سات سو صفحات نہایت عجلت میں لکھنے پڑے اور اسے نظر ثانی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کہیں کہیں انداز بیان پھیکا نہ ہوجاتا۔ اور ایک واقعہ دوبار تو ہرگز نہ آسکتا۔ ہوتا یوں ہے کہ ناول کے اختتام کے قریب ایلی اپنے ایک دوست کے ساتھ بازار حسن جاتا ہے۔ وہاں اسے ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آتی ہے وہ کہتا ہے: "اماں تو یہاں کس امید پر بیٹھی ہے۔" وہ کہتی ہے "تجھے ہمدردی ہے تو تو ہی آجا۔" اگلے باب میں ایلی کسی دوسرے شہر میں کسی دوسرے دوست کے ساتھ پھر بازار حسن جاتا ہے، وہاں پھر من وعن یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظر ثانی کی کمی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ناول کی نظر ثانی کی جائے۔ اس میں سے غیر ضروری تفاصیل اور غیر ضروری کرداروں کو نکالا جائے۔ ایلی کے کردار کو مزید نکھارنے ابھارنے کی کوشش کی جائے اور اس کو از سر نو قاری کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس میں بکھرے ہوئے موتی ضائع نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اور کرداروں کو چھوڑ کر اس میں صرف ملک شہزادی کا اس قدر عظیم کردار موجود ہے جو اس کو ادب میں زندۂ جاوید مقام دلانے کے قابل ہے مگر مشکل یہ ہے کہ موجودہ صورت میں بہت کم لوگ اسے پڑھنے کی جرأت کرتے ہیں۔

نظیر محسن

لوک گیتوں میں عورت کا مقام

لوک گیتوں کی قدامت کا صحیح اندازہ لگانا اور ان کی ابتدا کا وقت متعین کرنا بہت مشکل ہے تاہم ان کی قدامت کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی اپنے احساسات کو جن الفاظ کے روپ میں پیش کیا وہ گیت ہی تھے۔ راگ اور لے سے دلچسپی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ حقیقت نہ صرف انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ کائنات کے ذرے ذرے میں ہم کو اس ہمہ گیر ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ جو ہوا کی سرسراہٹ، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، ندی کی پرشور روانی، بادل کی گرج، یہاں تک کہ انسان کی نبض اور دل کی دھڑکن میں بھی پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو ہر قوم اور ہر ملک میں ان راگ راگنیوں کا وجود ملتا ہے، جو الفاظ کا روپ دھار کر کبھی شعر کہلاتے ہیں اور کبھی گیت۔

ہمارے ہاں ملک کے ہر حصے میں جہاں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں لوک گیتوں کا سرمایہ ملتا ہے۔ یہ گیت نہ صرف عوامی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ان میں مختلف ادوار کی سماجی و معاشی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور لسانی اعتبار سے علاقائی زبانوں کے دور بدور ارتقاء کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

گیتوں کی نوعیت اور مفاہیم پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں عورتوں کے جذبات کو ایک خاص مقام حاصل ہے ہر زبان میں خواہ وہ ہندی میں ہو یا پنجابی، پشتو ہو یا سندھی، بنگالی ہو یا بہاری زیادہ تعداد ان گیتوں کی ہے جو عورتوں کے لئے بنائے گئے۔ جن میں عورتوں کے لطیف احساسات کی ترجمانی بے مثال انداز میں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پنجابی لوک گیتوں کا جائزہ لیجئے آپ کو عورت کے جذبات کی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی تصویریں نظر آئیں گی۔ کہیں وہ ایک بیٹی کے روپ میں بابل گاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہیں بیوی اور بہو کی حیثیت سے شوہر کی بے وفائی اور ساس نندوں کے ظلم و ستم پر فریاد کرتی نظر آتی ہے۔ اور کہیں ماں کے بھیس میں ممتا کے بے لوث جذبات کے راگ الاپتی ہے زیادہ تعداد ان گیتوں کی ہے جن میں عورت کا مقام ایک محبوبہ کا ہے۔ بڑھاپے سے لڑکپن تک کی کیفیات میں عورت کے جذبات پیش کئے گئے ہیں۔

ہمارے لوک گیتوں میں کھیت میں کام کرتے ہوئے کسانوں، میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے بہادروں اور محبت کے ستائے ہوئے نوجوانوں کی عکاسی بھی بڑی حقیقی اور فطری انداز میں کی گئی ہے لیکن یقیناً عورتوں کا حصہ زیادہ ہے اس کی کئی وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ابتدا ہی سے عورت کے لئے اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار معیوب سمجھا گیا ہے حالانکہ وہ مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی ہوتی ہے گیت ہی ایک ایسا ذریعہ اظہار ہیں جو اس کے قلب کی مختلف النوع کیفیتوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ گیتوں میں عورت اپنے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی۔ حالانکہ روزمرہ گفتگو میں اس قسم کی بات زبان پر لانا بھی اس کے نسوانی وقار کی توہین سمجھی جاتی ہے نسوانی محبت کا اظہار جس طرح گیتوں میں ملتا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا گیتوں میں جو فطری بے ساختگی، لب و لہجہ کی معصومیت، سیدھا سادھا انداز بیان، اور احساسات کی لطافت

پائی جاتی ہے وہ طبقہ نسواں کی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورت نازک و لطیف احساسات کی مالک ہوتی ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں زیادہ نزاکت، گھلاوٹ اور معصومیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے لوک گیت بھی اسی معصومیت کے حامل ہیں۔ سیدھے سادے جذبات کو سادہ الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ لوک گیت اوزان اور عروضی پابندیوں سے یکسر آزاد ہیں۔ ان کی بے ساختہ ادائیگی ہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ صداقت، جذبات و خلوص ان گیتوں کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا تاثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی میں عورت کو جو مقام حاصل ہے اور انسانی روابط میں اس کو جو اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ ان لوک گیتوں سے بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے خصوصاً ہندوستان کی دیہاتی عورت کی مختلف حیثیتوں کا جائزہ بڑی عمدگی سے لیا جا سکتا ہے۔ ان گیتوں میں عورت عہد طفلی میں گڑیاں کھیلتی ہوئی بچی کے روپ میں بھی نظر آتی ہے اور کبھی گھر کی سب سے ذمہ دار اور بزرگ عورت ـــ مقام بھی رکھتا ہے۔ زندگی کی ہر منزل پر وہ ایک مخصوص مقام کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہے۔ پنجاب کے مقبول کھیلوں "کیکلی" اور "ستھال" میں ایک بچی کے تصورات اس کے گھر اور گھر کے ان افراد تک محدود رہتے تھے جو اس کی جذباتی زندگی میں سب سے زیادہ قریب تھے۔ بچی گیند کے ساتھ "ستھال" ڈالتے ہوئے کہتی ہے۔

میرا بھائی پردیس گیا ہوا ہے۔
میں چھت پر چڑھ کر اس کی راہ دیکھتی ہوں۔
وہ ہم تینوں بہنوں کے لئے تحفے لائے گا۔
میرے لئے دوپٹہ اور میری بڑی بہن کے لئے ہار،
اور سب سے بڑی بہن کے لئے ٹیکا۔

یہ معصوم بچی جیسے جیسے گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرتی جاتی ہے اس کے تصورات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ چرخہ کاتتے ہوئے، پنگھٹ پر پانی بھرتے ہوئے اور گھر کے دوسرے کام کرتے ہوئے اس کے احساسات میں جس طرح تبدیلیاں آتی جاتی ہیں وہ ان گیتوں سے پوری طرح اجاگر ہیں۔ ہندی گیتوں میں پنگھٹ کے گیت ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پنگھٹ جو گاؤں کی کنواریوں کے رومانی جذبات کا مرکز ہے، جہاں حسن و عشق کے افسانے پرورش پاتے ہیں۔ پشتو کے لوک گیتوں میں پنگھٹ کی ہر بوٹی شفا کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس نے دوشیزہ لڑکیوں کے آنچلوں کو چھوا ہے۔ پختو نوجوان اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔

عصر کے وقت پانی بھرنے آیا کر۔ اس بہانے سے دیدار ہو جاتا ہے۔

محبوبہ جواب دیتی ہے۔

میں عصر کے وقت پانی بھرنے نہیں آؤں گی
کیونکہ اس سے بڑی تہمتیں اٹھانا پڑتی ہیں
گھڑا اٹھاتی ہوں تو دل لرزنے لگتا ہے
غم نصیب محبوب میرا راستہ روکے کھڑا ہو گا
اگر دنیا والوں کا ڈر نہ ہوتا تو گھڑا اٹھا کر لے جاتا،
اور میں یونہی تیرے ساتھ جاتی۔

ہندی گیتوں کی ستم ناری پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی ہے۔ تو اسے دیر ہو جاتی ہے۔ گاؤں کا ستمگر نوجوان اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اس کا دل باپ بھائی اور ماں کی خفگی کے ڈر سے سہما رہتا ہے لیکن وہ پنگھٹ پر جائے بغیر نہیں رہ سکتی ـــ روز دیر سے واپس آتی ہے اور ڈانٹ

کارستنی ہے آخرکار راز افشا ہوجاتا ہے اور گھر سے باہر نکلنا بند ہوجاتا ہے۔ اور پھر ہجر و فراق کے سلسلے شروع ہوتے ہیں۔
ان گیتوں میں عورت کی سماجی حیثیت کی ہر تصویر بنتی نظر آتی ہے۔ لڑکی جوان ہوگئی ہے مگر اب تک وہ گڑیوں سے کھیلتی ہے گھر کے کام
سیکھنے میں دل نہیں لگاتی ماں اسے گن ڈھنگ سیکھنے کی ہدایت کرتی ہے تاکہ سسرال جاکر اسے ساس نندوں کے طعنے نہ سننے پڑیں اس پر بھی اگر
سسرال میں کوئی طعنہ دے تو ضبط و صبر سے برداشت کرنے کی تلقین کرتی ہے۔

سیکھ لیو گن ڈھنگواں سیکھ لیو نام رسوائی،
ساس نند توری مہا کہ یادیں لیو انچرا پسار ی
(اگر ساس نندیں تیری ماں کو برا بھلا کہیں تو آنچل پھیلا کر سن لینا جواب نہ دینا)

شادی بیاہ کے سلسلے میں مشرقی لڑکی کی مرضی اور انتخاب کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ ماں باپ جہاں چاہتے ہیں لڑکی کی سگائی کر دیتے ہیں۔ اور
یہ ہوتا ہے کہ کہیں سولہ برس کی لڑکی کو سات سال کا شوہر ملتا ہے اور کہیں پچاس سالہ شوہر کو ۱۲ سال کی دوشیزہ یہ بے جوڑ رشتے قدیم دیہاتی
معاشرت میں کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا احساس ضرور تھا — بوڑھا شوہر پانچ برس کی لڑکی کو بیاہنے آیا ہے۔ لڑکی کے گھر کی
عورتیں کہتی ہیں۔

پانچ برس کی موری رنگ رنگیلی اسی برس کا داماد
نکرنہ آؤ نو موری رنگ رنگیلی اے بگر ٹھاڑ و دوار
آنگن کیچ کیچ سینز پچ پچ بوڑھو گر و منہ با نے
سات سکھی مل بڑھوا اٹھا تن بڑھوا سیندور پراؤ

(پانچ برس کی موری رنگ رنگیلی ہے اور داماد اسی برس کا ملا ہے۔ اے موری رنگ رنگیلی باہر نکل کر دیکھ دروازے
پر اژدہام کھڑا ہے اندر باہر بارش کے پانی سے کیچڑ ہو رہی ہے بوڑھا دولہا منہ کے بل گر پڑا۔ سات سکھیوں نے مل
کر بوڑھے کو اٹھایا۔ بوڑھے اٹھ کر دلہن کی مانگ میں سیندور تو بھر دو)

ان بے جوڑ رشتوں پر اس سے زیادہ طنز اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایک سولہ سالہ دوشیزہ کو بالک سیاں سے سابقہ پڑا ہے اس کے جذبات کی
عکاسی اس طرح کی گئی ہے۔

چھوٹے سیاں نادان سے گمان کریں بڑے
پیا سمرن گئے سنگ لگے بلما۔ ماروں ہنسریا (رسی) جھرنے کے
دیا دیا کریں دیا سے متیا کریں ہاتھ جوڑیں مپیاں پڑیں۔
چھوٹے سیاں نادان . . . . .
روئی کرن گئے سنگ لگے بلما، ماروں بلنا (بیلن) جھرنے کے

شادی کے معاملے میں لڑکی اپنی بے بسی کے باوجود شوہر کے متعلق کچھ تصورات ضرور رکھتی ہے جن کو وہ گیتوں میں بیان کر دیتی ہے۔ ایک گجراتی
لڑکی اپنے باپ سے کہتی ہے۔

میرے باپ چادر ڈال کر میرے لئے بر تلاش کرنے چلے ہیں
اے بابا میرا بر بالکل چھوٹا نہ ہو اور نہ بوڑھا جو میری نظر میں نہ سمائے،

جو لڑکی ان نہ ہو۔
لڑکی سسرال جاتی ہے تو ہر قدم پر اسے میکے والوں کی یاد ستاتی ہے۔ اس کا اظہار نیچرل انداز میں اس طرح کیا گیا ہے۔

بھور بھئے ہمیں نندیا آوے ـــــ ساس جگاوے پیس کو ـــــ ہمیں میا کی یاد آوے

" " " " جیٹھانی روٹی کو بیڑے ـــــ ہمیں بھوجی کی یاد آوے

" " " " نند ہری گڑیا کھیلے ـــــ ہمیں بہنا کی یاد آوے

ہندوستانی بیوی کی شوہر پرستی کی داستانیں ان گیتوں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ شوہر پردیس چلا گیا ہے بیوی اس کی جدائی
تو سہہ رہی ہے۔

ہری چنے کب آئیو رے، ادھن شیام گھر سے کب آئیو
بارہ دن کو آون کہی گئے اتنے دن لگیو۔
بارہ برس پہ آئیو رے ادھن ہمیں جیت (جتہا) نہ ہیو،
ادھی بیا من پہر گھنی اے بنج کے دکھیو۔

فرقت زدہ عورت پردیسی پیا کو اپنی حالت زار سنانے کے لئے کاگا اور بھونرے کا سہارا لیتی ہے۔

جب تمہیں پردیس جانا تھا تو مجھ سے گونا کیوں کیا تھا،
میں تمہیں کس کے ہاتھ خط بھیجوں اور کس کے ذریعہ سندیس دوں،
اے میرے بھائی سمان بھونرے اڑ کر جاؤ اور انہیں میرا سندیس دو۔
اے کاگا تم جا کر میری چٹھی پردیسی ساجن کو سنا دو۔

فراق کی ماری بیوی پردیسی شوہر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

" ساس نند مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ شادی کے فوراً بعد ہی سیاں مجھے چھوڑ کر پردیس چلے گئے انہیں میری محبت
کی کشش پر شک ہے۔ اس لئے اے میرے ساجن تم واپس آجاؤ تاکہ مجھے ان طعنوں سے نجات ملے "

شوہر کے بغیر بیوی کو آرائش و سنگھار سے دلچسپی نہیں۔ نندیں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح گہنے کپڑے پہنے۔ لیکن وہ رنجیدہ
ہو جاتی ہے کہ جب میرا دیکھنے والا ہی گھر پر نہیں ہے تو میں کس کے لئے سنگھار کروں۔

ایک گجراتی گیت میں عورت کی وفا پرستی کا ذکر اس طرح ملتا ہے کہ ایک عورت چکی پیستے ہوئے رو رہی ہے ایک راہگیر دلجوئی کر رہا ہے اور رونے کا
دریافت کرتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میرے دروازے پر نارنگی کی جھاڑیاں لگی ہیں جو بارہ مہینے پھولی رہتی ہیں میرے دل کے زخم بھی بارہ ماس
ہرے رہتے ہیں کیونکہ میرا شوہر پردیس گیا ہوا ہے اور میں اس کی راہ تک رہی ہوں۔ راہگیر عورت کو دھن دولت کا لالچ دے کر وفا کی راہ سے ہٹانا چاہتا ہے
تو عورت غضبناک ہو کر جواب دیتی ہے کہ تیرے سونے موتی کو آگ لگے تیری دولت کی بجلی مٹا دے، میں نے اگر وفا کی راہ سے قدم ہٹا لیا تو میری عزت
باقی رہ سکتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کی کتنی حقیقی تصویریں ان گیتوں میں ملتی نظر آتی ہیں۔ میاں بیوی سے ناراض ہے بیوی شوہر کو منانے کے لئے اس طرح
التجا کرتی ہے۔

تمہاری ماں تمہاری پشت پناہ ہے۔

بہن تمہارے سر کی پگڑی [illegible] ہے۔
بھائی دانہ [illegible] ہے۔
لیکن میرے مالک — میں تمہارے پیروں کی دھول ہوں۔

بھائی بہن کے گھر جاتا ہے تو وہ شکایت کرتی ہے کہ ساس مجھ سے منوں اناج پسواتی ہے اور کھانچی بھر برتن منجواتی ہے۔ اس پر بھی میکے والوں کو برا بھلا کہتی رہتی ہے۔ لیکن اس شکایت کے باوجود بھائی سے کہتی ہے کہ میرے دکھ سکھ کا ذکر ماں باپ سے نہ کرنا۔

بچوں کے لئے لوریاں بھی ان لوک گیتوں میں موجود ہیں۔ پختون ماں اپنے بچے کو لوری دیتے ہوئے کہتی ہے۔

سو جا میری جان — سو جا
تیرا باپ لڑائی پر گیا ہوا ہے
تیسے تلوار کمر میں لٹکا کر
وہ اپنا سر وطن کے ناموس کی خاطر دے دیگا
سو جا — میری جان — سو جا
چچا زاد بھائی تاک میں بیٹھے ہیں
سارا وطن تباہ ہو گیا ہے۔
میرے دل سے خون جاری ہے۔
خدا کرے پکی فصل کی طرح بدخواہ لوگ کٹ جائیں۔

ساون کے گیت یوپی کے دیہاتوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں گھر گھر جھولے ڈالے جاتے ہیں۔ نوجوان کنواری بالیاں جھولوں پر پینگیں لیتی ہیں۔ اس موقع کے گیتوں میں مقامیت کے احساس کے ساتھ اس کیفیت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو برہ کی ستائی دوشیزہ پر طاری ہوتی ہے۔ کالی کالی گھٹائیں اور خوشگوار موسم اس کے دل میں پردیسی پیا کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اسے نہ کوئل کی کو کو اچھی لگتی ہے نہ پپیہے کی پی کہاں — بادل گرج گرج کر اس کے دل پر بجلی گراتے ہیں۔ پانی کا شور، بجلی کی کڑک، تنہائی کا احساس بڑھا دیتی ہے اور وہ اپنے پیا کی یاد میں آنسو بہانے اور گیت گانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ان گیتوں میں عورت صرف ایک ماں بہن یا بیوی ہی کے روپ میں نظر نہیں آتی بلکہ وہ ایک محبوبہ بھی ہے۔ ہمارے شعری ادب میں مرد کی طرف سے اظہار محبت معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ان گیتوں میں عورت فطری انداز میں اپنے محبوب کا ذکر کرتی ہے اس کے دل میں محبت وفا قربانی کے جذبات مردوں کی بہ نسبت ذاتی ہوتے ہیں۔ یہ لوک گیت عورت کی وفا اور خلوص کے بہترین عکاس ہیں۔ پنجابی ٹپے اور ماہیئے محبت کی داستانیں سناتے ہیں۔ پشتو لوک گیتوں میں لوبہ، ٹپہ، لنڈی وغیرہ میں عورت کے جذبات کی مختلف النوع تصویریں ہیں۔ ہیر اور سوہنی مہینوال جیسی منظوم کلاسیکی داستانیں تخلیق کرنے میں عورت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

پشتو لوک گیت میں فراق زدہ عورت کے جذبات اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

میں جدائی کے نرغے میں آ گئی ہوں۔
موت مجھے قبول ہے لیکن جدائی قبول نہیں،
اپنا محبوب ساتھ نہ ہو تو میرے لئے ساری دنیا کی بادشاہی ہیچ ہے۔

جدائی کی پہلی رات ہے۔ شام ہی سے رو رہی ہوں کہ رات کیسے گزرے گی۔

چاند آسمان کے درمیان پہونچ گیا۔

ہجر کسی کے گھر ایک دن کا مہمان ہوتا ہے۔

لیکن جب میرے پاس آتا ہے تو سالوں تک ڈیرے ڈالے رہتا ہے۔

ایک پنجابی گیت میں انتظار کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے۔

ہمسائے کے دروازے پر دستک ہوئی، میں نے سمجھا میرا محبوب آگیا۔

دروازہ کھول کر جھانکا تو معلوم ہوا کہ یہ تو دوسرے گھر کا دروازہ تھا۔

میرا دل جل کر رہ گیا۔

میں تیرے انتظار میں ساری رات کھڑکی میں کھڑی آنسوؤں کے ہار پروتی رہتی ہوں میرے محبوب!

اگر یقین نہ ہو تو تاروں سے پوچھ لے کہ تیرے انتظار میں میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔

ان لوک گیتوں میں مردوں کی بے وفائی کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ ایک نا تجربہ کار لڑکی مرد کے رنگین جال میں پھنس جاتی ہے وہ اسے اعلیٰ ذات [illegible] سمجھتی ہے لیکن وہ جلاہا نکلتا ہے اور اس کی عادتیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

لمبی لمبی دھوتیا پہ اودی اندی پگیلے ــ ہم جانا را جپوت رے

جات کا بنسیا ــ مری گوئیاں ــ دگا کھیل رے گئیو میری گوئیاں۔

ان گیتوں میں محبت کا اظہار نہایت سادگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہماری عشقیہ شاعری میں عاشق آسمان سے تارے توڑ کر اپنی محبوبہ کی [illegible] سنوارنے کا دعویٰ کرتا ہے سمندر کی تہہ سے موتی لا کر اس کے قدموں پر نثار کر دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ لیکن ایک دیہاتی عورت کا دعویٰ عشق اتنا ہی [illegible] ساجن کی خاطر داری کرنا چاہتی ہے۔

جو مورے سیّاں کو بھوکا لگے گی ــ آؤ رسیّاں کے بیچ۔ کردوں تورِی بھانی

جو مورے سیّاں کو پیاسا لگے گی ــ آؤ صراحی کے تیر۔ پیلوں تو ہے پانی

جو مورے سیّاں کو تکیا لگے گی ــ آؤ ڈھوبے کے تیر۔ رچلا تورے ہونٹوں پہ لالی

[illegible] اس کے عشق کی معراج ہے۔

غرض کے ان لوک گیتوں میں عورت ایک خاص مقام کی مالک ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی کا ہر پہلو ان گیتوں میں اس عمدگی سے اجاگر ہوتا ہے کہ اس کی ایک مکمل تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

مصطفیٰ زیدی

منزل

آج کیوں میرے شب و روز ہیں محرومِ گداز
اے مری رُوح کے نغمے، مرے دل کی آواز
ایک تاریک ستارہ ہے افق کے نزدیک
اک الم ناک خموشی ہے پسِ پردۂ ساز
اک نہ اک غم ہے نشاطِ سحر و شام کے ساتھ
اور اس غم کا نہ مفہوم نہ مقصد نہ جواز
یہ اندھیرے میں کسے شوقِ پذیرائی ہے
یہ خلاؤں میں کسے ڈھونڈ رہی ہے پرواز
میں تو اقبال کی چوکھٹ سے بھی مایوس آیا
میرے اشکوں کا مداوا نہ بدخشاں نہ حجاز

چند لمحوں سے یہ خواہش کہ دوامی بن جائیں
ایک مرکز پہ رہے سُرخ لہو کی ہلچل
کبھی ہر گام پہ ٹھوکر، کبھی منزل کا حریف
اے جہانِ گُزَراں ایک سے انداز پہ چل
دن کو مہکا ہُوا بَن شام کو تپتی ہوئی ریت
زندگی ایسے طلسمات کے حلقے سے نکل

کہیں حد درجہ لگاوٹ کہیں آہٹ سے گریز
دلِ محبوب نُما اور سنبھل اور بہل

اور کبھی یہ، کہ اگر ایک پلک بھی ٹھہرے
کوئی لمحہ، تو ہر اک سانس گراں ہو جائے
اگر اک گلشن بے خار رہے دامنِ وقت
یہ جہانِ گذراں ریگِ رواں ہو جائے
ایسا مذہب کہ خود اس وجہِ تعالیٰ سے گریز
ایسا الحاد کہ سجدے میں نہاں ہو جائے

اے مری رُوح کے نغمے، مرے دل کی آواز
لُطفِ شب تاب یہی رقصِ شرر ہو شاید
منزلیں پاس سے بھی دُور رہا کرتی ہیں
جستجو حاصلِ عرفانِ سفر ہو شاید
کوئی الحاد میں نازاں کوئی ایمان میں گم
کبھی اس دیدۂ و دل کی بھی سحر ہو شاید
میرے غم ہی میں نہاں ہو نئے سورج کی کرن
کم نگاہی میں ہی پوشیدہ نظر ہو شاید

فارغ بخاری

سنّاٹا

نہ کوئی جشن مسرت نہ کوئی ہنگامہ
نہ لپکتا ہوا شعلہ ہے نہ اٹھتا ہوا درد
نہ کوئی چاپ نہ دستک نہ کسی کی آہٹ
نہ مغنی کا ترانہ نہ بہاروں کا ورود

کوئی طوفاں، کوئی بھونچال کوئی ہنگامہ
میرے احساس کو ڈستا ہے یہ تاریک جمود

نہ کسی ٹوٹے ہوئے ساز کی روتی ہوئی لے
نہ کہیں بجتے ہوئے اجلی ہنسی کے گھنگھرو
نہ کہیں بہکی سی باتیں، نہ کوئی لغزشِ پا
خندۂ قلقلِ مینا ہے نہ آوازِ سبو

یوں ہے ٹھہری ہوئی، سہمی ہوئی مدہوش فضا
جس طرح آکے کوئی پھونک گیا ہو جادو

ٹمٹماتے ہوئے پلکوں پہ ستاروں کے دیئے
یہ سلگتی ہوئی تصویر بنائی کس نے
آج آتی نہیں مرغانِ خوش الحاں کی صدا
صحنِ گلزار میں دیوار اٹھائی کس نے

ہر طرف چھائی ہوئی موت کی خاموشی ہے
لبِ احساس پہ یہ مہر لگائی کس نے

بلراج کومل

جسم کا سفر

برہنہ جسموں کو
نرم کرنوں سے ڈھانپتے
ہم گھنے سسکتے، کراہتے
جنگلوں سے گزریں گے
وادیوں، پربتوں ابھرتے سمندروں کو پھلانگتے
آسماں کو چھوتے
زمیں کو ہنس ہنس گلے لگاتے
اتار لیں گے
لہو میں اک روز
جسم و جاں کے
چھپے ہوئے بے بہا، فراموش بھید سارے

مگر مری جاں!
ہمیں جنوں کے حریں شب و روز
سنائیں گی، یاد آئیں گی

ادھ کھلی مسکراہٹیں
نیم وا دریچے
بچھڑتے سائے
جھجکتی سرگوشیاں
محبت کا اجنبی سا حسین تصوّر

•

یہ وہ گھڑی ہوگی
جب مری جاں
پہنچ چکے ہوں گے
سرنگوں، خاک و خوں میں نہلائے
دل گرفتہ
خموش، پامال
ہم جہنم کی روندتی آگ کے بھنور میں
جہاں سے ہم دونوں لوٹ آئیں
مقام کوئی نہ ہوگا اس آخری سفر میں

ظہور نظر

سالہا سال کے بعد

تیرا آنا تیرا ملنا ہے عنایت، لیکن
تجھ سے اب کون سے پیمان کی تجدید کروں!؟
کون سا گم شدہ ارمان، کہاں پر ڈھونڈوں!؟
کون سے جذبۂ بے جان کو تمہید کروں!؟

سچ تو یہ ہے کہ شبستانِ جنونِ جاں میں
عرصۂ عشق کا جذبہ کوئی بیدار نہیں
دل، کہ ہر زخم کا گرویدہ و مشتاق تھا اب
لذتِ زخمِ وفا کا بھی طلب گار نہیں
زندگی اس شجرِ خشک کے مانند ہے جو
کسی پتے کسی کونپل کا روا دار نہیں

سالہا سال ترے ہجر کا صحرائے عظیم
تشنہ لب آبلہ پا عشق سے چھانا نہ گیا
تیری یادوں تیرے وعدوں کا سنہری چھاتا
لڑکھڑاتی ہوئی اُمید سے تانا نہ گیا

اس قدر تیز تھی تپتے ہوئے آلام کی دھوپ
چاہتیں آس کے دو موڑ مڑیں، بیٹھ گئیں
جستجو اپنا سفر بھول کے حسرت سے ملی
حسرتیں یاس کے دو موڑ مڑیں، بیٹھ گئیں

گرد باد اتنے چلے اتنے بگولے اُٹھے
صبر کا ساتھ ہوا جانے کہاں چھوٹ گیا
حوصلے جتنے تھے سب ریگ تلے دفن ہوئے
ضبط کا ہاتھ خدا جانے کہاں چھوٹ گیا

درد کی پیاس بجھائی نہ گئی اشکوں سے
بارہا ہجر کے صحرا میں یہ چشمہ پھوٹا
زانوئے دل پہ ترے پیار نے دم توڑ دیا
یاد کی گود میں ہر وعدہ و پیماں ٹوٹا
آسرا یاد کا تھا ایک سو وہ بھی نہ رہا
وقتِ رہزن نے یہ زادِ دل و جاں بھی لوٹا

تیرا آنا تیرا ملنا ہے عنایت لیکن
تجھ سے اب کون سے پیماں کی تجدید کروں!؟
کون سا گم شدہ ایماں، کہاں پر ڈھونڈوں!؟
کون سے جذبۂ بے جان کو تمہید کروں!؟

پال ورلین

ضمیر احمد

پت جھڑ کا گیت

دِل کے زخم مہک اُٹھے ہیں پھر پت جھڑ کی رُت آئی
پژمُردہ۔ خوابیدہ فضا پر ایک گرانی سی چھائی

وقت نے یہ کیا سرگوشی کی بیتے دن لَوٹ آئے ہیں
رنگ اُڑا، دِل ڈوب گیا۔ اشک آنکھوں میں بھر آئے ہیں

آوارہ یادوں کے بگولے دُھوم مچاتے پھرتے ہیں
جیسے سوکھے پتے ہر سو خاک اُڑاتے پھرتے ہیں

فعت سروش

راکٹ انسان اور ستارے

اڑا وہ راکٹ

فضا کے سینے میں ایک ہلکی سی تھرتھرائی
سکوت انگڑائی لے کے جاگا
ہزاروں برسوں سے جس فضا میں خموشیوں کے مہیب ڈیرے پڑے ہوئے تھے
وہ چونک اٹھی زندگی کے قدموں کی سن کے آہٹ
پھر اس نے اپنا رباب چھیڑا
ہواؤں نے ارغنوں بجایا
مچل اٹھا اک انوکھا نغمہ

فضا:- میں فضا کی پری میں فضا کی پری
بولی چھن چھنن آج پائل مری
میں زمان و مکاں کی اچھوتی دلہن
چاندنی سا بدن، دھوپ کا پیرہن
میرا نغمہ ہے فطرت کی جادوگری
میں فضا کی پری میں فضا کی پری
محو راحت تھی میں کس نے چونکا دیا
کس کے قدموں کی آہٹ کا بربط بجا
میری خلوت میں آیا کوئی اجنبی
میں فضا کی پری میں فضا کی پری

ی اڑا وہ راکٹ
پیامبر زندگی کا بن کر
فضا کے دل کا یہ نغمہ سن کر
زمیں کا وہ اجنبی کبوتر
کچھ اور مستی میں پھڑپھڑایا
اور اپنے اڑتے فضا سے بولا

راکٹ:- میں ہوں پر پرواز نئی فکر جہاں کا
فضا:- اے اجنبی مہمان ارادہ ہے کہاں کا
راکٹ:- ایٹم کا جگر فطرت انساں نے کیا چاک
بازیچۂ اطفال ہے اب رفعت افلاک
پیکر ہوں میں انساں ہی کے عزم جواں کا
میں ہوں پر پرواز نئی فکر جہاں کا
فضا:- اے شعلۂ آوارہ ذرا دیر ٹھہر جا
راکٹ:- ہے حکم مجھے شورش منزل سے گزر جا
بندہ ہوں میں تہذیب کے آشفتہ سراں کا
میں ہوں پر پرواز نئی فکر جہاں کا
یہ تیرا شبستاں تو مری راہگذر ہے
درپیش ابھی مجھ کو ستاروں کا سفر ہے
پروانہ ہوں میں شمع شبستان زماں کا
میں ہوں پر پرواز نئی فکر جہاں کا
فضا:- اے شعلۂ آوارہ ذرا دیر ٹھہر جا
راکٹ:- ہے حکم مجھے شورش منزل سے گزر جا

راوی:۔ اڑا وہ راکٹ کہ جو اِدھر اونچا
ہواؤں کی کشمکش سے الجھا
فضا کے خلوت کدہ سے نکلا
فضا کا خلوت کدہ کہ جس پہ دبیز پردے پڑے ہوئے تھے،
سنہرے بادل گھرے ہوئے تھے
سبک بدن ایٹمی کبوتر
مکاں سے اڑ کر زماں میں پہونچا
خلا کی پر ہول خامشی نے
بڑے تجسس سے اس کو دیکھا
جبیں پہ جس کی غرور تھا علم و آگہی کا
لبوں پہ افسانہ زندگی کا

عروج آدم پہ عقل حیراں تھی مشتری کی
زحل کو سکتہ سا ہو گیا تھا
بڑے تعجب میں تھا عطارد
نگاہ زہرہ میں تھا تجسس
لبوں پہ تھا چاند کے تبسم
شہاب ثاقب لپک کے آئے سلام کرنے
زمیں کے اس پیامبر کو
خراج لائے عقیدتوں کا

ستارے:۔ کون ہو تم! کہاں سے آئے ہو
بزم افلاک کے حسیں مہماں
تم سے مل کر خوشی ہوئی لیکن
دیکھ کر تم کو عقل ہے حیراں

راکٹ:۔ میں ہوں تخلیق ذہن انساں کی
اک کلی ایٹمی گلستاں کی
میں زمیں کا سلام لایا ہوں
زندگی کا پیام لایا ہوں
زہرہ و مہر و مشتری کے لئے
دل کا رنگین جام لایا ہوں

ستارے:۔ کیا زمیں بھی کوئی ستارہ ہے؟

راکٹ:۔ ہاں، خلا کا ہے وہ بھی سیارہ،
آدمی نے بنا لیا گلزار
تھا کبھی اک دہکتا انگارہ

فکر انساں کی ہے یہ جولاں گاہ
ہے جہاں مشتری سی محبوبہ
آدمی کو بہت لبھاتا ہے
چاند کا دلنشیں حسیں چہرہ

چاند:۔ میں تو اک داستان وحشت ہوں
ہوں اگر کچھ تو درس عبرت ہوں
زندگی کا وجود مجھ میں کہاں
ایک تاریک نقش فطرت ہوں

ستارے:۔ ہم سبھی رشک صد بیاباں ہیں
اپنی حالت پہ آپ خنداں ہیں
اے پیامی عروج آدم کے
ہم فراست پہ اس کی حیراں ہیں

کیا وہ پیغمبر حیات و جمال
بزم زہرہ میں آ نہیں سکتا؟
کیا مغنی رموز فطرت کا
چاند کو گدگدا نہیں سکتا؟

ہم سبھی زندگی کے طالب ہیں
ہم سبھی آدمی کے طالب ہیں

راکٹ:۔ وہ بھی ہے اس جہاں کا شیدائی
سیر افلاک کا تمنائی
دیدنی ہے یہاں کی زیبائی

ں کو ہے ذوقِ بزم آرائی
ھپر ہمارا سلام لیتا جا
ستارۂ بہار کے نام
پھول کا پیام لیتا جا
زو ہے کہ اے فلک پیما!
دمی تیرے ساتھ آئے یہاں
ور زمیں کے مہکتے گلشن سے
زندگی کی بہار لائے یہاں
نگ ہیں اس جہاں کے ویرانے
سازِ دل چھیڑے، گیت گائے یہاں
چاند کے زخم کا علاج کرے
زہرہ و مشتری پہ راج کرے
جا مگر جلد لوٹ کر آنا
منتظر ہم کھڑے ہیں راہوں میں
ذوق دیدار بڑھتا جاتا ہے
حسرتِ دید ہے نگاہوں میں
چلا وہ راکٹ زمیں کی جانب
فرازِ عرشِ بریں سے اترا،
نئے حوادث، نئے تحیر، نئے تجسس کے پھول چن کر،
ہزار اسرار آسمانوں کے ساتھ لایا
حیاتِ نو کو پیام سیارگاں سنایا
کیا یہ محسوس آدمی نے
کہ یک بیک پائے زندگی پر
ہزارہا عالمِ تجسس کے در کھلے ہیں
شعورِ ہستی کے کارواں کو
اک اجنبی راہ میں اچانک
ہزارہا قافلے ملے ہیں
عمل کی میداں کی وسعتیں اب،
خلا کی وسعت سے جا ملی ہیں،

ـــو ں ـــے ـــــ
خـــرد کی ان کامرانیوں پہ
سرودِ چنگ و رباب چھیڑے
نشاطِ ہستی کے جام چھلکے
چھنک اٹھی زندگی کی پائل
حسین نغمے فضا میں بکھرے

نغمہ:-

ناچ رہی ہے زمیں جھوم رہا آسماں
آئی ہے نئی بہار زندگی ہے شادماں
ہیں فضا کے لب پہ آج گیت فتح شوق کے
اب خلا میں گونجتے ہیں زندگی کے زمزمے
لو پہونچ گئے کہاں نسلِ گل کے کارواں
ناچ رہی ہے زمیں جھوم رہا آسماں
آج محفلِ حیات کس قدر حسین ہے
اک طرف ہے مشتری اک طرف زمین ہے
آج وہ یقین ہے تھا جو کل تلک گماں
ناچ رہی ہے زمیں جھوم رہا آسماں
کہکشاں کو ہم نے اپنی بزم میں سجا لیا
زہرۂ فلک کو اپنا ہم نشیں بنا لیا
خوب رنگ لائی ہیں دل کی بیقراریاں
ناچ رہی ہے زمیں جھوم رہا آسماں

راوی: خوشی سے مخمور آدمی نے
عروج سے آسماں کو دیکھا۔
عروج پر اپنے مسکرایا
زمیں جیسی نظامِ شمسی کی اک حسینہ کو جس نے اپنی دلہن بنایا
وہ جس کی محنت نے خاک پر گلستاں اگائے
سر تل کے حسین پودے لطیف صورت میں لہلہائے
سنہرا گیہوں
سفید چاول

رسیلے پھل اور مہکتے پھولوں کے شوخ جھرمٹ
وہ آدمی جو زمیں کے خلوت کدے میں پہنچا تو ساتھ لایا چھپے خزانے
دمکتے ہیرے، زمیں کی انگشتری میں ہنستے ہوئے نگینے
سنہرا سونا کہ جیسے سورج کی شوخ کرنیں
حسین چاندی کہ چاندنی جیسے مسکرائے
چمکتا ابرق کہ جیسے پانی میں جھلملائیں حسیں ستارے
وہ آدمی بحرِ بیکراں سے جو چن کے لایا حسیں موتی
وہ آدمی جس نے رازِ ایٹم کا فاش کر کے جبینِ تقدیر کو جلا دی
وہ آدمی جس نے برفزاروں کی خلوتوں میں بنائے عزمِ رواں کے مسکن
وہ آدمی جس نے کوہساروں کی چوٹیوں پر اڑائے عزمِ جواں کے پرچم
وہ آدمی اب چلا فلک سے خراج لینے
خلا کی دوشیزگانِ رقصاں کو زندگانی کا ساز دینے
اڑا وہ راکٹ امینِ قلبِ حیات بن کر
خود اپنے خالق کو لے کے پہونچا خلا کی پر ہول وسعتوں میں
جہاں پہ مشتری عطارد سبھی کو تھا انتظار اس کا
نقاب اٹھائے ہوئے تھی زہرہ
قمر کے چہرے پہ بے بسی تھی
نگاہ ویراں تھی مشتری کی
اور آدمی تھا کہ یادِ ماضی میں کھو گیا تھا

(آدمی:- یہی وہ جنت ہے جس کے خوابوں میں میں نے صدیاں گزار دی ہیں
یہی وہ عالم ہے جس کو کہتا تھا عالمِ نو میں زمیں پہ
یہی وہ پیکر ہیں جن کا پرتو مصوری میں ہے اور تصور ہے شاعری میں:
یہی وہ سیارے ہیں کہ جن پر لکھا ہے تقدیر کا فسانہ

(آدمی:- پلک جھپکتے میں یادِ ماضی ہوئی فسانہ
گذر گیا یک بیک زمانہ
اب اس کے ہونٹوں پہ تھا تبسم
حسین حیات آفریں تبسم
جدید سائنس کا تبسم
مگر جو اس نے بغور دیکھا

نظر ملی اس کی مشتری سے
نظر کہ جس میں ہزار دعوے، ہزار وعدے، نہ جانے کتنی تسلیاں
دلِ محبت کی گرمیاں تھیں

خلا کے خلوت کدے میں جا کر
کیا یہ محسوس آدمی نے
کہ جیسے وہ بھی وطن ہے اس کا
کہ جیسے حسرت سے دیکھتا ہے اسے خلا کا ہر اک ستارہ
دمک اٹھا اس کے دیدہ و دل میں جوشِ تخلیق کا شرارا

(آدمی:- ایک ہے کائنات کا مرکز
ایک ہے یہ وجود کی دنیا
ہیں نشانات میری منزل کے
وہ زمیں ہو کہ چاند ہو زہرہ
یہ خلا کے عجیب سیارے
داغ ہیں عہدِ نو کے دامن پر
دل زندہ زمیں کے سینہ میں!
ان کے پہلو میں ہوں مگر پتھر
اک طرف زندگی کے ہنگامے
اک طرف موت کی خموشی ہے
اک طرف رقص و چنگ و بادہ و جام
اک طرف بے حسی سی طاری ہے
میں زمیں کو بنا چکا گلزار
اب خلا نے مجھے پکارا ہے
ہے بہار آفریں مری فطرت
میرا محبوب ہر ستارہ ہے
ہر ستارہ کو زندگی دوں گا
میں نظامِ حیات بدلوں گا
علم و حکمت کی عظمتوں کی قسم
پتھروں کی صفات بدلوں گا

(آدمی:- فلک کی پر ہول خامشی نے

ستارے۔ اعلان آدمی کا
حسین پیغام زندگی کا
خلا کی دوشیزگانِ رقصاں نے مل کے چھیڑا نیا ترانہ

اردو کا نغمہ :-

فرش سے عرش پر آدمی آگیا
مرحبا پیکر زندگی آگیا
سونے آنگن میں پائل چھنکنے لگی
آج محفل کی محفل چہکنے لگی
نغمہ در رقص کا مدعی آگیا
فرش سے عرش پر آدمی آگیا
آدمی چھیڑ دے پیار کی راگنی ،
نغمۂ زندگی، نغمۂ زندگی
حسن کی فطرت میں ہے دلبری آگیا
فرش سے عرش پر آدمی آگیا

آدمی:۔ تم مجھے ساز دو گیت گاؤں گا میں
اک نئی لے میں نغمہ سناؤں گا میں

میں بصد نازشِ خسروی آگیا

ستارے و فرش سے عرش پر آدمی آگیا

آدمی:۔ خیمہ زن ہیں خلا میں جو دیا نیاں
ان کے پہلو میں خوابیدہ ہیں گلستاں

ستارے:۔ بن کے پھولوں کی تابندگی آگیا
فرش سے عرش پر آدمی آگیا

راوی:۔ ابھی تو ہے اشتیار رہ در رسم عاشقی کی
ابھی آئیں گے ہزاروں کٹ
زمیں سے آسماں کی جانب
اور آسماں سے زمیں کی جانب
پیامبر زندگی کے بن کر
سکونِ تخلیق اگر میسر ہو آدمی کو
اگر نہ الجھے زمیں کے کانٹوں سے اس کا دامن
اگر نہ ہو اس کے ذہن پر خوفِ جنگ طاری
اگر منظم ہوں قوتیں علم و جستجو کی
تو کوئی دن میں وہ اپنے قدموں سے دشتِ وحشت میں ساز چھیڑیگا
حسین خوابوں کے پھول لے جائیگا ستاروں کی انجمن میں
خوشا وہ لمحہ قریب تر ہے
کہ کہکشاں اس کی رہگذر ہے
سفر جو باقی ہے مختصر ہے !

سلام مچھلی شہری

○

سرحدِ فنا تک بھی تیرگی نہیں آئی
یُوں بھی راس اندھیروں کی زندگی نہیں آئی

تم شراب پی کر بھی ہوش مند رہتے ہو
جانے کیوں مجھے ایسی مئے کشی نہیں آئی

جس کی بھی تباہی ہو کچھ اثر تو رکھتی ہے
آج میری حالت پر کیوں ہنسی نہیں آئی

اوس رات بھر برسی، پھول رات بھر روئے
پھر بھی ان کی پلکوں پر کچھ نمی نہیں آئی

رہبرانِ دانش کی زندگی بتاتی ہے
کام کن منازل میں آگہی نہیں آئی

میری موت سے شاید زندگی جواں ہو گی
روشنی سے پہلے کب تیرگی نہیں آئی

لوگ چار ہی دن میں بن گئے سلامؔ اے دل
اور خود مجھے اب تک شاعری نہیں آئی

مدن موہن تلخ

○

اک شام کسی کی محفل سے یوں تنہا تنہا ہم آئے
پہچان نہ پائے سامنے جب اپنے ہی نقشِ قدم آئے

یوں تجھ سے بچھڑنا صدمہ ہے لیکن اب تک جی پر نہ کھلا
کیوں تو یہ تعلق بن سا گیا، پھر کیوں اس میں یہ غم آئے

ہو لاکھ یقیں اک دوسرے پر اک شک سا دلوں میں پھر بھی ہے
یہ بات نہ ہو تو ذکرِ وفا اپنی باتوں میں کم آئے

اب ہم سے تعلق تھا کہ نہیں، تم کوئی بات کرو اپنی
اس طرح نظر آئیں گے ہم جس طرح کہ دل میں غم آئے

کیا تیرے ستم کیا تیرے کرم اس جان پہ کیا اک آفت ہے
کچھ بھولنا چاہیں تو مشکل اور کم کم یادِ کرم آئے

یوں وہ بھی تعلق جبر نہ تھا، پھر بھی اب اکثر سوچتا ہوں
بے ساختہ جب کہ ملے ہوں ہم کیوں ایسے ملے کم آئے

خود جان سکے جو کچھ جانتا ہے، کیا ہم سے پوچھنا کیسے ہیں
ہم خود میں تو رہتے ہی نہیں، تو ہو یا شامِ غم آئے

اک پورا تعلق اس لمحے کچھ بھولا بھولا جان پڑا
ہستی میں نہ جب وہ درد ملا، اشعار میں جو پیہم آئے

لو آج بتا دیتا ہوں تمہیں کیوں میں اس داد پہ شاداں ہوں
پہلے کیا تھا اس زندگی میں تم آئے تو یہ غم آئے

ہم تیری بات تو کیا کرتے خود اپنی بات نہ کر پائے
اے دوست نہ اپنے تھے نہ ترے جس لمحے خود میں ہم آئے

میری تکمیل ہوئی کیسے یہ راز بھلا میں کیا جانوں
جو کچھ ہے انہی میں مضمر ہے جو مرحلے زیرِ قدم آئے

وہ میرے خیالوں میں آ کر تاثیرِ نوا بننے کو ہیں
اے آمدِ شامِ غم! اس پل کچھ تیری صدا بھی کم آئے

مل بیٹھنے کو آئے تھے ہم، وہ دن ہے اور یہ شامِ غم
کیا اکھڑا اکھڑا جیون ہے کب دیکھئے دم میں دم آئے

اب اپنے خیالوں میں اکثر محسوس کچھ ایسا کرتا ہوں
کہنے کو نہیں کچھ بھی لیکن، سننے کو اک عالم آئے

اب عشق ہے جس منزل پہ وہاں کہنے سننے میں رہا کیا ہے
اب تو اس بات پہ حیرت ہے کیوں ان باتوں میں ہم آئے

اے جانِ یقین جی آج ترا رد اٹھا میری حالت پہ، مگر
میں بھی تو یوں آیا جیسے اک کشتۂ شک و ستم آئے

کچھ فاصلے ہیں کچھ یادیں ہیں کس درد کا دل کو واسطہ دوں
اب ذکر بھی تیری جفاؤں کا اپنے لب پر کم کم آئے

اک حادثہ ہو تو غزل کی بھی کچھ نوک پلک بن جاتی ہے
کچھ آپ بھی تلخ اگر مانیں اس رنگ میں اب تک کم آئے

عباس احمد عباسی

○

میرے ہمدم مرے ساتھی مرے پیارے عالی
مجھے بتلاؤ بہاروں نے مجھے پوچھا ہے
ہر نیا پھول تو ہنستا ہے نظارے کو مرے
چاند تو اب بھی سرِ شام نکلتا ہوگا
آئے گی کوچہ و بازار میں آوارہ نسیم
سوچتے ہوں گے مرے دوست کہ شاید مجھ کو
ان سے جا کر یہی کہنا کہ بڑے عیش میں ہوں
تم تو واقف ہو بھلا تم کو میں کیا بتلاؤں
سرد و مرطوب سیہ خانے میں یاد آتا ہے

اجنبی دیس میں کچھ دیر کریں ذکرِ وطن
میرے ہی واسطے ہیں نوحہ کناں اہلِ چمن
خار ویران ہیں ملتا نہیں میرا دامن
ڈھونڈتی ہوگی مجھے راہ میں ہر ایک کرن
میرے بعد اس کو ہوا کیا جانیے کیا کیا الجھن
حسنِ تقدیر سے جنت میں ملا ہے مسکن
راس آئی ہے بہت مجھ کو فضائے لندن
آہ اے دوست ان آزاد فضاؤں کی گھٹن
سانولا چہرہ پسینے سے شرابور بدن

ذکر جو چاہے کرو نام نہ اس کا لینا
جس کی یادوں کی کھٹک ہے مرے دل کی دھڑکن

جعفر شیرازی

جگنو نظر پڑے کوئی اختر دکھائی دے — اس گھور شب میں کوئی تو رہبر دکھائی دے

اب کوئی کیسے سرحدِ غم پار کر سکے — جب تیرا در ہی سدِ سکندر دکھائی دے

آخر کوئی فریب کی حد اے سرابِ زیست — صحراؤں میں پھریں تو سمندر دکھائی دے

اے درد آنسوؤں میں فروزاں ہی رکھ ہے — شعلہ وہی جو آب کے اندر دکھائی دے

پایاب پانیوں کا سہی عکسِ اشکِ غم — اس بحر کا کوئی تو شناور دکھائی دے

کیا دیکھنے کی تاب ہو جعفر اُتر کے جب
مہتاب اسی مکان کی چھت پر نہ دکھائی دے

افضل حسین اظہر

جب دلِ زار سوالی ہوگا　　آپ کا نازِ مثالی ہوگا

بندہ پرور نہ ہوئے آپ اگر　　کون محتاج کا والی ہوگا

چارۂ پستیٔ قسمت کیجے　　مرتبہ آپ کا عالی ہوگا

آپ کے خندۂ شیریں کے قریں　　میرا فردوس خیالی ہوگا

پھول مرجھا کے کھلیں گے آخر　　نہ یہ گلچیں، نہ یہ مالی ہوگا

پھر گلستاں میں بہار آئے گی　　چہرۂ برق جمالی ہوگا

پھر تو مل جائے گی تسکین اظہر

دل جب احساس سے خالی ہوگا

اختر سکندروی

کیسے افسردگیِ دل کو چھپائے کوئی
غم اگر بارِ جہاں ہو تو اُٹھائے کوئی

انتقاماً مرے حالات پہ ہنسنے والے
تیرے ہونٹوں کا تبسم نہ چُرائے کوئی

روشِ جور و ستم ایک حقیقت ہی سہی
آدمی شاخ نہیں ہے کہ جُھکائے کوئی

اپنی بربادیٔ تقدیر سے ڈر لگتا ہے
آج پہچان کے نظریں نہ چُرائے کوئی

یوں گذارے ہیں جوانی کے حسیں دن ہم نے
جیسے مجبور بُرے وقت کو ٹالے کوئی

ایک میخانہ ہے اختر جسے دُنیا کہیئے
سب ہیں مدہوش یہاں کس کو سنبھالے کوئی
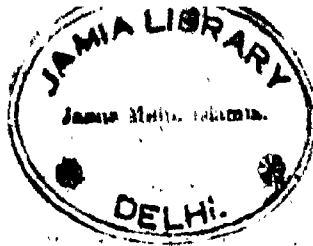
انور عظیم

شہزادہ گلفام

نہ جانے کس اُلو نے اس کا نام شہزادہ گلفام رکھ دیا تھا۔ شمشیر سنگھ نہ تو شہزادہ تھا اور نہ گلفام۔ وہ ٹھیٹھ پہاڑی چھوکرا تھا۔ سو فیصدی گرا ہوا لی۔ اس کا چہرہ چپٹا تھا، گول ہونٹ موٹے، دو جبڑوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، پیشانی تنگ اور بال سیدھے مگر لمبے ان میں تیل جذب کرائے کنگھے سے لہریں ڈالنے کے سو جتن کئے جاتے تھے۔ زیادہ تر صاحب کی ادھ جلی سگریٹ اور کبھی کبھی دست غیب سے حاصل ہونے والی سگریٹ کے کش اڑاتے رہنے کی وجہ سے اس کے خوبصورت دانت خاصے پیلے پڑ گئے تھے۔ منہ اندھیرے اٹھ کر سے ڈنڈ بیٹھک کرنے کی وجہ سے اس کا جسم کافی گٹھا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں اور رانوں میں مچھلیاں تڑپا کرتی تھیں۔ جسم میں شہسواروں والی چستی تھی اور آنکھوں میں، گھات میں بیٹھے ہوئے شکاریوں کی آنکھوں کی طرح چنگاریاں سی چمکتی رہتی تھیں۔

صاحب کی کار بجری پر سرسراتی ہوئی پھاٹک سے نکلی اور شہر کی طرف مڑ گئی۔ اٹھارہ انیس سال کی آدی باسی کرستان آیا کریمن نے شمشیر سنگھ کو ایش ٹرے سے سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا اٹھاتے دیکھا اور وہ دودھ کی بوتل کو نپل بے بی کے منہ میں ڈالنا بھول گئی۔ وہ اٹھلاتی بل کھاتی بالکنی میں آئی، بالکل شمشیر سنگھ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ چھوکرے کو اپنے بازوؤں پر کسی گرم، نرم اور نکیلی چیز کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ اچھل پڑا۔

"کریمن تیری آنکھیں ہیں یا بٹن۔ دھنسی چلی آ رہی ہے۔۔۔۔"

"کیا چرا رہا ہے بتا؟"

"چرانے ہوں گے تیرے ہوتے سوتے۔ صاحب میرا راشن چھوڑ گئے ہیں سو لے رہا ہوں۔۔۔" اس نے بغیر کسی کسیاہٹ کے جواب دیا۔

"صاحب کا بچہ ــــ چور۔۔۔۔" کریمن سینہ تان کر، مرنے مارنے کے انداز میں اور قریب ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل اندر ہی تھی۔

"کریمن کی بچی ــــ" شمشیر سنگھ اچھل کر اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی بھیگتی مسیں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

بے بی پھوٹ کر رو دی اور کریمن اسی طرح ہوا سے لڑتی ہوئی پالنے کی طرف لپکی۔

شمشیر سنگھ نے سگریٹ کا ٹکڑا بڑے فلمی اسٹائل سے جلایا اور نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اکڑتا ہوا زینے کی طرف بڑھا جہاں سے مڑتے ہوئے اس نے ترچھی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ ہرن کی طرح رک گیا۔ میم صاحب نے سارے کپڑے اتار دئے تھے۔

ساٹن کا سفید پیٹی کوٹ ہاتھ میں لئے سنگار میز کے سامنے کھڑی آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھیں۔ روشن دان سے دھوپ کی ایک تاش گری اور میم صاحب کی گوری پشت پر تلوار کی دھار کی طرح چمکنے لگی۔ یہ میم صاحب کیا دیکھتی ہیں، آئینے میں روز روزا شمشیر سنگھ نے زور سے سانس لی۔ میم صاحب مڑیں اور اس کی آنکھوں میں روشنی کے ہزاروں بلبلے ٹوٹ گئے۔ میم صاحب کا گدا روشن، نرم، ننگا جسم دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے دل میں پجاریوں والی پاکیزگی امڈ آتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا دل پگھلا جا رہا تھا سفید پیٹی کوٹ نے سنہری رانوں کو چھپا لیا۔ میم صاحب نے اپنی سرمئی بغلوں میں پہلے یوڈی کلون کی ٹھنڈی پھواریں برسائیں پھر پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا اور بلاؤز پہن لیا جس کی باہیں شانے کی ہڈیوں تک کٹی ہوئی تھیں۔ پھر چکن کی سفید ساری اٹھائی۔ شہزادہ گلفام کے پٹھے تن گئے۔ وہ پالتو کتوں کی طرح انتظار کرنے لگا۔

"شمشیر سنگھ" میم صاحب کی جھنجھلاتی، کرخت آواز نے اس کے جسم میں جھرجھری دوڑا دی۔ یہ آواز اسے بڑی شہریلی اور گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی چٹکی سے سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا اڑا اور وہ میم صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا۔

میم صاحب اب سنگھار میز سے ہٹ کر الماری کے آئینے کے سامنے کھڑی تھیں۔ سفید چکن کی ساری۔ سفید بلاؤز، گہرے کاجل پھیکے گلابی لپ اسٹک سے بھیگے ہونٹ، ساری کے پلو کا بوجھ کچھ شانے اور کچھ ہاتھ پر، دوسرا ہاتھ آگے کی طرف کمرے کو سہارا سا دیتا ہوا — شہزادہ گلفام نے بھی یہ جھلک آئینے میں دیکھی۔

"کپڑے سمیٹ لینا۔ میں چلی۔ شام کو آؤں گی . . . ."

میم صاحب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں۔ ان کی یہ جلدی اسے بہت کھلتی تھی۔ لیکن وہ کر کیا سکتا تھا۔ انہوں نے بے بی کو پیار بھی نہیں کیا اور نہ اپنی بڑی بڑی گھنی پلکیں جھپکا کر ٹا ٹا کیا۔ بس وہ چلی گئیں اور گھر میں سناٹا چھا گیا۔

"چپکی بیٹھ بے بی ورنہ ہاں . . . ." کریمن کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔

"تا تا تا تا تا!" بے بی اپنی تتلاتی زبان میں گانا گائے جا رہی تھی۔

شہزادہ گلفام چند لمحے یوں ہی کھڑا رہا۔ میم صاحب چلی گئیں، روشنی چلی گئی۔ وہ اب بھی قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کاجل میں ڈوبی ہوئی پلکیں تھرتھرا رہی ہیں بھیگے ہونٹ پھیل رہے ہیں، سمٹ رہے ہیں — ایک ایسا عکس جو پت جھڑ کے موسم شام کے وقت جھیل کے کنارے پانی میں جھلمل جھلمل کرتا ہے اور دھندلکے میں کھو جاتا ہے۔ وہ گڑھوال کی پہاڑیوں سے آیا اس نے پہلے نہ ایسی رنگوں کی جھیل دیکھی تھی اور نہ ایسی لہکتی ہوئی شام۔

"ارے او نواب زادے!" کریمن کی چیخ سنائی دی۔

شہزادہ گلفام نے سنی ان سنی کر دی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا عکس بھی آئینے میں دیکھا۔ بڑے بڑے آنکھوں میں جھکے آ رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم سے تڑپتا ہوا خون آگ کی طرح چھن رہا ہے۔ اس نے بالوں کو جھٹکا دیا، اپنے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر آنکھ ماری، بلاؤز، پیٹی کوٹ اور برسیری اٹھائے اور غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل خانے میں آئینے شیشے کی کارنس پر صاحب کا چھوڑا ہوا شیونگ کا سامان تھا۔ سیفٹی ریزر پر جمے ہوئے صابن میں داڑھی کے بال چھوٹی چھوٹی کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پلاسٹک کا نیلا گلاس صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو غور سے آئینے میں دیکھا۔ اسے بھیگتی مسیں کالی ہوتی ہوئی دکھ رہی ہیں۔ اس نے جھٹ شیونگ برش اٹھایا اور بڑے بے ڈھنگے پن سے گالوں پر صاحب کا برش پھیرنے لگا جیسے بینی روٹی پر گھی لگا رہا ہو یا جوتے پر پالش۔ برش اس کی انگلیوں سے مچھلی کی طرح پھسلا جا رہا تھا — ہنا

، نوراً سنبھلا اور صاحب کے انداز میں بولا "ڈیم اِٹ ..." اسے بالکل معلوم نہیں تھا "ڈیم اِٹ" کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن
نے نہ جانے کتنی بار اپنے صاحب کے منہ سے سنا تھا ــــ "ڈیم اِٹ" کھانے میں نمک کم ہوتا تھا تو صاحب یہی کہتے تھے۔
اِٹ" اور ایک بار جب میم صاحب نے ریڈیو اسٹیشن کی کسی چنچل لڑکی کی آنکھوں کا ذکر کیا تھا تو اس وقت بھی صاحب نے
تھا "ڈیم اِٹ"۔ ایک بار اور جب وہ ڈرائنگ روم میں گیا تو اس نے صاحب کو نشے میں دُھت میم صاحب پر
دیکھا تو بے ساختہ اس کے منہ سے ایک مریل سی کھانسی چھلک پڑی ــــ اس وقت بھی صاحب نے کسیا کر کہا تھا "ڈیم اِٹ"
بھیگا ہوا شیونگ برش پھسلنے لگا تو اس نے جھلا کر کہا "ڈیم اٹ"! اس کے میلے دانت آئینے میں مکئی کے دانوں کی طرح
پڑے۔ اس نے سیفٹی ریزر اٹھایا اور نل کی دھار میں اس پر جما ہوا جھاگ دھو یا اور سرسر گالوں پر پھیرنے لگا۔ جب اس
لمبی مسیں دھل دھلا کر برابر ہوگئیں تو اسے اپنی صورت بھی آواز کی طرح بدلی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اپنی سفید قمیص پتلون پہنی
کی کریز ہمیشہ تلوار کی دھار کی طرح چمکتی رہتی تھی کیوں کہ روز رات کو وہ اپنی پتلون تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔

جب وہ غسل خانے سے نکلا اور تھیلا اٹھا کر قصائی کی دوکان کی طرف چلا تو پھر جانے کہاں سے کریمن اس کے راستے میں آگئی۔ وہ
رہ گیا۔ کریمن میم صاحب کی اتری ہوئی ساری اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ ساری تو اس نے جیسے تیسے لپیٹ لی تھی لیکن بلاؤز
ڈھیلا ڈھیلا لگ رہا تھا۔ کریمن نے ہنس کر انگڑائی لی تو اسے لگا کہ اس کی بھیگی مسیں کریمن کی بغلوں میں جا چھپی ہیں۔ لیکن وہ
کسا یا لباس کے کہن سے چھوٹتا ہوا۔ تڑپتا ہوا، مہکتا ہوا جسم کہاں تھا۔ کریمن ہنسنے لگی اور انگڑائی کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ کمان
طرح ٹوٹ گئے۔

"ہنستی کیوں ہے چوہیا! ــــ ہوں! کوا چلا ہے ہنس کی چال!"

"کوا تو تیرا باپ! ذرا شیشہ دیکھ۔ صاب کا بچہ!"

"شیشہ؟" شہزادہ گلفام اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

"بھلا میں گھاس ڈالوں گا ایسیوں کے آگے ــــ!"

کریمن ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
سے میم صاحب کا مہکتا ہوا ڈھیلا بلاؤز کستا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا جسم بہت سڈول مگر چھریرا تھا اور کسے ہوئے خوبصورت
سینے بہت چھوٹے اور معصوم۔ نہ جانے کیوں پھر بھی اسے میم صاحب کا بلاؤز کستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شہزادہ گلفام اس کی
آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی بے بی کے پاس لوٹ گئی جو پالنے میں پڑی جھک رہی تھی۔

اگلی کوٹھی کے گیٹ پر گلاب سنگھ، بیڑی جیسے سیاہ ہونٹوں میں آدھی بیڑی دبائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی
چھوٹی چھوٹی آنکھیں مچی ہوئی تھیں۔ وہ خاکی ہاف پینٹ اور کھدر کی کالی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ دونوں یار ساتھ ہو لئے۔ گلفام کا
ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ میں تھیلا جس میں وہ ترکاریاں صابن اور گوشت وغیرہ لایا کرتا تھا۔ افسوس
یہ تھیلا میم صاحب کے ریشمین بلاؤز کی طرح ہلکا اور رنگین نہیں تھا۔ لیکن وہ تھیلے کو پھینک نہیں سکتا تھا کیوں کہ اسے میم صاحب
ہر مہینے تیس روپے دیا کرتی تھیں۔ اور جب میم صاب مسکراتی ہوئی رحم بھری نظر سے دیکھتی ہوئی اس کی ہتھیلی میں تیس روپے
کے نوٹ رکھتی تھیں تو اس کا دل شہد کی مٹھاس سے بھر جاتا تھا ــــ اسی لئے وہ روزانہ گلاب سنگھ کے ساتھ باہر جاتا تھا اور
اس تھیلے میں پیاز، کیلے، سنترے، ترکاریاں، قیمہ یا بوٹیاں بھر کر لے آتا تھا اور کریمن کے آگے رکھ دیتا تھا جو ایک فاسد

لنچ اور ڈنر تیار کرتی تھی، بے بی کی دیکھ بھال کرتی تھی اور شہزادہ گلفام کو میز سے بچے ہوئے کٹ لٹ اور آدھا چاپ بھی کھلاتی تھی۔

گلاب سنگھ پھک پھک بیڑی کا دھواں پھینکتا رہا۔ شہزادہ گلفام نے اس کو دیکھ کر منہ بنایا اور اپنی جیب سے پنیر سگریٹ نکالی۔

"تو بالکل نہیں بدلا گلاب سنگھ —" اس نے اپنے پہاڑی دوست پر ملامت کی۔

"می لا بدلی کا کیہ کرنا . . . . ."

قصائی کی دکان پر کالی جالی لگی ہوئی تھی۔ مکھیاں جالی پر بھنبھنا رہی تھیں۔ زینے کے پاس کتے بیٹھے ہوئے زبان نکالے ہا رہے تھے۔ پاس ہی چچوڑی، سوکھی سوکھی، بڑی بڑی ہڈیاں پڑی تھیں۔ دھول نے ان کا رنگ بگاڑ دیا تھا۔ شہزادہ گلفام نے کتے سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی پتلون کی طرف لپکا۔ گلاب سنگھ نے بڑے اطمینان سے اسے لات رسید کی اور گڑھوالی گیت گنگناتا ہوا دکان میں چلا گیا۔

شیرا قصائی سے شہزادہ گلفام کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی اُلّو نے اس کا نام شہزادہ گلفام رکھا تھا۔ شیرا قصائی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ گلفام کسے کہتے ہیں۔ کہیں اس نے سن لیا تھا اور اب اسے اپنے پہاڑی دوست پر چپکا دیا۔ نے اپنے زیادہ تر گاہکوں کا کوئی نہ کوئی نام رکھ چھوڑا تھا — کوئی پاجامچی، کوئی ٹم ٹملو، کوئی بگلا، کوئی ریکھا سپار، کوئی ترچھی۔ قصائی بہت باتونی تھا۔ اس کی چھری گوشت کی بوٹیاں کاٹتی رہتی اور وہ مونچھیں پھڑکا پھڑکا کر زبان کی قینچی چلاتا رہتا۔ دل موہ لینے والی باتوں کے ساتھ اس کی مونچھوں سے بڑی دوستانہ مسکراہٹ چھنتی رہتی تھی۔ وہ گوشت تول کر ایک آدھ بوٹی تول سے زیادہ ڈال دیتا تھا۔ یہی سخاوت اس کی مسکراہٹ میں بھی تھی۔

"ابے شہزادے یہ کیا — ریڑی چاٹ کر سویا تھا جو بلی میں چاٹ گئی . . . . ."

گاہکوں نے بھی اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا، کچھ مسکرائے، کچھ غرائے اور بعضے ناک کھجا کر رہ گئے۔ شہزادہ پسینے پسینے ہو گیا۔ شیرا نے کنکھی سے اسے دیکھا۔ گلاب سنگھ مسکرا رہا تھا۔

"بیٹا مرد مونچھوں سے پہچانا جائے اور عورت — —" اس نے بات پوری نہیں کی۔

"چلو آدھ سیر قیمہ تو لو —" شہزادہ گلفام نے بھنا کر کہا اور تھیلا بڑھا دیا۔

لوٹتے ہوئے راستے بھر گلاب سنگھ اس سے کچھ کہتا رہا۔ لیکن شہزادہ گلفام اسی کی باتوں کے جواب میں ہاں ہوں سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکا۔ گلاب سنگھ چاہتا تھا اب چھٹی لی جائے اور گڑھوال جا کر کھیتی باڑی کی جائے۔ گلاب سنگھ اپنا سارا پیسہ گھر بھیج دیتا تھا اور اوپر کی آمدنی سے بیڑی صابن کا خرچ چلاتا تھا۔ وہ شہزادہ گلفام کو بھی سمجھاتا تھا لیکن شہزادہ گلفام کے تیس روپے پنکھا کرتے تھے۔ اِدھر آئے اُدھر اڑے۔ وہ بھلا اس چکر میں کہاں پڑتا۔

"لگتا ہے تو اس لونڈیا کے چکر میں پڑ گیا ہے؟" آخر گلاب سنگھ نے سیدھا وار کیا۔

"لونڈیا؟" شہزادہ گلفام نے مڑ کر گلاب سنگھ کی طرف دیکھا جس کے تھیلے سے مولیاں جھانک رہی تھیں اور ننگی ٹانگیں الجھ رہی تھیں۔ "ابے تو تو پہاڑی گدھا کا گدھا رہا۔ میں نہیں کسی لونڈیا کے چکر میں پڑنے کا۔ —"

"پھر مونچھیں کیوں منڈوائیں —؟"

گلاب سنگھ ہی اس کو شہر لایا تھا۔ گرو گڑ ہی رہا اور چیلا چینی ہو گیا تھا۔

کوٹھی لوٹنے سے پہلے شہزادہ گلفام نے سانس روک کر گلاب سنگھ کو بتایا کہ میم صاب اس پر جان دیتی ہیں۔ ۔ ۔ تھکی ہوئی
ہو مجھ سے پنڈلیاں اور کمر دبواتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔
گلاب سنگھ نے اپنی خونخوار مالکن کے بارے میں سوچا اور جلدی سے اپنی کوٹھی کی طرف بھاگا۔
شام کا دھندلکا پھیلا۔ کوٹھی کے در و دیوار پر سائے تھرتھرانے لگے۔ بے بی سو رہی تھی۔ باورچی خانے میں کریمن کھانا
تھی۔ صاحب آئے، انہوں نے ایک بھورا سوٹ اتارا، سرمئی سوٹ پہنا۔ پوچھا میم صاب کہاں ہیں۔ میم صاب غائب
صاحب نے سوتی بے بی کو پیار کیا، سگار جلایا اور کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔
رات گہری ہوگئی۔ سڑک پر راہگیروں کے قدموں کی آہٹ بھی مٹنے لگی۔ شہزادہ گلفام نے میم صاحب کا بستر برابر کیا۔ تکیے
یا۔ اجنتا ایلورا کے ڈیزائن والا پلنگ پوش تہہ کر کے ایک طرف رکھا۔ "ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا ـــ اتنی دیر
میں ڈنر بھی نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" اس نے ایک بار پھر تکیے کو سہلایا، جہاں تھوڑی دیر بعد اس کی میم صاب کا سر ہوگا اور
گھنے کالے بال سرہانے لٹک جائیں گے اور کمرے میں جانے کیسی مہک بھر جائے گی۔ وہ کھڑکی سے باہر دوڑتی ہوئی کاریں
دبی آنکھیں دیکھنے لگا۔
کریمن نے اسے پکارا۔ وہ گھسٹتا ہوا اس کے پاس گیا۔ وہ بڑے گملے کے پاس کھڑی تھی ــ اکیلی۔ گھر میں سناٹا تھا۔
ٹھہری ہوئی تھی۔ کریمن نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل کر الگ ہوگیا۔ باہر کا دروازہ زور سے کھلا اور بند ہوگیا۔
ب سامنے سے سائے کی طرح گزر گئیں۔ جب وہ کمرے میں پہنچا تو میم صاب اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ تکیے میں
تھا۔ ان کے صاف خوبصورت تلوے اور ننگی پنڈلیاں چمک رہی تھیں۔ وہ بالکل پلنگ کے پاس پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ اس
صاب کے کچھ کہنے کا انتظار نہیں کیا اور آہستہ آہستہ میم صاب کی پنڈلیاں دبانے لگا جو اسے اور روز سے زیادہ تنی
ہوئی محسوس ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں اسے محسوس ہوا کہ وہ ریشم کی تنی ہوئی ڈور پر نٹ کی طرح چل رہا ہے۔ میم صاب۔
ٹ بدل لی اور چت لیٹ گئیں۔ ان کی آنکھیں آدھی بند تھیں، چڑھی چڑھی۔ جن میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ ہونٹوں
کونوں پر پھیل گئی تھی۔ گال جلے ہوئے خزاں کے پتوں کی طرح تمتمائے ہوئے تھے۔ میم صاحب اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہنسنے
اور ان کی آنکھیں چھلک پڑیں ـــ "کب تک، لیکن کب تک۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟" ان کے منہ سے نکلا اور ان کی ڈبڈبائی آنکھیں
گلفام پر جم گئیں۔ اس نے سر جھکا لیا اور ٹانگیں دبانے لگا۔ جب وہ ٹانگیں دباتا تھا تو اکثر میم صاب اس کا مذاق اڑایا
ہیں۔ "تری یہ مونچھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہی ہی ہی!" لیکن اب مونچھیں غائب تھیں تو میم صاب کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور
ہو نٹ چبا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ٹخنوں سے گھٹنوں تک یوں دوڑ رہے تھے جیسے وہ پیانو بجا رہا ہو۔ اس کے ہاتھ
سے بھی اوپر بڑھے اور رانوں تک پہنچ گئے۔ اس کی ہتھیلیاں جلنے لگیں اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اچانک
صاب تڑپیں اور ایک زناٹے دار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔
تھوڑی دیر تو وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اور میم صاب دوبارہ اوندھے منہ بستر پر گر گئیں تو وہ بھاگا۔ سائبان
گملے سے ٹکرایا جہاں تھوڑی دیر پہلے کریمن کھڑی تھی۔ وہ جا کر باورچی خانے میں رکا۔
کریمن بوتل میں دودھ بھر رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی شہزادہ گلفام اس کو دبوچ
چکا تھا۔ اس کے دانت کریمن کی گردن میں چبھ رہے تھے۔ وہ تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکلی اور جلتی ہوئی دودھ کی بوتل

اس کے سر پر دے ماری، بوتل شہزادہ گلفام کے سر سے پھسلتی ہوئی دیوار ....
سے جا ٹکرائی۔ وہ بندر کی طرح اچھلا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس کے بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ اندھیرے میں
کریمن نے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر شہزادے کا تمتماتا ہوا چہرہ پھر گیا۔

"اُلّو !"

باورچی خانے کا دروازہ کھلا اور آہستہ آہستہ بند ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑی۔ صاب کی آنکھیں بلی کی آنکھ
چمک رہی تھیں اور ہونٹوں میں ادھ جلا سگار تھا جس کی راکھ تھرتھرا رہی تھی۔
کریمن کھڑکی پر جھک سی گئی۔ باہر اندھیرا تھا۔ ہوا جھاڑیوں میں سرسرا رہی تھی اور وہاں کوئی نہ تھا، کوئی نہ

رضیہ فصیح احمد

ماموں

وہ ساری رقم ننانوے روپے دو آنے تھی۔

سو روپے پورے نہ ہو سکنے کی وجہ سے جو شدید رنج ماموں کو ہوا اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک نفسیاتی وجہ تو یہ تھی کہ سو روپے کا ہرا نوٹ کبھی ان کی جیب میں نہیں کھڑکھڑایا تھا۔ کبھی ان کی انگلی کی پوروں نے اسے چھو کر نہ دیکھا تھا اور یہ ان کی بہت پرانی خواہش تھی جو لاشعور میں کہیں چھپی بیٹھی تھی بظاہر تو ان کا یہی کہنا تھا کہ سو روپے کا ایک نوٹ ان ننانوے نوٹوں اور ریزگاری کے بوجھ سے بہت ہلکا ہوگا اور وہ اسے مزے سے جیب میں رکھ کر پھر سکیں گے اپنے ساری پونجی کو جیب میں رکھ کر اس کی حفاظت کرنے کا تلخ تجربہ وہ ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے کر چکے تھے۔ یعنی ان تھیلیوں کو تو صدمہ ہوتی ہے جتنا ان سے کچھ بھی ہائے سامنے ہی رہنا اتنا ہی یہ بہتر چلی کہ آپ کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کریں گے اور گاڑی میں سامان رکھیں گے تو ایسی جگہ کہ سب کی نظروں سے رکھنی ہی نہ دے تو بس اس کے مالک کو ۔۔۔ اور پھر کس بیدردی سے گھسیٹتے ہیں ان پرانے بکسوں کو کہ دل کٹنے لگتا ہے۔ ایسے وقت اگر ان کا بند کھل جائے تو ایسا ہی ہو جیسے کسی شریف آدمی کی عزت بھرے بازار میں اتر جائے ۔۔۔ اور پھر وہ اتنی ساری چیزوں کو کہاں سمیٹتے پھریں خصوصاً ان ریزگاریوں سے بھری اس پیٹ پھولی تھیلی دانی کو ۔۔۔ اس سب کے بارے میں وہ چاہتے تھے کہ ایک سو کا نوٹ ہوتا جسے وہ اپنے رومال میں باندھ جیب میں رکھ لیتے۔ اوپر سے پن لگا لیتے اور چاہے چوبیس گھنٹے جیب پر ہاتھ رکھتے کسی کو کیا۔ وہ کم بخت تھیلی ان کی جیب کو سر پر اٹھا کر میلوں پڑھیاں پھیلاتا ایں کی بھیڑ میں تو غائب نہ ہو سکتا نا ۔۔۔ مگر وہ تو ننانوے روپے دو آنے تھے اگر خواہش کرنے سے ہی روپے بڑھ جایا کرتے تو اب تک نوٹ ہزاروں تک ہو چکتے ۔۔۔ کیونکہ ان ننانوے روپوں کی کہانی بھی بڑی پرانی تھی۔

اب سے بارہ سال پہلے جب بڑے بھانجے نے ماموں کو اپنے چھوٹے بھائی کے پاس بھیجنے کو ریل میں سوار کرایا تھا تو ٹکٹ کے ساتھ ان کے ہاتھ پہ دس کا نوٹ بھی رکھا تھا کہ سفر خرچ کے کام آئے گا۔ سفر میں تو خیر انہوں نے بمشکل ایک روپیہ خرچ کیا وہ بھی جو ان کے پاس پہلے سے تھا اور اس دس روپے کے نوٹ کو انہوں نے خلیے میں باکر احتیاط سے اپنے کرتے کے نیچے ہوئے کمر بند کے درمیان میں ڈال کر تین تین گرہ لگائیں۔ گھر پہنچ کر یہ نوٹ اس تھیلی دانی میں منتقل ہو گیا جو ان کی اماں کی یادگار تھی۔ جس میں نو نیز کی طرح تہہ کئے ہوئے پرانے ایک ایک کے نوٹ اور جارج ششم کی بردبار صورت والے گھسے ہوئے سیاہ فام سکے تھے۔

ماموں نے ساری عمر دو کام نہیں کئے۔ شادی اور نوکری۔ بقول کسے اماں کے پلو سے لگے بیٹھے تھے۔ جب اماں بھی داغ دے گئیں تو بڑے بھانجے کی تجویز ہوئی کہ انہیں چھوٹے بھائی کے پاس بھیج دیا جائے جو چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رہتے ہیں ایک بزرگ کا سایہ ان کے لئے ہر صورت بہتر

رہے گا۔ چنانچہ وہ یہاں آ گئے، اور بچوں سے ان کا یہ کہہ کر تعارف کروایا گیا کہ یہ تمہارے دادا میاں ہیں اور کل سے تمہیں قرآن مجید اور اردو پڑھایا کریں گے۔ بچوں نے اس ناطے سے انہیں غور سے دیکھا تو وہ کچھ جچے نہیں۔ چرخ سے کالے سے، ہاتھوں پر یہ بڑے بڑے بال، آنکھیں بجھی بجھی، کپڑے میلے۔ سیاہ مخمل کی رامپوری ٹوپی جو ان کے چہرے کو اور بھی سیاہی بخش رہی تھی۔ سب سے عجیب بات انہیں یہ لگی کہ وہ اپنے ایک ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے صندوق اور ایک بے رنگ روغن ٹین کے ٹرنک کے پیچھے پیچھے یوں بولائے ہوئے پھر رہے تھے جیسے وہ اپنے بھانجے کے گھر میں نہیں کچھ چوروں کے ڈیرے میں پھنس گئے ہوں جو کسی بچے نے منہ ٹوٹی تھلیا کو ہاتھ لگا دیا اس کو جھڑک دیا۔ کسی نے بڑوں کا کام کرنے کے شوق میں ان کے بدقلعی گول پاندان کو تھام لیا تو جھپٹ انھوں نے اس کے ہاتھ سے لے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ جب تک ان کے نام کی کوٹھری میں ان کی ساری چیزیں ایک ایک کر کے نہ لگ گئیں۔ ان کا بستر بچھ گیا ان کی سنوکی مہری چھالیوں کی پڑیاں اور دیگر لوازمات گدے کے نیچے نہ رکھ دیئے گئے اور ان کی مٹھ ٹوٹی لاٹھی کو معقول جگہ نہ مل گئی وہ وہاں سے نہ ٹلے جب نوکر سامان رکھ کر چلا گیا اور بچوں کو بھی انھوں نے کسی بہانے ٹال دیا تو غور سے کھڑکی اور دروازے کی کنڈیاں دیکھیں جو اتفاق سے خاصی مضبوط تھیں۔ پھر کھڑکی کی جالی پر ہاتھ مار کر اس کے دم درود کا اندازہ کیا۔ وہ بھی خاطر خواہ پائی تب جا کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور احتیاط سے باہر کی کنڈی میں تالا ڈال کر وہ اپنے بھانجے اور اس کی دلہن سے دو باتیں کرتے باہر آئے۔

رات کو بچوں میں بڑی دیر تک کھسر پھسر کا بازار گرم رہا اور دوسرے دن صبح جب ناشتے کے لئے ان کی ڈھونڈیا پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ تو اپنے ملاجی سے قرآن مجید کا سبق لینے چلے بھی گئے۔ کہاں تو روز ناشتے کے بعد بھی خاصے فضیحتوں کے بعد جاتے تھے اور آج سعادت مندی کا یہ عالم کہ بغیر ناشتہ کئے ہی سبق لینے نکل کھڑے ہوئے، نوکر بھیج کر انھیں بلوایا گیا اور ہزار احتجاج کے باوجود انھیں ان دادا میاں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑا۔ مہینہ بھر میں بچوں نے پہلے کی نسبت خاصی ترقی دکھائی اور نیک دل بھانجے نے پانچ روپے یہ کہہ کر ماموں کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ یہ رکھئے کبھی کام آئیں گے۔ ماموں نے تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد قبول کر لئے۔ پھر تو یہ اس گھر کا غیر تحریر کردہ قانون بن گیا کہ مہینے کے مہینے جب بھانجہ تنخواہ لے کر آئے، بچوں کے جیب خرچ کے ساتھ پانچ روپے ماموں کو بھی بھجوائے جائیں۔ اس طرح ماموں کی ننھی دانی سیٹھ کے پیٹ کی طرح آہستہ آہستہ پھولنے لگی۔ اس میں سے کبھی ایک پیسہ بھی ماموں نے نکال کر خرچ نہ کیا اور نکالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کھانا اور پان مل جاتے تھے۔ کپڑے لتے نئے رہتے تھے جو وہ بڑی احتیاط سے اپنے بے رنگ روغن ٹرنک میں تہہ کر کے رکھتے جاتے تھے اور بھانجے کے ہر اصرار پر کہ اب وہ کپڑے پہن ڈالیں۔ ہاں ایک جبہ کو نت کر پہنوں گا۔ کہہ کر ٹالے جاتے تھے۔ اور انھیں گنتی کے جوڑوں کو رگڑے جاتے تھے جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔

چند مہینوں میں گھر والوں کو ان کی بہت سی عادتوں کا اندازہ ہو گیا وہ حلیم الطبع اور نرم دل ہونے کے باوجود بعض دفعہ کسی بہت چھوٹی سی بات پر ایکاایک بھڑک اٹھتے۔ بچپن سے اب تک کی محرومیوں کا جوالا مکھی ایک دم ہی پھٹ پڑتا لیکن کچھ دیر بعد جب وہ سرد پڑ جاتا تو وہ پھر وہی حلیم الطبع اور بے ضرر سے ماموں بن جاتے۔ وہ بچوں کو پسند کرتے تھے اور پڑھائی کے بعد بھی اپنے ساتھ لگائے رکھتے تھے انھوں نے اپنے لئے ان سب کے الگ الگ نام تجویز کئے تھے۔ سب سے بڑے پوتے کو جس کی ناک بہت لمبی تھی اور جسے وہ ہر وقت چھیڑتا رہتا تھا، نکو کہتے تھے۔ اس سے چھوٹی جو بولتی بہت تھی مینا تھی اور تیسرا شاگرد جو ہر وقت اپنی جیبوں میں کترنیں بھری رکھتا، گودڑ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ انہیں ہر چیز کو چھوٹا کر کے بولنے کا شوق تھا۔ اپنی کوٹھری کو کوٹھ صراحی کو صریا، پاندان کو پنڈنیا، اور پلنگ کو کھٹیا کہتے تھے۔ شاید اسی رعایت سے وہ سب سے چھوٹی پوتی کو مٹھا کہا کرتے تھے۔ انہیں اچھا پہننے کا نہیں مگر اچھا کھانے کا شوق تھا۔ جس دن کوئی چٹپٹی مزیدار چیز پکتی وہ اپنی سینی خود واپس کرنے جاتے اور بہو کے سامنے بار بار کھانے کی تعریف کرتے۔ کبھی کبھی وہ بہو کو یاد بھی دلایا کرتے کہ کریلے بھرے قیمے یا کڑھی کھائے بہت دن ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ سالن کبھی دوبارہ نہ مانگا لیکن یہ کم بخت میٹھا جو کبھی کھیر یا حلوے کی شکل میں ان کی زبان کو لگتا تو بعض اوقات انہیں اپنا یہ اصول توڑنا پڑتا۔ یہ میٹھے کا لپکا بعض اوقات انہیں چمچیاں شکر پھانکنے اور گڑ کی چرائی ہوئی ڈلیاں کھانے پر مجبور کرتا۔

ایک بات جو گھر والوں کے لئے عجیب تھی وہ یہ کہ یوں چاہے وہ مہینہ مہینہ دن نہ نہائیں مگر منہ ہاتھ دھونے میں انھیں گھنٹوں لگتے تھے انگلیوں کو تھوڑا تھوڑا رگڑ رگڑ کر یوں صاف کرتے جیسے چھری کی دھار تیز کی جاتی ہے۔ کلیاں بھی کوئی گنتا تو سو سے کیا کم کرتے ہوں گے۔ پھر پان بنانے، کھانا کھانے اور کسی شکر کو چھونے کے بعد یہ عمل دہرایا جاتا۔

اس کے علاوہ اکثر وہ بہو کے سامنے گول مول الفاظ میں اس قسم کی باتیں کیا کرتے کہ اب کے جب وہ وطن لوٹیں گے تو دنیا دیکھے گی کہ ہاں یہیں کوئی سرزمین کا سپوت تھا اور وہ لوگ نادار اور قرض خواہ جنھوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا آکر ان کے پیر چھوئیں گے اور وہ رشتہ دار جنھوں نے لتھو کہہ کر انھیں اپنی بیٹیاں دینے سے انکار کر دیا تھا کف افسوس ملیں گے ــــ پہلے چند مرتبہ تو بہو اس کا مطلب قطعی نہیں سمجھی پھر آہستہ آہستہ یہ اندازہ ہوا کہ ماموں کو اپنی زندگی میں غیر معمولی شہرت یا بے اندازہ دولت ملنے کا یقین ہے۔ یہ دولت کہاں سے آئے گی اور یہ شہرت کس چیز سے حاصل ہوگی، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں بتاتے تھے۔ شاید وہ خود نہیں جانتے تھے مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چھپّر پھاڑ دولت یا شہرت کا شدت سے انتظار تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اس کے لئے کوئی کوشش کرتے نظر نہ آتے تھے۔

پہلی عید اس گھر میں آئی تو ان کے لئے ایک بڑا دکھ بھرا مسئلہ لائی۔ سب ان سے چھوٹے تھے۔ بھانجی فرمانبردار تھی بہو قدردان تھی۔ بچے بھی اتنے ننھے نہیں تھے جتنا شروع میں انھوں نے اندازہ لگایا تھا۔ پھر عید کے موقع پر انھیں کچھ دینا تو چاہیے ــــ کئی دن کے سوچ بچار کے بعد انھوں نے جا نماز کو کوٹھریا کی زاحد کھڑکی اور اکلوتا دروازہ اچھی طرح بند کر کے اپنی تلے دانی میں سے تعویز کی طرح تہہ شدہ ایک روپیہ کا نوٹ نکالا اور نوکر کو اس کی چار چمکتی ہوئی چونیاں لاکر چپکے سے انھیں دینے کا حکم دیا۔ یہ چونیاں انھوں نے دوسرے دن اپنی پرانی تاریخی اچکن اور ٹوپی پہن کر عید کی نماز پر جانے سے پہلے بچوں کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اور ایک سال تک کے لئے زندگی کا پہیہ پھر اسی یکسانی سے چلنے لگا۔ لیکن اب تقریباً کچھ یوں ہونے لگا کہ ایک سال بعد چھوٹے بچوں میں سے ایک اس قابل ہو جاتا کہ اس کی بسم اللہ کروا کے ماموں کے سپرد کر دیا جائے اور اس کی جگہ پر کرنے کے لئے ان کی زوجہ کے ہاں ایک عدد کا اضافہ کر کے چھوٹے بچوں کی تعداد بھی برابر رکھتیں۔ اب جوں جوں ان کے شاگردان رشید کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا ماہانہ بڑھنے کے بجائے گھٹ رہا تھا اور اس کی باقاعدگی میں بھی تشویش ناک حد تک کمی آ رہی تھی۔ گھر کی حالت بھی ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی ــــ نوادران بساط کی ریل پیل تھی اور آمدنی اپنی جگہ بت کی طرح اٹل ــــ آنے والے اگر اپنی روزی کی پوٹلی ساتھ لے کر آتے تھے تو وہ یہاں کسی کو نظر نہ آتی تھی، حالت یہ تھی کہ نزلے مال سوکھتے جا رہے تھے۔ بھانجے کے کھلے ہاتھ میں بھی کبھی دبیدا ہو چلا تھا۔ پھل بھی اب موسم کے شروع اور آخیر کے بجائے صرف اپنے عالم شباب میں منگائے جاتے تھے۔ کپڑوں کے جوڑے بھی اب عید کے عید بننے لگے تھے (یہ دوسری بات ہے کہ ماموں کے پاس اب بھی کئی جوڑے ایسے رکھے تھے جن کی استری تک نہ ٹوٹی تھی) گھر میں سب کا برتاؤ ان کے ساتھ اب بھی اچھا تھا۔ بھانجہ بیویوں کا بدل میٹھے بول سے کر رہا تھا بہو کھیر اور حلوے کے بجائے گھر کے حساب کتاب میں ان سے مشورہ لیا کرتی تھی۔ جس کے بدلے وہ اپنے لکڑی کے بکس میں سے زرد بوسیدہ کاغذوں اور بھبکتی خوشبوؤں والے قصہ حاتم طائی یا تصویر اور آرائش محفل میں سے چند ناقابل سماع حصے نکال کر فرصت کے اوقات میں جب بھانجا آفس میں ہوتا اسے پڑھ کر گیا ہوتا بہو کو سنایا کرتے تھے۔ ان کتابوں کو جس احتیاط سے وہ لاتے، ان کے چندی چندی ہوتے ہوئے اوراق کو جس آہستگی سے کھولتے اور جس پیار سے ان کو بند کر کے لے جاتے اس سے بچوں میں ان کتابوں کو دیکھنے کا تجسس دن بدن بڑھنے لگا۔ مگر ان کی کڑی شرط کہانی سننے کی یہ تھی کہ سب دور چارپائی پر بیٹھیں اور کوئی ان کے سر پر آکر نہ کھڑا ہو۔ اس طرح وہ سولہ یا سترہ کے سن کی ماہ وشوں اور پری چہروں کو مزے سے پڑھ پڑھ کر سنا دیتے اور شہزادوں کے ہزار جان سے عاشق ہونے اور پریوں کے ساتھ شربت وصال پینے کی حکایتوں کی لانگ پھلانگ جاتے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بہو کو اپنے ہاتھ سے لونگ والا چھپّا پان بھی لگا کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بہو ان کی مہربانیوں کا ناجائز فائدہ اٹھائے جیسا کہ اس نے اٹھایا یعنی کہ ایک دن وہ ان کے سر پر تلوار بن کر قرض لینے آ کھڑی ہوئی۔

کام بھی ضرور تھا بہو کو معلوم بھی تھا کہ ان کے پاس پیسے ہیں انکار کرتے بن نہ پڑے گی۔ دروازہ کھڑکی بند کر کے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر لائے اور ایسے جیسے کوئی اپنے عزیز سے برسوں کے لئے بچھڑنے کو جدا ہوتا ہے۔ انھوں نے وہ نوٹ بہو کو دے دیا پھر یہ نوٹ بھیجا گیا جب تک ان کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کرنے لگا۔ "تم لوگوں کو جیب خرچ مل گیا؟" وہ چپکے سے بچوں سے پوچھتے۔

"ابھی کہاں سے — آج تو ستائیس تاریخ ہے۔ تنخواہ تو ابھی آئی بھی نہیں۔" ان بچوں کم بختوں میں یہ بڑی خرابی تھی کہ ایک ذرا سی بات پوچھو تو ڈھنڈورا پیٹنے کی طرح گلا پھاڑ کر چلاتے تھے۔ ایسی ہی کسی بات پر کھسیا کر وہ ان میں سے کسی کو چانٹا بھی دے دیتے۔

کبھی کبھی وہ خواب میں دیکھتے کہ ان کا نوٹ بہت سے ساتھیوں کو لئے ان کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ وہ حیران ہیں۔ ایک دو — دس۔ پچاس۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گنتی کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتے مگر آنکھ کے ساتھ حقیقت بھی کھلتی کہ ابھی تک تو ان کا اپنا نوٹ ہی نہیں لوٹا ہے۔ چہ جائیکہ اتنے مہمان — یہ روپیہ پیسہ اور نوٹوں کے خواب وہ بچپن سے دیکھتے آئے تھے کہ جیسے چلتے چلتے کسی چیز پر نظر پڑی، کریدا تو پیسہ، پھر جو دیکھا تو زمین پر پیسے ہی پیسے بکھرے پڑے ہیں۔ وہ جلدی جلدی سمیٹ رہے ہیں کہ اور لوگ بھی حصہ دار بن کر آ گئے اور جب جاگے تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ معلوم شروع سے ہی یہ پیسے اور نوٹ جتنا خواب کی دنیا میں ان کی طرف کھنچتے تھے، اصل زندگی میں ان سے بھاگتے تھے۔ اب بھی سوتی ہوتی ہوئی تو نکلے والی جیب وہ ٹٹولتے تو دل یوں دھڑ دھڑ کرتا جیسے کسی دولہا کا پہلے پہل دلہن کا گھونگھٹ الٹتے ہوئے۔ ہر دفعہ یہ خدشہ ہوتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹرنک کے بائیں طرف کپڑوں کے نیچے اس کی مخصوص جگہ کو ٹٹولیں تو وہ — خالی ہو — رات کو سونے سے پہلے کھڑکی اور دروازے کی چٹخنی کئی کئی مرتبہ ٹھونک بجا کر دیکھتے اور سخت گرمیوں میں بھی اندر سونے کو ترجیح دیتے۔ بھانجے نے کئی دفعہ درخواست کی کہ وہ باہر سویا کریں مگر "نہیں" میں مزے سے سوتا ہوں اپنی کوٹھریا میں" وہ جواب دیا کرتے۔ اب یہ کون دیکھتا کہ ان کے سیاہ ہاتھوں میں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان جو گٹے سے پڑ گئے ہیں وہ رات بھر پنکھے کی ڈنڈی کے رگڑ کھانے کے سبب سے ہیں۔

پہلی تاریخ آئی اور گزر گئی۔ اب کی بار کسی بچے کو جیب خرچ بھی نہ ملا اور ماموں کے پیسوں کی واپسی کا سوال بھی نہ اٹھا کیونکہ بہو کو اپنے سب سے چھوٹے بھائی کی ارمانوں بھری شادی میں جانا تھا۔ سب کے کپڑے جوتے چادریں تکیئے کے غلاف، دلہن کے لئے جوڑا کوئی ایک چیز ہو تو گنوائی جائے۔ اور جانے کہاں کہاں سے اس سلسلے میں قرض لینا پڑا۔ بھانجے کو چھٹی نہ ملی اس لئے انھوں نے شادی میں شرکت کے لئے تین دن کی چھٹی لے کر آنے کا وعدہ کیا اور بہو مع اپنی چھوٹی بڑی پوری خوشی خوشی بھیا کی شادی میں سدھاریں۔ خیال تھا کہ بھانجا جب سالے کی شادی سے لوٹے گا تو بال بچوں کو ساتھ لیتا آئے گا مگر وہ لوٹا تو خالی ہاتھ۔ معلوم ہوا کہ بہو کی اماں نے یہ کہہ کر روک لیا ہے کہ "ایسی حالت" میں اتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ خدا نے چاہا تو "اس" کے بعد آ کر لے جانا۔ — چنانچہ ماموں بھانجے بڑی قناعت سے اکیلے گھر میں رہنے لگے — اب بھانجے کی لاپرواہی کا یہ عالم کہ رات کو گھر کی ساری کھڑکیاں دروازے کھلے رہ جائیں تو اسے پروا نہیں۔ اور یہاں ماموں کو اپنی کوٹھریا کے ساتھ گھر کی حفاظت میں جان سوکھنے لگی۔ اس پر ایک زیادتی بھانجے نے یہ کی گویا ضد باندھ لی ان سے کہ انھیں باہر سلا کر ہی دم لے گا۔ روز روز کے جھگڑوں اور بھانجے کے الٹے سیدھے مذاق سے تنگ آ کر جن میں سب سے دکھتی رگ یہی تھی کہ ماموں کون خزانہ ہے جس کی خاطر گرمی میں مرتے ہیں آپ؟ آخر وہ عین اپنی کوٹھریا کی کھڑکی کے سامنے کھٹیا ڈلوا کر سونے لگے۔

ہونی شدنی، ایک دن جو سو کر اٹھے تو مکان کا تالا ٹوٹا ہوا اور کمرے میں عین سامنے رکھی ہوئی پرانی کھٹارا سینے کی مشین غائب۔ غور سے دیکھا گیا تو اور بھی کئی چیزیں نہیں تھیں۔ گراموفون جو بچوں کی زیادتی اور سوئیوں کی کمیابی کے باعث کئی سال سے گھر میں یوں بے کار پڑا تھا جیسے کسی غریب کے گھر میں ہاتھی، بڑے بکس میں سے گرم کپڑے بھی غائب تھے۔ ماموں نے یہ خبر سنی تو کئی لمحے چارپائی پر بیٹھے رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر جب ذرا ہاتھ پاؤں بس میں آئے تو سلیپر گھسیٹتے اٹھے۔ اپنی کوٹھریا میں علیحدہ سے قفل لگا دیکھ کر انہیں ذرا بھی اطمینان نہ ہوا۔ جھٹ سے اپنی کوٹھری کا دروازہ بند کر کے انھوں نے اپنے ٹرنک کا قفل کھولا۔ تہہ در تہہ چیزوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر جو نکلے والی کی جگہ ٹٹولی تو وہ . . . . . اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ کھولا تو پیسے بھی تھے۔ مگر اس وقت انھیں یہ خیال ستانے لگا کہ اگر چور اس میں کچھ رقم بے نیاز ہو تو بھلا انھیں کیا معلوم ہوگا۔ ہا — کیسی غلطی کی کہ آج تک

سلے بیچ گئے ہی تھیں۔ تب انھوں نے طے کیا کہ بند کرنے کے لیے رقم کی گنتی کر لی جائے۔ بند کھڑکی کے روزن سے اندر آتی ہوئی کرن کی روشنی میں انھوں نے بڑی طمانیت اور دلجمعی سے وہ ساری رقم گنی جو ستر روپے تک پہنچنے لگی تھی۔ اور یہ رقم ان کے دل پر یوں نقش ہو گئی جیسے قلم سے وہاں لکھ دی گئی ہو۔

پھر ایک دن جب ماموں غسلخانے میں تھے، ڈاکیہ ساڑھے تین روپے کا ایک وی پی لایا جو ماموں کے نام تھی۔ بھانجے نے سوچا کہ اول تو ماموں غسلخانے سے نکلیں گے بہت دیر میں، دوسرے کہیں یہ نہ سوچیں کہ بھانجے نے ساڑھے تین روپے کی کنجوسی کے مارے وی پی وصول نہیں کی۔ انہوں نے اٹھ کر روپے دیے اور دستخط کر کے وی پی رکھ لی۔ ماموں جب اپنے کام سے فارغ ہو کر آئے تو بھانجے نے وہ پارسل ان کی طرف بڑھا دی کہ شاید آپ نے منگائی ہو گی۔ دیر تو وہ کچھ نہ سمجھے پھر بھانجے نے بتایا کہ ابھی ابھی ڈاکیہ دے گیا ہے دہلی سے آئی ہے۔ تو دفعتاً ان کے سیاہ چہرے پر سرخی سی پھیلی اور "اچھا، اچھا ہاں — میں نے ہی منگائی تھی" کہہ کر پلندہ بغل میں داب تیزی سے اندر چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے دروازہ کھڑکی بند کی، آہستہ آہستہ جیسے کوئی چور سے کھا جا رہا ہو پھاڑا۔ انھوں نے اس کے کاغذ الگ کر کے نشست درست کی، جب آخری کاغذ بھی اتر گیا تو انھوں نے اپنے ہاتھ کی کتاب کو ایسے اچنبھے سے دیکھا جیسے دیکھتے دیکھتے کوئی معجزہ ہو گیا ہو۔ کھڑکی کی درز سے آتی ہوئی روشنی میں انھوں نے اس کا نام پڑھا پھر جلدی سے کھڑکی کھولی اور اندر سے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، اور لگا کر ایک دروازہ کھول تیزی سے باہر نکل گئے۔ بھانجے نے ساری زندگی میں ماموں کو اتنا غضبناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لٹیرے، لفنگے، بدمعاش.... چور.... ایک ایک پر مقدمہ چلاؤں گا۔ سب سالوں کو جیل میں بھجوا دوں گا.......... سمجھا کیا ہے انھوں نے... ہنھ...!

بڑی دیر بعد وہ ٹھنڈے ہوئے تو بھانجے کے پوچھنے پر بتایا کہ ایک رسالے میں انھوں نے اشتہار دیکھا تھا: روپیہ بنانے کی مشین، تین روپے میں۔ وہ مشین انھوں نے بذریعہ وی پی منگائی تھی اور ان کم بخت چوروں نے ایک کتاب بھیج دی تھی جس میں صابن، روشنائی اور کریمیں بنا کر گھر بیٹھے روپے کمانے کی ترکیب درج تھی — بھانجے کو ہنسی بھی آئی اور ماموں کی عقل پر رونا بھی۔ بہت دیر تک وہ سمجھایا کیے کہ اگر ایسی کوئی مشین مل جایا کرتی تو دنیا میں آج کا ہے کو کوئی غریب اور محتاج ہوتا۔ مگر ماموں یہی کہتے رہے کہ میرے پاس روپیہ ہوتا تو ان بدمعاشوں پر مقدمہ چلاتا اور اس دھوکہ دہی کا مزا چکھا دیتا۔ اسی وقت باتوں باتوں میں وہ یہ بھی کہہ گئے کہ وطن کے ایک نامی گرامی نجومی نے انھیں بتایا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں ایسی شہرت حاصل کریں گے کہ بایدو شاید۔ بڑے بڑے ان کے قدموں میں سر جھکائیں گے اور دولت ان کے گھر کی لونڈی ہو گی — اس وقت وی پی کی مایوسی کا ایسا اثر ان کے دل پر تھا کہ بھانجے نے اس کے خلاف کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

بھانجے ہو لوٹ کر آئیں تو بقول ان کے "مرغی کو تو تکلے کا گھاؤ ہی بہت ہے"۔ چوری کی چیزوں کی کمی انہیں آٹھ آٹھ آنسو رلانے لگی۔ سب سے زیادہ رنج انہیں اپنی اس بے رنگ روغن مشین کا تھا جو مریل ٹٹو کی طرح چلتی تھی پھر گھر بھر کے تن برابر ڈھانکتی تھی۔ پھر گرم کپڑے تھے، کچھ اور چیزیں تھیں، نتیجہ یہ کہ بچوں کے جیب خرچ بند ہونے کے ساتھ ساتھ ماموں کی ماہانہ آمدنی کے خاتمہ پر بھی آخری مہر لگ گئی۔ اب کس منہ سے وہ اس دس روپے کے نوٹ کا ذکر کرتے جو بہو نے ایک مرتبہ قرض لیا تھا۔ اگر ملنے کی امید ہوتی تو وہ منہ پھوڑ کر مانگ ہی لیتے، مگر حالات تھے کہ صاف نفی میں گردن ہلا رہے تھے چنانچہ دس روپے کا یہ غم اماں کی موت کے برابر میں نشست بنا کر جم گیا اور پھر کئی سال تک ان ستر روپوں میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہ ہوا بلکہ سال کے سال جار آنے فی کس کے حساب سے اس خزانے میں کمی ہی آتی چلی گئی۔ دل پر جو کچھ بھی بیتی انہوں نے اپنی اس وضعداری میں فرق نہ آنے دیا ورنہ ان میں اور اس بھانجے میں جس نے پہلے ان کو پانچ روپے کا نوٹ دے کر پرچایا اور پھر ہری جھنڈی دکھلا دی فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اس کے علاوہ یہ چونیاں ہی اس آس کی ڈوری تھیں جو بھانجے یا بہو کے غیرت کے دریا میں کسی لمحہ جوش پیدا کر کے قرض واپس سمیت لیں یا آمدنی بحال کرا دیں۔

انھیں دنوں منجھلے بھانجے نے کہیں سے آتے ہوئے چند دن یہاں قیام کیا اور منجھلی بھانج بہو نے دسیوں کہا "ماموں آپ یہاں تو کئی سال رہ لئے اب ہمارے ہاں بھی کچھ دن چل کر رہیے"۔ اس وقت تو انھوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا، مگر اکیلے میں انھوں نے اس بات کو اچھی طرح

تو لاہ یہ بھانجا بڑے شہر میں رہتا تھا اور زیادہ فارغ البال تھا۔ چھوٹے بچے بھی نہیں تھے جو پڑھانے لکھانے کا جھنجھٹ ہوتا۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ
کام سے اوب چکے تھے، بات کچھ دل کو لگی مگر ایک دم سے تیار ہو جانا انہوں نے مناسب نہ سمجھا اور دوسری مرتبہ کہے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ اس ر
حالات معمول ان سب کے ساتھ سیر کرنے بھی گئے کہ ٹہلیں ٹہلیں پھرتے، یا نرم رو ندی کے کنارے شاید بہو یا بھانجے کو وہ بات یاد آجائے
زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کوٹھری میں قفل لگانا بھول گئے ـــ بچوں کو اپنے سامان سے دور رکھنے کے لئے ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا کہ ک
بکس میں انہوں نے ایک جن بند کر رکھا ہے۔ بچے بجائے دور رہنے کے آج اس جن کو دیکھنے کے شوق میں کھنچے چلے آئے۔ دروازہ اندر سے بند کر
اور سب کو خاموش رہنے کی تلقین کے بعد ٹکو نے تار سے زنگ لگا قفل کھول ڈالا اور پھر ڈرتے ڈرتے اس کا بوسیدہ ڈھکنا اٹھایا۔ کئی
سب اندھیرے میں آنکھیں جھپکتے رہے۔ نہ بکس میں سے دھواں نکلا نہ اس نے جن کی شکل دھاری۔ تنگ آکر انہوں نے بکس میں الٹے س
ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ بوسیدہ کتابوں کی گھنیائی ہوئی خوشبو سے ان کا دماغ پھٹنے لگا۔ پھر بھی مارے تجسس کے وہ ٹٹولتے گ
کونے میں ہاتھ ڈالا تو ایک کے ہاتھ ٹوٹی ہوئی کنگھیوں کے چند ٹکڑے لگے۔ دانت ٹوٹے، میل بھری سیاہ، کنگھیوں کے
ایک اور کے ہاتھ مال غنیمت میں اسی طرح کے سیاہ میل بھرے جھانوے کے ٹکڑے آئے۔ احتیاط سے ایک کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز کو
نے کھولا تو ایک ٹوپی نکلی جس کا رواں جھڑ گیا تھا بوری کے تاروں ایسے کپڑے پر پسیج میل جم تھا۔ ایک اور پڑیا میں چھوٹے بڑے گھسے
چپاتی سے صابن کے ٹکڑے تھے اور ایک پوٹلیا میں جانے کب کے پھٹے پرانے ان کے خود کے کپڑے۔

"ہیں بھیا ـــ یہ کیوں رکھے دادا میاں نے؟" مینا جس کی ہر بات 'ہیں بھیا' سے شروع ہوتی تھی مصر تھی۔

"مجھے کیا پتہ ـــ لے کے کان کھا گئی"۔ ٹکو نے ڈانٹ بتائی۔ وہ خود اسی بات پر حیران ہو رہا تھا۔

ان کے ننھے دماغوں میں شاید یہ بات بتانے پر بھی نہ گھستی کہ ماموں نے آج تک جو چیز استعمال کی ہے یا جس چیز کو ایک مرتبہ ہاتھ ل
وہ پھینکنے کے بجائے احتیاط سے رکھ دی ہے کہ جب شہرت کی دیوی آسمان سے اتر کر ان کے قدم چومے گی تو لوگ ان ہی چیزوں کو سر آنکھوں
رکھیں گے۔

اب ان لوگوں نے درمیان میں رکھی ہوئی کتابوں پر ہاتھ صاف کیا۔ یہ وہی کتابیں تھیں جن میں سے ماموں کہانیاں سنایا کرتے تھے
دیکھا تو کوئی ایسی ناقابل دید چیز ان میں نہ تھی جو یوں چھپا کر رکھی جائیں۔ تصویروں کو دیکھ کر ہنسی ضرور آتی تھی۔ حاتم طائی اور ان کے
کے چہرے دیکھو تو تھوڑے سے اور ٹانگیں چھوٹی چھوٹی بونوں ایسی، جھاڑیاں آدمیوں کے قد سے بھی بڑی، گھوڑوں کی شکل بیلوں جیسی، پریوں کی
چڑیلوں سے بھی بدتر۔ یہ کتابیں رکھیں تو پرانی خبریاں ہاتھ لگیں۔ جن میں عجیب عجیب اوٹ پٹانگ نقشے بنے ہوئے تھے۔ پھر جو ایک ک
کھولی تو پسینہ آگیا۔ دوسروں سے چھپا کر کھڑکی کے روزن کے سامنے دو چار ورق الٹ کر تصویریں دیکھیں پھر خیال آیا کہ جو دادا میاں نے یہ
دیکھتے دیکھ لیا تو خیر نہیں۔ جلدی جلدی اس نے ساری چیزیں واپس جمانے کی کوشش کی۔ ابھی آدھی چیزیں بھی نہ رکھی گئی تھیں کہ
کھٹکھٹایا گیا اور ماموں کی دل دہلا دینے والی آواز سنائی دی۔ مینا دروازہ کھولنے لپکی تو ٹکو نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ پھر سب نے مل کر بکس
ٹ چیزیں بھریں، تالا لگایا اور کنڈی کھول دی۔ مگر ماموں دروازے سے ان کی آخری حرکتوں کے کچھ نمونے دیکھ چکے تھے، چنانچہ دروازہ کھ
باری باری ہر ایک کی وہ کان کھنچائی ہوئی اور وہ زنّاٹے دار تھپڑ پڑے کہ ایک دفعہ کو تو تارے نظر آگئے۔ غلطی اپنی ہی تھی اس لئے کسی نے
گال سہلاتے، آنسو چھپاتے یا سڑ سڑ کرتے باہر نکل گئے۔ تب ماموں نے سوچا کہ اب اس گھر میں جہاں یوں دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے
مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے چھوٹے بھانجے کو یہ اطلاع دی کہ اب وہ کچھ عرصہ منجھلے بھانجے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

"جیسی آپ کی مرضی ـــ وہ بھی آپ کا گھر ہے، مگر زیادہ دن نہ رہیئے گا، ہمارا دل گھبرائے گا۔" بھانجے نے کہا۔

لوٹ آؤں گا۔" انھوں نے تسلی دی اور دوسرے دن شام کو جانے کے لئے ابھی سے اپنی پنڈنیا، مریا اور دیگر سامان درست کرنے میں لگ گئے۔ چلتے چلتے
کہہ دیا۔ "نانا میاں یہ لکڑی کا بکس تو یہیں چھوڑتے جائیے اس کو لے جا کر کیا کریں گے، واپس تو یہیں آئیے گا نا" تو انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور پھر
کر وہ اپنے سامان کے پیچھے پیچھے پھرتے اسی طرح اس گھر سے رخصت ہوئے جیسے کئی سال پیشتر آئے تھے۔

منجھلے بھانجے کے ہاں وہ اس طرح گھر کا جزو نہ بن سکے جس طرح چھوٹے بھانجے کے ہاں تھے۔ اپنی کوٹھریا جو گھر کے بالکل ایک علیحدہ کونے میں تھی
دیری سی لگتی جیسے ان کی جڑیں کبھی اس کوٹھری میں مضبوط نہ ہو پائیں گی۔ گھر کے سب مکین اپنے اپنے کاموں میں ایسے الجھے ہوئے تھے کہ کسی کو ان
کی فرصت ہی نہ تھی۔ بعض تو صبح کا سلام بھی مغرب کے وقت کر پاتے۔ کہاں وہ فرصت اور اہمیت کہ مار بچے چمٹے ہوئے ہیں۔ کبھی کہانیاں سنا رہے
ہیں، پچکار رہے ہیں، جس کو چاہا ڈانٹ دیا، یہاں اپنے کام میں الجھا رہتا اور یہاں کسی سے بات شروع کرتے تو وہ اچھا نانا میاں ابھی آیا، کہہ کر بقول ان کے
ہو جاتا کہ پھر سلام دعا تک کا سایہ بھی نظر نہ آتا۔ گھر میں مہمان خوب آتے جاتے ان کی تنہائی اور ویرانی میں اور اضافہ کرتے کیونکہ مہمانوں کی چہل پہل
تک ان کو بھول جاتے ــــ انہیں آرام تھا تو یہ کہ کھانا کچھ بہتر تھا۔ مگر ایسی بیدلی سے کھانے کا مزا ہی کیا۔ پھر گاؤں میں دودھ، دہی، لسی کا
یہاں دونوں وقت کالی سیاہ چائے کے سوا کیا رکھا تھا۔ وہاں صبح و شام کی تازی ہوا، اور یہاں بسوں موٹروں کا شور، سنیما کے باجے کی ڈھب ڈھب
ــــ اور جہاں تک ستر روپے کے اضافے کا تعلق تھا منجھلے بھانجے کی امارت اور فارغ البالی ذرا کام نہ آئی اور وہ ارمان اب آہستہ آہستہ حسرت
لگا۔

انہیں دنوں پاکستان بن گیا اور ہجرت کا شور اٹھا۔ مسلمانوں کے بے پناہ ریلے میں بہتے بہاتے اپنے اسی بھانجے کے ساتھ وہ بھی پاکستان پہنچ گئے۔
یور، بینک بیلنس، جائداد کے کاغذ اور ڈگریاں تک چھوڑ آئی لیکن ماموں کے لکڑی کا بکس، ٹین کا ٹرنک، گول پنڈنیا اور بے مٹھ کی لٹھیا سب ہی
پاکستان کی سرزمین پر خیریت سے آ اترے۔ اور سوائے ایک صراحی کے جو ان کی نظروں کے سامنے کسی بے رحم مسافر کے ظلم کا شکار ہو کر شہید ہو گئی، اور
سے بہتا ٹھنڈا پانی انہیں بالکل یوں لگا جیسے اپنے کسی عزیز کی نعش سے بہتا لہو۔ پاکستان میں انہیں منجھلے بھانجے کے بڑے بیٹے کے ہاں ٹھہرنا
پڑا جو پہلے سے یہاں آ گیا تھا۔ یہ گھر کاہے کو تھا سرائے تھا۔ ہندوستان سے آتا ہوا ہر کنبہ پہلے اس گھر پر دھرنا دیتا پھر کسی کو کہیں ٹھکانا مل گیا تو اٹھ گیا، ورنہ
پڑا رہا۔ چھوٹا سا گھر اور کئی خاندان گھر کا کونہ کونہ آدمیوں اور بچوں سے پٹا تھا۔ ایسے میں علیحدہ کوٹھریا تو خواب و خیال ہو گئی۔ اس دھما چوکڑی میں تو
یا اور پنڈنیا کی عزت بچانی مشکل تھی۔ ادھر وہ غسلخانے تک گئے ادھر بچوں کی ایک پوری فوج ان کے بستر پر دھما دھم کودنے لگی۔ کوئی ان کی صراحی میں
نکال کر غٹا غٹ پی رہا ہے تو کوئی پاندان سے چھالیہ چرا کر کھا رہا ہے اور کوئی شیطان لکڑی کے پرانے بکس پر چڑھ بیٹھا۔ یہ منظر دیکھ کر تو ان کی
میں خون اتر آتا مگر کہتے کس سے۔ کسی ایک کے بچے تو تھے نہیں، اور پھر سب لٹے پٹے مصیبت زدہ۔ ان کے زخمی دلوں کو نہ چھیلنے کی کوشش میں وہ کیسے
زخم کھا رہے تھے اپنے اپنے ہنگاموں میں کسی کو دیکھنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ پھر دن بھر اور رات کے بارہ بارہ بجے تک وہ شور و شر کہ نیند حرام
بچے بھی رو رہے ہیں، لڑائیاں بھی ہو رہی ہیں، ریڈیو بھی چیخ رہا ہے۔ مردوں کو کچھ کام نہیں ہے تو بیٹھ کر گھر کو سیاست کا دنگل بنا رکھا ہے
جر کی آفتوں اور خرچ سے تنگ آئی ہوئی عورتوں نے اور گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔ رات کو ذرا یہ شور و شر تھما تو کوئی پڑھاکو صاحبزادے ہیں کہ عین
کے سر پر بلب جلائے پڑھ رہے ہیں۔ بارے ان کو نیند آئی اور بلب بند ہوا تو کوئی نوزائیدہ اماں کے فراق میں بلبلا کر رو پڑا ــــ اور جو کبھی ضرورتاً صحن
بنے ہوئے لیٹرین تک جانا پڑا تو راہ میں ان گنت پلنگوں سے ٹکراتے، زمین پر سونے والے بچوں کے سر سے ٹھوکر لگتے، ہاتھ پاؤں چھلتے وہاں پہنچتے تو وہ اندر
اس بیچارے لیٹرین کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے پٹ کسی کنجوس کے بٹوے کی طرح سدا بند ہی رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایک خوش قسمت
ایسا ہوتا ہوگا جب کوئی بڑا یا بچہ اس میں موجود نہ ہو۔

کھانے میں کہاں کی چٹ پٹی چیزیں اور کدھر کا میٹھا۔ اتنی ڈھیر سی عورتیں کئی کئی گھنٹے کی محنت اور کئی روپوں کی لاگت سے جو کچھ بھی پکاتیں ہضم ہو جاتا۔ مرد تھے مالی اچھے تھے تو کچھ کام نہیں سوائے کھانے کے۔ بقول گھر والی کے کہ بچے تو بچے ہیں یہ مرد لوگ بھی سر شام کھانے کی ہائے ہائے ڈال دیتے ہیں۔ کام کاج جو نہیں۔ کچھ ایسے ہی نرم طبیعت، بے کار اور بے جائیداد ماموں کو کون پوچھتا۔ وہ وقت کی روٹی میں جانتی تھی یہی غنیمت تھا پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ سب بڑے بھانجے نے جو سرحد سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے وہاں اپنی دال گلتی نہ دیکھ کر یہیں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور مع فیملی کے آنے کا تار دے دیا۔ اب تو سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یعنی ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ ماچس کی ڈبیا میں آخر ایک حد تک ہی تیلیاں ٹھونسی جا سکتی ہیں یا یہ انداز صلب ۔۔۔ مگر مارا جا چکا تھا اور آنے والے گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ آخر کچھ دور کے عزیزوں سے زبردستی اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ وہاں باہر ایک چھوٹا خیمہ نصب کیا گیا، اور مہمان بھی اسی گھر میں آ رہے۔ اب دن میں یہ گھر باہر تک بکھرے ہوئے فرنیچر اور سڑک تک پھیلے ہوئے بچوں کی وجہ سے یوں جیسے کوئی تالاب لبالب بھرنے کے بعد چھلکنے لگے اور رات کو یہ کیفیت ہوتی جیسے کوئی ٹڈی دل کسی چھوٹے سے کھیت پر آ اترا ہو کہ سوائے ٹڈیوں زمین یا کسی پودے کی شکل نظر آتی ہو۔ ایسے میں سب نے یہ خبر اطمینان بلکہ خوشی سے سنی کہ ماموں نکو کے ساتھ چھوٹے بھانجے کے پاس جا رہے جن کا قیام ملتان کے نزدیک ایک چھوٹی سی جگہ تھا۔ جانے سب سے بڑے بھانجے پر اس خبر سے رقت طاری ہوئی یا پہلے ہی ان کا کچھ ایسا نیک ارادہ تھا کہ انہوں نے پورے تیس روپے یہ کہہ کر ماموں کو دیئے کہ مجھے کبھی آپ کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ ہندوستان سے چلتے وقت کچھ پیسہ مجھے ملا تھا یہ آپ کی نذر اتنے دن بعد تیس روپے دیکھ کر ماموں کی کچھ ایسی حالت ہوئی کہ جیسے پندرہ سال کے انتظار اور مایوسی کے بعد کسی عورت کو پتہ چلے کہ وہ ماں بننے والی۔ انھوں نے اپنے دل کو بہتیرا للکارا کہ ذرا تکلف سے کام لے اور یہ کہہ کر ابھی تمہیں ضرورت ہوگی روپیہ لوٹا دے۔ مگر دل نے ان کی بات قطعی نہیں سنی۔ ان آگے بڑھ گیا اور دوسرے لمحہ وہ تیس روپے ان کے ہاتھ میں تھے۔ رات کو کیسی کیسی مصیبتوں سے کئی قسطوں میں انہوں نے وہ ساری رقم گنی اور تقدیر کہ وہ ننانوے روپے ہو آنے سے آگے نہ بڑھی۔

ان کا ٹکٹ اور سفر خرچ تو نکو کے ذمہ رہا۔ اس لئے اس رقم میں کمی کی گنجائش تو تھی مگر کسی طرح سو بھی نہیں نظر آتی تھی۔ کئی مرتبہ دل کہ ایک روپیہ کسی سے مانگ ہی لیں۔ کوئی ایسی بڑی رقم نہیں ہے کہ کوئی نہ دے؛ مگر کہیں کیا؛ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ بڑے میاں کے پاس ہیں تو سب اپنی ضرورتیں لے کر سامنے آ جائیں گے۔ ویسے ہی مانگیں تو کیا کہہ کر ۔۔۔ اور پھر چلتے وقت کسی کو دینے سے تو رہے اور الٹا مانگ بیٹھیں۔ کوئی اچھی بات نہیں۔ شاید کوئی بھانجا یا پوتا خود ہی ہاتھ پر رکھ دے، مگر بالکل چلتے وقت دیا تو کس کام۔ وہ تو چاہتے تھے کہ پہلے سے نوٹ تیار کر کے اس میں بحفاظت رکھ لیں۔ لیکن نکو سے کہے بغیر یہ کام مشکل ہوگا۔ ۔۔۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے میں بچوں کا ریلا شور مچاتا، اچھلتا کودتا گھ ان سب کے ہاتھوں میں ایک ایک روپے کا نوٹ تھا اور وہ اس کے اعزاز میں سارا گھر سر پر اٹھا رہے تھے۔ ابھی وہ اپنی ماؤں کے ساتھ رشتے داروں مل کر آنے کی مہم سے لوٹے تھے اور کسی دادی یا پھوپی نے ان پر دادو دہش کی یہ بارش کی تھی۔ ایسے بے موقع ایک ایک روپے کے یہ نوٹ دیکھ کر ان کا بڑا خراب ہوا۔ خاصی دیر کمرے میں اچھل کود مچانے کے بعد کسی نے کہا: "ہم تو ٹافی لیں گے" ۔۔۔ "ہم بھی" ۔۔۔ "ہم بھی" کا ایک طوفان سا اٹھا اور گرتے پڑتے باہر بھاگے۔ آخیر میں منجھلے بھانجے کے بیٹے کا بیٹا منو جس کی عمر مشکل سے دو سال ہوگی دروازے سے نکلنے کو تھا کہ ان کا ہاتھ بڑھا اور انھ اسے پکڑ لیا۔

"ذرا رکو ۔۔۔ دیکھ ایک چیز دکھاؤں تجھے" لڑکا رک گیا۔ انھوں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر دونی نکالی اور اسے دکھائی لپک کر لینے بڑھا تو انھوں نے جھٹ مٹھی بند کر لی اور کہا: "وہ مجھے دے دے ۔۔۔ یہ لے لے" شاید انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ بچے کاغذوں پر ہمیشہ چمکتے دمکتے ٹھوس سکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ منو نے کچھ دیر سوچا پھر نوٹ انہیں دے کر دونی لے لی اور باہر بھاگ گیا۔
وہ بہت دیر تک سُن بیٹھے رہے۔ دل ملامت کے غوطے سے غوطے پر غوطہ کھاتا رہا۔ آخر انھوں نے دل کو یوں مخاطب کیا کہ بھئی اس میں

تھا کہیں کھو دیتا۔ ذرا سی دیر میں ہوا سے اڑ جاتا۔ مجھے تو راستے کی حفاظت کے لئے سو کا نوٹ چاہیے۔ منزل پر پہونچ کر تڑوا لوں گا اور ایک کے بجائے پانچ روپے منی آرڈر کر دوں گا۔ اور کیا ۔۔ اور جب خدا نے مجھے چھپر پھاڑ کر دولت دی تو وہ آخر انہیں لوگوں کے کام آئے گی۔ جب اپنی وصیت لکھوں گا تو سب سے پہلے حصہ اس منو کو دے دوں گا۔ یا نوکر رکھ لوں گا کہ ایک روپے کے بدلے دادا نے مالامال کر دیا۔ یوں تلے دانی کے سارے روپے پیسے سمیٹ وہ نزدیک کے کے پاس پہونچے۔ حکیم جی سے ان کی کچھ صاحب سلامت تھی۔ موسم، مہنگائی اور آج کل کے بے نام رو نوجوانوں پر لعن طعن کرنے کے بعد وہ مطلب کی بات پہ حکیم جی بھی کھاگ آدمی تھے۔ سمجھ گئے کہ بیوہ ان کی زندگی بھر کی پونجی ہے۔ نوٹ، اکنیاں، دونیاں اور دھیلے بڑی دلچسپی سے گنے اور اپنی تجوری کھول کر ایک ہرا نوٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ نوٹ لیتے ہوئے جو کیفیت ان کی ہوئی اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ خوشی قابل یقین ہوتے ہوئے بھی ناقابل تھی غیر متوقع نہ ہوتے ہوئے بھی غیر متوقع اور اچانک سی تھی۔ ان کی مسرت، ان کی گھبراہٹ، ان کا سرور پہلے پہل کئے جانے والے کسی میٹھے اور بے حد ایسا تھا۔ جیسے گاؤں کی کوئی الھڑ کنواری دنیا سے چھپ کر پنگھٹ پر اپنے محبوب سے ملنے جائے، جیسے کوئی شہر کی لڑکی پہلے پہل اپنے چاہنے والے کو ہے۔ یا کوئی نوجوان پہلے پہل کسی کا بوسہ لے۔ اس نوٹ کو جیب کے آخری کونے تک پہونچا کر اور جیب پر ہاتھ رکھ کر جیسے ساتھ ہی وہ اپنے دھڑکتے دل کو ل بھی دے رہے ہوں۔ وہ دکان کی سیڑھیاں اتر کر تیزی سے گھر لوٹ آئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہر راہگیر اور گھر کا ہر فرد انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہو سب کو ان کے راز کی اطلاع ہو گئی ہے۔ اور وہ ان کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے ہیں۔

دوسرے دن نہا دھو، اجلا قمیص پاجامہ پہن جب وہ تیار ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے رومال میں وہ نوٹ باندھ کر جیب کی تہہ میں ٹھونس لیا ے بعد اپنا استعمال کا رومال، چھوٹا سا کنگھی کا ٹکڑا، پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ اور پرانی چھالیوں کی ایک آدھ پڑیا۔ ان سب چیزوں کے بعد ان کی اکلوتی جیب ندے کے پیٹ کی طرح ابھر گئی۔ ننکو نے ٹوکا تو انہوں نے کہا کیا کروں ایک ہی جیب ہے اور سب چیزیں ضروری ہیں۔ اس نے لاکھ کہا کہ ڈبیہ مجھے دے دو میں رکھ لوں گا، مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ "بھئی خدا جانے ریل میں تمہیں کہاں جگہ ملے، مجھے کہاں۔ پھر میں کہاں مانگتا پھروں گا۔" ننکو سمجھ گیا کہ عام بوڑھوں ح انہیں اپنی کسی چیز سے عارضی مفارقت بھی گوارا نہیں ہے اور خاموش ہو گیا۔ اس ابھری ہوئی جیب کے منہ پر لگی ہوئی سیفٹی پن پر بھی کئی اعتراض اسے سوجھے لیکن یہ سوچ کر ٹال گئے کہ آج کل کے بچوں کو تو عادت ہی پڑ گئی ہے بزرگوں پر اعتراض کرنے کی۔ اور بچوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ اگلے وقتوں کے ہیں انہیں کچھ نہ کہو۔

شام کو ٹرین سے اتر کر ننکو جس وقت گھر پہونچا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اپنی ناک کی پھنگ کو اس بے دردی سے مسل رہا تھا جیسے آج توڑ کر ہی دم لے گا۔ سلام کئے بغیر اس نے پہلا سوال جو پوچھا تو یہ نکلا: "دادا میاں تو نہیں پہونچے یہاں!"

دادا میاں یہاں؟ ۔۔ کب ۔ کیسے . . . . سوالوں کی بوچھار سے وہ اور گھبرا گیا۔ آخر جیسے تیسے اس نے بتایا کہ ماموں اس کے ساتھ آ رہے تھے۔ اسٹیشن پر اس نے اتارا۔ آس پاس کوئی قلی نہیں تھا اور گاڑی بہت کم دیر ٹھہرتی ہے اس لئے گاڑی سے سامان بھی اس نے اتارا پھر اس نے ان سے کہا کہ ذرا یہیں ٹھہریں وہ کوئی قلی تلاش کر کے لاتا ہے۔ اور کوئی اسٹیشن کی عمارت تک آ کر وہ قلی کو لے کر واپس لوٹا تو وہ غائب تھے گاڑی بھی جا چکی سارے اسٹیشن پر ڈھونڈا۔ ہر ایک سے پوچھا۔ اسٹیشن سے باہر بھی دور دور تک تلاش کیا مگر ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"ارے ہیں ۔۔ کہیں گاڑی کے آگے آ کر تو نہیں کٹ مرے۔" بہو نے جو برے سے برا خیال پل بھر میں سوچ لینے میں استاد تھی کہہ کر رونا شروع ... گھر میں ماتم سا مچ گیا۔ بھانجے نے بغیر پوری کہانی سنے یا سوچے سمجھے بیٹے کو گدھا، بے وقوف، اور پاگل کے خطاب سے نوازنا شروع کر دیا اور رونا دھونا ایک ذرا ملتوی کر بیٹے کی وکالت کو آئیں کہ آخر اس میں اس بے چارے کی کیا خطا۔ غریب نے انہیں خود پلیٹ فارم پہ اتار کر کھڑا کیا اب اسے کیا معلوم کہ انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ نوکر نے سامان لا کر اندر رکھا تو ماموں کا لکڑی کا بکس، ٹرنک اور پاندان دیکھ کر بہو

دم پھر رونا آگیا۔ بھانجے نے جلدی جلدی پتلون چڑھائی اور بیٹے کو لے کر پھر تحقیق کے لئے نکلے۔ سب جگہ پوچھ گچھ کرنے کے بعد بھی جب کچھ
نہ چلا تو انہوں نے اگلے دو تین اسٹیشنوں پر تار بھجوائے اور ریلوے پولیس کو اطلاع دی۔

رات جوں توں کٹی، دوسری صبح اگلے اسٹیشن سے اطلاع آئی کہ ایک آدمی اس حلیئے کا رات کو دیکھا گیا تھا مگر وہ تو غالباً پاگل تھا۔ یہاں کسی سے لڑائی بھی کی اور چوٹ وغیرہ کھائی۔ کوئی آدمی رحم کھا کر اسے لے گیا، معلوم نہیں اسپتال میں داخل کر دیا یا پاگل خانے میں۔ یہ بات سن گھر والوں کی اور حالت خراب ہوئی۔ دوپہر کے بارہ بجے سے پہلے کوئی گاڑی ادھر جانے والی نہیں تھی۔ بسیں اس طرف چلتی نہیں تھیں۔ صبر کے سوا کیا تھا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ نہ رات کو کسی نے کھانا کھایا نہ صبح اچھی طرح ناشتہ کیا۔ ٹکو علی الصبح ماموں کی خبر لینے نکل گیا تھا مگر اب تک نہ لوٹا۔ بھانجے نے بیوی کے بہت کہنے سننے سے دو چار لقمے زہر مار کئے، اور دوپہر کی ٹرین سے اگلے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ بھی پروگرام تھا کہ اگر وہاں کچھ نہ چلا تو رات کو وہاں رہ کر دوسرے دن اس سے اگلے اسٹیشن پر تلاش جاری رکھی جائے۔ جب ٹرین چلی گئی تو ٹکو واپس لوٹا ناکام و نامراد۔ اس نے بتایا شہر میں تو کسی نے ان کی ایک جھلک تک نہ دیکھی تھی، اور کل سے اس وقت تک ریل کی لائنوں پر کسی حادثے کی اطلاع بھی نہیں آئی تھی۔

شام تک گھر میں اداسی اور مایوسی کا دور دورہ رہا۔ گھر والے قیاسات کے گھوڑے دوڑاتے بھی ڈرتے تھے۔ سب اپنے اندیشے اپنے دل میں لئے تھے۔ شام کو جب اگلے اسٹیشن سے واپسی ٹرین کا وقت آیا تو سب کے سب اپنی جگہ بے چین تھے۔ ذرا ذرا دیر بعد کوئی بچہ کسی بہانے سے دروازے کے باہر جھانک آتا۔ بارے ایک تانگے کی آواز آئی اور وہ گھر کے عین سامنے رکا۔ بھانجا ماموں کو سہارا دیتے اترا۔ ٹکو نے لپک کر دوسری طرف تھاما۔ اور وہ بمشکل انہیں اندر لائے اور ایک پلنگ پر لٹا دیا۔ ان کی سیاہی مائل جلد سے زردی جھلک رہی تھی اور وہ برسوں کے بیمار نظر آتے تھے۔ ایک طرف سے چہرہ سوجا ہوا تھا۔ یہ سوجن کان کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی اور چہرے اور گردن پر کئی چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ آنکھیں موندے نڈھال سے بستر پر پڑے تھے۔ قمیص میں سے ان کا چپاتی سا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بہو دوڑ کر گرم دودھ لائی۔ چمچہ چمچہ انہیں [illegible] گیا۔ جب ذرا طاقت آئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔ "کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں ...... ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ آرام سے لیٹے رہئے" بھانجے نے کہا۔

ماموں کی آنکھیں جو کسی امید سے جھپک رہی تھیں دھندلا گئیں۔ پھر بند ہو گئیں۔ اور وہ اونگھ گئے۔ اس وقت بھی انہیں حرارت تھی مگر رات کو خوب تیز بخار ہو گیا۔ بخار میں وہ بڑبڑائے "ہٹو جا ... دیکھ دیدے ... اچھا کہاں جائے گا ...... مردود"

رات کو بھانجے نے بیوی کو وہ سارا قصہ سنایا جو ماموں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جس وقت ٹکو ان سے سامان کے پاس ٹھہرنے کو کہہ کر گیا انہوں نے اپنے سامان کو جو بغور دیکھا تو صراحی غائب۔ اسے لانے وہ واپس ٹرین میں چڑھ گئے۔ صراحی غسل خانے میں تھی۔ جیسے ہی وہ غسل خانے میں پہنچے گاڑی چل دی۔ گھبرا کر خالی ہاتھ باہر نکلنے لگے تو گھبراہٹ میں غسل خانے کا دروازہ ہی نہ کھلا۔ آخر جب چیختے چلاتے شور مچاتے باہر نکلے تو گاڑی تیز ہو چکی تھی۔ مسافروں نے یہ سوچ کر کہ کودنے کی کوشش نہ کریں لپک کر انہیں پکڑ لیا۔ ناچار صبر کر کے بیٹھ گئے اور اگلے اسٹیشن پر اتر گئے کہ واپس آتی گاڑی سے آجائیں گے۔ واپسی کی گاڑی کے متعلق پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ دونوں گاڑیوں کا کراس یہیں ہوتا ہے۔ ان کی گاڑی رکی ہے دوسری گاڑی چلی ہے اور دوسرے دن سے پہلے اب کوئی گاڑی اس طرف نہیں جائے گی۔ یہ سن کر وہ بہت پریشان ہوئے اور ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ معلوم کس وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔ پھر ایک دم کھلی تو معلوم ہوا جیسے کوئی ان کی جیب میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ ٹٹولا تو جس رومال میں ان کے روپے تھے وہ غائب تھا۔ انہوں نے لپک کر اس لڑکے کو پکڑا جو قریب ہی کھڑا تھا۔ اور شور مچایا۔ لڑکے نے الٹا انہیں مارنا شروع کر دیا اور پاگل پاگل کہہ کر سارا اسٹیشن سر پر اٹھا لیا۔ اسی وقت بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ماموں نے کہا کہ اس نے میرا سو کا نوٹ لیا ہے۔ اسی وقت اس کی تلاشی لی گئی۔ مگر اس کے پاس سے کچھ نہ نکلا۔ ماموں خود کچھ اتنے گھبرائے ہوئے تھے بری طرح چیخ چلا رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے کہ اسٹیشن والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ یہ پاگل ہیں۔ لوگ ہنسنے لگے، بچوں نے تماشا بنا لیا۔ ان بچوں کو تفریح دی انہیں

بازار کے کسی ہوٹل میں انہیں چائے اور بسکٹ دلوائے۔ پیسے خود دے کر اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ ہوٹل کے باہر ایک بنچ پر رات بھر پڑے
ے کہہ رہے تھے کہ رات بھر ان کے رونے چلانے اور بڑبڑانے سے ہم سبھی یہی سمجھے کہ پاگل ہے۔
یا واقعی ان کے پاس سَو روپے تھے ؟" بہو نے حیران ہو کر پوچھا۔
ون تو یہی کہتے ہیں ــــــ میرا خیال ہے ضرور ہوں گے۔ ان کی حالت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے روپے کھونے کا صدمہ ہے جب
ے ہیں یہی پوچھتے ہیں پکڑا گیا وہ مردود ۔"
جب اس لڑکے کو عین وقت پر پکڑ لیا تو نوٹ اس کے پاس سے کیوں نہیں نکلا ! "
لوم نہیں ــ یا تو اس نے کسی ایسی جگہ رکھ دیا جو تلاش کرنے والوں کو ملا نہیں یا ہو سکتا ہے نوٹ کسی اور نے نکالا ہو۔ وہ تو چمپت ہو گیا۔ اور انہوں
سی دوسرے لڑکے کو پکڑ لیا ۔"
رڈ نے بھی دیکھ کر کہا کہ انہیں کوئی صدمہ پہونچا ہے ۔" اگر نوٹ کی بات غلط بھی ہو تو شریف آدمی کے لئے یہی صدمہ کیا کم ہے کہ ایک آوارہ
ئے ، لوگ اسے پاگل کہیں ، خیرات کے پیسے پر جائے پیئے ، اور رات بھر دن بھر بھوکا پیاسا رہے ۔" بہو کی یہ بات بھی سب کے دل کو لگتی
ہے وہ صدمہ پیسوں کا ہو یا اپنی بے عزتی کا ، لیکن روز بروز ان کی بگڑتی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وقت کے ساتھ یہ زخم بھرنے کے بجائے
، جس طرف چہرے پر سوجن تھی اسی طرف کا کان بھی بہنا شروع ہو گیا تھا۔ بخار بھی پیچھا نہیں چھوڑتا تھا اور کمزوری حد سے زیادہ ہو گئی تھی
ون ایسا دم درود تھا اب ملتان کے علاقے کی سڑی گرمی اور بیماری نے بالکل ہی ادھ موا کر دیا اور جلد ہی وہ دن آ گیا جب ڈاکٹر ان کی طرف سے
ہو گیا۔ بخار ہونے کے باوجود اس نے کھانے پینے کی پابندی اٹھا دی۔ اور کہا کہ جو کچھ بھی وہ مانگیں انہیں دے دیا جائے کیونکہ آخری وقت میں
ے ترسانا بیکار ہے جب بھانجے نے ان سے پوچھا کہ کس چیز کو ان کی طبیعت چاہتی ہے تو قیمے بھرے کریلے یا کہ مٹھی کی فرمائش کے بجائے نقاہت
سے انہوں نے پوچھا : اس بدمعاش نے ابھی تک وہ نوٹ اگلا یا نہیں ۔" اور پھر بھانجے کو جواب میں پس و پیش کرتے دیکھ کر انہوں نے آنکھیں
ی وقت بھانجے نے جلدی جلدی پتلون چڑھائی اور بوٹ پہن کر بغیر کچھ کہے سنے گھر سے نکل گیا۔ آج گرمی روز سے بھی سوا تھی۔ باہر لو کے جھکڑ
ے اندر تپش تھی معلوم ہوتا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر کھڑا ہے۔ بہو ماموں کو غافل دیکھ کر اپنے کمرے میں آئی اور ذرا کی ذرا کمر ٹکانے کو لیٹ گئی
ی کی کوٹھری سے کچھ عجیب و غریب سی آواز دل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ادھر لپکی تو دیکھا کہ ان پر سکوت کا عالم طاری ہے نکو کچھ ضرورتی
دوسرے بڑے اسٹیشن گیا ہوا تھا۔ چھوٹے بچے پسینے میں شرابور اوندھے سیدھے پڑے سو رہے تھے اور میاں اس قدر گرمی اور دھوپ کے
ر کہاں غائب تھے۔ بہو کو اور تو کچھ سوجھا نہیں زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور بھانجا لپکا ہوا اندر داخل

ماموں ، یہ مل گیا آپ کا نوٹ ــــ " اس نے سَو روپے کا ہرا نوٹ ماموں کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ ایک لمحہ کو ان میں چمک سی آئی
گئی ۔ دل کو ذرا تھام کر انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ بھانجے نے کان ان کے منہ سے لگا دیا۔
انہوں نے کہا ــ
یہ . . . . تم رکھو . . . . . میں نے اپنے . . . . . . کفن دفن کے لئے . . . . . جمع کئے تھے . . . . "
س نے اطمینان کا سانس لیا۔
بھانجا اور بہو یہی سمجھے ، مگر وہ ان کی آخری ہچکی تھی۔

طاہر احمد

روشنی کے لئے

ٹرین سامنے والی پلیا پر سے گذر چکی تھی۔ وہ دیر تک جیپ میں بیٹھا ٹرین کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ شام کے
ہوئے افق کی طرف بڑھتی گئی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور کسی انجا منزل کی جانب روانہ ہوگیا
اس نے شام کے جھٹ پٹے میں جیپ ایک درخت کے نیچے روک لی اور بوجھل قدموں سے اتر کر سامنے والی اس ویران
نڈی کی طرف چل دیا جہاں بوڑھے پرانے درختوں کے پیچھے سفید رنگ کی کوٹھی میں اس کو رات گذارنی تھی۔ وہ یہاں اس علاقہ
چند دن کے دورہ پر آیا تھا۔ ویسے اس کا کیمپ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا پھر بھی وہ یہ رات اس کوٹھی کی بے انتہا وسیع
ئی میں گزارنی چاہتا تھا۔ اس کو اس کوٹھی سے بے حد دلچسپی اور لگاؤ تھا یہ بات نہیں کہ یہاں آرام دہ فرنیچر یا خوبصورت پیالہ
بلکہ اس کی ایک اور وجہ تھی اور اب جبکہ وہ اس علاقہ میں ایک عرصہ بعد آیا تو اچانک اس کو اب سے دس سال پہلے کے واقعات
ں کی سی دھیمی سبک آہٹ کے ساتھ یاد آگئے اور وہ جیپ لے کر سارا دن ادھر ادھر آوارہ گھومتا رہا کبھی کسی ویران گاؤں میں
ا ریلوے کے پل کے نیچے۔ اس کے پاس تھرماس میں گرم چائے اور کھانے پینے کا کچھ سامان تھا اس لئے کوئی تکلیف نہ تھی۔ وہ بڑے
ت سے پرانے بوجھل درختوں کے نیچے ہری دوب کے درمیان سے گذرتے ہوئے پتلے سے راستے پر چڑھتا ہوا چلتا رہا۔ اس
انک احساس ہوا جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ آہستہ دبے پاؤں آرہا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا لیکن صرف خشک پتوں کی
مڑاہٹ تھی۔ اچانک ایک شاخ پر سے ایک پرندہ پھڑک کر چیخا اور ویران باغ کی پہنائی میں گم ہوگیا۔ اس نے اطمینان سے
سے نکال کر پائپ سلگایا اور ماتھے پر سے پسینہ پوچھ کر چلنے لگا راستہ درختوں سے گرے ہوئے نہ جانے کتنے سالوں کے زرد پتوں
ٹا ہوا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ اور بڑی بڑی سوکھی ہوئی گھاس جو خزاں کی وجہ سے سرخی مائل ہوگئی تھی اس کے قدموں کے
ر مرمر کر رہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ جیسے وہ ماضی کے راستے پر آگیا ہے اور حال سے دور بہت دور ماضی کی اداس پر اسرار
ی میں اتر گیا ہے۔ درختوں کے پیچھے سے سفید کوٹھی چھوٹے سے سفید چاند کی ہلکی روشنی میں مزار کی طرح خاموش کئی داستانیں
ے کھڑی تھی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ عجیب غمناک اور حسین لمحہ زندگی میں پھر نہ آئیگا
تنہائی، یاد اور حسن سب ایک جگہ ہیں۔ اس نے درختوں کی بڑھی ہوئی شاخوں کو ہاتھ سے پرے کیا جو دروازے کو تقریباً
تھیں اور دروازہ کو پرانے چوکیدار سے کھلوا کر اندر چلا گیا۔ اس دوران اس کی نگاہ دروازہ پر لگی ہوئی نام کی ایک تختی پر

زنگ آلود اور مٹی مٹی سی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنا نام پڑھ لیا ۔

شہزاد احمد ۔ فاریسٹ آفیسر

بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس کو ایک سرد جھرجھری سی آئی جیسے اس کو احساس ہو کہ اندر سے قدموں کی چاپ
ہی ابھی ٹاپی دوڑا دوڑا آئے گا اور پھر اپنی لمبی تھوتھنی سے دیر تک اس کے قدموں کو سونگھتا رہے گا اور پھر ساتھ ساتھ اندر
اور لیلی اپنی گڑیا مانگنے بسورتی ہوئی آ جائے گی ۔ اس نے لاشعوری طور پر دروازہ پر دستک دی ۔ حالانکہ اسے معلوم تھا
سال سے گھر میں کوئی پرندہ پر نہیں مارتا ۔ اندر بڑے کمرے میں سرد فرش پر مدت سے کسی انسان نے قدم نہ رکھا تھا
سرد اور شفاف تھا ۔ کھانے کی بڑی ساری میز پر پھولوں کا گلدان خالی پڑا تھا اور کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا ۔ شروع شروع
وا کبھی کبھار کھڑکیوں کے پردے تیزی سے اڑاتی گزر جاتی ۔ اس نے بٹن دبا کر کمرے کا فانوس روشن کر لیا اور شب خوابی
میں داخل ہو گیا ۔ سونے کے کمرے میں دو مسہریاں کچھ فاصلے سے بچھی ہوئی تھیں ۔ اور ان پر صاف ستھرا اجلا بستر بغیر شکن کے
تھا ۔ پاس ہی لیمپ اور میز پر ایک پرانی مقدس کتاب پڑی ہوئی تھی ۔ اس نے کتاب کو ہاتھ میں لیا ۔ کتاب کے سرد
کی سردی خاموشی کے احساس کو بڑھا رہی تھی ۔ پاس ہی ریک کے اندر اس کی پسندیدہ کتابیں اب بھی رکھی ہوئی
اور ریک کے ایک کونے پر فریم میں صفیہ کی تصویر لگی ہوئی تھی ۔ وہ یادوں میں گہرا اترنا نہ چاہتا تھا اس لئے اس نے جلد
صفیہ کی تصویر سے نگاہیں ہٹالیں اور دوسرے کمرے میں جو ڈرائنگ روم کہلاتا تھا آ گیا ۔ یہ اس کا سب سے پسندیدہ کمرہ ہوتا
یہاں کھڑکیوں میں سے ہوا نے لا لا کر کافی خشک پتے جمع کر دیئے تھے ۔ اس نے بڑی مشکل سے اندھیرے میں راستہ ٹٹولا اور
پایا ۔ اس کا ہاتھ آپ ہی آپ ان تمام جانی پہچانی چیزوں کو چھو رہا تھا ۔ کمرہ روشن ہو گیا جہاں اب بھی صفیہ کے ڈالے
گہرے مونگیا رنگ کے پردے لہرا رہے تھے اگرچہ ان کا رنگ موسموں نے کچھ بگاڑ دیا تھا اور بارش کے پانی نے جو بند کھڑکیوں سے
آتا تھا دیواروں پر ہلکے ہلکے چھینٹوں کے نشان ڈال دیئے تھے ۔ چھت پر فانوس میں چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا تھا اور پیا
ہی پیانو پر گرد جم گئی تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے سرد فرش پر سے خالی کرسیوں کی طرف آیا ۔ ایک پل کے لئے ان پر
لیا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں جو شہزاد احمد فاریسٹ آفیسر ہوں اب کافی تھک گیا ہوں ۔ اب ذرا ان منہ پھاڑے خالی کرسی
ذرا سستا لوں ۔ اس نے بجھے ہوئے پائپ میں آرام سے تمباکو بھرا اور اسے جلا کر مزے سے کش لینے لگا ۔ دیوار پر صفیہ
اور اس کے والد کی تصویریں اسی طرح موجود تھیں ۔ کارنس پر حضرت مسیح کا لکڑی کا چھوٹا سا مجسمہ اپنی باہیں پھیلائے
تھا اور شمع دان میں ادھ جلی شمعیں موجود تھیں ۔ اس نے دیا سلائی جیب سے نکال کر ایک ایک کر کے تمام شمعوں کو روشن
یا اور پیانو کے پاس آ بیٹھا ۔ رومال سے پرانی گرد صاف کی اور اس کی چھوٹی سی سائڈ ٹیبل کھولی ۔ اس کی خوشی کی حد نہ
وہ پھر بے حد غمگین بھی ہو گیا جب اس نے پیتل کے فریم میں لگے ہوئے گیتوں کے البم پر صفیہ کا نام دیکھا جو اس نے خود کھ
اگرچہ نام کچھ کالا پڑ گیا تھا لیکن صاف پڑھا جاتا تھا ۔ اس نے ہولے سے صفیہ کا نام صاف کیا اور پیانو کی دراز میں
نے بہت پرانے آرکسٹرا گیت پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرنے لگا ۔ پھر اس کی بھی انگلیاں [illegible] کر پیانو کے پردے
ں اور پھر اچانک بڑے سارے خاموش کمرے میں اور کمرے سے نکل کر ویران باغ والی سفید کوٹھی میں پیانو کی موسیقی
ساتھ جھنکار کے ساتھ پھیل گئی ۔ وہ دیر تک آنسو بہاتا رہا اور پیانو پر کئی دھنیں بجاتا رہا ۔ آخر میں "موسم خزاں کے زرد چا
تے ہوئے اس کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن اس نے نغمے کو ادھورا چھوڑ دیا اور پیانو پر سے اٹھ کر باہر دریچے میں سے جھانکنے لگ

یونہی بغیر کسی آواز کے بغیر وجہ کے۔ بس یونہی جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ جو کبھی نہ آئے گا۔ بوڑھے درخت خزاں سے ننڈ
سرد ہواؤں کی ضد پر کانپ رہے تھے۔ دور تک گھنی شاخوں نے بڑھ کر کوٹھی کو بالکل ویران اور اجاڑ بنا دیا تھا اور اوپر آسمان
سیاہ شاخوں کے پاس ایک بڑا سا تارہ ٹمٹما رہا تھا جیسے کانپ رہا ہو۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ... ماضی نے جو اس
چھن چکا ہے دبے پاؤں آکر اسے حال کی بے رنگی اور بے کیفی کا طعنہ دیا ہے۔ وہ تھکا ہارا سونے کے کمرے میں پھر آگیا اور ایک
پر لیٹ کر دوسرے خالی پلنگ کو دیر تک وحشت ناک نگاہوں سے گھورتا رہا۔

پھر اسے یاد آیا کہ جب وہ اس گھر کا ایک فرد تھا وہ شہزاد احمد فاریسٹ آفیسر نہ تھا بلکہ صفیہ اور لیلی کا محبوب تھا
تھا تو وہ ایک شاعر ہوا کرتا تھا۔ اس کے بال بڑے بڑے اور بے ترتیب ہوتے تھے اور اسے شیلے بہت پسند ہوتا تھا۔ ح
صفیہ کو شیلے کی جگہ کیٹس پسند تھا۔ اور لیلی تو وہ تو صفیہ کی چھوٹی بہن ہونے کی وجہ سے صرف لڑنا اور گڑیاں کھیلنا جانتی تھ
صفیہ کے ڈیڈی ایک مصروف کاروباری بمعقول اور خاموش ڈاکٹر تھے جن کو شاعری صفیہ۔ لیلی اور اپنی نارمن بیوی
زیادہ ڈپتھیریا وائرس کی فکر رہتی تھی اور وہ سوتے میں بھی کوئی آرڈر اپنے اردلی کو دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی سائنس
پسندی کی وجہ سے کبھی کسی کے کام میں دخل نہ دیا۔ وہ صفیہ کو ڈاکٹری پڑھانا چاہتے تھے لیکن صفیہ کو فنون لطیفہ سے دلچسپ
چنانچہ انہوں نے نہایت خاموشی سے صفیہ کے آگے سپرڈ ال دی تھی اور خود اپنی لیبارٹیری میں چلے گئے تھے۔ اور وہ جو شہ
الھڑ آوارہ اور بے رحم زادہ تھا کس طرح صفیہ سے ملنے آتا تھا۔

اسے یاد آیا کہ شروع شروع میں یہ گھر کتنا پرسکون اور شہر بھر کے دانشوروں اور موسیقاروں کا مرکز رہتا تھا
اس میں ایک نووارد کی حیثیت سے کس طرح شرمایا شرمایا آیا تھا۔ لیکن پھر یہ سب بدلتا گیا۔ زندگی نے کئی رخ بدل لئے یہ سب
ہوا۔ حالانکہ اسے اسی طرح ہونا تھا لیکن پھر بھی اس کے نیند نہ آنے والے دماغ نے باہر برآمدے کی فضا میں ماضی کی جھنکار
کر دینی شروع کر دیں اور اسے یہ سب یاد کر کے ایک طرح کا گہرا سکون مل رہا تھا جیسے وہ کسی پرانی خانقاہ میں آکر اپنے گناہ
اعتراف کر رہا ہو۔

اس نے نگاہ اٹھائی۔ سردیوں کا ویران چاند نہ جانے کس غم میں اس قدر زرد اور اداس تھا اور آہستہ آہ
پرانے راستوں پر حسن اور ٹھنڈک بکھیرتا جا رہا تھا اور درخت بھوتوں کی طرح کہر میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ اس
منظر کو دم بخود دیکھتا رہا پھر اس خیال سے بے چین ہو گیا کہ یہاں اب جو اتنی ویران ٹھنڈک ہے اور ہوائیں زرد پتے اڑا
ہیں اسی برآمدے میں اس نے آخری مرتبہ صفیہ کو گلے لگایا تھا۔ وہ اندر آگیا۔ خالی بستر اس کو بے حد پراسرار اور اج
لگ رہا تھا۔ وہ دیر تک آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ پھر اس نے بستر سے تکیہ نکالا اور اسے سونگھنے لگا۔ اس میں سے اسے
کے محبوب عطر کی پرانی باس آرہی تھی۔ اس نے چاہا کہ اس کی آنکھوں سے صرف دو آنسو ٹپک کر اس بستر میں خاموشی
جذب ہو جائیں لیکن آنکھوں میں آنسو کا نام نہ تھا۔ جب دل ہی اداسی سے پوری طرح نہ بھر سکے تو آنسو کیسے۔ اور پھر وہ اپنے
تھرڈ کلاس ناولوں والے خیال پر نفرین کرتا ہوا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اسے دس سال پہلے کے تمام لمحے یاد تھے اسی لئے تو وہ یہاں آ
اس کو معلوم ہو رہا تھا جیسے ہواؤں میں لیلی کے گڑیا کا چھوٹا سا آنچل اڑ رہا ہو اور وہ اسے پکڑنے دوڑ گئی ہو اور صفیہ ا
ایک درخت کے نیچے اس کے انتظار میں سر نیوڑھائے بیٹھی ہو۔ یہ محسوس کر کے اس کا دل ڈوبنے لگا اور جسم میں سرد بے جا
سرسراہٹ دوڑ گئی۔ اسے آج صفیہ سے ڈر لگ رہا تھا حالانکہ اس کی یاد میں آج انتہائی سکون تھا۔!

برملکی کتابیں منگوانے پر صرف ہو گئے ہیں اور اب وہ بہت پریشان ہیں اور دیوالیہ ہو چکے ہیں. لیکن وہ ریسرچ مکمل کرکے
ے خواہ کچھ ہو. اور پھر آخر میں یہ کہ ڈیڈی نے اس کی شادی میجر نوشیرواں سے کردی ہے اور وہ اس کے ہمراہ شہر سے
ہوئے آخری بار اس میں کے پرانے درخت کے نیچے جاکر ضرور بیٹھے گی اور اس کا انتظار کرے گی اور رات کو شمع جلاکر
رگیت کی دھن بجائے گی. اور یہ بھی یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی رہے گی. زادو کو حیرانی ہوئی کہ اس لڑکی نے کس
لیری اور جرأت کے ساتھ وہ سب کچھ کہہ دیا جواب تک نہ کہا تھا اور وہ بڑا تیرانداز شاعر نہ کہہ سکا تھا. لیکن اس کو
ں شادی کا کوئی خاص افسوس نہ ہوا۔

پھر صفیہ کا کوئی خط نہ آیا. وہ میجر نوشیرواں سے خوش نہ تھی اور اس کی آخری ملاقات لوکیوسٹ [illegible] پر سرسری
سے ہوئی. وہ یونہی اتوار کی شام کو ادھر جا نکلا. ڈاکٹر کے ہاں دانشور ادیب اور سائنس داں پہلے کی طرح جمع تھے لیکن
ب میں الگ تھلگ سی تھی ایک غصیلی موٹی تو اور سفید کنپٹیوں والے شخص کی تھی جو بعد میں اسے معلوم ہوا میجر نوشیرواں
یاں مجلس بہرحال پہلے کی طرح خوش باش تھی البتہ گھر میں صفیہ کی امی کی کمی تھی جو خدا کو پیاری ہوگئی تھیں اور لیلیٰ سے یہ
چھپانے کے لئے اسے لندن چچا کے پاس بھیج دیا گیا تھا. زادو اب وہ نہ تھا. اب وہ بڑی سنجیدگی سے اپنی جیب میں سے
تھا اور لوگوں سے بڑے مہذب انداز میں مصافحہ کرکے بیٹھ گیا تھا اور اپنا پائپ پینے لگا تھا پھر اس نے صفیہ کی طرف
جو اسے بالکل اچھی نہ لگی تھی اور جس کا رنگ زرد تھا اور آنکھیں جاگنے سے بوجھل تھیں جیسے ان آنکھوں میں شکایت تلخ
ہو اس نے صفیہ سے بڑی رسمی باتیں کیں. کچھ رسمی قہقہے لگائے. ڈیڈی کو ان کی مالی تباہی اور سائنسی کامیابی پر
دی اور مبارکباد دی اور چند تعزیتی جملے کہہ کر رخصت ہوگیا تھا. دروازہ میں آتے آتے صفیہ اس کے قریب آئی اس
ہونٹ وفور جذبات سے کانپے اور وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ـــ اس کا چہرہ خزاں کے پتوں کی طرح زرد تھا ـ دروازہ
رتے ہوئے اس کا ہاتھ اس سے چھو گیا۔ وہ بالکل برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

پھر وہ چلا گیا اور سندربن اور مشرقی پاکستان کے جنگلوں میں پھرتا رہا. ایک دن اسے صفیہ کا خط ملا جس میں اسکی
شی اور بے رخی کا شکوہ تھا اور لکھا تھا کہ ڈیڈی اپنی لیبارٹیری میں مردہ پائے گئے. انہوں نے گذشتہ کئی ماہ سے
جانا اور بات کرنا بند کر دیا تھا اور ہر وقت لیبارٹیری میں گھسے رہتے تھے. ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ سخت محنت کی
سے ہوا جو وہ سائنس کی ریسرچ میں کر رہے تھے. ان کے انتقال کے بعد ٹامی پاگل ہوگیا اور اسے گولی مار دینی پڑی کیونکہ وہ
بھر روتا رہتا تھا. میجر نوشیرواں فوج سے ریٹائر ہوگئے ہیں اور اب ایک منٹ بھی اس کی ان سے نہیں بنتی وہ شہر چھوڑ
پنی پرانی زمینوں پر جا رہے ہیں جہاں فارم پر کاشت کاری کریں گے. چنانچہ اس کو بھی اب مجبوراً شہر چھوڑنا پڑے گا
مانکہ اس کے لئے اس سفید، پرانے درختوں والی مہربان کوٹھی کو چھوڑنا بہت سخت دشوار ہوگا اور اسے یقین ہے کہ اب وہ کبھی
اس شہر، اس کوٹھی اور چنار کے پرانے سایہ دار درخت کے نیچے نہ جا سکے گی نیز یہ کہ وہ اب بھی شہزاد نہیں اس کو
دو کہتی ہے اور پھر یہ مشورہ تھا کہ زادو کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے. کب تک اس طرح بن بن اکیلے بھٹکتے
رہو گے؟

وہ واقعی کافی عرصہ تک بن بن بھٹکتا پھرا تھا. پھر بہت دن بعد اس علاقے میں آگیا تھا لیکن اب وہ شہزاد تھا اور
ادو تھوڑا ہی رہا تھا. اب تو وہ کافی سرد مزاج اور موٹا سا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا. شہزاد فاریسٹ آفیسر کئی سال پہلے اسے

صفیہ سے اس کی ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ وہ ان دنوں فاریسٹ کالج میں پڑھتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی اس سفی
کوٹھی کے پاس "فاریسٹ ہاسٹل" میں رہتا تھا محض ذرا سا تھروٹ پینٹ لینے وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں آیا تھا لیکن صفی
نے اسے زبردستی ضد کر کے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا اور اس کو چائے پلاتے ہوئے یاد دلایا کہ وہ شہزاد فاریسٹ کا جنگلی ہا
نہیں بلکہ کالج کے مشاعروں کا مشہور شاعر زادو بھی ہے جس پر وہ واقعی خوشی سے ہوش کھو بیٹھا تھا اور دیر تک دانت نکا
نکال کر صفیہ کی شرمائی شرمائی لیکن تیز تیز شرارت آمیز باتوں کا الٹا سیدھا جواب دیتا رہا۔ اور پھر چلتے ہوئے یہ جملہ

" زادو صاحب! ہماری امی کو نئی شاعری سے اور ڈیڈی کو ڈ تھیریا وائرس سے دلچسپی ہے۔ آپ
ضرور آئیں پھر"

پھر وہ کئی بار گیا۔ لیکن شاید صفیہ اس سے ایک حد سے آگے بے تکلف ہونا نہ چاہتی تھی اور یہ بات اسے بہت تڑپاتی
وہ بڑے بڑے منصوبے بنا کر اس سے ملنے جاتا لیکن وہ شرما کر گھگھیا کر ٹال دیتی۔ اکثر اسے بے وقوف بناتی اور شہر کے
ویران باغ یا قبرستان میں اس سے ملنے کا وعدہ کرتی اور پھر اس کو انتظار کروا کے دوسرے دن بالکل انجان بن جاتی اور
جب وہ کہتا —

"آپ نے بہت انتظار کرایا۔ کل قبرستان میں مجھے بہت ڈر لگا" —— تو وہ ہنس دیتی اور پھر دل ہی دل میں خوش
ہوتی کہ زادو اس کو کیسا چاہتا ہے۔ اسی دوران زادو اس گھر میں بہت مقبول ہو گیا۔ صفیہ کی سہیلیاں۔ لیلی۔ صفیہ کی
اور شہر کے ممتاز دانشور اور ادیب جو ڈاکٹر صاحب کے بھی دوست تھے اس گھر میں ہر اتوار کی صبح جمع ہوتے اور کئی گھنٹے
فن ادب۔ تجریدی آرٹ۔ سائنس اور حیاتیات پر باتیں ہوتیں لیکن کبھی نہ کبھی بات شاعری پر ضرور ٹکتی اور ایسے میں زاد
پناہ نہ ملتی اور اسے کچھ نہ کچھ سنانا پڑتا۔ اور رہی صفیہ تو وہ تو سب معتبر دانشوروں کی بٹیا تھی ان سب نے اسے "پیانو بجا
والی پری" کے لقب سے نوازا تھا کیونکہ وہ پیانو بجانا سیکھ رہی تھی۔ ایک اتوار کو اس نے سب کی فرمائش پر ایک نئ
دھن سنائی جس کو سب خواتین و حضرات نے بہت سراہا تھا۔ پھر تو صفیہ باقاعدہ پیانو سیکھنے لگی۔ جب صفیہ پیانو کے پردو
اپنی باریک باریک سفید انگلیاں پھیرتی تو اس کا چہرہ جذبات اور شرم سے لال بھبوکا ہو جاتا۔ ایک شام گارڈن پارٹ
اختتام پر اس نے "خزاں کا زرد چاند" نامی گیت بہت کامیابی سے بجایا۔ اور زادو کو بھی مجبوراً صفیہ کی تعریف کر
پڑی حالانکہ وہ اسے جلانے کے لئے کبھی تعریف نہ کرتا تھا۔

پھر زادو فاریسٹ سائنس کی ڈگری لینے جاپان چلا گیا۔ اسی عرصہ میں اسے برابر صفیہ کے ڈھیر ڈھیر خطوط ملتے ر
جن میں لیلی کی شرارتوں۔ ممانی کے لاڈ پیار۔ ڈیڈی کی میڈیکل ریسرچ اور امی کی بیماری کے حالات ہوتے لیکن وہ کچھ
جو صفیہ کے دل میں اور زادو کے دل میں تھا۔ یعنی صفیہ ہمیشہ زادو سے دل کی بات کہتے ہوئے کتراتی۔ پھر صفیہ کے خط کم
اور وہ بھی ٹوکیو یونیورسٹی کے ہنگاموں اور پگوڈوں اور پھولوں میں گھرے ہوئے ٹی ہاؤسوں میں بیٹھ کر صفیہ کو بھولنے
بس کبھی کبھار بھول جاتا۔ لیکن پھر اس نے محسوس کیا کہ اب صفیہ کے قرب اور اس کے پیار کی آگ کی لو دھیمی ہو رہی —
ویسے بھی اب اس کو ایسے فضول کاموں کی نسبت اپنے کیریئر اور درختوں کی ریسرچ سے فرصت کہاں ملتی تھی۔ اس کو
ایوارڈ لینا تھا۔ لیکن پھر اچانک صفیہ کا خط آنا غائب ہو گیا۔ کچھ دن زادو کو فکر رہی لیکن پھر جیسے انتظار میں مگن ہو گیا۔ کافی
بعد صفیہ کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ڈیڈی نے ایک نئی بکٹیریا پر ریسرچ کی ہے لیکن ان کو بہت نقصان ہوا ہے اور کئی ہزا

معلوم ہوئی تھی کہ صفیہ کو میجر نوشیرواں نے طلاق دیدی تھی اور اس بیچاری نے مدت سے ایک نرسنگ ہوم میں
رلی تھی لیکن یہ سب باتیں تو بہت پرانی ہوگئی تھیں اور وہ کب کی بھول چکا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس کے ذہن کے
ں میں جہاں اس کے تین بچوں اور بیوی کی تصویر ہر وقت جمی رہتی تھی اچانک ایک اداس۔ تیز نگاہوں والی لڑکی کی
ں آجاتی ہے اور جنگل میں گونجنے والی سرد ہواؤں کے ساتھ اس کو گمان ہونے لگتا کہ وہ لڑکی کہیں سے اس کا تعاقب
ہے جو اسے زادو کہتی تھی اور وہ جس کو کبھی اتنا والہانہ چاہتا تھا۔

بہت عرصہ کے بعد۔ دس سال کے بعد وہ یہاں ڈیوٹی پر بھیجدیا گیا تھا۔ اور اس علاقے میں آکر اس کو ایسا محسوس
جیسے وقت بہت گزر چکا ہے اور راستوں پر جو گرد جم گئی ہے اس پرسے ہو کر اس کو ایک بار ضرور ماضی ۔۔ انجان
ماضی کی پکار سننی ہوگی وہ اپنی روح کی آواز پر کان نہ بند کر سکے گا۔ چنانچہ کئی دن ٹالنے کے باوجود آج شام اس کے قدم
گئے اور جیپ کو طوفانی کی تیزی سے چلاتا ادھر آنکلا تھا۔

اس نے برآمدوں میں درختوں کے طویل سائے دیکھے جو ساکت ٹھیرے ہوئے تھے اور جن کے اوپر زرد چاند ایک
اداس پھیکی مردہ چاندنی بکھیر رہا تھا۔ اس نے اندر جاکر پیانو کو ہولے سے چھیڑا انگلیاں پھیریں اور ایک نغمہ فریا
کر بنکر گونج گیا — پھر وہ ویرانے کے خوف سے جلدی سے باہر آگیا — اسے محسوس ہوا جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔
یدہ اور ویران — ہر طرف گہرا شب گزیدہ سکوت طاری تھا۔

چلتے ہوئے اس نے چنار کے پرانے توانا درخت پر نگاہ ڈالی جس کی شاخوں میں ہوا سسکیاں بھر رہی تھی اسے ایسا
م ہوا جیسے کوئی سایہ اس کا پیچھا کرنے دوڑ رہا ہو اور وہ اور بھی تیزی سے چلنے لگا۔ پرانے درختوں کی زرد پتیوں اور شاخوں
ے گذرتا ہوا وہ بوجھل قدموں سے باہر آگیا اور جیپ میں بیٹھ کر اسی مانوس راستے سے لوٹ گیا ۔

اختر رضی

پرانا جوتا

یوں تو وہ ایک مدت سے ہر صبح سیر کو نکلتا تھا۔ لیکن جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا اور ریٹائر ہوئے اسے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ وقت سے آزاد ہو گیا ہو۔ صبح دفتر جانے، شام کو واپس آنے، دن بھر فائلوں کے ڈھیر میں پڑے رہنے، اپنے ساتھی کلرکوں کی گھٹیا سگریٹوں کا دھواں سونگھنے اور ٹانگیں میز پر رکھ کر چپراسی کی پکار سننے کے جس چکر نے اسے گھیر رکھا تھا اس سے آزاد ہو گیا ہو۔ جیسے تیس برس کے بعد وقت اپنا ہو کر رہ گیا ہو۔ جتنی دیر چاہے، سیر کرے، وہ جہاں چاہے جائے، جو چاہے پڑھے، فائلیں پڑھنے پر مجبور نہیں۔

صبح کی سیر میں مزا ہی کچھ اور آنے لگا تھا۔ صبح سویرے کی سورج کی کرنیں یوں لگ رہی تھیں، جیسے ہلکی ہلکی خنکی سے چھن کر آ رہی ہوں اور اس کے جسم میں نرم نرم سی گرمی پہونچا رہی ہوں۔ اس گرمی سے اسے اپنے اندر نئی حرارت کا سا احساس ہو رہا تھا۔ باغ میں جس پودے پر اس کی نظر پڑی، تازہ دکھائی دیا۔ جس پھول پر نظر پڑی اس میں ایک نئی چمک اور نکھار دکھائی دیا . . . .

آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھلا دھلا سا لگ رہا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ جو ہوا سینے میں اترتی اس سے سارے جسم میں ایک لہر سی پیدا ہو کر تمام رگوں میں پھیل جاتی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی کی وہ راہیں، جو برسوں پہلے بند ہو گئی تھیں اب پھر کھل گئی ہوں۔ اور گھر کی طرف جاتی ہوئی جس پر قدم بہ قدم چلا جا رہا تھا، جیسے مسرتوں سے بھرا راستہ ہو۔

دروازے کے پاس وہ رکا اور ایک نظر مکان کے دروازے اور اس کی دیواروں پر ڈالی۔ سورج کی کرنیں سفید دیواروں کو چمکا رہی تھیں اور درخت کی پتیوں کا سایہ دروازے پر ہلکورے لے رہا تھا۔ اسے اس سائے کے ہلکورے یوں محسوس ہوئے جیسے کوئی آغوش میں بھرنے کے لئے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا ہو۔ اس کے دل کے قریب جھکی سی ہوئی اور جسم میں لہرا گئی۔ وہ اپنے آپ مسکرانے لگا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ صبح کا اخبار نظر پڑا۔ اسے اٹھانے کے لئے جھکا اور ذہن میں آیا: کتنی مدت میں نے انتظار کیا ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آخر میں بھی اپنے مکان میں رہنے کے قابل ہو ہی گیا۔

اخبار کی سرخیوں کو دیکھتے ہوئے وہ سلیم کے کمرے کی طرف عادتاً قدم بڑھاتا گیا۔ ہر صبح سیر سے واپس آ کر سلیم کو جگایا کرتا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی رک سا گیا۔ کھڑکی کے پاس پلنگ پر سلیم سو رہا تھا اس کے چہرے سے سکون ٹپک رہا تھا۔ سانس لینے سے لحاف اوپر نیچے ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور سانس کی آواز کمرے کی خاموشی کو جیسے ہلکے ہلکے سروں سے توڑ رہی تھی۔ کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے، سو رہا ہے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک لمبی سانس لی جس سے سینہ بھر سا گیا۔ آج اتوار بھی تو ہے۔ اسے کون سا کالج جانا ہے۔ سونے دو۔ میں اتنے اخبار پڑھ لوں گا، پھر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مزا رہے گا۔ دونوں کو فرصت ہے۔ مجھے تو خیر اب فرصت ہی فرصت ہے لیکن ہفتے میں ایک ہی دن تو سلیم کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ میں بھی تو دن گئے تک سوتا رہتا تھا کتنا لطف آیا کرتا تھا۔ میری نیند کتنی گہری تھی اسے اپنے جسم میں نرم نرم سی گرمی کا احساس ہوا اور جیسے لحاف کی روئی کی سی نرمی، اور پلنگ کی گرمی اس پر سکون سا طاری کرنے لگی۔ سلیم کے نرم بال، اونچی

ں ناک، ہونٹ اور چہرے کی بناوٹ اسے اپنا لگنے لگا: آج سے پچیس تیس سال پہلے میں بھی تو ایسا ہی لگتا تھا:
قاسم نے آج سے پہلے کئی مرتبہ یہی محسوس کیا تھا۔ سلیم کو آئینے کے سامنے ٹائی لگاتے دیکھ کر، اس کے ہاتھوں کی تیز تیز حرکتوں کو دیکھ کر، گھر میں داخل ہوتے
، اپنے کمرے میں کتابیں سجاتے دیکھ کر، باتیں کرتے ہوئے ہاتھوں کے اشارے دیکھ کر قاسم نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ سلیم نہیں خود وہ ہے۔
اس بات کا احساس پہلی مرتبہ قاسم کو اس روز ہوا، جس روز وہ اس نئے مکان میں رہنے کے لئے آئے۔ سلیم سب سے آگے داخل ہوا اور ایک چکر لگا کر واپس
مرے کی طرف اشارہ کرکے بولا: "امی، میں وہ کمرہ لوں گا، مجھے وہ پسند ہے۔"
کون سا؟ وہ کمرہ؟" اس کی امی نے اسی طرف اشارہ کرکے پوچھا اور مسکرا کر کہا: "وہ تو تمہارے ابا کو پسند ہے۔"
سلیم نے قاسم کی طرف دیکھا، کہا کچھ نہیں، لیکن قاسم کو اس کی نظروں سے یوں لگا کہ وہ خود مانگنا نہیں چاہتا بلکہ اسی کے منہ سے کہلوانا چاہتا ہے۔
ہاں کمرہ تو بہت اچھا ہے، اور مجھے پسند بھی تو سلیم کے لئے ہے۔ میرا مطلب ہے میرے خیال میں سلیم کے لئے یہ کمرہ بہت اچھا ہے۔" اس نے
ں نے کہا، کہ کہیں سلیم کی دل شکنی نہ ہو۔
سلیم نے اس کمرے میں سامان خود اپنی خواہش کے مطابق سجایا تھا اور قاسم کو حیرت ہوئی تھی کہ بالکل یہی ترتیب اس کے اپنے ذہن میں تھی، اور
ے اس نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کیا سلیم میری ہی طرح سوچتا ہے؟"
اس کے بعد وہ سلیم کی ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اسے سلیم میں اپنا آپ نظر آنے لگا اور دن بدن زیادہ سے زیادہ اور ہر بار اپنی
ی ہوئی زندگی کے نقوش ہیولے سے بن کر ذہن میں لہرانے لگتے۔ ویسے ہی جیسے اس وقت اپنے سونے کی عادت اچانک ابھر کر ذہن میں پہنچ گئی تھی۔
قاسم، وہیں سے لوٹنے والا تھا کہ سلیم نے لمبا خراٹا سا لیا، کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول دیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر قاسم پر پڑی، جو یوں کھڑا
ا کہ اسے سلیم کو جگا دینے کا افسوس ہو رہا ہو۔ سلیم نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے لیٹے لیٹے کہا۔

"السلام علیکم! ابا جان — آپ سیر سے واپس آگئے؟"
قاسم نے بڑی دھیمی آواز میں جواب دیا، یوں جیسے زور سے بولا تو سلیم کو چونکا دے گا۔ "ہاں آ تو گیا، تمہیں جگانے آیا تھا۔"
سلیم اب بھی آنکھیں مل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کا چہرہ بھی سکڑ رہا تھا: "میں جاگ گیا، ابا جان۔"
"ٹھیک ہے، میں چل کر منہ ہاتھ دھو لوں — آج تمہیں چھٹی ہے نا، ذرا گپ رہے گی۔" کہتا ہوا قاسم کمرے سے باہر نکل آیا۔ اپنے پیچھے دروازہ بند
رتے ہوئے اس کی نگاہ بیوی پر پڑی جو باورچی خانہ میں کچھ کام کر رہی تھی۔ اور وہ اس طرف بڑھ گیا۔ "سلیم کو بتانے میں کیا حرج ہے۔ کالج میگزین ہی میں سہی،
لیکن لکھتا تو تھا۔ مجھے شوق تو تھا لکھنے کا۔ پہلے ہی دو برس میں سال کے بہترین لکھنے والے کا انعام بھی تو ملا تھا مجھے۔ یہ بتانے میں کیا حرج ہے۔ بعد میں اب تک
نہیں لکھ پایا۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ پرنسپل نے کہا تھا: اگر تم لکھنا چھوڑ دو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔ تم لکھ سکتے ہو۔ اسے جاری رکھنا۔"
اسے ہنسی آگئی۔ ہلکی سی ہنسی، اور پرنسپل کی اپنے متعلق رائے بھی غلط معلوم ہوئی، اور اپنی اہلیت پر اسے شبہ ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی بھی اسے دیکھ
مسکرا دی: "صبح صبح باورچی خانے میں کیا ہو رہا ہے بھئی۔"
"آپ کو بھوک نہیں لگی کیا؟ آج تو بڑی لمبی سیر کی، بہت دیر لگا دی آنے میں آپ نے۔"
"ہاں، آج بہت مزا آ رہا تھا سیر کا۔ ذرا دور نکل گیا تھا۔" اور پھر اس نے کہا، "بیگم اب تو تم اپنے مکان کی مالکن ہو، ایک نوکر رکھ لو نا، کچھ آرام بھی کرو"
اس نے کہا اور سوچ رہا تھا کہ کیسی ہمت والی عورت ہے، کبھی اس نے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا اور کبھی شکایت نہیں کی۔
"مالک تو ماشاءاللہ آپ ہی ہیں، مجھے نوکر کی کیا ضرورت ہے، کام ہی کیا ہوتا ہے گھر میں۔" اس کی بیوی کانوں تک سرخ ہو گئی اور مسکرا دی۔ قاسم

کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ آج میں اپنے متعلق اسے بتانا چاہتا ہوں، میں کیا کیا کرتا تھا۔"

اسے اپنے دوستوں کے ساتھ سیاسی نظریات پر بحثیں یاد آ رہی تھیں، جو کچھ وہ خود لکھتا تھا اس پر تنقید یاد آ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی خواب دیکھا ہو جس کا کوئی نقش صاف نہ ہو اور کوئی بات پوری طرح یاد نہ ہو۔ ایک لمبی سانس کھینچ کر اس نے سوچا: "وہ سب سیاست تو تاریخ کا حصہ بن گئی ہے، آج کل کا کچھ علم ہی نہیں۔ سلیم سے باتیں کر کے سوچ کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔"

اسے یاد آ گیا: "ارے ہاں، بیگم،" اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر بیوی کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔ "تمہیں معلوم ہے سلیم لکھتا بھی ہے؟"

"کیا لکھتا ہے؟" اس کی بیوی نے پراٹھا توے سے اتارتے ہوئے کہا۔

"ارے کہانیاں، مضمون — مجھے چند دن ہوئے پتہ چلا کہ ادبی محفلوں میں بھی جاتا ہے۔" اس کا ذہن ان محفلوں کا نقشہ کھینچ رہا تھا جہاں وہ جایا کرتا تھا۔ مشاعرے اور ادبی جلسے کرانے میں پیش پیش ہوتا تھا اور کئی کامیاب جلسے کروا چکا تھا۔

"کالج میں پڑھتا بھی تو ہو گا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کا اسے وقت کیسے مل جاتا ہے؟" اس کی بیوی نے چولہے کی آگ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ تعلیم ہوتی ہے بیگم۔ میرا تو خیال ہے کہ آدمی ان باتوں میں حصہ نہ لے تو تعلیم مکمل ہی نہیں۔ آج میں اسے بتاؤں گا کہ میں کیا کیا کرتا تھا۔ مجھی ان ہی باتوں سے دلچسپی تھی۔ جانتی ہو مجھے اس نے کئی دفعہ کہا ہے آپ کو زندگی کے ان پہلوؤں سے دلچسپی ہے تو آپ کہیں آتے جاتے کیوں نہیں۔ نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے بھی ساتھ لے جایا کرے گا۔" اس نے اپنا سر پھر گھٹنوں پر رکھ لیا اور صحن کی طرف دیکھنے لگا۔ اپنی دلچسپیاں جو بہت دور ہو چکی تھیں — اتنی کہ اسے اپنی دسترس سے باہر معلوم ہوا کرتی تھیں، سلیم کے ساتھ ساتھ قریب آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

سلیم اپنے کمرے کے دروازے سے نکلا۔ اس نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ بال بنائے ہوئے تھے اور ایک پرانا جوتا ہاتھ میں لئے باورچی خانے آ رہا تھا۔ اس نے آتے آتے قاسم کی طرف جوتا بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ابا جان، یہ آپ کا جوتا ہے کیا؟"

قاسم اس منظر سے ایک دم جیسے مرجھا سا گیا۔ "ہوں — ہاں۔" اس کے منہ سے بغیر سوچے نکلا۔ اس نے جوتا پہچان لیا تھا لیکن اس کا ذہن بجائے خود سلیم پر تھیں۔ وہ سلیم کا اتنا احترام کرتا تھا کہ گھر سے باہر جاتا ہو تو وہ کوٹ پتلون نہیں پہنتا۔ اور اگر کوئی تقریب ہی ہو تو باہر۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرنے شروع ہوئے۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتا کہ جوان بچے سے زیادہ سوال نہیں پوچھنے۔ تنگ آ جاتا ہے اور اچھا نہیں سمجھتا۔

"یہ — یہ جوتا کہاں سے ملا تمہیں؟" اس نے اپنی بدلتی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کی۔

"میری الماری میں تھے۔ میرے تو ہیں نہیں۔ میں سمجھا آپ ہی کے ہوں گے۔ ابھی آپ کے کمرے میں رکھ دوں گا۔"

سلیم نے جوتے باورچی خانے کے باہر رکھتے ہوئے کہا اور قریب ہی نل پر ہاتھ دھوتے ہوئے ماں سے پوچھا: "امی! آج کچھ پراٹھے بنا دیں۔" امی نے آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے ہنس کر کہا: "کیوں، صبح صبح بہت بھوک لگ گئی کیا؟"

"اصل میں ہم تین چار دوست پکنک کے لئے جا رہے ہیں۔ قاسم صاحب میں گھوم رہے تھے۔ سلیم باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ "کھانا گھر نہیں کھاؤ گے؟"

سلیم نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: "[illegible]"

قاسم کے ہاتھ پاؤں جیسے پھول گئے اور بے قابو ہو گیا۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ... "آج کوئی ... ہے کیا؟"

"جی ہاں، ابا جان! آج سہ پہر ایک لٹریری میٹنگ ہے اور شام کو ایک کلاسیکی موسیقی کی کونسرٹ۔"

قاسم نے ضبط کی ایک بار پھر کوشش کی، لیکن اس سے رہا نہ گیا: "سب دوست جا رہے ہیں کیا؟"

"جی نہیں — سب تو نہیں — شاید ہم اور اشتیاق ہی جائیں گے۔" اور سلیم ماں سے مخاطب ہو گیا: "امی جان، آپ نے ناشتہ کر لیا؟"

قاسم دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ صحن کی دیوار کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اوپر سے آنے والی سورج کی کرنیں فضا کے ابھرنے گرنے سے کسی ساز کی ہوئی تاریں معلوم ہو رہی تھیں۔ قاسم کے کانوں میں ہلکی ہلکی لے آنے لگی۔ جیسے دور کہیں کرنوں کے تاروں پر کسی نے کوئی ساز چھیڑ دیا ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ بند آنکھوں کے سامنے خود قاسم کھڑا وائلن بجا رہا تھا۔ یہ وہی دھن تھی اس نے پہچان لی اور ساتھ ہی اسے آواز سنائی دی: "یہ کیا ہو رہا ہے قاسم، گھر میں کیا راگ رنگ کھیلے جا رہے ہیں۔ شریفوں کا گھر ہے یا نہیں۔"

قاسم کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں۔ اور اسی وائلن کی زنگ آلود ٹوٹی تاریں اور گز کے بکھرے بال گھوم گئے۔ اس واقعہ کے بعد وائلن یہ ہی بنی تھی۔ ہم کو احساس ہی نہیں تھا کہ یہ دھن، یہ منظر اور اپنی ماں کی آواز آج تک اس کے کانوں میں محفوظ ہے۔ اس نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا، وہ کہہ رہی تھی: "پہ بھی کھا لیجیے نا، اتنی دیر ہو گئی آپ کو بیٹھے بیٹھے۔"

قاسم نے بغیر کچھ کہے پراٹھے کی تھالی اپنی طرف کھسکا لی اور نوالہ توڑتے ہی اسے خیال آیا، وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ موسیقی سے دلچسپی کو تضیع اوقات سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ شرافت سے بعید۔ اماں کے خیال کے مطابق بات ٹھیک تھی ان کی۔ وہ زمانہ اور تھا۔ میں دم نہ مار سکا۔ زمانہ بیت گیا۔ اب تو یوں لگتا ہے لوگوں میں احساس ہو کہ موسیقی زندگی کا اہم پہلو ہے۔ جسے ذوق نصیب ہو۔ کونسرٹ، کلاسیکل میوزک۔ عمدہ ہونی چاہیئے۔ ہاں سلیم نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا آپ بھی چلا کریں۔ پوچھ لوں کیا ہرج ہے۔ شاید ٹکٹ ہو۔ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے انتظام کیا ہوتا، اس کا ارادہ ہوتا تو مجھ سے بھی کہتا۔ اس نے نہیں کہا۔ مجھے پوچھنا چاہیے۔ مگر نہ رہ سکا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"سلیم! تم نے تو کہا تھا ہمیں بھی لے چلا کرو گے ایسی جگہوں پر۔"

سلیم نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں ابا جان۔ مجھے یاد تھا۔ میں نے سوچا بھی تھا۔ اصل میں مجھے خیال آیا کہ آپ وہاں جا کر بیٹھے۔ کیونکہ۔ . . . ."

سلیم نے جو کچھ آگے کہا وہ قاسم کے کانوں سے ٹکرا کر واپس ہو گیا۔ کیونکہ وہ تو سن ہو گئے تھے دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ اس کا ہاتھ لمحہ بھر کو پھڑک گیا۔ جیسے ہاتھ سے کچھ گر گیا ہو۔ اس نے سلیم کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی اور نوالہ منہ میں ڈال کر یوں چباتا اور نگلتا رہا جیسے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی ہو اور اسے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سلیم اور اس کی امی آپس میں باتیں کرنے لگے ان کی آوازیں تو قاسم تک پہنچ رہی ہیں لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ذہن بالکل خالی ہو گیا ہو۔ اسے پراٹھا ختم ہو جانے کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھ کر ہاتھ دھو جالیا۔ اگر یہیں بیٹھا رہا تو شاید پھر ایسے ہی سوال کرنے لگوں۔ جوتا اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلتے ہوئے اتنا کہتا گیا: "میں تھک گیا ہوں، ذرا سوتا ہوں۔"

ہر ایک قدم پر سلیم کی بات ابھر آتی — "آپ وہاں جا کر کیا کریں گے" — اس کے سینے پر بوجھ سا بڑھتا گیا۔ آنکھیں بھیگی سی گئیں۔ چہرہ گرم تھا لیکن جسم کپکپانے لگا۔ کمرے میں پہنچ کر اچٹتی نگاہیں گھومنے لگیں، جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہوں۔ جوتا بستر کے قریب رکھتے ہوئے نگاہیں کب نہ کہ ایک دراز میں کاغذوں کے ڈھیر پر رک گئیں۔ بکھرے ہوئے کاغذ، کچھ لکھے ہوئے، کچھ سادہ، جیسے شیشے کی اوٹ سے جھانک رہے ہوں۔ نہ لا سکا۔ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک اداس مسکراہٹ چہرے پر پھیلی اور اس نے اپنے آپ سے کہا: "لکھو سکتے ہو، ہو سکتے ہو" اور بکھرے کاغذوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں اس کے کتنے ہی دن گم تھے۔ اس کی کتنی ہی ناکام کوششیں بکھری پڑی تھیں۔ نامکمل نقوش جنہوں نے

زندگی کا سانس نہیں لیا تھا۔ اپنے سینے کے بوجھ تلے اسے اپنی ناکام کوششوں اور ناکمل زندگی کی سانسوں کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ چہرہ اور بھی گرم ہو گیا کنپٹی
ئی۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے، وہ جلدی سے کپڑے بدل کر لوٹ ہی گھس گیا آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھ سینے پر یوں رکھے جیسے بوجھ کو اٹھا کر پھینکنا چاہتا
ہے بس ساہو کر کروٹ لی اور پڑ رہا یا "زمانہ بدل گیا" سلیم کی آواز پھر جیسے ابھری "لٹریری میٹنگ ہے" اور وہ دور ماضی میں چلا گیا "تم اپنا وقت
ئع کرتے ہو۔ مجھے ایسے بیٹے کو پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو آوارہ ہو۔ جو دوست ہے تمہارا شاعر ہے یا افسانہ نویس بنا پھرتا ہے۔ انہوں نے کچھ
بھی کیا زندگی میں۔ خود کماؤ، جو چاہو کرو۔ مجھے تمہاری آوارگی سے کچھ مطلب نہیں ہوگا"

ان دنوں وہ یہ سوچا کرتا کہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ابا ٹھیک کہتے ہیں مجھے کوئی حق نہیں پہونچتا۔ اپنے خیالات ان پر ٹھونسوں۔ ماں نے حل
لا تھا کہ شادی کر دو، سب آوارگی ختم ہو جائے گی۔ ماں کو لڑکی کی تلاش ہوتی اور اسے نوکری کی۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ ان کو تکلیف نہ پہونچے
ہنے اپنے خیالات کے مطابق جو ٹھیک سمجھا کیا"

دفتر میں پہلا دن اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے اسے ایک میز اور کرسی ملی تھی اور ہیڈ کلرک نے بڑے تجربہ کارانہ انداز میں
تھا: "مسٹر قاسم: مجھے معلوم ہے تم کچھ شاعر قسم کے آدمی ہو۔ مگر محنت کرنی پڑے گی محنت۔ یہ سرکاری نوکری ہے مستقل بھی ہو جائے گی اور پنشن بھی
گی۔ محنت کرو۔ بس محنت"

ان دنوں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خوش ہو یا ناخوش۔ شکایت کرے یا قناعت۔ کام زیادہ کرے یا کم۔ فائلوں پر جھکے جھکے اسے خیالات کا
ہوم گھیر لیتا تو فائل کی سطور محو ہو جاتیں۔ اور وہ کھو سا جاتا۔ لیکن جب ہوش آتا تو اسے معلوم نہ ہوتا کہ کیا سوچ رہا تھا۔ اپنی تمام قوت سمیٹ کر فائل پر جھک
جاتا اور کام ختم کرنے کی کوشش کرتا، شام کو جب بھی دفتر سے نکلتا اس کا سر بوجھل ہوتا اور اس قدر تھکاوٹ محسوس ہوتی کہ کہیں جانے
کسی سے ملنے کو جی نہ چاہتا اور سیدھا گھر پہونچکر، اگلی صبح کی تیاری شروع کر دیتا یا چپکے سے کونے میں پڑا کوئی کتاب لے کر پڑھنے لگتا۔ کبھی کبھی لکھ
کی کوشش کرتا، لیکن خیالات اس قدر تیزی سے آتے کہ جھکپانے لگتا۔ اور پھر ذہن بالکل خالی ہو جاتا۔ ابا نے ایک مرتبہ صرف اتنا کہا: "اسی طرح ہوتا
ہے جب ذمہ داری پڑتی ہے تو سب آوارگی رفو چکر ہو جاتی ہے"

ماں نے کہا: "شادی ہو جانے دو یہ خاموشی بھی چلی جائے گی"

شادی بھی ہو گئی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور سلیم کہتا ہوا، صحن سے گزرا: "اشتیاق ہوگا نا امی جان! میں نے اسے بلایا تھا۔ آپ ذرا جلدی سے
پراٹھے بنا دیجیے"

سلیم کے قدموں کی آواز ابھر کر اس کی آواز کے ساتھ ہی مدھم پڑتی گئی۔ دروازہ کھلا اور اشتیاق کی آواز سنائی دی: "اخاہ! تیار ہو؟
مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مجھے معلوم تھا تم تیار ملوگے"

"دو گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔ چلے آئے وہاں سے، تم تیار ملو گے" سلیم نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری پھر آہستہ سے کہا: "ادھر ہی آجاؤ میرے
کمرے میں۔ ذرا دیر ٹھہرو ابھی چلتے ہیں"

دونوں کے قدموں کی چاپ سے، قاسم کو احساس ہوا کہ دونوں کمروں کے درمیان دروازہ ذرا سا کھلا ہے۔ جس سے آوازیں اس تک پہونچ رہی ہیں
اس کا جی چاہا کہ دونوں کو آواز دے کر اپنے پاس بلائے، جب تک پراٹھے بنیں تب تک ان سے باتیں ہی کرے، اس نے تکیہ سے سر اٹھایا اور دروازے
طرف کروٹ لی ہی تھی کہ اشتیاق کہتا سنائی دیا۔

"کہو پیارے، پراٹھے کہاں ہیں؟"

"کباب نکالو، کباب، پراٹھے بھی آجاتے ہیں۔ اور بیٹھ جاؤ شور نہ مچاؤ، ساتھ والے کمرے میں اباجان سو رہے ہیں۔"

"اوہو نہیں — یہ کیا وقت ہے ان کے سونے کا — یار یوں غضب ہے نہ دیکھو۔" اشتیاق نے اور اونچی آواز میں کہا۔ "شور تھوڑی مچا رہا ہوں۔"

قاسم نے سوچا: "اشتیاق بھی خاصا نڈر اور دل لڑکا ہے۔" اور سلیم کو پکار کر کہا: "میں سو نہیں رہا ہوں ادھر ہی چلے آؤ۔"

"بہت اچھا، اباجان۔" سلیم نے وہیں سے جواب دیا۔ سلیم ہنسا اور آہستہ سے بولا: "دیکھا!"

قاسم نے تکیہ پلنگ کے سرہانے پر لگا کر ذرا اونچا کر لیا اور کہنیوں پر زور دے کر سارا جسم سرہانے کی طرف کھینچ لیا۔ لحاف سینے سے اتار کر پیٹ کے گرد لپیٹ لیا اور بیٹھ کر انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے لحاف کو ادھر ادھر سے یوں ٹھیک کیا جیسے ان کے استقبال کے لئے تیار ہو رہا ہو۔

اشتیاق آگے داخل ہوا۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا: "معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو جگا دیا۔"

"نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ میں سویا تھوڑا ہی تھا۔ کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ میں نے سوچا ذرا آرام ہی کر لوں۔ تم بیٹھ جاؤ نا۔ کرسی لے لو۔" یہ کہتے ہوئے قاسم نے جسم آگے جھکا کر ہاتھ کرسی کی طرف بڑھایا۔ لیکن اشتیاق نے جلدی سے ایک ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر ہلاتے ہوئے اور دوسرے سے کرسی پکڑتے ہوئے کہا: "آپ تکلیف نہ کریں میں خود ہی لے لیتا ہوں۔"

اور کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

پلنگ کے سرہانے کی طرف سیدھا ہوتے ہوئے قاسم کی نظر سلیم پر پڑی جو دروازے کے قریب کھڑا اشتیاق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یوں مسکرا رہا تھا جیسے کچھ کہہ رہا ہو۔ اشتیاق نے ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا اور سلیم ہنستا ہوا باہر جانے لگا۔

"کیا بات ہے سلیم؟" قاسم کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں کسی بات پر ہنسے ہیں، لیکن کس بات پر، یہ معلوم نہیں تھا۔

"کچھ نہیں اباجان، میں نے سوچا ذرا دیکھ آؤں امی جان نے پراٹھے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔" سلیم صحن کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"رک جاؤ میاں — تم ہنس رہے تھے، ذرا ہمیں بھی ہنسی میں شریک کر لو۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے جیسے اظہار تمنا کیا ہو۔

"کچھ نہیں اباجان۔ میں تو آپ کی طرف دیکھ کے ہنسا تھا۔" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زہے نصیب۔ لیکن یہ بات تو نہیں تھی، دیکھ تو تم کسی اور طرف رہے تھے۔" قاسم نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ "اشتیاق کی طرف دیکھ رہے تھے۔"

"نہیں اباجان۔ واقعی!" سلیم نے بالکل بچوں کی طرح کہا: "اچھا میں ذرا پراٹھوں کا پتہ کر لوں!"

"ہاں، ہاں، ضرور۔" قاسم مسکرا رہا تھا لیکن یہ محسوس کر کے کہ سلیم نے اسے ٹالنے کے لئے غلط بات کہی، اسے کچھ دکھ سا ہوا۔ اور ایک دم اشتیاق بالکل اجنبی سا لگنے لگا۔ قاسم کے ذہن میں ایک سوال شدت سے اٹھا، کیا اشتیاق سلیم کو مجھ سے زیادہ عزیز ہے؟ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی جسم میں گرمی کی ایک لہر سی پھیل گئی اور پھر کپکپی سی ہوئی۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اشتیاق سے کہا

"سلیم بتا رہا تھا، تم لوگ پکنک کے لئے جا رہے ہو۔"

"جی — جی ہاں، پکنک کے لئے۔" اشتیاق مسکرا تو رہا تھا لیکن بول یوں رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"کہاں کا پروگرام ہے؟" قاسم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی — یونہی —" اشتیاق ذرا رکا۔ ماتھے پر ہلکا سا بل پڑا۔ پھر کھل گیا اور بولا: "ذرا دریا کے کنارے جانے کا خیال ہے۔ شاید شاید کچھ بوٹنگ کریں گے۔" اشتیاق اتنا کہہ کر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا: "معاف کیجئے، میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا، وہ سائیکل پر ہی بندھی ہیں۔ سائیکل بھی باہر ہی کھڑی ہے، اسے ڈیوڑھی میں لے آؤں۔"

،،ہاں، ضرور: قاسم نے اپنا بایاں ہاتھ لہرا کر کہا۔ "پونگ" اس کے ذہن سے جیسے نکل گیا۔ اشتیاق دھکر کہ کی طرف چلا گیا۔ قاسم کی نظریں اس
بہتے بہہ رہے تھے۔ ان کی لہروں نے قاسم کے سامنے ایک منظر کھول دیا۔
تیں۔ اشتیاق پرندوں کے میاں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دریا کے کنارے چھوٹے بڑے پودے اور بلند قامت درخت سب دھوپ میں جیسے نہا رہے تھے۔ پانی کی بھی
کا پانی پھیلا ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ دھوپ کی کرنیں پانی کی بہت بڑی چادر پر جیسے لوٹ رہی تھیں۔ پھر ابھر کر پھیل رہی تھیں جیسے موتی بکھیر رہی ہوں۔ پنچھی
اٹھتی ہوئے چل رہی تھی۔ اور کشتی کے پہلوؤں کو تھپتھپاتی لہریں، جیسے کوئی ساز چھیڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔
چل، جیسے نیم غنودگی میں چل رہی تھی اور کشتی کے پہلوؤں کو تھپتھپاتی لہریں، جیسے کوئی ساز چھیڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔
"اشتیاق کہاں ہے، ابا جان؟" سلیم کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے مسکرا کر سلیم کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا: "اپنی سائیکل شکر
ہے۔ کہہ رہا تھا باہر رکھی ہے۔" سلیم دھکر کہ کی طرف چلا گیا۔ قاسم کی آنکھوں میں وہی منظر گھوم رہا تھا۔ سلیم بولا تو ساتھ والے کمرے میں لیکن قاسم
جیسے بہت ہی دور سے آئی: "تم یہاں کیا کر رہے ہو جی، میں تو تمہیں ابا جان کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔"
"کچھ نہیں بھئی، ذرا سائیکل باہر سے اٹھا کر ڈیوڑھی میں رکھنے گیا تھا۔"
"جھوٹ۔" سلیم کی آواز میں گھٹی گھٹی ہنسی چھپی تھی۔

"نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تم سائیکل پر کب آئے ہو، جھوٹے۔"

اشتیاق مسکراتا ہوا دروازے سے داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا سلیم؟" قاسم نے سلیم کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ابا جان۔" سلیم جیسے ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

"ہوا تو ہے، تم جھوٹا کہہ رہے تھے کسی کو۔" قاسم نے جانا کہلوا کے چھوڑے۔

"جھوٹا!" سلیم نے ہنس کر تعجب کا اظہار کیا۔ "میں نے تو نہیں کہا۔"

"تم نے نہیں کہا؟" قاسم کو تشویش سی لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سلیم نے پھر اسے کیوں ٹالنے کی کوشش کی: "اچھا تم نے نہیں کہا ہوگا۔ میں نے ہی

سنا ہوگا۔"

قاسم نے نظریں جھکا لیں۔ اس سے سلیم کی مسکراہٹ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے سینے پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ اس کا بات کرنے کو
جا رہا تھا۔ لیکن سلیم اور اشتیاق دونوں پاس تھے۔ بات نہ کرنا اسے بداخلاقی معلوم ہوئی۔ اس نے ذہن کو ٹٹول کر سوال نکالا۔ "اشتیاق

بیٹھو نا!"

اشتیاق نے جیسے چونک کر سلیم کی طرف دیکھا اور آگے جھک کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک کر کہا: "جی نہیں، ڈیبیٹر تو نہیں، ویسے کبھی کبھی کالج کی میٹنگ

پر کر لیتا ہوں۔"

"اب بنتے کیوں ہو، کہو نا، ہوں۔ ابا جان ــــ اس دفعہ کالج کو ٹرافی ملی ہے اس کی وجہ سے۔"

سلیم کا انداز مذاق کا تھا۔

"جی نہیں، سلیم کی تو عادت ہے مذاق کی ــ ویسے تقریر کر دیتا ہوں۔"
"میں نے تو خیر کبھی تقریر نہیں کی، بہت سے لوگوں کو دیکھ کر طبیعت گھبرانے نہیں لگتی؟" قاسم نے باتیں جاری رکھنے کی خاطر سوال کیا۔
"جی ــ جی گھبراتی تو ہے کچھ شروع شروع میں، لیکن میرے خیال میں، جب پریکٹس ہو جائے تو پھر نہیں گھبراتی۔" اشتیاق نے کہا۔

کر بول رہا تھا۔ مجھے جواب دینے میں دقت پیش آ رہی ہو۔

"چلو۔" قاسم نے اس دوران میں جو سوال سوچا تھا وہ بھول گیا کیونکہ اس کا ذہن بار بار اس سے کہہ رہا تھا تمہاری وجہ سے اشتیاق اور سلیم دونوں پریشان ہو ئے۔ قاسم نے انہیں اپنے پاس بلا کر بٹھایا کیوں۔ اسے ایک اور بات سوجھی۔ "تقریر کرتے ہوئے تمہاری ہوٹنگ تو نہیں ہوئی کبھی؟"

اشتیاق ہلکی سی ہنسی ہنسا اور بولا: "جی ہاں کئی دفعہ ہوئی ہے۔"

"کوئی واقعہ بتائیے، دلچسپ ہوگا۔" یہ واقعہ تو ذرا لمبا ہوگا۔ اس نے سوچا، اتنی دیر خاموش رہ سکوں گا۔

اشتیاق ہلکی سی ہنسی ہنسا اور بولا: "پچھلے سال کی بات ہے۔ انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ تھی ہمارے ہی کالج میں۔ سارا ہال بھرا ہوا تھا۔ دوسرے کالجوں کے لڑکے بھی آئے ہوئے تھے اور جو اسپیکر بھی اٹھتا دوسرے کالجوں کے اسٹوڈنٹس اسے ہوٹ کرنے کی کوشش کرتے۔ میری باری بھی آئی۔ جب میں اسٹیج پر گیا ہوں تو لوگ خاموش تھے لیکن میں نے جیسے ہی 'مسٹر پریذیڈنٹ، لیڈیز اینڈ جنٹلمین' کہا ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اب کیا بتاؤں آپ کو۔" اشتیاق نے کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائیں اور بازو لہرا کر ہاتھ اوپر اٹھائے اور سر پر پھیرنے لگا۔

قاسم سوچ رہا تھا سلیم نے نہیں چاہا کہ میں مذاق میں شریک ہوتا اور پھر صاف مکر گیا۔ ظاہر ہے کہ اشتیاق کے اور اس کے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں مجھ سے نہیں کرنا چاہتا۔ مگر کیوں؟ بار بار یہی بات اس کے ذہن میں آ رہی تھی اور کیوں پر آ کر رک جاتی تھی۔ اس نے دیکھا اشتیاق بالوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے تو محسوس ہوا کہ اس نے بات پوری نہیں سنائی۔ "لیکن ہوا کیا تھا۔ ہنگامہ کیا تھا؟"

اشتیاق پھر ویسے ہی جھک گیا۔ "کچھ نہیں جی۔ ویسے ہی۔" پھر ہنس کر بولا: "بس بلیوں کی آوازیں نکالنے لگے کچھ لڑکے اور کچھ ہنسنے لگے۔"

"ٹھیک تو ہے۔" قاسم کو خود بخود ہی سوال کا جواب مل سا گیا۔ "یہ نوجوان ہیں۔ انہیں زندگی سے لطف اٹھانا چاہیئے۔ مجھ پر تو دروازے بند ہو گئے تھے۔ شوق کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اس کا بوجھ ان پر کیوں ہو۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" قاسم کو حیرت ہوئی کہ اس نے بات ساری کیسے سن لی۔

"کچھ نہیں۔ میں رک گیا۔ جب ہنسی ختم ہوئی تو میں نے کہا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہمارے یہاں کی بلیاں بھی اس قدر مہذب ہو گئی ہیں کہ ڈی بیٹ آتی ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی۔ پھر کبھی یاد آ رہا ہے کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا اور خاموشی ہو گئی۔"

اشتیاق پھر خاموش ہو گیا۔

اس بیچارے کو مجھ سے باتیں کرنے میں کتنا بوجھ پڑ رہا ہے۔ سلیم کے ساتھ کس قدر کھل کے باتیں کرتا ہے۔ منہ سے الفاظ نکلے پڑتے ہیں۔ میرے سامنے لفظ کے لئے سوچنا پڑ رہا ہے۔ یہی حال سلیم کا ہوتا ہوگا۔ اسے پھر سلیم کی بات یاد آ گئی۔ میں نے تو نہیں کہا۔ اس سے زیادہ وہ مجھ سے کیا کہے۔ بتا تو دیا اس نے کہ انہیں دینا چاہیئے۔ میں نے کبھی کسی کی بات میں دخل نہیں دیا اس کی باتوں میں کیوں دوں۔ اسے محسوس ہوا جیسے سلیم اس سے علیحدہ بالکل بیگانہ شخصیت ہے۔ سینے میں گولا سا پیدا ہوا اور حلق تک آ گیا۔ اس نے اشتیاق کی طرف دیکھا کہیں وہ اس کی کیفیت سمجھ تو نہیں رہا اور پھر ایک دم ادھر ادھر دیکھ کر بولا: "کہاں ہے؟"

"آپ نے جاتے نہیں دیکھا؟" اشتیاق نے کرسی پر اونچا ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔" قاسم کی نظریں اپنے جوتے پر پڑ رہیں۔

"باہر گیا ہے ابھی۔ شاید پھلوں کا پتہ لینے۔"

"ہاں اچھا۔ بھتے عجیب دکھائی دے رہے تھے۔" اس نے اشتیاق سے کہا: "یہ صوفہ نہایت آرام دہ ہے۔"

"لیکن خاصا پرانا معلوم ہوتا ہے۔" اشتیاق نے دیکھتے ہوئے کہا۔

تحقیقی مسائل

پروفیسر مرزا حیرت

ابن حسن قیصر صاحب نے پروفیسر مرزا حیرت کے بارے میں "ہم قلم" کے تازہ شمارے میں چند اہم استفسارات کئے ہیں
چونکہ میں بمبئی کے اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس میں جس سے مرزا صاحب کئی برس تک وابستہ تھے، ۲۲ برس تک کام کر چکا ہوں اور مرزا صاحب کے بعض
شاگردوں سے بھی ذاتی طور پر واقف ہوں اس لئے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہوں۔ خدا کرے انھیں تشفی ہو جائے۔

مولوی صاحب کے مضمون میں پروفیسر حیرت کی تاریخ وفات غلط درج ہو گئی ہے ان کا انتقال اگست ۱۸۹۹ء میں نہیں ۱۱ اکتوبر ۹۸
کو ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد الفنسٹن کالج کے پرنسپل ہیتھورن وہٹ نے اس عظیم المرتبت شخص کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا اور
حکومت کی تمام روایات کے خلاف ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم بمبئی کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۹۹-۱۸۹۸ء میں بطور ضمیمہ کے شائع کرایا (میرا اپنا
خیال ہے کہ چونکہ مولوی عبدالحق محکمۂ تعلیم سے متعلق تھے، اس لئے انھوں نے وہ مضمون اسی سرکاری رپورٹ میں پڑھا ہوگا۔) بہرحال یہی وہ مضمون ہے
جس نے پہلی دفعہ دنیا کو پروفیسر حیرت کے حالات اور کمالات سے روشناس کرایا۔ آج تک جتنے مضمون پروفیسر حیرت پر شائع ہوئے ہیں، ان سب
کی بنیاد یہی مضمون ہے

اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس سے منتقل ہو کر پروفیسر حیرت الفنسٹن کالج آ گئے اور یہاں انھوں نے ۲۹ سال تک فارسی کی کرسی کو زینت دی
یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ ایرانی نژاد دوست کون تھے۔ اس سلسلہ میں میرا قیاس یہ ہے کہ وہ دوست مرزا صاحب کے کوئی شاگرد
اور چاہتے ہوں گے کہ "افسر" میں وہ مضمون شائع ہو جائے تاکہ ان کے قابل فخر استاد کے حالات پبلک تک پہنچ جائیں۔

پروفیسر حیرت نہایت باکمال فاضل تھے۔ ان کی دو یادگاریں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک مرجان عالم کی تاریخ ایران جو حکومت بمبئی کے ایماء
انگریزی سے فارسی میں منتقل کی گئی تھی۔ دوسری ان کی غزلوں کا مجموعہ "منظومات" جو ۱۹۰۰ء میں چھپا تھا۔ اس میں صرف چند غزلیں ہیں اس لئے
حیرت نے مرنے سے پیشتر اپنا بیشتر کلام نذر آتش کر دیا تھا۔ یہ غزلیں وہ ہیں جو ان کے شاگردوں کے پاس محفوظ رہ گئی تھیں۔

۱۹۴۵ء میں پروفیسر حیرت کے ایک ممتاز شاگرد پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز نے حکومت بمبئی کی اجازت سے تعلیمی رپورٹ والے
مضمون کو ایک علیحدہ کتابچہ کی صورت میں شائع کرایا۔ اس میں پروفیسر حیرت کی غزلیں بھی ہیں جو منظومات سے لی گئی ہیں۔ کچھ نایاب

ہیں جو انھوں نے اپنی بعض کتابوں کے حاشیوں پر لکھ دی تھیں یا "منظومات" کا فارسی مقدمہ ہے جسے عبدجانی قاسم عقاریانی نے تحریر کیا تھا۔ کتابچہ میں پروفیسر حیرت کی تصویر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ ایک غزل بھی درج ہے۔ پروفیسر حیرت کی یہ دونوں یادگاریں اب "منظومات" تو ملتی نہیں، البتہ تاریخ کی جلدیں دنیا کی بعض لائبریریوں میں موجود ہیں۔

مرزا صاحب کے شاگردوں میں بعض بڑے نامور اشخاص گزرے ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی کے رجسٹرار خان بہادر فردونجی ایم۔ دستور آنجہانی کے چہیتے شاگرد تھے۔ مغل لائن بمبئی کے دفتر میں ایک ایرانی نژاد بزرگ مرزا محمد علی بھی ان کے شاگردوں میں تھے۔

میں نے جواب میں ارادۃً چند باتوں کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ مولوی صاحب والا مضمون زیادہ مکمل ہو جائے۔

(ضیاء الدین احمد برنی)

تصحیح

"ہم قلم" کا بابائے اردو نمبر نظر سے گزرا۔ اس میں آپ نے "ایک اہم دستاویز" کے عنوان سے بابائے اردو اور بابو راجندر پرشاد کا مشترکہ بیان شائع کیا ہے۔ اردو ترجمہ کی تمہید میں آپ نے لکھا ہے "یہ بیان بابو راجندر پرشاد کے قلم سے ہے" یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انگریزی مسودہ خواجہ غلام السیدین صاحب (سابق معتمد تعلیمات حکومت ہند) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا ذکر مجھ سے خود خواجہ صاحب موصوف نے کیا تھا نیز میں خواجہ صاحب کی شان خط سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔

(جلیل قدوائی (کراچی))

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

ہم قلم ادبی انعامات کے قواعد

یہ انعامات ادارۂ مصنفین پاکستان کی طرف سے دیئے جائیں گے۔

یہ انعامات ادارۂ مصنفین پاکستان کی طرف سے دیئے جائیں گے۔ سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء

۱ انعامات کے لئے صرف انہیں تخلیقات پر غور ہوگا جو مختلف پاکستانی (اردو) جرائد و رسائل میں یکم جولائی ۱۹۶۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء تک کے عرصے میں شائع ہوئی ہیں۔

۲ یہ انعامات حسب ذیل اصناف ادب پر دیئے جائیں گے اور ہر انعام کی رقم مبلغ چار سو روپے ہوگی۔

ا۔ تنقید و تحقیق

ب۔ شاعری (جملہ اصناف)

ج۔ نثر (افسانہ، طنز و مزاح، انشائیہ)

د۔ ڈرامہ

ہ۔ علاقائی زبانوں کے اُردو میں تراجم

۳ شق "ہ" کے علاوہ تمام انعامات طبع زاد نگارشات پر دیئے جائیں گے۔

۴ مقابلے میں حصہ لینے والے ادیبوں کا پاکستانی شہری ہونا لازمی ہے، البتہ ادارۂ مصنفین پاکستان کا رکن ہونا ضروری نہیں۔

۵ مرحوم مصنفین کی نگارشات بھی مقابلے میں شامل کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان کی پہلی اشاعت کی تاریخ مقررہ میعاد یعنی یکم جولائی ۱۹۶۱ء

۶ ۳۰ جون ۱۹۶۲ء کے اندر ہو۔

۷ تمام نگارشات کے تین تین نسخے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء تک مرکزی دفتر ادارۂ مصنفین پاکستان (اسٹریچن روڈ، کراچی) میں پہنچ جانا چاہئیں۔ ضروری نہیں کہ تینوں نسخے مطبوعہ صورت میں ہوں۔ ایک نسخہ مطبوعہ اور بقیہ دو نسخے منقول کی صورت میں بھیجے جاسکتے ہیں۔

۸ مصنف کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی مصنف کی نگارشات بھجوا سکتا ہے لیکن اس صورت میں اسے یقین دلانا ہوگا کہ مصنف کی منظوری حاصل کرلی گئی ہے۔

۹ انعامات کا اعلان گلڈ کی سالگرہ کے موقع پر ۳۱ جنوری ۱۹۶۳ء کو کیا جائے گا۔

۱۰ اگر کوئی مصنف انعام کے اعلان سے پہلے انتقال کرجائے تو اس کا انعام اس کے قانونی ورثاء میں تقسیم کردیا جائے گا۔

۱۱ انعام کا فیصلہ ادارۂ مصنفین کے مرکزی منتظمہ کے نامزد کردہ ججوں کی کمیٹی کرے گی۔

نوبل انعام (ادب) برائے ۶۲-۱۹۶۱ء

نوبل انعام کی اکیڈیمی نے امریکی ناول نگار جان اسٹین بک کو سال رواں کے لئے نوبل انعام برائے ادب کا مستحق قرار دیا ہے۔ اکیڈمی نے اپنے اعلان میں یہ کہا ہے کہ اسٹین بک کے ادبی کارنامے جو خیال آرائی اور حقیقت پسندی کا بہترین امتزاج ہیں ہر اعتبار سے اس انعام کے مستحق ہیں

اسٹین بک ، ۲۷ فروری ۱۹۰۲ء میں کیلی فورنیا میں پیدا ہوئے انھوں نے ابتدائی تعلیم کیلی فورنیا کے پبلک اسکول میں پائی اور پھر اسٹینفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ایک عرصہ تک وہ نیویارک میں مقیم رہے اور اخباری نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ایک عرصہ بعد بیروزگاری کے عالم میں انھوں نے میڈیسن اسکوائر کے باغ میں راج مزدور کا کام بھی کیا۔

اسٹین بک کی زندگی نشیب و فراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے میں گزری اور ان کی ادبی فتوحات دراصل اسی نبرد آزمائی کی عکاس ہیں۔ امریکی زندگی کی جس قدر صحیح تصویریں ان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتیں۔ انھوں نے آٹھ ناول لکھے ان کے علاوہ افسانوں کے سات مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اسٹین بک کی شہرت کی اصل بنیاد ان کی ناول نگاری ہے۔ اسٹین بک کو عالمی شہرت دینے کا سبب ان کا ناول "GRAPES OF WRATH" تھا جس کی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں انھیں مغربی ادب میں امتیازی مقام حاصل ہوا۔ اور ان کو اس سال کا پلٹزر انعام دیا گیا۔ اس ناول میں اسٹین بک نے بے زمین کسانوں کے حالات کو بڑی دل سوزی سے بیان کیا ہے۔

اس سے قبل ان کا ناول OF MICE AND MEN بھی خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اسٹین بک نے اس ناول کا مواد چراگاہوں کی زندگی سے لیا تھا اس ناول کو فلمایا بھی گیا۔ اسٹین بک کے دوسرے اہم ناول یہ ہیں۔

CUP OF GOLD (۳) PASTURES OF HEAVEN (۲) THE MOON IS DOWN (۱)

اسٹین بک کے مشہور افسانوں کے مجموعے یہ ہیں۔

THE LONG VALLEY (۲) THE FORGOTTEN VILLAGE (۱)

THE PEARL (۳)

خبرنامہ

ادارہ مصنفین پاکستان

ذیلی حلقہ نواب شاہ

یوم بابائے اُردو

ستمبر ۶۲ء کے آخری ہفتے میں ذیلی حلقہ نواب شاہ کی طرف سے یوم بابائے اردو منایا گیا۔ اس سلسلے میں دو روز تک ۲۸ اور ۲۹ ستمبر کو تین ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلا اجلاس ۲۸ کی شام کو جناب شاہد احمد دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر احسن فاروقی، اختر انصاری اکبر آبادی، جلیل قدوائی، جمیل نقوی، آفاق صدیقی، حکیم اسرار احمد، مظہر جمیل، طفیل احمد جمالی، اور م۔ م۔ فرشوری نے بابائے اردو کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب شاہد احمد دہلوی نے اپنے صدارتی خطبہ میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور فرمایا کہ بابائے اردو وہ واحد ادیب تھے جنہوں نے ہر محاذ پر اردو زبان اور ادب کی خدمت کی اس لئے اردو یونیورسٹی کی صورت میں ان کی یادگار قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ بابائے اردو نے سیاسی محاذ پر جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اس کی طرف عام طور پر بہت کم توجہ کی گئی ہے، وہ اگر اردو کے مسئلے پر گاندھی جی سے سمجھوتہ کر لیتے تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ بابائے اردو نے اردو کے لئے جو جد وجہد کی اس کا واضح نتیجہ پاکستان ہے۔ جناب اختر انصاری اکبر آبادی (رکن مرکزی منتظمہ گلڈ) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ بابائے اردو کی یاد منانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ علم کی نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر کی جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ہر شہر اور قصبے میں لائبریریاں قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور کہا کہ اس نیک کام کا آغاز نواب شاہ ہی سے ہونا چاہیئے۔ اختر صاحب کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ توقع ہے کہ جلد ہی جناب مصطفےٰ زیدی ڈپٹی کمشنر نواب شاہ کی توجہ سے یہ تجویز عملی صورت اختیار کرے گی۔

دوسرا اجلاس ۲۹ ستمبر کو ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں جدید اردو شاعری کے عنوان کے تحت ایک مذاکرہ ہوا جس میں جناب صدر کے علاوہ حضرت جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر احسن فاروقی، اختر انصاری اکبر آبادی، طفیل احمد جمالی، مسعود اشعر، رئیس امروہوی اور رشید لکھنوی نے حصہ لیا۔

اس سلسلے کی تیسری کڑی مشاعرہ تھا جس کی صدارت جناب مصطفےٰ زیدی نے کی۔ جن شعراء نے اس مشاعرے میں شرکت کی ان کے نام یہ ہیں: جوش ملیح آبادی، احسان دانش، جلیل قدوائی، شاعر لکھنوی، اختر انصاری اکبر آبادی، حمایت علی شاعر، محشر بدایونی، شمس زبیری، عثمان عرفانی، فضل حق، اعجاز الحق قدوسی، ظفر حیدر آبادی، ظہور نظر، عابد حشری، نظر حنفی، امداد نظامی، صہبا لکھنوی، صہبا اختر، خالد علیگ، حسن حمیدی، آفاق صدیقی، واحد بشیر، قمر جمیل، جاذب بریلوی، منظر ایوبی، نیاز بدایونی، عماد انصاری، حیش لڈھی، تنویر واسطی، رشید لکھنوی اور عارف جلالی۔

ذیلی حلقہ میرپور خاص

ادبی کنونشن

میرپور خاص کے ذیلی حلقہ ادارۂ مصنفین کی طرف سے جناب علم دار رضا صاحب کی سرپرستی اور نظام الدین صاحب کی نگرانی میں ۲۰ و ۲۱ اکتوبر کو دو روزہ ادبی کنونشن منعقد ہوا۔ پہلی نشست مضامین و مقالہ پر مشتمل تھی جس کی صدارت ڈاکٹر احسن فاروقی نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر سید شاہ علی، اختر انصاری اکبرآبادی، اعجاز الحق قدوسی، ف۔م۔ ماجد اور انجم اعظمی نے حصہ لیا۔ اس اجلاس میں سیف سلطان پوری (معتمد ذیلی حلقہ ادارہ مصنفین میرپور خاص) نے اپنی استقبالیہ تقریر میں مختصر طور پر میرپور خاص کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا۔ اختر انصاری نے سندھ کے جواں سال غزل گو قابل اجمیری کی بے وقت موت پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ ۲۰ ر کی رات کو خلیل احمد صاحب کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں طفیل احمد جمالی، ف۔م۔ ماجد، اختر انصاری اکبرآبادی، شمس زبیری، انجم اعظمی، جون ایلیا، محشر بدایونی، صہبا اختر، عثمان عرفانی، صہبا لکھنوی، خالد علیگ، خمار انصاری، اقتدار قدر، حسن حمیدی، محسن بھوپالی، ارتضیٰ عزمی، سیف سلطان پوری، اور دوسرے بہت سے شاعروں نے شرکت کی۔ دوسرے روز ڈاکٹر سید شاہ علی (کراچی یونیورسٹی) کی صدارت میں ایک مذاکرہ ہوا جس کا موضوع "اردو ادب تقسیم کے بعد" تھا۔ اس مذاکرے میں پروفیسر افتخار احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، طفیل احمد جمالی، اختر انصاری اکبرآبادی، انجم اعظمی، ف۔م۔ ماجد، شمس زبیری، اعجاز الحق قدوسی، آفاق صدیقی اور حسن حمیدی نے حصہ لیا۔ اس سلسلے کی چوتھی نشست شوکت صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں جناب صدر کے علاوہ حمید کاشمیری، انور عنایت اللہ، سلطان جمیل نسیم، نسیم درانی، عثمان عرفانی اور محمد احمد نے اپنے تازہ افسانے سنائے۔ اس نشست کے مہمان خصوصی اختر انصاری اکبرآبادی تھے۔

ذیلی حلقۂ ملتان

گلڈ لائبریری کا افتتاح

ملتان سب ریجن کے انتخابات ۱۵ راگست کو ہوئے اس کے بعد پہلا بڑا جلسہ ۳۰ ر ستمبر کو ہوا۔ ملتان سب ریجن نے ایک لائبریری قائم کی ہے جس کا افتتاح ۳۰ ر ستمبر ۶۲ء کو ملتان کے ڈپٹی کمشنر جناب سید محمد نسیم نے کیا۔ اس موقع پر ایک شاندار عصرانہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا اور مدعوین کی تعداد تقریباً سوا سو تھی اس موقع پر حاجی حمید الدین، معطی گلڈ ہاؤس کے بعد طفیل احمد جمالی نمائندہ مرکز اور قتیل شفائی ریجنل سکریٹری نے حاضرین سے خطاب کیا۔ جمالی صاحب نے ملتان گلڈ کو اس شاندار تقریب پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ گلڈ کی دوسری شاخوں کو بھی لائبریریاں قائم کرنی چاہئیں۔ قتیل شفائی صاحب نے فرمایا کہ وہ ملتان گلڈ کے موجودہ عزم، کام اور طریق کار سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ دوسرے شہروں میں بھی گلڈ ہاؤس قائم کئے جائیں۔

ان حضرات کے بعد ملتان سب ریجن کے سکریٹری عرش صدیقی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ انہوں نے ملتان گلڈ کے عزائم کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ گلڈ کا مقصد صرف ہفتہ وار یا پندرہ روزہ تنقیدی جلسے یا مشاعرے منعقد کرنا نہیں ہے بلکہ مصنفین کی تنظیم، ان کی ہر طرح کی حوصلہ افزائی، ان کے حقوق کی حفاظت، قومی اور علاقائی زبانوں کی ترویج اور اشاعتی آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے۔

انہوں نے حاجی حمید الدین معطی گلڈ ہاؤس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ حاجی صاحب، چند مخیر شہری اور ریجن کی مدد کے بغیر وہ اس شاندار تقریب کا انعقاد نہیں کر سکتے تھے۔ ریجن نے سب ریجن کو پانچ سو روپے کی رقم دی تھی جو ساری کی ساری کتب کی خریداری پر صرف کر دی گئی تھی۔ عرش صدیقی نے مزید بتایا کہ انہوں نے گلڈ لائبریری میں اردو اور انگریزی کے اچھے رسالے منگوانے کا انتظام بھی کیا ہے۔

عرش صدیقی نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ملتان میں اشاعت کتب کے معیاری ادارے ناپید ہیں اور اگر کوئی ہمت کرتا ہے تو حالات اس کی مدد نہیں کرتے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ اگر اصحاب ثروت ان کی کچھ اعانت کریں تو وہ ملتان سے ایسی کتب کی اشاعت کا انتظام کر سکتے ہیں جن پر ملتان فخر کر سکے گا۔

عرش صدیقی نے مزید کہا کہ آج کے ادیب کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ زندگی کا شعور نہ رکھے، حالات حاضرہ سے غافل رہے، اپنی حکومت قوم اور معاشرے کی خدمت سے بے خبر ہو، اور بیوی بچوں کی پرواہ نہ کرے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ گلڈ کا قیام ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آج کا ادیب زندگی کے تقاضوں سے آشنا ہے اور قوم کے تعاون سے اپنی اور معاشرے کی خدمت کا آرزو مند ہے۔

جناب سید محمد نسیم نے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ یہ درست ہے کہ حکومت گلڈ کی اعانت کر رہی ہے لیکن محض اس اعانت سے سب مسئلے حل نہیں ہو سکتے۔ کہا کہ شہر اور ملک کے اصحاب ثروت کو چاہیئے کہ وہ گلڈ کی مدد کریں۔ ملتان کے مخیر لوگوں سے انہوں نے کہا کہ وہ ملتان گلڈ کی مدد کریں تاکہ گلڈ معیاری کتب کی اشاعت کا اہتمام کر سکے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ گلڈ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

لائبریری کے افتتاح اور عصرانہ کے بعد دور شعر ہوا جس میں مقبول قریشی، صادق قمر، فرخ درانی، تاثیر نقوی، صادق مصور، عاصی کرنالی، جابر علی رشد ملتانی، ریاض انور، عرش صدیقی، طفیل احمد جمالی، کشفی ملتانی اور فنیس شفائی نے حصہ لیا۔

ذیلی حلقہ کوہاٹ

ادبی سرگرمیاں

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ نے بتاریخ ۲۲ ستمبر بوقت ۵ بجے عصر بر مکان ابو الفضل غلام رسول صاحب، سابق صوبہ سرحد کے ادیب اور اردو و پشتو کے مشہور ... صابر کے اعزاز میں ان کی کتاب "اس حمام میں" کے طبع اور شائع ہونے پر ایک دعوت عصرانہ دی جس میں کوہاٹ کے جملہ اہل قلم اور شعراء کرام نے شرکت کی۔ اس ... ادبی نشست زیر صدارت پروفیسر سید اشرف بخاری صاحب منعقد ہوئی۔ میاں غلام حیدر اختر، عطوف شفیق، محمود شوکت، سید وصی رضا اور عتیق ... ایوب صابر صاحب کی کتاب "اس حمام میں" پر مقالات پڑھے۔ ڈار صاحب، محمد حسن، محمد اسلم خاور، ابو الفضل غلام رسول صاحبان نے تقاریر کیں ... کے افادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ گلڈ شاخ کوہاٹ کے اس ادبی اجلاس میں شہر کے دیگر معززین نے بھی شرکت کی۔ اجلاس ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔

ذیلی حلقہ لائل پور

تنقیدی اجلاس

پاکستان رائٹرز گلڈ (سب ریجن) لائل پور کا پندرہ روزہ تنقیدی اجلاس جمعہ ۱۳ ستمبر کو ساڑھے پانچ بجے شام زیر صدارت حزیں لدھیانوی گلڈ کے دفتر واقع لائبریری بلڈنگ میں منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق نیر درانی کو مضمون، افضل احسن کو غزل اور نعیمی جھنجھانوی کو نظم پیش کرنا تھی مگر اول الذکر کسی وجہ ... نہ لا سکے۔ کارروائی کا آغاز یوسف تنویر جیلانی نے گذشتہ اجلاس کی روئیداد سے کیا جس کی متفقہ طور پر توثیق کی گئی۔ افضل احسن صاحب کی غزل کا ... شعر:

اب یہاں کس کے بھلا ساتھ چلا جائے ہے	ہر کوئی راہ میں دیوار بنا جاتے ہے

خلیق قریشی صاحب نے کہا وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کوئی راہرو اپنے ساتھ چلنے والے کے لئے کس طرح دیوار بن سکتا ہے۔ انہوں نے خیال ظاہر ... افضل احسن صاحب اپنا مافی الضمیر بطریق احسن بیان نہیں کر سکتے۔

زندگی ہاتھ میں پتھر لئے پھرتی ہے یہاں	کس سے شیشے کے گھروندوں میں رہا جائے ہے

خلیق قریشی، منظور احمد منظور اور کئی دوسروں نے اس شعر کی بہت ستائش کی۔

کون احسان اٹھائے گا تری آنکھوں کا	کس سے ویران مکانوں میں رہا جائے ہے

خلیق قریشی نے اعتراض اٹھایا کہ محبوب کی آنکھوں کے لئے "ویران مکانوں" کی تشبیہ بھلی نہیں لگتی، اور یہ روایت کے منافی ہے۔ تاہم ممکن ہے اب آنکھ کی خوبصورتی کا معیار بدل گیا ہو۔ احسن زیدی نے کہا کہ شاعر کے پیش نظر وہ آنکھیں ہیں جن میں کوئی تاثر نہیں پایا جاتا۔ خلیق صاحب نے سوال کیا کہ جن آنکھوں میں تاثر نہ ہو کیا وہ ویران ہوتی ہیں؟ یوسف تنویر جیلانی نے کہا یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے۔ شاعر جس فرد سے مخاطب ہے اور جس کی آنکھوں میں اس کے لئے کوئی ترغیب نہیں، کوئی ضروری نہیں کہ وہ شاعر کا محبوب ہی ہو۔ خلیق قریشی نے کہا کہ اگر کوئی سہانی گھڑی بیت چکا تو اس کی آنکھیں ویران تو کیا ہوں گی اور معصوم ہو سکتی ہیں۔ منظور احمد منظور نے کہا کہ غمزدہ آنکھیں تو اور دلکش ہوتی ہیں۔ یوسف تنویر جیلانی نے اس سلسلے میں "نرگس بیمار" کا ذکر کیا۔ خلیق قریشی تجویز کیا کہ آنکھوں کی بجائے دل کی ویرانی کو معرض اظہار میں لایا جاتا تو بہتر ہوتا۔ افضل احسن نے کہا کہ جو کچھ کہا جا چکا ہے اصلیت ہم یہی بات کہیئے۔ کہنے کو تو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ خلیق قریشی نے کہا کہ احسن صاحب نے غزل کے لئے بڑی اچھی زمین منتخب کی مگر جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے وہ پوری محنت کام نہیں لے سکے۔

رات بھر میں یا تری یاد کے ظالم سائے　　　شام ہوتے ہی مرا رنگ اڑ جائے ہے

خلیق صاحب نے کہا کہ یہ ایک اچھا شعر ہے مگر حسن بیان متقاضی ہے کہ پہلا مصرع اس طرح ہو۔ "رات میں اور تری یاد کے ظالم سائے"

افضل احسن نے کہا کہ ذیل کے دو شعر قطعہ بند ہیں۔

آنکھ کہ بحر کبھی پایاب ہے اسکے آگے　　　جسم کہ رنگ کا دریا سا بہا جاتا ہے

روشنی تیز ہو تو آنکھ کہاں کھلتی ہے؟　　　مجھ سے کب تک ترے پہلو میں رہا جاتا ہے

خلیق قریشی نے کہا کہ بہتر ہو گا ان دونوں شعروں کو باہم مربوط نہ کیا جائے کیونکہ دوسرا شعر جو بہت اچھا ہے، اپنی جگہ بالکل مکمل ہے۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ پہلے شعر میں دو جگہ لفظ "کہ" "کوکب" کے وزن پر لایا گیا ہے، اور وہ اسے کسی طرح جائز خیال نہیں کرتے۔

خلیق قریشی کے اس اعتراض کے جواز اور عدم جواز کے سلسلے میں ان کے اور فیض جھنجھانوی، منظور احمد منظور اور سحر جالندھری کے مابین کئی علمی نکات زیر بحث آئے، تاہم بالآخر خلیق قریشی کے اعتراض کو بجا قرار دیا گیا۔ غزل کا مقطع تھا۔

افضل احسن جو کبھی آگ کا طوفان تھا آج　　　ایک شعلہ ہے جو رہ رہ کے بجھا جاتا ہے

خلیق قریشی، ریاض مجید اور کئی دوسروں نے اسے بہت سراہا۔

غزل کو مجموعی طور پر زیر بحث لاتے ہوئے خلیق قریشی نے افضل احسن اور دوسرے تازہ واردان بساط سخن کو ان کی جدت طرازیوں پر داد دی اور ظاہر کی کہ وہ فنی لوازمات کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھنے کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس کریں گے۔

فیض جھنجھانوی کی نظم کا عنوان تھا "شاعر"۔ خلیق قریشی نے اس پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ نظم بہت معیاری ہے اور اس کے اشعار میں حسن تو ہے کوئی فنی سقم بھی نظر نہیں آتا، تاہم مناسب ہو گا کہ روایت کے مطابق برائے تنقید ہر شعر الگ الگ پڑھا جائے۔ حفیظ نیر صاحب نے اعتراض اٹھایا کہ جب اتنی معیاری ہے تو اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟

خلیق قریشی نے کہا کہ ہر شعر کو علیحدہ علیحدہ زیر غور لانے سے کوئی ایسا خاص نکتہ سامنے آ سکتا ہے جو مجموعی طور پر نظر نہ آ رہا تھا۔

قطرہ وہ با گوکب گوہر سے جیسے ستنیر　　　لیستی کو نین اسی جوہر سے سرافراز ہے

خلیق قریشی نے اس شعر کے پہلے مصرع کے پیش نظر اعتراض اٹھایا کہ جو گوہر صدف میں بند ہو اس کا روشنی پھیلانا بعید از قیاس ہے۔ فیض جھنجھانوی نے جواب دیا کہ آپ صدف کو فانوس تصور کیجئے۔

نظم کی مجموعی کیفیت کے بارے میں بات کرتے ہوئے خلیق قریشی نے فیض صاحب کے زور بیان اور حسن بیان کی بہت تعریف کی۔

پنجابی لسانی گروپ

رائٹرز گلڈ کے "پنجابی گروپ" نے ستمبر میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ دفتر قائم کرنے کے بعد گروپ کے تمام اراکین کو ایک سوال نامہ بھیجا گیا جس کے ذریعہ یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ لکھنے والوں نے کیا کیا لکھا، کیا کیا چھپا اور ان دنوں کیا لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی کلاسیکی ادب کے نایاب نسخوں اور غیر مطبوعہ مسودوں کے بارے میں بھی استفسار کیا گیا ہے۔ اس سوال نامہ میں فلم اور ریڈیو کے شعبوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سوال نامے کے جوابات آنے پر گروپ ٹھوس کام کرنے کا منصوبہ مرتب کرے گا۔

گروپ نے علاقائی اور قومی زبانوں کی ادبی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لئے گلڈ کے پشتو گروپ اور سندھی گروپ اور ڈھاکہ میں اردو گروپ کے سکریٹریوں سے رابطہ قائم کیا۔ لاہور میں ۲۰ اکتوبر کو مجلس عاملہ کے اجلاس میں سندھی اور پشتو کے سکریٹریوں کو بھی شرکت کرنا ہے۔ چنانچہ پنجابی گروپ کا سکریٹری اس موقع پر ان سے اپنے مسائل کے بارے میں تفصیلی بات چیت کر رہا ہے۔

مشرقی پنجاب میں پنجابی ادیبوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لئے سکریٹری نے آٹھ گورمکھی رسالوں کے ایڈیٹروں سے گزارش کی ہے کہ وہ اپنے پرچے باقاعدہ گروپ کو ارسال فرمائیں۔

گروپ نے اپنی لائبریری قائم کرنے کا پروگرام بھی وضع کر لیا ہے مگر بعض تفصیلات مجلس عاملہ کی تشکیل کے بعد طے کی جائیں گی۔ فی الحال مقامی پنجابی رسائل کے ایڈیٹروں (ڈاکٹر فقیر "پنجابی"، حکیم ناصر "پنجابی ادب" اور محمد افضل خاں "پنج دریا" — یہ سب گلڈ کے رکن بھی ہیں) سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنے رسائل کی ایک ایک جلد گلڈ کو عنایت کریں۔ اس وقت تک ماہنامہ "پنجابی ادب" اور "پنج دریا" کی جلدیں موصول ہو چکی ہیں۔

گروپ نے لاہور میں ہفتہ واری تنقیدی اجلاس شروع کر دیئے ہیں۔ گروپ ہر دو ماہی کے لئے پروگرام وضع کیا کرے گا۔ پہلے اور آخری جلسے کے علاوہ پروگرام دوسری ادبی مجلسوں کی طرح ہوگا۔ ہر دو ماہی پروگرام کے پہلے جلسے میں ایک سمپوزیم اور ایک مشاعرہ ہوا کرے گا اور آخری اجلاس کسی سربرآوردہ ادیب یا شاعر کے ساتھ ایک شام کی صورت میں ہوگا۔

سندھی لسانی گروپ کے انتخابات

۱۹۶۲-۶۳ء کے لئے سندھی لسانی گروپ ادارہ مصنفین پاکستان کے حسب ذیل عہدیدار منتخب ہوئے ہیں۔ یہ انتخاب حلقہ مغربی پاکستان ادارۂ مصنفین کی نگرانی میں عمل میں آیا۔ جناب حسن حمیدی رکن مرکزی مجلس عاملہ نے آفیسر انتخابات کے فرائض انجام دیئے۔

معتمد :- تنویر عباسی

خازن :- محمد علی ڈپلائی

اراکین مجلس عاملہ :- غلام محمد گرامی، کریم بخش خالد، پروانہ بھٹی۔

اطرافِ عالم

خوبصورت کتابوں کے لئے انعامات

نیشنل بک سینٹر آف پاکستان، امسال سال ۱۹۶۲ء میں چھپنے والی کتابوں کی صوری خوبیوں پر مجموعی طور پر چھ ہزار روپے کے انعامات دے

۱۔ چار انعامات (پریذیڈنٹس پرائز) ایک ایک ہزار روپے کے جن میں سے دو اردو کے لئے ہیں اور دو بنگلہ کے لئے۔ ہر زبان کے دو انعامات میں سے ایک بچوں کی کتابوں کے لئے مخصوص ہوگا دوسرا عام قسم کی کتابوں کے لئے۔

۲۔ یہ انعامات ناشرین کے لئے ہیں، واضح رہے کہ ان انعامات کے لئے نفس مضمون کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا بلکہ عام دلکشی، طباعت، تزئین، لے آؤٹ وغیرہ کی خوبصورتی دیکھی جائے گی۔

۳۔ دو انعامات پانچ پانچ سو روپے کے آرٹسٹوں اور تزئین کاروں کے لئے رکھے گئے ہیں۔ یہ کسی کتاب کے اندر شائع ہونے والے نقوش یا بہترین گرد پوش ڈیزائن پر دیئے جائیں گے۔ ان میں سے بھی ایک اردو کے لئے ہے ایک بنگلہ کے لئے۔

۴۔ دو انعامات پانچ پانچ سو روپے کے ٹائپ اور کتابت کی دلکشی کے لئے وقف ہیں۔ اصل مقصد اردو اور بنگلہ میں بہتر ٹائپ کی ترویج اور حوصلہ افزائی ہے۔ لیکن اگر اس میدان میں کوئی جدت بروئے کار نہ آئی ہو تو حسن کتابت پر انعام دیا جائے گا۔

قواعد

۔ ہر کتاب کی دو جلدیں نیشنل بک سنٹر آف پاکستان (نفیس سافیکل ہال، تیلدرود کراچی) کے دفتر میں دستی یا بذریعہ ڈاک ۵ جنوری ۱۹۶۳ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔ کسی فارم یا فیس داخلہ کی قید نہیں۔

۔ کتابوں کے ساتھ پریس کا سرٹیفکیٹ اس مضمون کا منسلک ہونا چاہئے کہ یہ کتاب فلاں تاریخ کو چھپ کر مکمل ہوئی۔

۔ نیشنل بک سنٹر ایسی کتابیں بھی زیر غور لاسکتا ہے جو رسمی طور پر داخل نہ کی گئی ہوں۔

۔ صرف پاکستان میں تیار شدہ کتابوں پر غور کیا جائے گا۔

انعامات کا فیصلہ ججوں کا ایک بورڈ کرے گا جس میں یونسکو کے مواد خواندگی کے ڈائرکٹر یا ان کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ رقمی انعامات کے علاوہ دوم، سوم درجہ پانے والی مطبوعات پر سندات دینے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔

مقابلے میں شامل ہونے والی تمام کتابوں کی نیشنل بک سنٹر کے لائبریری ہال میں نمائش کی جائے گی۔

مولانا سالک کی تیسری برسی

۲۷ ستمبر کو لاہور میں مولانا عبدالمجید سالک کو آج ایک دردمند طنز نگار، ایک صاحب بصیرت صحافی، ایک زندہ دل شاعر اور ایک با اصول سیاستداں کی صفات کے ساتھ یاد کیا گیا۔ مولانا سالک کی تیسری برسی کے سلسلے میں یونیورسٹی پریس کلب نے مسٹر جسٹس انوار الحق کی زیر صدارت ایک جلسہ کا اہتمام کیا تھا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ، آغا شورش کاشمیری، مولانا حامد علی خاں اور میاں محمد شفیع نے مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا۔ صاحب صدر نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ جب تک اردو ادب و صحافت زندہ ہے سالک کا نام زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سالک کی تصنیفات کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی ظرافت میں انسان دوستی تھی جو ان کا ر زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ آپ نے کہا کہ سالک کی تحریروں میں اقبال کا طرز تخاطب، ظفر علی کا قومی درد اور شبلی کا ملی تفاخر تھا اور مرحوم نے ان صفات کے ساتھ ایک ساتھ فکر کے منفرد اسلوب بیان پیدا کیا۔ سید صاحب نے سالک کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ شاہ دل اور دُنیا دلی کو زندگی کی قدر راعلیٰ سمجھتے تھے، اور ادب کے سچے خادم تھے۔

آغا شورش کاشمیری نے سالک کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر کی جن شخصیتوں کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی ذات میں ادارہ تھیں عبدالمجید سالک بھی ہیں۔ آپ نے کہا کہ یہ تخصیص کا زمانہ ہے اور ہر شخص علم و ادب کی کسی ایک شاخ یا نوع میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سالک کی عظمت اس حقیقت میں ہے کہ بیک وقت تمام اصناف ادب میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔

سالک کے مشہور فکاہیہ کالم "افکار و حوادث" کو سراہتے ہوئے آغا شورش نے کہا کہ مرحوم گالی اور طنز کے ضروری امتیاز کا پورا شعور رکھتا تھا۔ اور اس شعور نے ان کی طنزیہ تحریر یا رنگین بنایا اور نشانۂ طنز بننے والوں نے بھی ان کی داد دی۔ آغا صاحب نے زور دیا کہ ادب و صحافت اور شعر و سیاست میں مرحوم نے جو قلمی لڑائیاں لڑیں ان سے ایک نئی مرتب کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ مستقبل کا مورخ جب اردو زبان کی تاریخ لکھے گا تو اس میں سالک اور انقلاب کے نام نمایاں نظر آئیں گے۔

مولانا حامد علی خاں نے روزنامہ "زمیندار" سے سالک مرحوم کی وابستگی کا ذکر کیا اور بتایا کہ مولانا ظفر علی خاں کی فعال زندگی کے زمانے میں اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھال کر ثابت کر دیا کہ وہ ایک منجھے ہوئے اخبار نویس تھے مولانا نے انکشاف کیا کہ جس زمانہ میں سالک صاحب زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوئے حفیظ جالندھری وہاں پروف ریڈر تھے۔ مولانا نے کہا کہ سالک صاحب ہمیشہ حاجت مندوں کے کام آتے تھے اور وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔

میاں محمد شفیع نے کہا کہ جن اخبار نویسوں نے ہندو سیاست کو مسلمانوں کے حقوق پامال کرنے سے روکا ان میں سالک سب سے آگے تھے۔

لاہور میں یوم آغا حشر منایا گیا

ستمبر کو لاہور میں ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک جلسے میں آج حشر اکیڈیمی کے قیام کا اعلان کیا گیا جو مشہور مغنیہ مختار بیگم کی سربراہی میں ڈرامے کی ترویج و ترقی کے لئے کام کرے گی اور مرحوم کی تخلیقات کی تدوین و اشاعت شروع کرے گی۔ یہ جلسہ یوم آغا حشر کے سلسلہ میں مرکز تعمیر نو میں مرکزی وزارت داخلہ کے سکریٹری مسٹر این ایم خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یوم حشر لاہور پلے ہاؤس اور نیشنل کونسل آف میوزک کے زیر اہتمام منایا گیا۔ پلے ہاؤس کے سربراہ عشرت رحمانی نے حشر اکیڈمی کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ آغا حشر کا کوئی ڈراما اصل حالت میں شائع نہیں ہوا۔ وہ اپنے ڈرامے تھیٹریکل کمپنیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے اور کمپنی والے اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت ان میں شدید قطع و برید کرتے تھے جس کے نتیجے میں اصل تخلیق کا حلیہ بگڑ جاتا تھا۔ آغا حشر کے ڈراموں کی صحیح قدر و قیمت معین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں ضروری چھان بین کے بعد صحت سے شائع کیا جائے۔ عشرت صاحب نے بتایا کہ حشر اکیڈمی ۷۴۔ سی گلبرگ میں کام کرے گی۔

مسٹر این ایم خاں نے آغا حشر کی فنکارانہ صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ حشر جس مقام پر اردو ڈرامے کو چھوڑ گئے تھے وہ وہیں ہے اس کی ترقی کے لئے کچھ نہیں ہوا جب کہ دنیا کے تمام ممالک میں فن ڈرامہ عروج پر جا پہنچا ہے۔ مسٹر خان نے کہا کہ اگر ہم اردو ڈرامے کو عالمی معیار تک نہیں پہنچا سکتے تو کم اس معیار کو سامنے رکھ کر ہم آگے قدم ضرور بڑھانا چاہیئے۔

حکیم احمد شجاع نے مرحوم کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے تجویز کیا کہ آئین کے تحت اردو کی ترقی کا جو بورڈ قائم کیا گیا ہے اسے حشر کے ڈراموں کی تدوین و تہذیب کا کام سونپا جائے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اس خیال کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ کام حکومت کے سپرد کرنے کے بجائے مرحوم احباب اور مداحوں کو سرانجام دینا چاہیئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ آج ڈرامے کا تصور بدل چکا ہے ہمیں آغا حشر کی تخلیقات پر قانع ہونے کے بجائے ان کی روایات کو آگے بڑھانا چاہیئے۔

پروفیسر علیم الدین سالک نے اپنی تقریر میں کہا کہ حشر ایک شعلہ نوا خطیب، ایک زندہ دل عالم اور ایک وطن پرست شاعر بھی تھے لیکن ان کی تمام تر سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ ملک حبیب احمد اور پروفیسر نصیر احمد ناصر نے بھی آغا حشر کے فن اور شخصیت کو خراج تحسین ادا کیا۔ یوم آغا حشر کی دوسری تقریبات اوپن تھیٹر میں منعقد ہوئیں مرحوم کے ڈراموں میں سے اقتباسات کو اسٹیج کیا گیا اور مختار بیگم، عبدالشکور اور محمود بٹ نے حشر کا کلام سنایا۔

"میری جگہ میرا وطن ہی" (فیض)

(دہلی ۱۶ اکتوبر۔ ٹائمز آف انڈیا دہلی کے نامہ نگار مقیم لندن نے اطلاع دی ہے کہ امن کے لینن انعام یافتہ مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض نے لندن میں اردو کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے انہوں نے نامہ نگار مذکور کو ایک انٹرویو میں بتایا "میری جگہ میرا وطن ہے اور میں وہیں واپس جاؤں گا دوسرے ملک میں بود و باش اختیار کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا"

کتب کے غیر مجلد اور سستے ایڈیشن عوام میں مقبول ہو رہے ہیں

کتابوں کی طباعت و اشاعت کے کاروبار کے جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ لاہور میں نئی معیاری کتب کی اشاعت کی یومیہ اوسط دس ہے ان کتابوں کی ۸۰ فیصد تعداد افسانوی ادب سے متعلق ہوتی ہے کیونکہ مقامی ناشر کاروباری نقطہ نظر سے مقبول عام موضوع کتابوں کی اشاعت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خالص علمی اور تحقیقی موضوعات پر چھپنے والی کتابوں کی تعداد سب سے کم ہے۔

افسانوی ادب کی کتب کے بعد اسلامی تاریخی کتب زیادہ تعداد میں شائع ہوتی ہیں ان کے بعد شاعروں کے مجموعے اور شعری ادب کا نمبر آتا ہے جائزہ میں جاسوسی کتابوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ کتب مستند ناشر فروخت نہیں کرتے اور یہ زیادہ تر کراچی میں شائع ہوتی ہیں اگر ان کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد افسانوی ادب کی کتب سے بھی بڑھ جائے گی۔ جب سے ناشروں نے معروف اور مقبول کتب کے غیر مجلد اور سستے ایڈیشن شائع کرنے شروع کئے ہیں کتابوں کی فروخت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے لاہور اور کراچی کے بیشتر ناشر اپنی کتابوں کے سستے ایڈیشن چھاپ رہے ہیں جن کی قیمت نصف یا تہائی کم ہوتی ہے یہ کتب اخباری کاغذ پر چھپتی ہیں اور جلد کے لئے گتے کی بجائے موٹا کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔

بعض ناشر علمی اور تحقیقی کتب بھی اخباری کاغذ پر شائع کرتے ہیں لیکن ان کی قیمت نفیس کاغذ پر شائع ہونے والی کتابوں کے برابر ہی رکھی جاتی ہے کیونکہ ان کی مانگ بہت کم ہے اور ایک ایڈیشن فروخت ہونے میں کافی عرصہ لگتا ہے اس لئے رقم پھنسی رہتی ہے اور یہ کسر قیمت میں اضافہ کر کے نکالی جاتی ہے معلوم ہوا ہے کہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ افراد زیادہ تر رسالے پڑھتے ہیں لیکن وہ کبھی کبھی سستی کتابیں بھی خرید لیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ اپنے مطالعہ کے ذوق کی تسکین کے لئے بالعموم محلوں کی لائبریریوں سے رجوع کرتے ہیں جہاں انہیں اپنی پسند کی کتاب مل جاتی ہے۔

شاعروں کے کلام کے مجموعے اور اس قسم کی دوسری کتابیں صرف وہی لوگ خریدتے ہیں جو مالی اعتبار سے خوش حال ہیں۔ مقامی ناشروں نے بتایا کہ دولت مند طبقہ ایسی کتابیں خریدنا پسند کرتا ہے جو حسن طباعت کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے دل پسند موضوع کی کتابیں عموماً دیدہ زیب ہوا کرتی ہیں ایسی کتابیں پڑھنے والوں میں اکثریت خواتین کی ہے کیونکہ خواتین کے پاس وقت بہت ہوتا ہے۔

مقامی ناشر کو شکایت ہے کہ مطالعہ کا شوق روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے کتابوں کی فروخت میں ایک تہائی کمی ہو گئی ہے چنانچہ لوگوں میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے ناشروں نے پرانی اور نئی کتابوں کے سستے ایڈیشن چھاپنے شروع کر دیئے ہیں۔ ناشروں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کتابوں کے سستے ایڈیشن جس رفتار سے مقبول ہو رہے ہیں اس کے پیش نظر خطرہ ہے کہ ان کی کتابوں کے مجلد ایڈیشن صرف لائبریریوں تک محدود ہو جائیں گے۔

لاہور میں نادر اور قیمتی دینی کتب کی لائبریری کا قیام

لاہور۔ مرکزی کتب خانہ علوم اسلامیہ" نامی اسلامی کتب کی ایک لائبریری ایس پی ایس کے ہال بیرون موچی دروازہ لاہور میں قائم کی گئی۔ اس لائبریری سے عوام فائدہ اٹھا سکیں گے نیز یہ اسلامی موضوعات پر اجتماعی اور انفرادی تحقیق کی ضروریات کو بھی پورا کرے گی اس مقصد کے پیش نظر لائبریری میں جو کتب رکھی جائیں گی وہ مذہبی علوم پر مشتمل ہوں گی، اسلامی کتب کی یہ لائبریری مختلف اسلامی موضوعات پر نادر اور قیمتی کتب مہیا کرنے والی اپنی نوعیت کی پہلی لائبریری ہوگی۔ لائبریری علما اور محکمۂ اوقاف کے ملازمین علما کو تحقیق کے کام میں پوری سہولتیں فراہم کرے گی۔

اصلی علوم اسلامی کے متعلق سیمیناروں کے لئے اجتماع گاہ کا کام دے گی اور اسلامی نشر و اشاعت کی اساس مہیا کرنے کے سلسلہ اسلامی کتب دفتر کی تاریخ کی اشاعت میں سہولتیں مہیا کرے گی۔ مریں اثنا ڈپٹی اسپیکر اوقاف نے ایسے پبلشروں، کتب فروشوں، لائبریریوں، اداروں، محکموں ا

دیگر اشخاص سے جن کے پاس مذہبی تعلیم سے متعلق نادر اور اہم کتب کے مسودات ہیں درخواست کی ہے کہ وہ یہ کتب اور مسودات اس لائبریری کو بطور عطیہ دے دیں
عطیات معہ اپنے مسودے ڈپٹی سکریٹری (اوقاف) کو ان کے نام بہ عنایت کئے جائیں۔ اس صورت میں جب کہ کوئی عطیہ مشروط ہو تو ڈپٹی سکریٹری (اوقاف) حکومت
مغربی پاکستان لاہور کے نام مراسلہ لکھ کر شرائط پہلے سے طے ہونا چاہئیں۔

بزم وحشت کا قیام

۱۷ اکتوبر ۶۲ء کو حکیم اکرام حسین سیکریٹری کے دولت کدہ "رشائے صحت" (حیدرآباد) میں شعرا و ادبا کا ایک اجتماع ہوا۔ صدارت خورشید علی
تقوی نے پوری کی۔ مغربی و مشرقی پاکستان کی تہذیب، ثقافت و ادب کو قریب تر لانے، عوام میں باہمی اتحاد و ذہنی یکجہتی پیدا کرنے اور افہام و تفہیم
کی راہ استوار کرنے کی غرض سے بنگال کے مشہور و معروف شاعر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی کی یاد میں "بزم وحشت" کی بنیاد ڈالی گئی۔ کارروائی کا آغاز
تلاوت قرآن سے ہوا۔ حسب ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔
صدر۔ ڈاکٹر غلام مصطفے خاں صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، نائب صدر۔ صادق دہلوی۔ جنرل سیکریٹری وفا راشدی، جائنٹ سیکریٹری
رونق جودھپوری۔ اراکین مجلس عاملہ:- (۱) ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل (۲) حکیم سید اکرام حسین (۳) حکیم عزیز الرحمن مرزا (۴) کامل صدیقی بریلوی (۵) شرف اللہ
گیا۔ اس کے بعد وفا راشدی نے اپنی مختصر و جامع تقریر میں علامہ وحشت کی زندگی اور فن پر روشنی ڈالی۔

پنجابی شعراء کے کلام کا انگریزی ترجمہ

ایک ممتاز پنجابی ادیب، شاعر اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر [illegible] لیفٹیننٹ الو ایڈورڈ کیپٹ گوجرانوالہ نے پنجاب کے تین صوفی شعرا بلھے شاہ، شا
اور سلطان باہو کے کلام کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے
یہ تینوں شعرا سولہویں سے اٹھارویں صدی تک کے درمیانی عرصے میں گزرے ہیں
گلڈ کے پنجابی گروپ کے سیکریٹری نے پنجابی ادبی اکاڈمی کے صدر ڈاکٹر محمد باقر کو ایک خط لکھا ہے جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ وہ ان تراجم سے فا
اٹھائیں اور ان کی اشاعت کا اہتمام کریں۔
یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حال ہی میں اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے نے پنجابی ادبی اکاڈمی سے رابطہ پیدا کر کے کلیات بلھے شاہ کے انگر
دیگر زبانوں میں تراجم کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

مجلس یادگار قابل کی تشکیل

حیدرآباد، یہاں کے ادب نواز اور علم دوست حضرات کے ایک نمائندہ اجتماع میں مجلس یادگار قابل کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس کے کنوینر طالب
جوہری منتخب کئے گئے
مجلس کے پروگرام میں حضرت قابل اجمیری مرحوم کے مجموعہ کلام "دیدۂ بیدار" کی اشاعت اور ۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء کو کل پاکستان مشاعرہ
انعقاد سر فہرست ہے۔

عبدالعزیز خالد کی تصانیف

سرود رفتہ

یونان کی ریحان نفس و لالہ رخ و سنبل مو شاعرہ سیفو کے مسحور کن اور سحر کرنے والے نغمات اردو نظم میں۔

قیمت چار روپے

گل نغمہ

بنگلہ زبان کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب کا منظوم ترجمہ

قیمت چار روپے

سلومی

دوسرا ایڈیشن۔ منظر ثانی کے بعد مع اضافہ ترنم۔

(زیر طبع)

ورق ناخواندہ

ترتیلی تمثیلیں (زیر طبع)

دکان شیشہ گر

منظوم ڈرامے

قیمت ۳ روپے

زنجیر رم آہو

منظومات اور غزلیات مجموعہ

قیمت ۲ روپے

غزل الغزلات

عہدنامہ عتیق کا نغمۂ سلیمان اردو شعر میں مع تفسیر و حواشی۔

قیمت ایک روپیہ

برگ خزاں

منظوم ڈرامے۔

قیمت ۴ روپے

KARACHI
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

ایک روپیہ
ONE
RUPEE

ہم قلم

جعفر طاہر

ادارہ مصنفین پاکستان

ہم قلم

جلد ۳ نمبر ۴

دسمبر ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خصوصی نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حبِ وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصوّرات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دُنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۲۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

(ادارۂ مصنفین پاکستان نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔ طابع، ناشر، مدیر جمیل الدین عالی)

فہرست

هنری ملر

خط بجائے اداریہ

پیارے عالی

اس بار نیویارک میں تم مجھ سے اور میں تم سے بچ کر نکل گئے مجھے تمہارا خط بالکل چلتے وقت ملا اور میرا رکنا محال تھا یعنی یہ کہ میں رکوں نہیں جواب دوں اور تم ہارورڈ سے آؤ۔ یہ تم ہارورڈ میں کیا کر رہے تھے وہاں تو سائنس اور سیاست کا کام ہوتا ہے۔

ہاں تم اب مانتے یا نہیں مانے کہ پچھلے سال میں نے تم سے کہیں پیمبرانہ باتیں کی تھیں پچھلے سال تم کہاں ملے تھے فرینکفرٹ یا پیرس یا لوزان بہرحال مجھے یاد ہے کہ میں نے تم سے کیا کیا باتیں کی تھیں مجھے اس لئے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں سبھی سے یہی باتیں کی تھیں ان مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تمہاری جوانی کے جوش نے میرے بڑھاپے کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی اور تم نے کہا تھا کچھ ایسا یعنی اس سے ملتا جلتا کہ بڈھے تم ادب سیاست پر کیوں اترآئے ہو۔ میں اسوقت تمہاری ذہانت اور شعلوں کی طرح لپکتی ہوئی زبان کے پھیر میں آگیا تھا اصل میں میں تمہیں ایک ایشیائی مدبر کچھ رہا تھا۔ شاید تم ہو بھی گو تم غریب آدمی لگتے تھے اور میں نے سنا ہے کہ ایشیائی مدبرین کافی پیسے والے ہوتے ہیں۔

مگر میرا بڑھاپا سچ تھا اور تمہاری جوانی غلط۔ تم نے دیکھا کہ لوگ ایک سال کے اندر اندر کھل کر آمادہ پیکار ہو گئے۔ میرا امریکہ کیوبا کے معاملے میں خم ٹھونک کر روس کے سامنے آگیا اور ایٹم بموں کے لادنے والے جہازوں کے انجن دھوئیں اگلنے لگے اور چین ہندوستان کے تاج میں سے ایک ایک کر کے موتی توڑنے لگا۔ لیکن آثار ایسے ہیں کہ تم پاکستانی بھی جھگڑے پہ آمادہ ہو گئے مجھے معلوم نہیں کہ کشمیر کا جھگڑا واقعی ہے کیا میں مشرق کی سیاست بہت کم جانتا ہوں ——— مجھے یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ برخوردار اس زمانے میں ادب و دب سب بکواس ہو کر رہ گیا ہے دنیا کا سب سے اہم مسئلہ (ہمیشہ کی طرح) ادب یا مصوری میں (جو میں دھڑلے سے کرتا ہوں) خیالات کے بہاؤ لفظوں کے دروبست اور رنگوں اور خاکوں کے تناسب کا نہیں بلکہ بچوں کے دودھ کا ہے اور تپتی ہوئی دوپہروں اور جمتی ہوئی راتوں میں دھوپ اور سردی سے بچاؤ کے لئے چھوٹے چھوٹے آرام دہ مکانوں کا ہے اور یہ بھی ہے کہ لوگ زندہ رہیں اور ان پر بم نہ پڑیں اور صحت مند رہیں یعنی خالی آرٹ کا تنکا نہ ہو اور ان کے لئے موت آسان اور قابل قبول ہو ایکدم ہزاروں لاکھوں آدمی بم کے خوف سے ہر وقت نیم مردہ نیم زندہ کی حالت میں نہ رہیں اور میں نے کہا تھا کہ بعض غلط طاقتیں ابھی بھی ہوتی ہیں۔ آخری سچائی کی قوتیں عمل پذیر ہونے سے نہیں روک سکتیں اور تم کہتے تھے کہ غلط باتوں کا دور کتنا ہی طویل اور موثر کیوں نہ ہو ایک آخری سچائی ہوتی ہے جس کی فتح لازمی طور پر ہوتی ہے تم مشرق کے لوگ اس قسم کے پیارے نرم و نازک فلسفوں کے بادشاہ ہوتے ہو (یہی بات تو مجھے تم لوگوں میں اچھی لگتی ہے) اور چونکہ تم لوگ آزاد لوگ ہو اور ابھی تمہارے پاس لوہے کی ملیں نہیں ہیں اور تم ہتھیار اور ہوائی جہاز نہیں بناتے اس لئے اس قسم کے فلسفوں کی اماں لیتے رہتے ہو۔ ہم بھی ایسے ہی فلسفوں کے سائے میں

رہا ہوں۔ مگر یہ سب شاید بیکار باتیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں کچھ مفادات نے ایسا جال بچھا رکھا ہے کہ سب اس میں پھنستے چلے گئے ہیں اب مجھ سے ایسا تجربہ نہ کراؤ۔ اتنی دیر میں تو میں بیس خطوں کے جواب دے لیتا جس میں دو خطوط ان ناشروں کے بھی ہیں جن سے مجھے کچھ ہزار ڈالر وصول ہونے والے ہیں۔ دیکھا تم نے میں بھی ڈالر جال میں پھنسا ہوا ہوں۔

ہاں کبھی میں پاکستان آنا چاہتا ہوں مگر میں ہندوستان بھی جانا چاہتا ہوں مجھے تمہاری مسجدوں میں اذانیں سننے کا شوق یقیناً ہے میں نے سپین میں مشرقی اسلامیت کا کچھ نقشہ محسوس کیا ہے مگر میں ہندوستان کے مندروں میں موٹی موٹی سونے کی گھنٹیاں بھی دیکھوں گا اور ان کی آواز سنوں گا۔ سنا ہے تمہارے پہاڑ ہندوستانی پہاڑوں سے زیادہ آسان اور خوبصورت ہیں وہاں تو آج کل پہاڑوں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ پھر وہ بہت ہی اونچے بھی ہیں مجھے معقول اور درمیانے سائز کے پہاڑ پسند ہیں جن میں دوستانہ فضا چھائی ہوئی ہو اور جھیلیں بھی تو ساتھ ہی ہوتی ہیں میں ایک جھیل کے کنارے ایک بنگلہ بنانا یا کرائے پر لینا چاہوں گا یا تمہارا گلڈ مجھے مفت دلوادے دیکھو ایک امریکی بھی دور مانگ رہا ہے خیر میں ایسا امریکی بھی کہاں رہ گیا ہوں میرا امریکہ تو کبھی کا بڑی بڑی مشینوں اور اونچی اونچی عمارتوں کی نذر ہو گیا۔ اب تو وہاں تم جیسے لوگوں کو مزا آتا ہوگا جن کے گندمی رنگ اور طرار باتوں پر خوشحال امریکی بیوائیں جان دیتی ہیں۔ ہاں میں مشرقی عورتوں سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں تمہارے ہاں پردہ بھی تو ہے بس تو میں پردے دار خواتین سے پوچھوں گا بہت سے سوالات ہیں میرے ذہن میں۔ ہاں مجھ سے کتاب لکھنے کی توقع نہ کرنا میں کوئی سیاح ادیب نہیں ہوں جو مختلف ملکوں کے دورے کرتے پھرتے ہیں اور وہاں کی خوبیاں ٹورسٹوں اور سیاسی مبصروں کے لئے مضامین کی صورت میں شائع کرکے پیسے کماتے ہیں۔ پیسے میں نے بہت کما لئے اب تو مجھے کہیں آرام سے مر جانے کی خواہش ہے مگر میں کچھ مجلس آرائی کا بھی عادی ہوں سو تم سے گپ کرتے کرتے مر جاؤں گا۔ کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہوگا کہ ایک بڈھے باتونی بدمزاج انگریزی کے ادیب پر چند مہینے صرف کر دو۔ تم بھی تو کچھ کام کرتے ہوگے۔ کیا کرتے ہو تم۔ میرا خیال ہے تم ایک بہت مخلص آدمی ہو اور تم دور تک نہیں جاؤ گے بس اپنے خیال دل ہی دل میں لئے بیٹھے رہو گے یا زبان چلایا کرو گے بولتے تو خوب ہو تم مگر اسکا کیا فائدہ میں خود دانا دینے کا حامی نہیں مگر جو لکھ سکے وہ نہ لکھے تو خیال ہوتا ہے کہ برا ہوا حالانکہ کیا برا ہوا۔ برا اور اچھا کیا ہوتا ہے فرض کرو میں اتنی فضولیات نہ لکھتا تو کس شعبۂ عالم میں کیا کمی ہو جاتی؟ محسوس تک! کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی میں نے لکھا۔ ہاں اس وقت مجھے پیسوں کی ضرورت بہت تھی۔ پیرس بہت سستا ہی مگر پیٹ وہاں بھی بھرنا پڑتا ہے اس شہر کی شرابی ہوائیں بس ہوائیں ہی ہیں یہ بھی تو نہیں کہ آدمی سین کے کنارے آدھ گھنٹے ہوا سونگھ لے تو اسے ایک سینڈوچ کی ضرورت نہ رہے۔ اب بتاؤ ادب بڑا کہ سینڈوچ؟ ———

ابھی مجھے جواب مت دینا میں جاڑوں سے گھبرا کر کہیں گرم جگہوں کی طرف نکل جاؤں گا۔ کیا پتہ ایک دن تمہیں تار ملے کہ میں کراچی پہنچ رہا ہوں۔ ہاں جی بہت چاہے تو لکھ دینا خط مجھے کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لے گا۔ اب کے پکچر کارڈ ضرور بھیجنا اور کبھی تمہیں خوش کرنے کو لکھ دوں کہ اپنی ایک تصویر بھی بھیج دو میں نے پتہ نہیں کہاں تمہارا ذکر کیا تھا تو لوگوں نے جن میں میری بیوی بچے بھی شامل ہیں ایک عرب ایشیائی کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی شاید اگلے موقع پر تمہاری یاد آئے تو میں وہ تصویر ان لوگوں کو دکھاؤں گا شاید تم اس امر سے خوش ہو کہ تمہاری وجہ سے تمہارے وطن کی ایک اچھی سی تصویر میرے ذہن کے کسی گوشے میں قائم ہو گئی ہے اور میں زیادہ پاکستانیوں سے ملنے کا خواہش مند رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دوسرے کئی ہم وطن تم سے بھی بہتر مفکر اور ہم جلیس ثابت ہوں گے۔

تمہارا
ہنری ملر

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اُردو اسٹیج کے مزاحیہ اداکار

اُردو تھیٹر کی ابتدا ہی مغربی اصولوں پر ہوئی تھی اس لئے یورپ کی تمدنی تحریکیں انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی رگ۔ و پے میں سرائت کرگئیں۔

عہد پرتگیز میں اردو یا ہندستانی میں جو ڈرامے ہوتے وہ سو فیصدی مذہبی جذبات سے مملو اور حضرت عیسیٰ یا کسی سینٹ کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں جب اردو یا ہندستانی اسٹیج نے دوبارہ جنم لیا تو مہابھارت اور رامائن کے قصے اسی اسٹیج پر دہرائے جانے لگے۔ چونکہ مذہبی ناٹکوں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ اداکاری کسی طرح میل نہیں کھاتی اس لئے یقین نہیں آتا کہ اُردو کے مزاحیہ ڈرامے ہندستانی یا ہندستانی زبان میں دکھلائے گئے ہوں۔

اُردو اسٹیج کی تاریخ میں پہلی مرتبہ "شریمنت جی" کا مزاحیہ ڈرامہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء (مطابق ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۰ھ) کو بمبئے تھیٹر پلے ہاؤس۔ بمبئی میں دکھلایا گیا۔ یہ ڈرامہ "راجہ گوپی چند اور جلندھر" پیش کرنے کے بعد دکھلایا گیا تھا۔ بعدہٗ ۶ مئی ۱۸۵۴ء (مطابق ۸ شعبان ۱۲۷۰ھ) کو "تیکھے خاں شمشیر بہادر" اسٹیج کیا گیا۔ یہ مزاحیہ ڈرامہ "شیوکس کی پیدائش" کے بعد دکھلایا گیا تھا۔ ان ڈراموں کے بعد پارسی ڈرامیٹک کورنے "حاجی میاں اور ان کے ملازمین فضل اور تیکھے خان" ۲۰ مئی کو دکھلایا۔ پھر ۳ جون کو دو مزاحیہ ڈرامے "حاجی میاں" اور "کلال خانہ" اسٹیج کئے جو پسند عام و خاص ہوئے۔ ۱۶ ستمبر کو "پٹھان صغر بیا اور گالو" اور بعدہٗ "الہ دین اور بانو زلیخا" دکھلائے گئے۔

چونکہ یہ ڈرامے عوام کی پسندیدہ زبان ہندستانی میں دکھلائے جاتے تھے اس لئے گورنر بمبئی یہ اجلاس کونسل۔ اراکین دولت اور عہدہ داران سرکاری اور عمائدین شہر انھیں دیکھنے کے لئے آتے اور خوشنودی مزاج کا سرٹیفکٹ عطا فرماتے تھے۔ اردو کے ابتدائی مزاحیہ ڈرامے عموماً پارسیوں نے لکھے ہیں جن کی مادری زبان اگرچہ اُردو نہ تھی۔ لیکن وہ کاروباری اردو سے بخوبی واقف ہوتے تھے اور حسب ضرورت منشیوں سے اصلاح بھی لیتے تھے۔

۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۸ء تک "بمبئے تھیٹر" بند رہا۔ ۱۸۵۸ء میں جب حکومت کو "غدر" یا "جنگ آزادی" کی تہلکہ خیزیوں سے فرصت ملی اور کچھ اطمینان نصیب ہوا تو اُردو اسٹیج پر گہما گہمی شروع ہوگئی۔ "بوڑھے خوشحال جی کی دعوت" نامی مزاحیہ ڈرامہ اسٹیج ہوا جو اصل ڈرامہ سے زیادہ پسند کیا گیا۔

اس وقت کی پارسی کمپنیاں کسی خاص تنقیدی اور اصلاحی مقاصد کے تحت مزاحیہ ڈرامے دکھلاتی تھیں۔ اس زمانے میں جن مزاحیہ ڈراموں نے خاص شہرت پائی ان میں دھنجی غرق۔ تری رام۔ سکارام۔ گیلی راتری۔ بھاٹیا کی نقل۔ کپور چند ناتا چند۔ گھانی گراکیہ۔ پینسٹھ ۶۵ سالہ دولہا اور تیرہ سالہ دلہن، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دھنجی غرق میں ایک بے ایمان پارسی کو پیش کیا گیا تھا جو قیمتی کھڑیوں کے عمدہ

پرزے نکال کر خراب پرزے لگا دیا کرتا تھا۔ چونکہ شہر میں ایک ہی گھڑی ساز تھا اس لئے سب لوگ اسی سے اپنی گھڑیاں درست کراتے تھے۔ یعنی شرفاء کے لئے ایک وبال جان بن گیا تھا۔ ہر شخص اس کی اس حرکت سے نالاں تھا۔ چنانچہ جب اسٹیج پر دھنجی کا مذاق اُڑا گیا تو واقعی اس کا بیڑہ غرق ہو گیا اور اس کو اپنی دوکان بند کر دینی پڑی۔ اسی طرح جب مسماۃ تری رام کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا تو اس نے بھی اپنے افعال سے توبہ کر لی۔ تری رام ایک فیشن ایبل طوائف تھی اور روزانہ شام کو قیمتی کپڑے پہن کر تفریح کے لئے جاتی۔ مالدار نوجوانوں کو پھانس کر اپنے گھر لاتی۔ اُن کو شراب پلا کر مدہوش کرتی اور اس عالم بیہوشی میں ان کی جیبوں کا صفایا کر کے ان کو کسی سنسان جگہ میں پھکوا دیتی تھی۔ جب اسٹیج پر اس کا کیری کیچر پیش ہوا تو اس نے بھی اپنا پیشہ ترک کر دیا۔

جس شخص کا مذاق اسٹیج پر اڑایا جاتا وہ کمپنی کے مالکوں اور اداکاروں کو بڑی بڑی رقمیں بطور رشوت پیش کرتا لیکن مالک اور ایکٹر فرض کو رشوت پر ترجیح دیتے۔ نسروان جی دوراب جی آرختیار ایسے ہی لوگوں کا مذاق اُڑاتا جو ملکی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کے مزاحیہ ڈراموں میں "سکارام" نے خاصی شہرت پائی۔ اس ڈرامہ میں جی بھر کر سکارام کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ سکارام اُن لوگوں میں سے تھا جو گھر میں انڈے، مچھلی اور گوشت اڑاتے لیکن باہر گوشت خوروں پر آوازے کستے تھے۔ اسی طرح "باجی راؤ" نامی ڈرامہ بھی کافی مقبول ہوا۔ باجی راؤ بظاہر نیک اور پارسا انسان تھا لیکن پیشہ ور عورتوں اور بیسواؤں کا روپیہ ہضم کر جانے میں اپنا آپ نظیر تھا۔ وہ کسی ظالم ساہوکار سے کم نہ تھا۔ "گیلی رانڑی" کا ڈرامہ بھی عوام میں کافی مقبول ہوا۔ گیلی کھلے بندوں سیٹھوں اور ساہوکاروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتی اور سرِ بازار ان کو رسوا کرتی تھی لیکن اس کی جوانی اس کے آڑے آتی اور لوگ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتے تھے۔

نسروان جی آرختیار کے بعد مارکو زیر یا دوسرا شخص تھا جو مزاحیہ ڈراموں میں الفریڈ، وکٹوریہ اور زوراسٹرین کا مدِ مقابل تھا۔ اس کا ڈرامہ "بھاٹیا" سب پر سبقت لے گیا۔ یہ بھی ایک بھاٹیا سیٹھ کی غیر اخلاقی اور غیر قانونی زندگی کا آئینہ دار تھا۔ بھاٹیا سیٹھ یہ ڈرامہ دیکھ کر اسقدر چراغ پا ہوا کہ مارکو زیر یا کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی اور دوسرے ذرائع بھی استعمال کئے لیکن مارکو اس سے بددل نہ ہوا اور مقدمہ ختم ہوتے ہی اس نے "کپور چند ماتا چند" کا خاکہ اس شان سے پیش کیا کہ بمبئی میں آگ لگ گئی۔ کپور چند نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ وہ خاموش رہے۔

لیکن "گھائی گراکیس" سب پر سبقت لے گیا۔ اس میں نسروان جی کوہیار، دادا بھائی بھمن جی واڑیا اور منچر جی چانگوش جیسے مشہور اداکاروں نے کام کیا۔ یہ ڈرامہ زوراسٹرین منڈلی نے پیش کیا تھا اور اس میں دو صاحب ثروت اور تعلیم یافتہ پارسی خاندانوں کی شکر رنجی دکھلائی گئی تھی کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے باوجود لوگ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر موت اور زندگی کی لڑائی لڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ زوراسٹرین کا ایک اور مزاحیہ ڈرامہ "پینسٹھ[۶۵] سالہ دولہا اور تیرہ سالہ دولہن" بھی کافی کامیاب رہا۔ یہ مزاحیہ ڈرامہ جمشید جی... مہراب جی دانڑیا نے لکھا تھا اور اس میں "اسلا" کا پارٹ وہ خود کرتا تھا۔

۱۸۵۵ء کے بعد مزاحیہ ڈراموں کا سلسلہ "بوڑھے خوشحال جی کی دعوت" سے شروع ہوتا ہے جو "فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ" کے ساتھ دکھلایا گیا تھا۔ بمبئی والینیٹر کور کا تماشا "بھگلا حجام" بھی کافی مقبول ہوا۔ دیگر مشہور ڈراموں میں (۱) گھڑی کی گھڑیاں عرف بنائے ستمگر (۲) نورالدین اور حسن افروز (۳) چمبیلی گلاب اور (۴) میاں پسوا اور بیوی کھٹمل نے کافی شہرت پائی۔

ظریف کے "گلزارِ عصمت" کے بعد "گرو جی" کا مزاحیہ ڈرامہ دکھلایا گیا۔ اس ڈرامہ کا اصل نظم میں تھا اور مزاحیہ حصہ نثر میں۔ حافظ محمد عبداللہ نے جو ڈرامے لکھے ان میں (۱) اندھیر نگری (۲) پولس ناصح (۳) چمبیلی گلاب (۴) چنیاں منیاں

(۵) فریب محل (۶) قیصر و جعفر (۷) علاء الدین وحسن وافروز کافی مشہور ہوئے۔

۱۸۸۵ء تک مزاحیہ ڈرامے اصل ڈرامے کے بعد دکھلائے جاتے تھے، بعدہٗ اصل ڈرامے کے درمیان دکھلائے جانے لگے۔ آرام افسون - بزرگ - بیکس - جوہر - حباب - رونق - ظریف - عبداللہ - نظر وغیرہ سنجیدہ ڈراموں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ڈرامے بھی لکھے تھے، جن کی ایک مستقل حیثیت ہوتی تھی۔

ابتدائی دور کے مزاحیہ ڈراموں میں کن کن لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔ ممکن ہے کہ پرائیوٹ کتبخانوں سے اس کا پتہ چل سکے۔ یہاں اُن مشہور مزاحیہ اداکاروں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے زمانہ میں کافی شہرت پائی۔

سہراب جی اوگرا —— اس کا شمار اردو کے اول دو تین مزاحیہ اداکاروں میں ہوتا ہے۔ وہ پہلے اوریجنل وکٹوریہ میں ملازم تھا۔ تین سال بعد کلکتہ چلا گیا اور جمشید جی میڈن کی الفنسٹن تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہوگیا۔ وہاں چند سال گذارنے کے بعد وہ الفریڈ اور پھر نیو الفریڈ میں کام کرنے لگا۔ اس نے بقیہ عمر نیو الفریڈ میں گذار دی۔ مصنفین میں اس کو مراد علی بہت پسند تھا۔ اس نے مراد سے "تاثیر خواب" لکھوا کر اس میں کام کیا اور اسے ڈائرکٹ بھی کیا۔ اس نے نیو الفریڈ میں علاء الدین - علی بابا - فسانہ عجائب ڈائرکٹ کئے اور ان میں کام بھی کیا۔

خورشید جی مہروان جی بالی والا —— وہ مزاحیہ اداکاری میں اپنی آپ نظیر تھا اور "کنگ آف کمیڈینز" کہلاتا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں وکٹوریہ منڈلی اپنے شباب پر تھی تو وہ اس کے خاص اداکاروں میں شمار ہوتا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں جب کمپنی دہلی گئی تو وہ بھی اس کے ہمراہ گیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ خود اپنی کمپنی لے کر لندن گیا اور وہاں اس نے لندن کے اسٹیج پر اپنی مزاحیہ اداکاری کے جوہر دکھلائے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

نسروان جی نوروز جی پارکھ —— ۱۸۶۷ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے "سلیمانی شمشیر" ۱۸۶۷ء میں "نرزدشتس نورانی" میں کام کیا۔ نرودشن نورانی میں اس کا کام پسند خاطر ہوا۔ اسی سال اس نے "فلک سور سلیم" اور "پاکدامن گلنار" میں بھی کام کیا۔ نسروان جی کا خیال تھا کہ وہ اس پیشہ سے کافی دولت کما سکے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ دو بارہ سال میں اسقدر بھی جمع نہ کر سکا کہ شادی کر سکے، جب کنور جی ناظر کو اس کا علم ہوا تو اس نے اسے ایک بنفٹ نائٹ دی جس سے اس کی شادی ہو گئی۔

پالن جی پائیدھونی والا —— وہ ایک پستہ قد ایکٹر تھا اور عوام میں "پالی" کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کاؤس جی کھٹاؤ کی الفریڈ میں اہم مزاحیہ رول ادا کرتا تھا۔

دوراب جی رستم جی دہابیر —— وہ ایک غیر معمولی شخصیت کا انسان تھا۔ مصنف ہونے کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا اداکار بھی تھا اور ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ اس نے وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مقابلہ میں شاہ عالم ناٹک منڈلی قائم کی تھی اور "جان عالم اور انجمن آرا" دکھلانے کے بعد افلاطون جن - گل لالہ پری اور پاکدامن شیریں دکھلائے تھے اور اُن میں مزاحیہ پارٹ بھی کئے تھے۔

دیگر مزاحیہ اداکاروں میں کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ - جہانگیر جی پسنن جی کھمباتہ - ہیر جی بھائی کھمباتہ - پستن جی رستم جی لالی - جمشید جی فرام جی میڈن - مانک جی ماسٹر - نوروز جی نسروان جی مجگاؤں والا وغیرہ نے کافی شہرت پائی۔

اردو اسٹیج چونکہ ایک آل انڈیا اسٹیج تھا۔ اس لئے شمالی ہندستان سے جنوبی ہندستان تک اور مشرق سے مغرب تک

ہا سکے رواں دواں تھا ۔ سیکڑوں مزاحیہ اداکار اس اسٹیج پر آئے اور اپنے اپنے پارٹ ادا کرکے اس جہانِ فانی سے رخصت
ہ ۔ فی زمانہ ماسٹر اشرف اور ماسٹر مصطفٰے بہترین مزاحیہ اداکاروں میں شمار ہوتے اور اپنے فن میں خاص شہرت کے مالک سمجھے
ہیں ۔ ماسٹر مول چند جس کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے اپنے وقت کا ایک بے مثال اداکار تھا ۔ اس کی اور ماسٹر مصطفٰے کی جوڑی
. تماش بین صرف ان کے نام پر آتے اور ان کی اداکاری سے بیحد محظوظ ہوتے تھے ۔ جب تک ماسٹر مول چند زندہ رہا ہند کی پارسی اور
ی کمپنیاں چلتی رہیں ۔ اس کے انتقال پر ماسٹر مصطفٰے نے بھی گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اب وہ ایک بزرگ اداکار کی حیثیت سے
وں کو مشورہ دیتے اور کبھی کبھی ریہرسلوں میں شرکت کرتے ہیں ۔ اگرچہ آج مزاحیہ اداکاروں کا بازار سرد ہے لیکن وہ اب
قومی تعمیر میں حصہ لے کر ملکی تمدن میں اضافہ اور (CULTURAL INTEGRATION) کے سلسلہ
اپنا فرض انجام دے رہے ہیں ۔

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک نئی جہت

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ بلراج کومل کی نظموں کا پہلا مجموعہ — "میری نظمیں" شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں بلراج کومل کی ۱۹۵۴ء
کی نظمیں شامل تھیں۔ اب اس نوجوان شاعر نے ایک نیا مجموعہ ترتیب دیا ہے جو عنقریب "رشتۂ دل" کے نام سے منظرِ عام پر آ جائے گا۔ اس مجموعے
میں وہ تمام نظمیں شامل ہوں گی جو بلراج کومل نے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیانی عرصے میں لکھی ہیں۔ اگر میں ان دونوں مجموعوں کے درمیان جلد
کی دیوار کو حدِ فاصل قرار دے کر یہ کہوں (جیسا کہ عام دستور ہے) کہ "میری نظمیں" سے "رشتۂ دل" تک آتے آتے بلراج کومل نے فکر کی بہت
منزلوں کو طے کر لیا ہے تو یہ ایک بالکل رسمی سی بات ہوگی اور شاعر کی روح تک رسائی حاصل کرنے میں قطعاً ممد ثابت نہ ہو سکے گی۔ فی الواقعہ بلراج
کومل کے پہلے اور دوسرے مجموعۂ نظم کے درمیان جلد کے علاوہ مجھے اور کوئی دیوار نظر نہیں آئی اور اس لئے میں شاعر کے کلام میں سوچ کی اُس
مشعل اور احساس کے اُس نورانی پیکر کو سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ جس کی روشنی ان دونوں مجموعوں کی قریب قریب ہر نظم سے پھوٹ
رہی ہے۔

بلراج کومل کی نظموں میں سوچ کی اس مشعل اور احساس کے اس نورانی پیکر کی نوعیت کیا ہے؟ واضح رہے کہ میں نے شاعر کی سوچ
ایک مشعل اور احساس کو نورانی پیکر سے تشبیہ محض اس لئے نہیں دی کہ مجھے یہ تشبیہ خوبصورت نظر آئی تھی بلکہ اس لئے کہ بلراج کومل کے احساس
سوچ کو سمجھنے کے لئے وقت کے اُس "ٹکڑے" کو گرفت میں لینا ضروری ہے، جسے عام طور سے "حال" کا لمحہ کہا گیا ہے۔ اور جو فی الواقعہ ایک
لمحۂ تاباں ہوتا ہے — ایک ایسا لمحۂ تاباں جو حقیقت کے تمام تر گوشوں کو بے نقاب اور اُجاگر کر دیتا ہے۔ وقت کے سیلِ رواں کو سمجھنے
لئے اہلِ نظر نے اسے تین واضح ادوار میں تقسیم کیا ہے — ماضی، حال اور مستقبل! فی الاصل وقت تقسیم اور تفریق سے ماورا ہے لیکن اسے
گرفت میں لینے کے لئے تحلیل اور تجزیئے کا وہ طریق ضروری ہے جو اسے ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ ان ادوار میں سے ماضی یا مکان محض بیتے ہوئے
وقت کی ایک صورت ہے۔ یہ وقت کا نقشِ پا ہے۔ دوسری طرف مستقبل جسے ہم اپنے خوابوں، آرزوؤں اور ارمانوں سے ہر دم سینچتے ہیں محض ایک فرضی
میدان ہے جس میں وقت ایک صبا رفتار گھوڑے کی طرح مصروفِ تگ و تاز رہتا ہے۔ حال وہ صبا رفتار گھوڑا ہے جو نہ صرف ہمہ وقت متحرک رہتا ہے
بلکہ ایک خاص سمت میں بڑھتا اور ایک نظر پلٹ کر دیکھنے کی کوشش تک نہیں کرتا۔ فی الواقعہ وقت کے تحرک اور تموّج کو صرف اس ایک نقطے پر دیکھا اور محسوس
کیا جا سکتا ہے جو "حال" کا لمحہ ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچیں کہ کائنات کی ازلی و ابدی تاریکی میں حال وہ ایک مشعل ہے جو آگے ہی آگے کو بڑھتی اور اپنے
دائرۂ نور کی مدد سے وجود یا مکان کو تخلیق کرتی ہے تو شاید یہ تشبیہ بات کی کچھ وضاحت کر سکے۔ مستقبل ہر لحظہ اس دائرۂ نور میں آ کر مکان کی صورت
اختیار کرتا اور دوسرے ہی لمحے ماضی میں ڈھل کر بے جان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا ممکن ہے کہ کائنات کی تخلیق کا عمل مسلسل اور جاری ہے اور وقت ہی
اس کائنات کا خالق ہے۔ نور وقت کی خصوصیت ہے۔ شاید اسی لئے خدا نے نور کو نہ صرف اپنی سب سے بڑی صفت قرار دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وقت کو
بُرا نہ کہو کیونکہ "میں خود وقت ہوں!"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ حال کے اس متحرک لمحے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کتنے لوگ ہیں جو وقت کا روپ دھارکے
ل کے اس لمحے کے ساتھ خود بھی متحرک رہتے ہیں؟ بہت کم! بات یہ ہے کہ ایک عام انسان یا تو اپنے ماضی میں رہتا ہے اور یا مستقبل میں! اور اس کی وجہ محض یہ ہے
وہ حال کی چندھیا دینے والی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا اور ماضی یا مستقبل کی نیم تاریک فضا میں خود کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض لوگ محض ماضی
ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں اگر ہم فائزہ FOSSIL کا نام دیں تو بہتر ہے۔ اسی طرح بعض لوگ محض مستقبل سے وابستہ رہتے ہیں۔ ان کی حالت بھی فائزہ سے کچھ
تلف نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں فائزہ کا روپ دھار کر یہ لوگ انجماد اور ٹھہراؤ کی تصویر بن جاتے اور وقت کے سیلِ رواں کے ساتھ بہتے چلے جانے سے
کار کر دیتے ہیں۔ شاعری میں بالخصوص یہ بات عام ہے اور اکثر شعرا ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد محض ماضی یا محض مستقبل کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور
ن تحرک اور تموج سے ناآشنا ہو کر گویا "رُک" جاتے ہیں۔ بلراج کومل کو اگرچہ ابھی بہت کچھ تخلیق کرنا ہے اور اس لئے وثوق کے ساتھ ابھی سے یہ کہنا بہت
شکل ہے کہ عمر کے ایک خاص دور میں داخل ہونے کے بعد ان کے ردعمل کی نوعیت کیا ہوگی تاہم جو کچھ انہوں نے اب تک تخلیق کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ
بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بلراج کومل کے ہاں "حال" کا لمحہ اپنی پوری شدت اور توانائی کے ساتھ ابھرا ہے اور انہوں نے حال کے اس نقطے پر
کھڑے ہو کر چاروں طرف ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ یہ نہیں کہ بلراج کومل حال کے اس نقطے پر منجمد ہو کر کھڑے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ "بابر بہ عیش کوش" کے نظریے
کے علم بردار بن کر رہ جاتے اور ان کے ہاں ارضی کیفیات اور جسمانی قرب کا احساس "سورج" کی قندیل" کو گل کر دیتا۔ بلراج کومل کی انفرادیت اس بات
میں ہے کہ "حال" کے اس لمحے میں رہ کر بھی وہ وقت کے سیلِ رواں سے ہم آہنگ اور اسی لئے متحرک اور زندہ ہیں۔ وہ ایک تختے کی طرح وقت کی اس موج
کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں بلکہ ایک زندہ انسان کی طرح اس تختے کے ساتھ بندھے ہوئے آگے کو بڑھ رہے ہیں اور اپنی اس حالت کا انہیں پورا پورا احساس بھی
ہے۔ مثلاً ان کی نظم "عالم کل" کا یہ ٹکڑا دیکھئے:

آسماں صدیوں پرانی رہگذر
میں مگر اس رہگذر کے موڑ پر
سنگِ خارا کی طرح
وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہوں
دیکھتی آنکھوں سے ہر شے دیکھتا ہوں روز و شب
مضطرب ہوں جانے والوں کے لئے
منتظر ہوں آنے والوں کے لئے

بلراج کومل کے زاویۂ نگاہ اور شعری مزاج کو سمجھنے کے لئے "عالم کل" کا یہ ٹکڑا ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ٹکڑے کے مطالعہ سے صاف
محسوس ہوتا ہے کہ شاعر وقت کے اس اہم موڑ پر کھڑا ہے، جہاں وہ جانے والوں سے بھی احساسی طور پر ہم آہنگ ہے اور آنے والوں سے بھی۔ پھر اس مقام
پر وہ محض ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح ساکن اور جامد نہیں بلکہ اسے دیکھنے کی شکتی بھی حاصل ہے اور اس کی نظریں وقت کے دونوں ادوار ــــ ماضی او
مستقبل کا احاطہ کر رہی ہیں۔ وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہونے کا احساس ایک روحانی تجربے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ جہاں "لامحدود"
سے ہم آہنگ ہونے کا منفی طریق یہ ہے کہ اپنی ذات کو اس لامحدود میں ضم کر دیا جائے وہاں مثبت طریق یہ ہے کہ خود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ ذات
اور کائنات میں کوئی خلیج باقی نہ رہ جائے۔ بلراج کومل کی اس نظم میں موخرالذکر طریق نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا بلراج کومل نے "حال" کے اس لمحے پر اس میں اسیر ہو کر وقت کے ادوار پر ایک نظر ڈالی ہے تاہم وقت کی معانی اور اس کا ...
کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کے بہتے چلے جانے کا احساس ان کے ہاں ہر وقت تازہ اور استوار رہتا ہے۔ مثلاً ان کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے دیکھئے:

میں آوارہ صدیوں سے
میری راہ میں یادوں کی سرمست ہوا
صبحوں کے پیڑوں پہ بکھری ہریالی
شاموں کے چشموں کے کنارے راتوں کے نورس غنچے
نیم ہنسی کے گھونگھٹ میں چہروں کی دلہن کے غمزے
نیند کی ٹھنڈی گھاس پہ خوابوں کی شبنم
میرے جام شکستہ میں
قطرہ قطرہ گرتی ہوئی لمحات کی مے
اپنی رَو میں بہتا ہوں
میں منزل سے غافل اپنی راہ پہ چلتا رہتا ہوں

——— "گلستان"

میں وقت کے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا
سرِشام آنکلتا ہوں
ریگِ ساحل پر سینکڑوں سیپیاں ہیں، گھونگھے ہیں
ان کو چنتا ہوں
دامنِ زیست بھر رہا ہوں

——— "سمندر"

حیات اپنی منزل پہ گو آج بھی گام زن ہے
میں خاموش
تنہا کھڑا سوچتا ہوں
کوئی دور سے آکے مجھ کو پکارے!

——— "میں شاعر، میں فنکار"

جنوں کی رُت میں
ملا ہوں میں شہرِ نو میں اس سے
حریفِ سُود و زیاں وہی ہے
حکایتِ خونچکاں وہی ہے
برہنہ پا تھا برہنہ پا ہے
برہنہ سر تھا، برہنہ سر ہے
وہی سنگ وہ، وہی سفر ہے

——— "ہیرو"

بلراج کومل کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے جو میں نے بغیر کسی کاوش کے چن لئے ہیں نہ صرف اس مسلسل سفر کی نشاندہی کرتے ہیں جو دراصل وقت کی ایک صفت ہے بلکہ اس بات کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ ان نظموں کا شاعر وقت کے چار حصوں (یعنی ماضی یا مستقبل) میں مقید نہیں بلکہ وقت کی یلغار میں پیش پیش ہے۔ لیکن چونکہ وقت کے اس نقطے پر بہت کم لوگ بیداری کی حالت میں موجود ہوتے ہیں اس لئے بلراج کومل کے ہاں ایک شدید تنہائی کا احساس بہت نمایاں ہے۔ یوں بھی عرفانِ ذات کے لمحات میں انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے تا آنکہ اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس یاترا میں تو کسی سنگی ساتھی کا وجود ہی بے معنی ہے۔ وقت کے اس نقطے پر دوسرا احساس یہ بیدار ہوتا ہے کہ ہر شے رواں دواں ہے۔ تغیر کو ثبات ہے اور اشیا سے وابستگی بے معنی ہے خود کو برہنہ سر اور برہنہ پا محسوس کرنے کی وجہ جواز یہی ہے۔ وہ لوگ جو محض ماضی میں رہتے ہیں۔ ان پودوں کی مانند ہیں جن کی جڑیں زمین میں بہت دور تک اتر گئی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کے لئے ماضی سے (جو ان کے لئے ذاتی جائیداد یا اثاثے کی حیثیت رکھتا ہے) دست کش ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے ٹھہرا ہوا معاشرہ ہمیشہ مادہ پرستی کی طرف مائل ہوتا ہے جبکہ خانہ بدوش یا آوارہ قبائل میں ماضی سے منقطع ہونے، زمین کو تیاگنے اور رشتے ناطے توڑ دینے کا احساس ابھر آتا ہے۔ حال کے متحرک سفینہ پر سفر کرنے والی روحِ بیدار چاروں طرف پھیلی ہوئی اشیا سے وابستہ ہونے کے بجائے اپنی ذات کی پہنائیوں میں غوطہ لگاتی اور "جاوداں" ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ بلراج کومل کی نظموں میں "اس لمحہ بے اماں" یا "بے زباں" میں وقت کی تنگ دامانی سے اوپر اٹھ کر جاوداں ہونے کی خواہش بہت نمایاں ہے اور قاری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہے۔

ماضی کی زنجیروں سے آزاد رہنے کی خواہش بلراج کومل کی کئی ایک نظموں میں پوری طرح ابھر آئی ہے اور میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ یہ شاعر Fossil Poets کے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً "نوادر کی دکان" میں شاعر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ماضی کے نوادر محض کانچ کے بے جان ٹکڑے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گداز جسم زندگی اور حرکت اور جبت کی آماجگاہ ہونے کے باعث ان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اسی طرح "یہ زاویہ" میں شاعر نے ان تمام اصنام کو بنظرِ تحقیر دیکھا ہے جو ماضی کا ورثہ ہیں اور جن سے ہمارے اذہان میں تمدن کی روشنی ہے، اور کہا ہے کہ اے پتھروں کے پوجنے والو! اپنے چاروں طرف دیکھو۔ وہی ہونٹ اور آنکھیں اور کمر کے بل جنھیں تم پتھروں میں دیکھ کر پوجتے ہو، زندہ جسموں کی صورت تمہارے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ نظم بھی انجماد اور ٹھہراؤ اور ماضی پرستی کے مقابلے میں حرکت اور جبت کو زیادہ اہمیت بخشتی ہے۔

حال کے متحرک لمحے کے ساتھ بہتا ہوا شخص نہ صرف ماضی کے بندھنوں کو قبول نہیں کرتا بلکہ ایک خواب پرست کی طرح مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرنے سے بھی گریز اختیار کرتا ہے چونکہ وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جو روشنی کا نقطہ ہے اور جہاں سے وہ ماضی کی منجمد فضا اور مستقبل کی سرابی کیفیت کو پوری طرح محسوس کر سکتا ہے۔ اس لئے ایسا شخص حقیقت پسند ہوتا ہے اور احمق کی جنت —— Fool's Paradise میں رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اگر حقیقت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہو تو اگرچہ اس کے ہاں تخیل توانا اور احساس گہرا ہوگا تاہم حقیقت پسندی کی روش اسے ماضی یا مستقبل کی تنگنائے میں رک جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات اوپر واضح ہوئی ہے کہ یہ شاعر ماضی میں غائمزہ کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتا۔ اب اس کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے دیکھئے جو اس بات پر دال ہیں کہ اس شاعر نے مستقبل کے بارے میں بھی حقیقت پسندانہ روش کو اختیار کیا ہے اور اسے اپنے خوابوں، ارمانوں اور تمناؤں کی آماجگاہ نہیں بنایا ہے۔

گھروں کی رونق

یہ زرد بچے

یہ گھر سنائیں گے، شادیانے بجائیں گے آنے والے رنگیں دنوں کی خاطر

یہ چند لقموں کو زندگی کا مآل سمجھیں گے حسب دستور
عمر بھر ان کو انگلیوں پہ گنا کریں گے
یہ میرا حصّہ
یہ تیرا حصّہ
پھر ایک دن یہ بھی زرد بچوں کے باپ ہوں گے
اور ان کی خاطر دعا کریں گے۔
دراز ہو ان کی عمر، دیکھیں یہ سو بہاریں

———— "یہ زرد بچے"

ہم مستقبل
کل کی محفل
چھٹی ہونے پر گھر جا کر سو جائیں گے
پھٹے پرانے بستر سے اُگنے والے رنگین خوابوں میں کھو جائیں گے

———— "طالب علم"

میں تم کو حیرت سے دیکھتا ہوں
یہ منحنی جسم زاویوں کی پناہ گہ ہے
تمھارے سر پہ
جو سینگ اب تک نہ اُگ سکے تھے
پلک جھپکنے میں یوں اُگے ہیں
کہ جیسے اپنے جنم کے برسوں سے منتظر تھے
لہو کہاں ہے؟
تمھاری رگ رگ میں ایک سیّال زہر کا بحر بیکراں ہے
تمھارے ہمراہ آج قرنوں کی داستاں ہے

میں تم کو پہچانتا نہیں ہوں
نہ میرا چہرہ نہ میری آنکھیں
میں بے زباں ہوں
مگر میں شاید
تمھاری نظروں میں جاوداں ہوں

———— "میرا پوتا"

ان نظموں میں سے "یہ زرد بچے" میں بلراج کومل نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ مستقبل محض اس لئے سہانا ہے کہ یہ ملائم اور کومل خیالوں میں لپٹا ہوا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی تو ایک دائرے میں گھومتی ہے۔ یہ زرد بچے جو مستقبل ہیں اور جن کے ساتھ امیدیں وابستہ کر کے ان کے والدین دراصل مستقبل سے امیدیں وابستہ کرتے اور خوابوں کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں، تو دبھی ایک روز عمر کی پامال راہوں سے گذر کر زرد بچوں کے باپ بنیں گے اور اسی طرح مستقبل کی خوابناک فضا میں زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن شاعر خود ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے وہ مستقبل کی اس سرابی کیفیت کو بہت اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے اس کا ردِ عمل حقیقت پسندانہ ہے۔ دوسری نظم "میرا پوتا" میں شاعر نے مستقبل کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ فردا پرستوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مستقبل کا سہانا پن صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ خواب و خیال کے ملائم دھاگوں میں لپٹا ہوا ہے۔ ورنہ جب یہ حقیقت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئے گا تو اس کا اجنبی پن۔ اس کی بغاوت، بالکل واضح ہو جائے گی۔ اس نظم میں شاعر نے نئی نسل کی بغاوت کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے اور ماضی اور مستقبل، دادا اور پوتا کے درمیان کھڑے ہو کر ان دونوں حقیقتوں اور ان کے ربطِ باہم پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہے۔

بلراج کومل، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ وقت کے متحرک، زندہ اور دھڑکتے ہوئے لمحے کا شاعر ہے اور اسی لئے وہ ماضی یا مستقبل میں رہنے کے بجائے حال "کے لمحۂ پرّاں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا رجحان محض مادہ پرستی یا لذت کوشی کی طرف ہے اور وہ محض گزرتے ہوئے لمحے سے لذت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی آرزو میں سرشار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آج اور آج سے بھی زیادہ اس ایک لمحے کو اہمیت دیتا ہے، جس کی عمر طبعی ذہن کی گرفت میں بھی نہیں آسکتی لیکن جو ایک "مسلسل اظہار" ہونے کے باعث ہر دم نظروں کے سامنے ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ایک لمحے میں رہتے ہوئے بلراج کومل کے ہاں اوپر اٹھنے، بیکراں اور جاوداں ہو جانے کی آرزو بہت نمایاں ہے۔ یہ بات ان نظموں میں خاص طور پر موجود ہے جو "من و تو" کے رشتے سے متعلق ہیں یعنی جن میں شاعر اور اس کی محبوبہ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جسم کے بارے میں بلراج کومل کا ردِ عمل تیاگ اور گریز سے ہرگز مملو نہیں۔ جسم اس کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے اور جسم سے قربت ایک لذتِ نایاب کو وجود میں لاتی ہے۔ لیکن اس شاعر کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ اس نے جسمانی قرب کو بھی رفعتِ ذات کے لئے ایک وسیلہ بنایا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر کی طرف اس کا رجحان چمٹنے اور لپٹنے اور رُک جانے کا نہیں بلکہ ان مظاہر کو خود سے لپٹا کر اوپر اٹھنے کا ہے۔ چنانچہ قربِ محبوب کی لذت میں کھو کر بھی اس کی روح آسودگی اور کیف کی ایک بلند تر سطح کی طرف اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ چند مثالیں دیکھئے:-

آسماں سے زمیں تک ہستی
خواب ہے اور خواب آوارہ
جھونکے آتے ہیں نرم اور تازہ
دونوں جسموں میں رازداری ہے
دونوں روحوں پہ وجد طاری ہے

——— "وصال"

اگر ہم اس خاکدانِ ہستی میں اپنے زرخیز گرم جسموں
کو زندگی بھر قبول کرلیں
تو ہم خدا ہیں
ازل سے بہتر

ابد سے بہتر
خدائے ارض و سما سے برتر
یہ شب حسیں ہے
سحر حسیں ہوگی، دوپہر، شام اور پھر شب
میں آج ہوں اور کل نہ ہوں گا
میں جسم ہوں اب، میں جسم ہوں اب
تو آج ہے اور کل نہ ہوگی
تو جسم ہے اب تو جسم ہے اب
یہ لمحۂ بیکراں مری جاں ــــ بڑا حسیں ہے
ہمارے جسموں کی وسعتوں میں
وہ موسم گل ہے جس کی کوئی خزاں نہیں ہے

ــــــــــــ "موسم گل"

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ان چند سطور میں بلراج کومل کی نظم نگاری کے اُن پہلوؤں سے قطعاً بحث نہیں کی جو درسی تنقید کو ہمیشہ سے بہت عزیز رہے ہیں مثلاً رمزیت و ایمائیت، ہیئت کے تجربے، غلاظتوں اور برائیوں کے خلاف احتجاج، سماج یا سوسائٹی کی عکاسی، شاعر کا پیغام وغیرہ وغیرہ اور یہ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید کی یہ راہیں اتنی بار روندی جا چکی ہیں کہ اب پامال شاہراہوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں اور ان کے گرد و غبار میں شاعر کی انفرادیت نظر تک نہیں آتی۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ ہمیں تنقید کے چند امتحانی سوالات کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے کلام سے بحث نہیں کرنی چاہئے بلکہ شاعر کے کلام سے اس کی شخصیت اور روح کی کڑیوں کو ترتیب دینا چاہیئے۔ میں نے جب اس خاص نظریے کے تحت بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کیا تو مجھے ان میں ایک عجیب انفرادیت نظر آئی۔ سطور بالا میں میں نے بلراج کومل کی اس انفرادیت کے چند اہم پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ مزید برآں مجھے یہ کہنا ہے کہ بلراج کومل کی ان نظموں کی اہم ترین خصوصیت ان کی جہت DIRECTION ہے۔ یہ نظمیں نہ صرف خود متحرک ہیں بلکہ ایک متحرک ذہن کی پیداوار بھی ہیں۔ تاریخ تہذیب کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ قدیم سوسائٹی ایک ازلی و ابدی دائرے میں مقید تھی اور اس لئے وقت کی جہت اور تحرک سے آشنا تک نہیں تھی۔ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اس قدیم سوسائٹی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور ایک خاص سمت میں بڑھتا چلا گیا۔ واقعات اس سفر کے سنگ ہائے میل تھے۔ گویا انسان کی زندگی میں سفر کا یہ آغاز وقت کے آغاز سے مماثل تھا۔ پھر سفر محض مادی اور جسمانی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نوعیت ذہنی اور روحانی بھی ہوتی ہے۔ گویا جب سوچ کا آغاز ہوا اور انسان نے ہر شے کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے چند اہم سوالات اٹھائے تو وہ وقت سے ہم آہنگ ہو کر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یہی احساس ہوا کہ اس شاعر نے سوچ کے عنصر کو جگہ دے کر اور ایک خاص سمت میں متحرک ہو کر وقت کے ازلی و ابدی تحرک سے اپنی نظموں کو آشنا کر دیا ہے۔ یہی بلراج کومل کی نظموں کی اہم ترین خصوصیت ہے کہ ان میں "جہت" یا "سمت" کا احساس ہوتا ہے اور چونکہ یہ جہت یا سمت حال کے اُس لمحے سے واضح ہوتی ہے جو گویا وقت کے تحرک کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس لئے بلراج کومل نے اسی ایک مقام پر ٹھہرے ہو کر اپنی بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سفر بہت طویل ہے۔ راستہ بھی نیا ہے۔ اگر بلراج کومل کا جذبۂ سیاحت اور آسودہ سفر اسی طرح جہاں مستقل رہی تو یہ بات غیر اغلب نہیں کہ وہ آگے چل کر اردو نظم کو ایسی بہت سی منازل سے آشنا کریں گے جو ابھی تک پس پردہ ہیں لیکن جن تک رسائی

[illegible]

نادم سیتاپوری

گذشتہ صدی کے چند ادبی رسالے

اردو صحافت کا آغاز سنہ ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفاء) کے اردو اخبار کلکتہ سے ہوا۔ اور یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ اردو کا پہلا ادبی ماہنامہ "خیر خواہ ہند" (دہلی) یکم ستمبر ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر دہلوی نے نکالا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء تک اردو کے دو رسائل نکلے۔ لیکن گذشتہ صدی کے آخری قرن میں تو اردو اخبارات و رسائل اس کثرت سے شایع ہونے لگے تھے جن کی صحیح تفصیلات بھی فراہم نہیں کی جا سکتیں۔ زالدولہ محمد اشرف نقوی کا احسان ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۸ء تک بہت سے اخبارات، رسائل اور گلدستوں کی کافی تفصیلات اپنی مشہور کتاب "اختر شاہنشاہی" مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء میں یکجا کر دی ہیں جسے متفقہ طور پر ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ کا درجہ دیا جاتا ہے۔

"اختر شاہنشاہی" میں انھیں اخبارات و رسائل کا ذکر ملتا ہے جو ۱۸۸۹ء تک نکل چکے تھے اس کے بعد جو رسائل و اخبارات جاری ہوئے ان کے متعلق یکجائی تفصیلا[illegible] کہیں نہیں ملتیں بجز ۱۹۰۴ء میں "پیسہ اخبار لاہور" کی طرف سے چھ سو چوالیس اخبارات و رسائل کی جو "فہرست اخبارات" شایع کی گئی وہ تو ناقص و نامکمل ہے کہ اس سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون اخبار یا رسالہ کس سنہ میں جاری ہوا اور اس کا ایڈیٹر کون تھا؟ گذشتہ صدی کی آخری دو تین دہائیوں میں اردو کے جانے کتنے معیاری رسالے جاری ہوئے تھے جن کے فائل بھی اب کہیں نظر نہیں آتے۔ میرے کتب خانے میں ایسے ہی چند رسائل کے متفرق پرچے موجود ہیں جس سے اس دور کے ادبی رجحانات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے اس مختصر مضمون میں جن چند رسائل کا ذکر کیا جا رہا ہے ان میں شعر و سخن کے گلدستے شامل نہیں جو اس زمانے میں زبان و ادب کے ارتقا کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ جن چند رسائل کی تفصیلات اس وقت پیش کی جا رہی ہیں۔ میرے پاس ان کے صرف ایک ہی ایک شمارے ہیں کسی کے بھی مکمل یا نامکمل فائل نہیں ہیں۔

تفریح العقلاء

(ماہنامہ الہ آباد) نام سے تو مزاحیہ رسالہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں بالاقساط وہ ناول شایع ہوا کرتے تھے جنھیں بعد میں "مطبع نظائر الہ آباد" مطبوعات کے طور پر فروخت کیا جاتا تھا۔ "مطبع نظائر قانون ہند" الہ آباد کا ایک بڑا کاروباری پریس تھا جس کے مالک منشی شمبھو دیال تھے یہ پریس محلہ شاہ گنج الہ آباد میں قائم کیا گیا تھا اور یہیں (ماہنامہ) "نظائر قانون ہند" کا دفتر بھی تھا۔ یہ قانونی رسالہ جنوری ۱۸۷۵ء میں منشی شمبھو دیال نے نکالا تھا جس میں "انڈین لا رپورٹس" (انگریزی) کی قانونی نظائر کا لفظی ترجمہ اردو میں شایع کیا جاتا تھا۔ عام طور سے یہ رسالہ تین جزو پر شایع ہوتا تھا اور رسالانہ چندہ پچیس روپیہ چار آنے تھا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا۔

"تفریح العقلاء" کا جو شمارہ میرے پاس ہے اس پر نہ تو جلد نمبر ہے نہ شمارہ نمبر۔ ماہ اگست ۱۸۹۰ کا یہ پرچہ صرف سولہ صفحات (علاوہ سرورق) پر مشتمل ہے اس میں بعد [illegible]

شروع ہو کر صفحہ ۱۰۰ پر ختم ہوتی ہے اور قصہ تسخیر الخشہ کے آٹھ صفحات ۱۱۰ سے ۱۱۴ تک شامل ہیں۔ ناولوں کی ان دونوں درمیانی قسطوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے بھی اس رسالے کے اور بھی نمبر شایع ہو چکے تھے لیکن اجرا کی تاریخ صحیح کا تعین کرنا دشوار ہے۔ رسالے کے سرورق پر فارسی کے تین شعر درج ہیں یہ عبارت بھی۔

"مخزن قصص وحکایات وروایات نادر و مضامین دلچسپ۔ خیال انگیز مختصر و پسندیدہ ماہوار واسطے نزہت ناظرین کے طبع ہوتا ہے۔"

یہ رسالہ مطبع نظامی قانون چشمہ الہ آباد میں چھپتا تھا منشی شمبھو دیال ہی اس کے سب کچھ تھے۔ سرورق پر اس کے مضامین کے قانونی تحفظ کے "جملہ حقوق قانوناً محفوظ ہیں" لکھا ہوا ہے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ ... تھا اور بلا محصول بارہ آنے سالانہ۔ ایک شمارے کی قیمت صرف ایک آنہ

اودھ ریویو

(ماہنامہ لکھنؤ) منشی نولکشور اور نولکشور پریس کی علمی و ادبی اور صحافی خدمات ایک تاریخی تذکرے کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ مرحوم "اودھ اخبار" کے بعد آخری دور میں نولکشور پریس کی طرف سے ۱۸۹۶ء میں ماہنامہ اودھ ریویو کا اجرا ہوا اور مولوی عبدالحلیم شرر کے زیر ادارت کم و بیش اسی زمانے میں "ہفت روزہ تفریح" بھی جاری ہوا۔ "تفریح" کے کوئی شمارے میرے پاس نہیں ہیں۔ "اودھ ریویو" کا صرف ایک پرچہ بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۰ء موجود ہے جس پر جلد ۵ اور شمارہ ۵ درج ہے اس حساب سے اس کے اجرا کا زمانہ جنوری ۱۸۹۶ء متعین کیا جا سکتا ہے۔ "اودھ ریویو" کی ایک غالباً مکمل فائل "انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" بمبئی کے کتب خانے میں محفوظ ہے جو محب محترم مولینا نجیب اشرف ندوی[1] کی وساطت سے میری نظر سے گذری ہے چونکہ خود ندوی صاحب اس پر کام کرنا چاہتے تھے اس لئے میں نے اس کی کوئی یادداشت مرتب نہیں کی۔

"اودھ ریویو" کی عام ضخامت پانچ جزو کے قریب تھی سرورق مجلد ہوتا تھا۔ مئی ۱۹۰۰ء کے شمارے میں فہرست مضامین سرورق ہی پر دی ہوئی۔

۱۔ مسٹر جے۔ این۔ ٹاٹا رئیس بمبئی۔
۲۔ مئی ۱۹۰۰ء۔
۳۔ تجارت ہند کی ابتدائی تاریخ۔
۴۔ ترکوں کی خاندانی زندگی۔
۵۔ جہانگیری۔
۶۔ ناگری میں اردو تلفظ۔
۷۔ ناول دربار اودھ۔

مضامین ۷۳ صفحات پر محیط ہیں اور ناول "دربار اودھ" کے ابتدائی تین جزو شامل ہیں اس شمارے کا ابتدائی صفحہ غائب ہے اس کے ایڈیٹر کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ مئی ۱۹۰۰ء کے تحت اس دور کی عالمی سیاست کا جائزہ لیا گیا ہے۔

> "یہ مہینہ بوجوہ قابل یادگار رہے۔ اسی مہینے میں آغاز جنگ جنوبی افریقہ سے برٹش اسلحہ کو متواتر کامیابیاں ہوئیں اوائل ہی میں "کرونسٹاڈ" پر برٹش کا قبضہ ہو گیا پھر تو برٹش کی فوجیں ٹرانسوال کو بڑھ گئیں میفکنگ کی حالت اپریل میں سخت نازک ہو گئی تھی اوائل مئی میں محصورین کے جو حالات موصول ہوئے وہ نہایت افسوسناک تھے لیکن لارڈ رابرٹسن کی دور اندیشی اور فوجی قابلیت سے دفعتاً میفکنگ کا محاصرہ ٹوٹ گیا۔"

---

[1] جہاں تک یاد پڑتا ہے مولینا ندوی کا ایک مضمون "اودھ ریویو" پر چند سال ہوئے "نوائے ادب" بمبئی میں شایع بھی ہو چکا ہے۔ (ناظم سیتاپوری)

اس کے بعد فہرست خطابات کا ایک حصہ دیا گیا ہے جو ہر سال برطانوی عہد حکومت میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ اس اعزاز میں تینتیس آدمیوں کو طلائی تمغے ایکاسی افراد کو نقرئی تمغے دیئے گئے جس میں بنگال۔ پنجاب اور مدراس کے مستحقین کو ان کا مناسب حق نہیں ملا۔ اس سلسلے میں انڈین مرر۔ ہندو۔ بنگالی۔ دیپٹریٹ اور ٹریبون وغیرہ کے احتجاج کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

ادیب ماہنامہ پٹنہ

نواب نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی کا شمار گذشتہ صدی کی ان عظیم شخصیات میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنا سب کچھ زبان و ادب پر وار تھا۔ اس دور کے بلند پایہ ادیب اور انشا پردازوں میں انھیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ خیال نے "اردو لٹریچر سوسائٹی" کے نام سے پٹنہ میں ایک ادبی رہ قائم کیا تھا اور اسی کی طرف سے "ادیب" نام کا ایک ماہنامہ بھی ۱۸۹۰ء میں جاری کیا تھا جس کا تیسرا شمارہ بابتہ ستمبر ۱۸۹۰ء پیش نظر ہے۔ اس رسالے ایڈیٹر نواب نصیر حسین خاں خیال ہی تھے۔ مطبع قیصری پٹنہ (عظیم آباد) میں چھپتا تھا ضخامت علاوہ سرورق کے ۳۲ صفحات ہے سالانہ چندہ ڈھائی روپیہ تھا۔
اس شمارے میں سات مضامین اور صرف ایک نظم ہے زیادہ تر مضامین سید علی سجاد سجاد عظیم آبادی کے لکھے ہوئے ہیں، جو اپنے زمانے کے ایک نامور یب اور نثار گذرے ہیں۔ ستمبر ۱۸۹۰ء کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ ریشمی کپڑوں کا رواج ۔ مولوی سید علی سجاد سجاد
۲۔ کرشمۂ قدرت ۔ سید نصیر حسین خاں خیال
۳۔ قدیم یونان کے میلے ۔ مولوی سید علی سجاد سجاد
۴۔ موت اور اسکی یاد ۔ سید محمد وصال
۵۔ فال لینے کا رواج ۔ مولوی سید علی سجاد سجاد
۶۔ موسم بہار کی ایک رات ۔ سید نصیر حسین خاں خیال
۷۔ زبان اردو ۔ مولوی سید علی سجاد سجاد
۸۔ آسمانی سقا (نظم) ۔ مولوی سید علی سجاد سجاد

"زبان اردو" والا مضمون نواب نصیر حسین خاں خیال کا وہی تاریخی موضوع ہے جو کتابی شکل میں شایع ہو چکا ہے۔

تہذیب

(ماہنامہ سیتاپور) جون ۱۸۹۵ء میں منشی حسن رضا ادیب سیتاپوری نے جاری کیا تھا۔ ادیب فورٹ ولیم کالج کے مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفا) کے پرپوتے تھے۔ دلچسپی تو شعر و سخن سے بھی تھی لیکن ان کا اصل دائرۂ عمل نثر ہی تھا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "اخوان الصفاء" کا سیتاپور ایڈیشن ہے جو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں شایع کیا تھا۔ "تہذیب" کے صرف دو ہی شمارے نکل سکے اس کے بعد بند ہو گیا۔
پیش نظر شمارہ جولائی ۱۸۹۵ء کا پرچہ ہے ابتدا میں ایک مسلسل ناول کے چند صفحات شامل ہیں جس کے عنوان کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ اس شمارے میں مضامین کی کوئی فہرست نہیں ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے مضامین "تہذیب الاخلاق" اور زراعت غالباً ادیب ہی کے لکھے ہوئے ہیں اس کے بعد دو صفحے کے متفرقات۔

۱۔ عجیب عجیب باتیں
۲۔ عجیب پیالہ
۳۔ نقل عجیب

حصۂ نظم میں زیادہ تر شعرائے سیتاپور کا انتخاب شامل ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تجمل محمود آبادی ۔ استاد تجمل حسین تجمل تلمیذ عباس سلیم (شاگرد خواجہ آتش) کے تین شعر شایع کئے گئے ہیں

تم تو کہتے تھے کہ الفت میں اثر کچھ بھی نہیں   کیوں چلے آئے مرا جذب اگر کچھ بھی نہیں
ننگ ہے آج جو ڈھونڈھے کوئی مرد میداں   داغ پیشانی جرات ہے سپر کچھ بھی نہیں
ہم ہیں کہ خواہش وصلت ہے نہ ایذائے فراق   شام تک آؤ تو کچھ ہے بھی۔ سحر کچھ بھی نہیں

۲۔ وفا سیتاپوری ۔ میر کاظم حسین وفا (وفات ۱۸۹۷ء) اپنے رنگ کے منفرد غزل گو تھے ان کے بھی چار شعر دیئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

حشر میں کون مرے خوں کی گواہی دے گا   تو جدھر ہوگا ادھر ساری خدائی ہوگی

۳۔ فصیح فتحپوری کے بھی چار شعر شایع ہوئے ہیں ایک شعر ملاحظہ ہو۔

بیاں کرے گی میری سرگذشت دل وہی تجھسے   سحر کو شمع جو بجھکر تری محفل سے نکلے گی

۴۔ فارغ سیتاپوری ۔ سید محمد افضل فارغ۔ میر انیس کے مشہور شاگرد تھے اور مرثیہ میں رزم کے بادشاہ ؛ غزل کے یہ دو شعر ان کی ابتدائے مشق کا نمونہ ہیں ؎

میں وہ ہوں سخت جاں گردن پہ چھریاں مڑکے ٹوٹی ہیں   پلٹ کر پشت پر باڑھ آئی ہے قاتل کے خنجر کی
وہ انساں ہیں برائی کو بھلائی ہم سمجھتے ہیں   بگڑتی ہے جو قسمت کہتے ہیں خوبی مقدر کی

۵۔ طالب سیتاپوری ۔ حکیم محمد شریف طالب مرزا غالب کے ہمرنگ شاگردوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے ان کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔

یقیں ہے واں کوئی دلچسپ بستی بس گئی ہوگی   حسیں کیا کیا یہ زیر خاک پنہاں ہوتے جاتے ہیں

حالانکہ طالب کا اصلی رنگ یہ تھا ۔ جو انھیں استاد غالب سے ورثہ میں ملا تھا۔

رنگ پر پیدہ پردہ دیدہ راز ہوگیا   میں اپنے حق میں آپ در انداز ہوگیا

ماہنامہ تہذیب" لکھنؤ کے "مطبع ریاض رضا" اشرف آباد میں چھپتا تھا اور اسکا دفتر منشی حسن رضا ادیب کے مکان پر سیتاپور میں تھا۔ سالانہ چندہ فیشنگی طلبا سے ایک روپیہ آٹھ آنے۔ عوام سے دو روپیہ۔ وکلا اور روساسے پانچ روپیہ اور تعلقداروں سے دس روپیہ لیا جاتا تھا۔

معارف (ماہنامہ علی گڈھ)

گذشتہ صدی کے آخری چند سال کے اندر ماہنامہ "معارف" علی گڈھ جیسا معیاری رسالہ شاید ہی کوئی نکلا ہو۔ جولائی ۱۸۹۸ء میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں (اورد مسلم گزٹ والے) مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت میں علی گڈھ سے جاری ہوا۔ اس کا پہلا دور علی گڈھ کا زمانہ تھا اس کے بعد اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اسکا دفتر پانی پت منتقل ہوگیا۔ غالباً دو تین سال تک حاجی محمد اسمٰعیل خاں شریک ادارت رہے اس کے بعد تنہا مولوی ۔۔۔۔ وحید الدین سلیم ہی نکالتے رہے۔

میرے پاس معارف کا بھی صرف ایک شمارہ بابتہ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء ہے جس پر جلد ۲ اور شمارہ ۴ پڑا ہوا ہے۔ سرورق پر فہرست مضامین ہے۔

۱۔ احکام اسلام کی پابندی اور اس کا اثر عمر و صحت پر ۔ مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

۲۔ روانی آب (نظم) ۔ اکبر الٰہ آبادی

۳۔ مسلمانوں کی تاریخ گوئی کا بیان ۔ مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی

عام طور سے اس رسالہ کی ضخامت علاوہ سرورق کے دو جزو تھی۔ مطبع فیض عام علی گڈھ میں چھپتا تھا سالانہ چندہ چار روپیہ تھا نمونہ کا پرچہ پانچ آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر بھیجا جاتا تھا۔ اس شمارے میں سات کتابوں پر تبصرہ بھی ہے (۱) رہنمائے فوٹو گرافی (۲) پارسوں کی محنت بربادی (۳) امیرانہ دخریا

زندگی (۴) شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ۔ (۵) ملخص تعلیم (۶) لکچر حکیم امین الدین بیرسٹر (۷) اردو تعلیم حصّہ اول۔

آخری صفحہ پر رسالہ "المعلومات" لکھنؤ۔ رسالہ اودھ ریویو "لکھنؤ اور ہفت روزہ اخبار تفریح" لکھنؤ کے معاصرانہ اشتہار بھی ہیں۔ "المعلومات" کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی نظم (آب رواں) جو "سودلے" کی نظم کا ترجمہ ہے ممکن ہے اکبر کے کسی نئے مجموعہ میں شامل ہو پرانے کلیات میں تو نظر سے نہیں گذری۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا فاضلانہ مضمون "احکام اسلام کی پابندی اور اس کا اثر عمر و صحت پر" ایک نہایت ہی پرمغز اور عالمانہ مضمون ہے جس میں شروانی اپنی پوری عالمانہ شان و شوکت کے ساتھ نظر آتے ہیں اور شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں کا مضمون (مسلمانوں کی تاریخ گوئی کا بیان) بھی اپنے رنگ کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔

"معارف" کی جلدیں بھی اب کمیاب ہیں۔ شائد علی گڈھ پٹنہ اور رام پور میں اس کے کوئی فائل تلاش سے مل جائیں۔

ل اس رسالے کے بیشتر شمارے کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہیں (مدیر)

عابد رضا بیدار

ایک جوئے کہستاں کی موج رواں

(اقبال کے چند غیر مرتب نوادر)

(ذیل میں بعض قدیم رسالوں سے جو میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اقبال کے کچھ غیر مرتب نوادر پیش کر رہا ہوں جو ابھی تک ان کے کسی مرتب مجموعے میں نہیں آ پائے اور جب تک ان کی نشاندہی نہ کی جائے شاید ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہی رہیں۔ میں نے پہلے منظومات دی ہیں پھر دو نثری تحریریں اور الگ الگ دونوں تاریخی ترتیب کے ساتھ ہیں۔)

(۱)

جو مضموں زندگی میں حرفِ موزوں بن کے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں

سبب اے ہمنشینو! کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

نہ تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارماں نے
کہ سارے دیکھنے والے تری چلمن کے نکلے ہیں

کبھی اس رہ سے بھی شاید سواری تیری گزری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے توسن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے
خدا جانے تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

کوئی کیا جانے ہے وسعت فزا یاں کی ہوا کیسی
تری درگاہ سے ذرّے بیاباں بن کے نکلے ہیں

مری جاں داستاں میری کلیجہ تھام کر سننا
کہ میرے حال پر آنسو مرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر من چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ لے دستِ جنونِ بادِ محبت کی
عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیہ گر چاکِ محبت ہو تو کیونکر ہو
مرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رخ نہیں کرتے
جو مثلِ بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی ترے دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

تعلق پھول اب گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

برہمن روزِ محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے وہ پتھر وادیِ ایمن کے نکلے ہیں

تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت اک گوشے میں اس دامن کے نکلے ہیں
وہ مذبوحِ ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے
بہانے آشنا میری رگِ گردن کے نکلے ہیں

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

(۲)

غزل فارسی: "مکتوبات بنام عطیہ بیگم فیضی" (انگریزی)۔ ص ۱۳ دمیده۔ رمیده

(۳)

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم
دل کو بیگانۂ انداز مسیحائی کر
نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
تو یہ بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کیسی
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر
پہلے خوددار تو مانند سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوس شوکت دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

(۴)

رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
اختر شام کی آتی ہے افق سے آواز
سجدہ کرتی ہے جسے صبح وہ ہے آج کی رات

(۵)

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا مے کہ تلخ تر او نکوتر است
گفتم کہ کرمک است و ز گل سر برون زند
گفتا کہ شعلہ زاد و مثال سمندر است
گفتم ورے نہاں کدہ عام است زندگی
گفتا بہانۂ او زند و عالم فزون تر است
گفتم کہ شوق راہ نبرد کس بمنزلے
گفتا کہ منزلش ہمہ شوق مضمر است
گفتم کہ شر بطینت خاکش نہادہ اند
گفتا کہ خیر او نشناسی ہمی شر است

(۶)

شبے بہ میکدہ پیرِ کلیسیا می گفت — کہ رندِ میکدۂ تو لبے تنک جام است
گرفتم ایں کہ ثمر پختہ شد دلے گویم — اگر بدر زشاخِ نہال ماخام است
تراز پنجۂ شاہیں اماں دہد صیاد — فغاں چہ سود کہ آزادگی تہ دام است
مِن ستم زدہ ایں نکتہ را نہ فہمیدم — کہ فکر کہنۂ ہندی اسیرِ اوہام است
سروشس مطلع ہبر رضی بیادم داد — چہ مطلعے کہ سراپا نوائے الہام است

نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

(۷)

سائمن آں کہ بدل شہر و دیار آمد و رفت — دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت
باز لاہور از آفاتِ خزاں شد پامال — صف در گلشن پنجاب بہار آمد و رفت
صبح امید کہ از زاویۂ غیب رسید — خبر آورد کہ عہد شب تار آمد و رفت
اے عزیزان وطن بر سر گنج پنجاب — مژدگانے کہ زبرطانیہ کار آمد و رفت
. . . . از حلقۂ زنداں جہاں — کہ دگر بار . . . . . زار آمد و رفت

(۸)

مخدوم مکرم جناب مولوی کرم الٰہی صاحب ۔ السلام علیکم!

میں نے آپ کی کتاب اسلامی تاریخ عہد افغانیہ شروع سے لے کر آخیر تک پڑھی۔ یہ کتاب نہایت برمحل لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی مسلم اس کی ضرور قدر کریں گے۔ تاریخی تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اکثر مقامات اس کتاب کے قابل داد ہیں اور آپ کی قوت استدلال اور درایت تاریخی ثابت کرنے کے علاوہ اس بات پر نہایت قوی حجت ہے کہ ہندوستانی مسلموں میں مذاق اب تک زندہ ہے۔ اور ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تاریخ غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے واقعات کو مورخانہ نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ عام پڑھنے والے لوگ بالخصوص مسلم جن کی قومی روایات کی یہ کتاب ایک نہایت روشن اور صحیح تصویر ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے اخلاق کے وہ گراں قدر اصول سیکھ سکتے ہیں جو ان کی قوم کے مایہ الامتیاز رہے ہیں اور جن پر عمل کرنے سے حجاز کے صحرانشیں تیس ہی سال کے اندر شتربانی سے جہاں بانی پر پہنچ کر اقوام قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدید کے بانی بن گئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے، اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہیے، آپ کی تصنیف اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے اور میں بحیثیت ایک مسلم ہونے کے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ کتاب ہمیں ضرورت کے موقع پر لکھ دی ... قومیت کا احساس، جس کو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیے قومی زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے ... کے لئے ضروریات ہوتے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپ کی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلم خا

ائلہ کے پڑھنے سے مستفیض ہوگا۔ اللہ تعالے آپ کو اس کی محنت اور اس کاوش کا اجر دے۔ اور اس کا انعام آپ کو اس مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ

لے جس کے کام سے بنی نوع انسان کی نجات اور جس کے نام سے ہماری قومیت وابستہ ہے۔

والسلام

(۹)

نام سید اکبر حیدری

یوم اقبال کا یہ مقصد نہیں کہ میں چندہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو یہ رقم اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی تحقیقات کے شعبہ کے لئے بھجوا دیں جیسے میں

ے تجویز کیا ہے۔

(۱۰)

میں نے اپنے کسی مضمون میں حضرت مسیح کی آمد ثانی کے متعلق موافق یا مخالف خیال کا اظہار نہیں کیا۔ نہ کہیں یہ لکھا ہے کہ یہ عقیدہ اپنی اصلیت میں مجوسی

ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ غلط فہمی لاہوری احمدیوں نے عمداً پھیلائی ہے جو پراپیگنڈا کرنے میں دیانت سے قطعاً بے پروا ہیں۔

محمد اقبال۔ لاہور

۵۔ جولائی ۳۶ء

تصریحات

۱۔ اقبال کے وطن سیالکوٹ سے اکتوبر ۱۹۰۲ء میں "الکاشف" نام کا ایک ماہنامہ منشی فیض علی پروپرائٹر پنجاب پریس سے چھپوا کر قاضی حمید الدین مالک و

یڈیٹر نے شائع کیا۔ اس کے پہلے شمارے میں اقبال کی یہ غزل چھپی ہے۔

اس غزل کا تیرھواں شعر سر سید بکڈپو علی گڑھ کی ابھی پچھلے مہینہ کی شائع کردہ کتاب "نوادر اقبال" میں بھی موجود ہے اور مقطع "مہر صاحب کی مرودہ

ںیا گیا ہے۔ (اگرچہ دونوں بلا حوالہ ہیں)

الکاشف کے ایڈیٹر کا غزل پر یہ نوٹ ہے:۔

زمانہ کی مسلسل تفرقہ اندازیوں سے ایک مدت کے بعد ہمیں اپنے معزز ہم وطن اور مکرم دوست جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے

سے سیالکوٹ ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ صاحب موصوف کا نام نامی زیادہ تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ ہمیں ان کی ایک غزل اتفاق

سے ملی ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:۔

اور غزل کے مقطع میں "سید" کے لفظ پر لکھا ہے:۔

شیخ صاحب موصوف نے جس خوش اسلوبی سے مقطع میں اس لفظ کو رکھا ہے اس کا مزا کچھ واقفان راز ہی لے سکتے ہیں۔ جناب قبلہ

مولانا سید میر حسن صاحب سیالکوٹ میں ایک نہایت ہی نیک نفس اور روشن خیال خوش اخلاق عالم و فاضل بزرگ ہیں جن کے شاگردان رشید

کی ایک معتدبہ جماعت گورنمنٹ کی اعلیٰ خدمت کے معزز عہدوں پر ممتاز ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے بھی ابتدائی تعلیم سے لے کر بعض

تک انہیں کے سایہ عاطفت میں تعلیم پائی ہے اور ان کا مذاق شاعری بھی حضرت ممدوح کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے۔ جس کا اشارہ انہوں نے

مقطع میں کہا ہے:

انہی سے جنوری ۱۹۰۹ء میں بخشی حضوری علی کی ایڈیٹری میں، انجمن اخوت اسلام پنجاب کا سہ ماہی پرچہ "الاخوت" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اقبال نے غلطیہ بیگم بنت مکتوب، اوّلین مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء میں دمیدہ، رمیدہ قوافی کی جو فارسی غزل بھیجی تھی (ص ۱۳) وہ "الاخوت" کے اس پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی غزل پر ایڈیٹر کا یہ نوٹ تھا۔

"الاخوت کی اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جناب ڈاکٹر اقبال صاحب دام فیضہٗ جیسے صاحب علم و کمال نے اس کا سرپرست ہونا منظور فرمالیا ہے . . . .

ڈاکٹر صاحب موصوف ابھی مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر نہیں ہوئے اور یہی وجہ کہ ان دنوں آپ کے جملہ علمی مشاغل بے توجہی کا شکار رہے ہیں۔ یہی حال شغل شعر و سخن کا ہے۔ تاہم بعض وقت اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی بن آتی ہے لیکن جو لطف فراغت اور سکون میں نظم لکھنے میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

امید ہے کہ ہمارے دوسرے پرچے کے چھپنے تک آپ استحکام کے ساتھ یہاں مقیم ہو جائیں گے۔ اور ہمارے دامن امید کو گوہر مقصود سے پُر کرتے رہیں گے۔ ذیل کی فارسی غزل جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اس پرچے کے لئے مرحمت فرمائی ہے کمال شکریہ کے ساتھ چھاپی جاتی ہے غزل سراپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔"

یہ غزل منڈی بہاؤالدین سے نکلنے والے مشہور رسالہ صوفی کی فروری، مارچ ۱۹۱۷ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس کا عنوان ہے "بھی کر تو باندازہ رعنائی کر"

معراج کی رات کے عنوان سے یہ دو شعر بھی صوفی کے ۱۹۱۷ء ہی کے اکتوبر نمبر میں شائع ہوئے تھے اور نمبر ۳ کی طرح کسی مرتب مجموعے میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

زندگی کے عنوان سے فارسی کے یہ چھ شعر اردو کے شاعر برج نرائن چکبست لکھنوی کے رسالہ صبح امید کے پہلے شمارہ، اکتوبر ۱۹۱۸ء کی اشاعت کی زینت تھے۔ یہ ان اشعار کی پہلی اشاعت تھی۔ اس کے بعد پیام مشرق میں شامل کئے گئے۔ لیکن چھ کے بجائے صرف پانچ اور وہ بھی اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اور دوسرے کے بعد ترتیب بدل دی گئی اور پانچویں شعر کو تیسرے نمبر پر رکھا گیا، چوتھے کو پانچویں نمبر پر اور آخری شعر چوں کا توں۔ چوتھے شعر کو پانچویں نمبر پر رکھ کر پہلے مصرع میں بھی کردی گئی اس طرح کہ "راہ" کی جگہ "سیر" کا مترادف لفظ لے آیا گیا۔

تیسرا شعر پیام مشرق میں شامل کرتے وقت قلم زد کر دیا گیا۔ اس شعر کی وجہ سے اور اولین ترتیب پیش کرنے کے خیال سے میں نے پوری نظم دے دی ہے صبح امید شاعت سے ان اشعار کی تاریخ کا بھی پتا چل جاتا ہے۔

مشہور لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نگرانی میں اور قریشی کی ادارت میں امرتسر سے تنظیم کی مشہور پنجابی تحریک کا آرگن تنظیم رسالہ (اور اخبار کی شکل میں) نکلتا تھا۔ اس کے شمارہ نمبر ۵۵ میں اقبال کی یہ نظم سوراج (در حدود سلطنت) کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ شمارہ اپریل ۱۹۲۰ء میں نکلا تھا۔ کلام اقبال کے مجموعوں میں یہ نظم مجھے کہیں نہیں ملی۔ زبور عجم میں ایک غزل ہے جس میں بجنسہٖ یہی ردیف و قوافی اور بحر استعمال کی گئی ہے۔ یہاں اقبال کے پانچ شعر ہیں (اور ایک ہی کا) زبور میں سات شعر ہیں۔ اور دو شعر تو بالکل موجودہ میری مندرجہ نظم کے پیرائے میں ہیں۔ وہی سوراج کے سلسلے میں خیالات معلوم ہوتے ہیں۔

گزشتم از ہمہ کہ جوشا ہیں بلند پروازی ہوش باش کہ صیاد ما کمین دام است
گمان مبر کہ نصیب تو نیست جلوۂ دوست درون سینہ ہنوز آرزوئے تو خام است

اقبال کے ایک گمنام ہم عصر ریاست حسین خاں عجیب و غریب قسم کے آدمی تھے۔ ساری عمر رامپور میں گزری۔ منشی امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی اور داغ سے لے کر رضا بیدار تک کا زمانہ انہوں نے دیکھا تھا۔ تسلیم سے تو ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کے پڑوس ہی میں تسلیم آکر رہے تھے۔ کتابیں اور رسالے جمع کرنے

انور عنایت اللہ

جان اسٹین بیک

۱۹۳۵ء میں ایک نوعمر جذباتی ادیب نے ادب اور زندگی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا "ادب حیات انسانی کی ترجمانی اور تنقید ہے انسان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تفتیش و تحقیق — اس کے دکھ سکھ اچھائیوں اور برائیوں کی پرحقیقت اور باحیات آئینہ داری — بلند پایہ ادب وہی ہے جس میں انسان کی مضمر اور خوابیدہ قابلیتوں اور قوتوں کو بیدار کرنے کی صلاحیت ہو — وہ تحریر جو زندگی اور اس کے مسائل کی صحیح ترجمانی نہ کرے اسے مقصدی ادب کے دائرے میں شامل کرنا غلط ہوگا"

امریکی ادب میں یہ آواز نئی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ایسی تحریریں منظر عام پر آ چکی تھیں، جو حقیقت نگاری کی اچھی مثالیں تھیں، جنہیں ادب بلند کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا تھا لیکن اس نوعمر ادیب کے یہاں نہ صرف بڑی انفرادیت تھی بلکہ اسے پڑھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اس بھٹی سے گزر چکا تھا کہ اس زمانے کے امریکی عوام شکار تھے۔ اس کا لہجہ اکثر نقادوں کو تلخ لگتا۔ اس کی بھی بڑی معقول وجہ تھی۔ اس نے اپنا بچپن اور جوانی کا خاصا حصہ کشمکش زندگی میں مبتلا عوام کے ساتھ بسر کیا تھا۔ اور بڑے قریب سے ان کے مسائل کا مطالعہ کیا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب امریکہ میں اس قسم کے بے باک خیالات کے اظہار کو بڑی شک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا حالانکہ امریکی ادب میں خاص طور پر ناول نگاری میں حقیقت نگاری کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی۔ لیکن پھر امریکی ادیبوں کی اکثریت خیالی اور بے مقصد رومانی کہانیوں کی مقناطیسیت کا شکار تھی اسی لئے جب بھی کوئی سرپھرا بڑی بے دردی سے سماجی بدعنوانیوں اور معاشرتی کمزوریوں کو بے نقاب کرتا اور امیر طبقے کے حسن و عشق کی نرمی داستانوں کے بجائے عوام کی کشمکش زندگی، ان کی آرزوئیں اور ان کے ارمان، اس خود غرض دنیا میں ان کی عزت اور شرافت سے زندگی بسر کرنے کی کوشش — ان سب موضوعات کو اپناتا تو لوگ اسے فوراً اشتراکی قرار دے کر اس کا حقہ پانی بند کر دینے کی دھمکیاں دیا کرتے۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ ہنری جیمس اور ولیم ڈین کی عظمت سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور تھیوڈور ڈریسر کی "امریکن ٹریجیڈی" کو شائع ہوئے بارہ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس سے بھی تقریباً پچیس سال پہلے ڈریسر نے "سسٹر کیری" لکھ کر حقیقت نگاری کے ایک ایسے دور کو جنم دیا تھا جس نے آگے چل کر یکے بعد دیگرے کئی بڑے فنکار پیدا کئے جنہوں نے زندگی کی جھوٹی اقدار اور قدامت پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور اس زمانے کے امریکی سماج کی برائیوں کو بے باکی سے بے نقاب کیا — ڈوس پاسوس (Dos Passos) ہیمنگوے، فاکنر، جیمس ٹی فیرل (James T. Farrell) اسٹین بیک، ہارورڈ فاسٹ وغیرہ ایسے ہی ادیب ہیں۔

جب جان اسٹین بیک نے لکھنا شروع کیا اس وقت ڈوس پاسوس کے عظیم ناول "مین ہاٹن ٹرانسفر" (Manhattan Transfer) کو شائع ہوئے چار سال ہو چکے تھے اور جیمس فیرل کی "گیس ہاؤس میک گنٹی" (Gashouse McGinty) نے امریکہ کے امیر طبقے میں تہلکہ

ی جھلکیاں اب بھی نظر آہی جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ حقیقت پسندی پر مبنی جس قسم کی طرز نگارش کی ابتدا فلابیر نے کی تھی وہ اب اوج کمال کو پہونچنے والی ہی
اگرچہ اسٹین بیک کا پہلا شائع شدہ ناول "کپ آف گولڈ" تکنیک کے اعتبار سے خاصا کمزور تھا لیکن پھر بھی اس کے مطالعے سے اس کے نوعمر مصنف
ی سوز دنیا اور اس کے عقائد کا واضح طور پر اظہار ہو جاتا تھا۔ یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ اس نے اپنے دور کی تمام زندہ اور جاندار تحریکوں سے متاثر ہو کر لکھنا
شروع کیا ہے۔

"کپ آف گولڈ" ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس کا تازہ ترین طنزیہ ناول Travels with Charlie in search of Ame-
rica اسی سال شائع ہوا ہے۔ ان ۳۳ ہنگامہ خیز برسوں میں ذہنی سکون اور آسودگی کی تلاش میں اسٹین بیک کی بے چین روح نے بے شمار کٹھن منزلیں طے
اور ان گنت تجربے حاصل کئے اور ۲۷ کتابیں پیش کیں۔ یوں تو اس نے سیاحت میں اپنی زندگی کے کئی سال ضائع کر دیئے، لیکن بقول اس کے سکون اسے اس کی
ریاست کیلی فورنیا کی Salinas Valley ہی میں ملا۔ یہ وہ علاقہ ہے جس کا اس نے بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور جو اس کی اکثر کتابوں کا
پس منظر ہے۔

جان اسٹین بیک کے نانا اور نانی اس علاقے میں آئرلینڈ سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ جان یہیں فروری ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا۔ بچپن سے بے چین طبیعت پائی
تھی اس لئے کہیں بھی ٹک کر چین سے نہ رہ سکا۔ ابتدائی تعلیم بھی اس نے اسی افراتفری کے عالم میں حاصل کی۔ کئی سال تک اسٹین فورڈ یونیورسٹی (Stanford)
میں زیر تعلیم رہا۔ آخر کو ۱۹۲۵ء میں اس نے نئی منزلوں کی تلاش میں اپنے عزیز کیلی فورنیا کو خیرباد کہا اور مال و اسباب لانے لیجانے والے ایک جہاز پر سوار ہو کر پناما
عبور کیا اور نیویارک سٹی جا پہونچا۔ بچپن سے لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی، اور کہانی سننا اور سنانا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ اس لئے ایک ادیب بننے کے ارادے
سے ایک اخبار میں ملازمت کر لی۔ خیال تھا کہ شاید اخبار کی رپورٹری سے ذہن کو وہ ایسے ملے، وہ ردعمل اور تخلیقی تحریک نصیب ہو جو حساس انسان کو فنکار بناتی ہے
اور فن کو جلا بخشتی ہے جس کے بغیر کوئی بھی ادبی شہ پارہ عالم وجود میں آہی نہیں سکتا۔ چند مہینے نیویارک کے ہنگاموں میں گزارنے کے بعد یہ مایوس کن حقیقت واضح
ہو گئی کہ اخباری دنیا میں رہ کر اچھے ادب کی تخلیق مشکل ہی سے ہوتی ہے چنانچہ بہت جلد اس نے استعفےٰ دے دیا اور وہ اپنے عزیز ترین علاقے Salinas Valley
لوٹ آیا تاکہ باقی زندگی تصنیف و تالیف میں گزار سکے۔ اس کی اکثر تحریریں اسی پرسکون حسین اور قوس قزح کے علاقے میں لکھی گئیں جس طرح مارک ٹوین نے مسی سپی اور
ہیمنگوے نے مڈل ویسٹ اور فاکنر نے جنوبی ریاستوں کو زندہ جاوید کر دیا اسی طرح کیلی فورنیا کی بہترین اور کامیاب عکاسی کا سہرا اسٹین بیک ہی کے سر ہے۔ چارلس
ڈکنس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انیسویں صدی کے انگلستان کے عوام اور ان کی زندگی کی ترجمانی اس سے بہتر طور پر کسی نے نہیں کی۔ اسی طرح اسٹین بیک کے بارے
میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے امریکی عوام کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کے دکھ اور سکھ کے بارے میں اس سے زیادہ خلوص، ہمدردی اور دیانتداری
سے کسی دوسرے امریکی ادیب نے قلم نہیں اٹھایا۔

"ٹارٹیلا فلیٹ" (Tortilla Flat) اس کا پہلا کامیاب ناول تھا جو خاصا فروخت ہوا۔ بعد میں اسے کامیابی سے فلمایا بھی گیا تھا۔ اس ناول
کے فوراً بعد اس کا وہ مشہور ناول شائع ہوا جس نے کچھ عرصے کے لئے اس کی شہرت کو خطرے میں ڈال دیا۔ "In Dubious Battle" ان بے شمار غریب بیکس مزدوروں کے بارے
میں تھا جن پر کیلی فورنیا کے پھلوں کے باغوں میں بڑا ظلم ڈھایا جاتا تھا۔ ایسے بے کس اور پریشان حال انسان ہمیشہ اسٹین بیک کے محبوب کردار رہے۔ ان کے مسائل پر اس نے اور کئی ناول
اور افسانے لکھے جو بعد کو بے حد مشہور ہوئے اور عوام کے علاوہ نقادوں نے بھی انہیں بہت سراہا۔ "In Dubious Battle" گویا ابتدا تھی اس جہاد کی جسے اپنے ہم وطنوں کی
اکثریت کی مخالفت کے باوجود اسٹین بیک نے ہمیشہ جاری رکھا۔ اس ناول کی اشاعت کے فوراً بعد امریکی ادبی دنیا میں اس کے خلاف خوب شور مچا اور اس کے مصنف کو ایک ایسا ذلیل
اور ناشکر گزار انسان قرار دیا گیا جو اشتراکیت کے چکر میں گمراہ ہو گیا تھا جس کا دین اور ایمان ان تمام اقدار کا مذاق اڑانا اور ان تمام روایتوں پر کیچڑ اچھالنا تھا جن کے سہارے
امریکہ اب تک پروان چڑھا تھا۔ بدقسمتی سے اس پر نکتہ چینی کرنے والوں نے اس اہم حقیقت کو بھلا دیا کہ اسٹین بیک نے کبھی مارکسی نظریوں کو قبول نہیں کیا۔ کسی زمانے میں بھی وہ اشتراکی نہیں
رہا۔ اسے تو ڈس پاسوس، فیرل اور ہیمنگوے کی طرح ہمیشہ امریکی عوام بے حد عزیز رہے۔ اور اس کے حساس ذہن نے ان اقدار کو فوراً قبول کیا جو بیکس اور مجبور امریکی عوام کے حقو

میں پروان چڑھ رہی تھی اور جنہوں نے جذباتی فنکار کے دل میں ہر قسم کی استحصالیت کے خلاف غم و غصہ کو جگہ دی تھی۔ The Raid : Vigilante
The Grapes of Wrath میں بھی اس کا انداز بیان اور اس کا Approach یہی رہا۔

"گریپس آف راتھ" بلاشبہ اسٹین بیک کا عظیم ترین ناول ہے۔ بعض نقاد "ایسٹ آف ایڈن" (East of Eden) کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں لیکن فنی طور پر "گریپس آف راتھ" آخرالذکر ناول سے کہیں زیادہ عظیم تخلیق ہے۔ یہ ایک ایسے باغی ذہن کی پیداوار ہے جس نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں لاکھوں خانماں برباد کسانوں کی دنیا لٹتے دیکھی تھی۔ ان کے پریشان حال قافلوں کو Oklahama سے لے کر ان کے خوابوں کے حسین علاقے کیلی فورنیا تک بارش اور طوفان، سفر کی تکلیف اور گرمی کی اڑتی ہوئی دھول میں ہفتوں بھوکے پیاسے نڈھال سفر کرتے دیکھا تھا۔ ان کے مصائب سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے یہ عظیم ناول لکھ ڈالا۔ اس کا مرکزی کردار ماجوڈ (Ma Joad) ہے جو قدم قدم پر مصیبتیں اٹھاتی ہے۔ بے رحم قدرت کے پے درپے حملوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ منزل بہ منزل ذہنی جھٹکے برداشت کرتی ہے اس کے باوجود اس کی اولوالعزمی میں فرق نہیں آتا اور وہ ایک تابناک مستقبل پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے کنبے کو اپنے ساتھ مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسے بھی مایوسی ہوتی ہے اور جب ان کا تھکا ہارا قافلہ ارض موعود جا پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان سب نے ایک سراب کی تلاش میں اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ انسانی روح کے اس کڑے امتحان کی داستان کو انگریزی ادب میں ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہے گی۔ ماجوڈ ایک زندہ کردار ہے جس کی مثال امریکی ادب میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔

"گریپس آف راتھ" کی اشاعت کے بعد بھی امریکہ میں خاصا شور مچا۔ ایک بار پھر اس کے مصنف کو اشتراکی قرار دے کر اس کی خوب مذمت کی گئی لیکن سنجیدہ طبقے نے سوچنا شروع کیا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اسٹین بیک نے ایسے موضوع کو اپنایا جو دولت مند امریکیوں پر ایک زبردست چوٹ تھی۔ کیا کسی بے کس اور مجبور انسان کے مسائل کے بارے میں لکھنا اشتراکیت کا پرچار تھا؟ کیا واقعی Oklahama کے کسانوں کی حالت اتنی ہی بری تھی جتنی کہ اسٹین بیک نے لکھی تھی؟ سرکاری حکومت تک جب یہ ناول پہنچا تو اس نے فوراً ایک کمیشن مقرر کیا جسے صحیح حالات پر روشنی ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں خوب مضامین لکھے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان مفلوک الحال کسانوں کے دن پھر گئے۔ یہ اسٹین بیک کی بہت بڑی فتح تھی۔

"گریپس آف راتھ" کے بعد اسٹین بیک نے اور بہت سے اچھے ناول، ڈرامے اور کہانیاں لکھیں۔ اس کے کئی ناولوں کی بڑی کامیاب فلمیں بن چکی ہیں اور ان کے دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ "گریپس آف راتھ" پر اسے ۱۹۴۰ء میں پولٹزر پرائز مل چکا ہے اور اب اسے ادب کا نوبل پرائز ملا ہے۔ یہ چھٹا امریکی ہے جسے اس عظیم اعزاز کا مستحق سمجھا گیا۔

اس کی بعض دیگر مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

"آف مائس اینڈ مین"۔ "کینیری رو" (Cannery Row) "دی مون از ڈاؤن" جس کا کینوس جنگ کے زمانہ کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جس پر نازیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ "سویٹ تھرسڈے" ایک نہایت دلچسپ تصوراتی کہانی The Short-Reign of Pippin IV
اور "ٹریولز وِتھ چارلی ان سرچ آف امریکہ" (Travel with Charlie in search of America) یہ ایک طنزیہ ناول ہے جس میں مصنف اپنے پالتو کتے کے ساتھ ان اقدار کی تلاش میں شہر شہر، قریہ قریہ، گھومتا پھرتا ہے، جنہوں نے کبھی امریکہ کو ایک عظیم ملک بنایا تھا۔ یہ ایک عظیم Symbolic تصنیف ہے جسے اسٹین بیک نے اپنے دلچسپ انداز بیان سے سیدھی سادھی کہانی کا روپ دیا ہے۔

اسٹین بیک چھٹا امریکی ادیب ہے جسے نوبل پرائز ملا ہے۔ اس سے پہلے ولیم فاکنر، ارنسٹ ہیمنگوے، پرل بک، سنکلیر لوئس اور مشہور ڈرامہ نویس یوجین اونیل کو یہ عظیم اعزاز مل چکا ہے۔ ان میں سے اب صرف پرل بک زندہ ہیں اور نہ جانے کیوں اب انہوں نے چین کے بارے میں لکھنا بھی کم کر دیا ہے۔ شاید اسی لئے ان کے فن میں وہ گہرائی نہیں رہی جس نے کبھی "گڈ ارتھ" جیسی اچھی تصنیف کو بے پناہ شہرت بخشی تھی۔ اسٹین بیک برابر لکھ رہے ہیں اور ان کے فن میں آج بھی بڑی گہرائی ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو فنکار کو زندہ جاوید کر دیتے ہیں۔

اختر انصاری دہلوی

یہ تو ظاہر ہے کہ عرضِ مدعا ممکن نہیں
اپنے دل کو چیر کر رکھ دوں، یہ ناممکن نہیں

ہم سے بے بس خود کو بدلیں اے خدا ممکن نہیں
تو بدل ڈال اپنے آئیں تجھ سے کیا ممکن نہیں

محشرستاں جن کے سینے، صورِ محشر جن کے سانس
حشر کا دیکھا کریں وہ آسرا، ممکن نہیں

اپنی دنیا آپ ہی پیدا کروں میں تو سہی
سایۂ گردوں میں ہو میرا بھلا ممکن نہیں

دِل پہ جو گزری تلافی اُس کی کر سکتا ہے کون
خوں بہائے آرزوئے بے بہا ممکن نہیں

توبہ توبہ زخمِ دل کی چارہ جوئی اور میں
روند ڈالوں خود ہی اپنا گُل کدہ ممکن نہیں

کیوں نہ اختر اِس کو روحِ زندگانی مان لوں
بخش دے دل کو یہ سوزِ جاں گزا ممکن نہیں

ڈاکٹر سید صفدر حسین

تھوڑا سا کیف لے کے کسی کی نگاہ سے ۔۔۔ آگے ہے شوق قافلۂ مہر و ماہ سے

افسانۂ کلیم بڑی بات تو نہیں ۔۔۔ جب چاہیں آپ آگ لگا دیں نگاہ سے

وہ ضبطِ غم کا حوصلۂ مستقل کہاں ۔۔۔ عادت بدل گئی کرم گاہ گاہ سے

دنیا ہمیں بھی لا کے رہی اپنی راہ پر ۔۔۔ ہم بچ کے لاکھ بار چلے رسم و راہ سے

اے عقل تیری راہ میں آسانیاں سہی ۔۔۔ اپنا سفر مگر ہے محبت کی راہ سے

میرا گلہ نہ کیجئے، اپنے کو ایک دن ۔۔۔ آئینہ لے کے دیکھئے میری نگاہ سے

غصے کو لاکھ آپ نے عنوان تو دیئے ۔۔۔ دل بول اُٹھا مگر نگہِ بے پناہ سے

افلاک پر ستاروں کی افشاں بکھر گئی ۔۔۔ نکلی جو اک شعاع تری جلوہ گاہ سے

ہونے لگی ہے ہوش میں دیوانگی شریک ۔۔۔ کچھ فیض مل گیا ہے تمہاری نگاہ سے

پابوسیٔ نظر سے سُنائے ہیں رازِ عشق ۔۔۔ اکثر زباں کا کام لیا ہے نگاہ سے

گو ڈال دی غرور نے چلمن عتاب کی ۔۔۔ شوخی مگر رُکی نہ تمہاری نگاہ سے

جُھکتی نہیں ہے اب کسی چوکھٹ پہ یہ جبیں ۔۔۔ نازِ سجود پا کے تری بارگاہ سے

جب سے ملی ہے مُنھ پہ تری رہگذر کی خاک ۔۔۔ دامن خراج مانگتا ہے گردِ راہ سے

نازاں ہے شیخ عصمتِ دامانِ زہد پر ۔۔۔ واقف نہیں ہے عظمتِ ذوقِ گناہ سے

یہ سجدۂ وفا ہے نمازِ حرم نہیں ۔۔۔ اک بار جُھک کے سر نہ اُٹھا سجدہ گاہ سے

سُلجھا دوں لاؤ شیخ و برہمن کی کشمکش! ۔۔۔ رشتہ ملا دوں ان کا تمہاری نگاہ سے

کیا دے سکیں گی مجھ کو فسوں سازیاں فریب ۔۔۔ میں دیکھتا ہوں نبضِ دو عالم نگاہ سے

نازاں ہے حُسن شعبدۂ آب و رنگ پر ۔۔۔ ہے بے خبر کرشمۂ ذوقِ نگاہ سے

رُسوائیوں کے خوف سے لب بند ہیں مگر
صفدر تمھیں پُکار رہا ہے نگاہ سے

حافظ لدھیانوی

○

کوئی نظر بھی اُٹھ نہ سکی جلوہ گاہ میں
زنجیر کس نے ڈالدی موجِ نگاہ میں

کیوں پا شکستہ بیٹھ گئے رہروانِ شوق
کانٹا کوئی ضرور ہوس کا تھا راہ میں

میخوار جس کو دیکھتے ہی جھومنے لگے
کیا چیز تھی چھپی ہوئی ابرِ سیاہ میں

پیہم رہے تعلقِ خاطر تو بات ہے
کیا لطفِ زندگی ستم گاہ گاہ میں

جسکو کسی بھی دَور میں آتا نہیں زوال
ایسی بھی زندگی ہے ہماری نگاہ میں

حافظ جو کوئی آئے تو محسوس بھی کرے
کیا وسعتیں ہیں اِس دلِ حسرت پناہ میں

بشیر بدر

ضروری نہیں سب سنیں عرضِ غم ‏ ‏ خدا پھر خدا ہے صنم پھر صنم
میں کب چاہتا ہوں مئے انگبیں ‏ ‏ مجھے زہر دے دیں وہ دستِ کرم
کئی سال بعد آج ایسا ہوا ‏ ‏ بڑی دیر تک خود کو یاد آئے ہم
کئی اہلِ ایماں کے ایماں گئے ‏ ‏ جو کافر نے کھائی خدا کی قسم
پلک جھپکی اور کھو گئے خاک میں ‏ ‏ بڑی دیر سے تھے نگاہوں میں ہم

یہاں - بدرؔ صاحب کا کوئی نہیں
کوئی اور گھر اے غمِ محترم

محمود شام

○

پیڑوں کی چھاؤں جب گھنی تھی
اپنی کہیں نہیں ٹھنی تھی

اُجڑے گھروں کی خامشی میں
پنہاں عجیب راگنی تھی

ملتے تھے آدمی بھی کیا کیا
جب شہر میں رسمِ گل زنی تھی

در پر تھی نرم نرم دستک
دیکھا جو اُٹھ کے چاندنی تھی

بادل ابھی ابھی کھلے تھے
رنگت گھروں کی دیدنی تھی

جلوؤں میں جب نہائیں آنکھیں
دل میں غضب کی روشنی تھی

جب شام ڈھل رہا تھا سورج
لمحوں کی جان پر بنی تھی

ڈاکٹر احسن فاروقی

ناسور

ایک شہر کی ایک پتلی سڑک پر میں سر جھکائے ہوئے جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک معمولی آدمی دکھائی دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ وہ بالکل قریب آ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "لڑکی مانگتا ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا

"مطلب لڑکی۔ بیگم۔ جوان حسین جیسا چاہیے"

"مجھے شوق نہیں۔"

"شوق کیا بولتا ہے۔ تم ہم کو کوئی بھڑوا سمجھتا ہے۔ ہم ناجائز کام نہیں کرتا۔"

"پھر کیا کرتے ہو اور مجھے لڑکی کیسے دلاؤ گے"

"بالکل جائز طریقے۔ اللہ رسول کے طریقے سے۔ کوئی حرام بات نہیں"

"اچھا تم شادیاں کراتے ہو۔ مجھے ابھی شادی کرنے کا خیال نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ میں نے ابھی گھر بسانے کا نہیں خیال کیا"

"تو تم اپنا پسند کا لڑکی لے لو۔ ہم گھر بھی دلا دے گا۔" لڑکی جتنے پیسے کا چاہو لے لو۔ خرید کیا ہوا لڑکی حرام نہیں ہوتا۔ خدا نے جائز کیا ہے۔

"تم لڑکیاں بیچتے ہو؟"

"ہاں"

"مگر یہ تو قانون کے خلاف ہے"

"ہو انگریز حرامزادہ یہ قانون بناتا ہے۔ ہم انگریز نہیں۔ ہم نصاریٰ نہیں، کرسٹان نہیں۔

وہ نہ معلوم اور کیا کیا کہتا گیا اور میں ایک عجیب تعجب کے عالم میں آ کر اس کی باتیں سنتا گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں اک دم سے کہہ اٹھا "کہاں ہیں لڑکیاں دکھاؤ"

"آؤ" کہہ کر وہ آگے بڑھا اور میں اس کے ایک قدم پیچھے چلا۔ بہت سی گلیوں میں ہوتے ہوئے ہم ایک پرانے قسم کے پھاٹک پر پہنچے جو کسی وقت میں کسی رئیس کے محل کا پھاٹک ہوگا مگر اب بالکل شکستہ ہو گیا تھا۔ لکھوری اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر کا حصہ جو کبھی نوبت خانہ ہوگا گر چکا تھا۔ لوہے کے پٹ موجود تھے مگر وہ عرصے سے بند نہ کئے جانے کی وجہ سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ اس کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی مجھ کو ایک

الان دکھائی دیا جس میں آٹھ یا دس عورتیں تھیں"۔

میں نے پوچھا "یہی لڑکیاں ہیں"

"یہ بھی ہے۔ مگر یہ سستا مال۔ تمہارے لئے نہیں ہے۔ تم کو آگے اچھا مال دکھائے گا"

"نہیں میں ان کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان ہی میں کوئی اچھی ہو"

"آجا تو چلو" کہکر وہ مجھے اس دالان میں لے گیا

میری نگاہ پہلے ایک عورت پر پڑی جو ادھیڑ سن رسیدہ تھی اور ایک پلنگڑی پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ میں نے مڑکر پوچھا "ایسی بھی بکتی ہیں؟"

"بہت۔ ایسا ہی بہت بکتا ہے۔ دیہات والے لے جاتا ہے۔ گھر کا کام کرتا ہے اور سستا"

"کیا قیمت ہوتی ہے؟"

"قیمت کیا کروگے پوچھ کر۔ کل چار ایسا بیچا"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور لپک کر چلا گیا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے ایک آدمی کے ساتھ انگنائی میں آئیں۔ مکان والے آدمی نے اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر کچھ نوٹ آنے والے آدمی کو دیے وہ چلا گیا اور عورتیں جن کی تعداد اب میں نے گنی کہ پانچ تھی دالان میں آکر برقعے اتارنے لگیں۔ میں نے سب کو ایک نگاہ میں دیکھ لیا۔ سب سہمی ہوئی تھیں اور ایک تو نہایت گھنونی معلوم ہوتی تھی۔ ان سے ہٹ کر میری نگاہ دالان کے ایک کونے کی طرف گئی جہاں ایک چولہا تھا اور ایک لڑکی پھکنی سے چولہے کو پھونک رہی تھی۔ اس کا گول چہرہ مجھے اچھا معلوم ہوا اور میں اس کے پاس آیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رنگ کالا تھا آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ناک ذرا لمبی تھی۔ گال بھرے بھرے تھے۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اس نے آنکھوں کو اوپر کی طرف ٹیڑھا کرکے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

"یہ لڑکی پسند آیا" مالک کی آواز میرے کان میں آئی۔ میں نے اس کی طرف رخ کیا۔ وہ کہے گیا "یہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ چھ ہم ان سب میں اچھا مال یہ ہے" اور وہ تخت پر پڑی ہوئی ایک لڑکی کو ہاتھ پکڑ کر اٹھا کے میری طرف گھسیٹتا ہوا لایا۔ یہ لڑکی سب میں نہ یاد کمسن تھی۔ وہ کہے گیا "بچہ ہے بالکل۔ جلدی شادی ہوگیا۔ دو بچہ ہوگیا۔ یہ سب میں اچھا"

میں نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرہ پر بھولا پن ضرور تھا مگر اس کی چھوٹی سی چپٹی ناک بڑی بری معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "نہیں مجھے وہی پسند ہے"

"ارے بابا غور سے تو دیکھ لے۔ یہ سب"

نئی آئی ہوئی پانچ لڑکیوں کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ میں نے ایک ایک نگاہ ان چھ پر بھی ڈالی جو وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں سے ایک بہت موٹی سی ایک کھٹیا پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بھدا تھا مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور عجیب انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ ایک دبلی نازک نازک تھی اور اس کے ہونٹوں کا انداز بہت پیارا تھا۔ باقی چار کسی طرح جاذب نظر نہ تھیں بلکہ ایسی بدصورت تھیں کہ دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میری نگاہ پھر اسی لڑکی پر واپس آئی جسے وہ آدمی ابھی تک پکڑے کھڑا تھا۔

"اس کے کیا دام ہیں؟" میں نے پوچھا

"دو سو روپیہ"

میں نے پلٹ کر چولہے کے پاس والی لڑکی کو دیکھا۔ وہ اسے بھی ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لایا اور دونوں کو پاس پاس کھڑا کرکے

"دیکھو کون اچھا ہے"

"اچھا اس کے دام کیا ہیں؟"

"اس کا بھی دو سو"

"واہ واہ" میں نے ہنس کر کہا "یہ سب سے اچھی بھی دو سو کی اور یہ تمہارے حساب سے معمولی بھی دو سو کی۔ ہماری پسند دیکھ کر دام بڑھا رہے ہو"

"دام میں پھرک نہیں ہے۔ مگر یہ اچھا ہے" وہ کہے گیا

مجھے بڑی ہنسی آئی

"چلو چلو۔ یہ سب تمہارے کام کا مال نہیں ہے۔ تمہیں اس سے اچھا دکھائے گا۔ بالکل جوان کوئی بچہ نہیں ہوا"

اور وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے دالان سے باہر آیا۔ ہم دونوں انگنائی پار کر کے دروازے سے نکلے۔ تھوڑی سی خالی جگہ پر گزرے اور پھر ایک اور بڑے مکان میں داخل ہو گئے۔ اس میں آمنے سامنے دو بڑے بڑے دالان اور در دالان تھے۔ اس نے مجھ سے کہا "تم ٹھیرو" اور لپک کر دالان میں گیا اور ایک بید کی کرسی اٹھا لایا اور بولا "تم اس پر بیٹھو۔ ہم سب کو ایک ساتھ تمہیں دکھا دیگا"۔

تھوڑی دیر میں اس نے ایک دالان میں دس لڑکیوں کی قطار کھڑی کر دی اور بولا "تم ان کو دیکھو" اور خود دوسرے در دالان میں چلا گیا۔ میں نے دسوں لڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ سب قبول صورت آدمی کا بچہ تھیں۔ سب تندرست تھیں۔ چار گوری تھیں مگر بھدی نظر آتی تھیں۔ ایک سانولی نک سک کی بہت ہی اچھی تھی۔ اس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ ناک سڈول تھی اور ہونٹوں کا خط بڑا دلکش تھا۔ میں نے اسے اور غور سے دیکھا۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں اور پھر نیچی کر لیں۔ میرا جی چاہا کہ اسے ضرور خرید لوں۔ اس کا جسم نہ بہت بھرا ہوا تھا اور نہ دبلا ہی تھا۔ ایسا ہی جسم مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔

میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ آواز آئی "ادھر دیکھو بابا"

میں دوسرے دالان کی طرف مڑا اور میری نگاہ ایک نہایت نازک گورے رنگ کی لڑکی پر پڑی۔ اس کے بال بڑے چمکدار تھے۔ اس کا لمبا منہ اور اس پر مناسب ناک اور آنکھیں عجیب کیف پیدا کر رہی تھیں۔ میری نگاہ اس پر کچھ دیر جمی رہی پھر اٹھ کر گیارہ لڑکیوں پر یکے بعد دیگرے پڑی جو اس کے ادھر ادھر کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کھلتے رنگت کی کافی موٹی بڑی جاذب نظر تھی۔ وہ آپ ہی آپ کھلی جا رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دیا۔ میری نگاہ پھر نازک لڑکی پر آ گئی۔ دونوں کا میں نے مقابلہ کرنا شروع کیا باقی کو ایک ہی نگاہ میں رد کر چکا تھا۔

"اب تم نے ان کو قطار میں کھڑا کیا ہے تو قیمت کے حساب سے کھڑا کرو۔ میں اپنی پسند نہ بتاؤں گا بس تم دام بڑھا دو گے"۔

"واہ بابا۔ واہ۔ ہم پر شبہ کرتا ہے۔ ہم پانچ وقت نماز پڑھتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔

"ارے میاں تم ان سب کو ایک لائن میں کھڑا کر دو اور دام کے حساب سے۔ ہم ان میں ایک ضرور لے لیں گے"

سانولی شرمیلی لڑکی پر میرا دل آ گیا تھا۔ میں اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ اور وہ بھی اپنی شرمیلی نگاہیں اب جلد جلد اٹھانے لگی تھی۔ مگر گورے رنگ والی نازک لڑکی کی طرف بھی کچھ نہ کچھ دل ضرور جھک رہا تھا۔ نازک عورتوں کی طرف میرا رجحان ہمیشہ سے تھا۔ کیا معلوم اس وجہ سے کہ پرانی داستانوں میں نازک معشوقاؤں کو قصوں کی ہیروئن بنایا گیا ہے یا پھر اس وجہ سے کہ ہمارے یہاں غزل کا معشوق نازک ہے۔ وہ آدمی ان کو ترتیب سے کھڑا کرنے میں مصروف رہا اور میں ایک سے دوسری کو دیکھ دیکھ کر سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں آیا کہ گوری نازک لڑکی کو

میرے ذہن کے روایتی رجحانات پسند کر رہے تھے۔ ساونلی شرمیلی لڑکی کو میری انفرادی پسند قبول کر رہی تھی۔

اتنے میں دونوں دالانوں میں لڑکیاں قیمت کے حساب سے قطاریں کھڑی کرکے وہ آدمی بولا " دیکھو بابا "

میں نے دونوں قطاروں پر نظر دوڑائی مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اس شخص کا معیار جس گورا رنگ اور موٹے جسم کے حساب سے ہے۔ دونوں قطاروں میں چھٹے نمبر تک کی لڑکیاں اس معیار کی پورے طور پر ترجمانی کر رہی تھیں۔ گوری نازک لڑکی اپنی قطار میں آٹھویں نمبر پر تھی۔ ساونلی شرمیلی لڑکی اپنی قطار میں نویں نمبر پر تھی۔ میں نے پوچھا " کم سے کم کیا دام ہے اور زیادہ سے زیادہ "

اس نے کہا " دو ہزار سے لیکر پانچ سو تک۔ اس سے کم نہیں "

" یہ بھی گڑبڑ بات ہے۔ پھر وہی گڑبڑ ہوگی جو ابھی ہو چکی ہے "

" تم کسی کا قیمت پوچھو ہم بتائے "

" تم سب کا قیمت بتاتے چلو۔ ہم جس کو چاہیں گے لے لیں گے "

وہ ہر ایک کی قیمت بتاتا گیا اور میری طرف دیکھتا گیا۔ گوری نازک لڑکی کی قیمت اس نے آٹھ سو بتائی۔ پھر دوسری قطار میں ساونلی شرمیلی لڑکی کی قیمت چھ سو بتائی۔ میں نے ان ہی قیمتوں کو توجہ سے سنا۔ اس اثناء میں مجھے محسوس ہوا کہ گوری نازک لڑکی کے چہرے پر کچھ پیلاہٹ تھی۔ " اسے کچھ مرض ہے " میرے دل نے کہا۔ میں نے طے کر لیا کہ اس کو نہ لونگا۔ اب میں نے ساونلی شرمیلی لڑکی کو پھر دیکھا وہ اور بھی زیادہ اچھی معلوم ہوئی۔

" اس کی چھ سو ہی قیمت ہے ؟ " میں نے پوچھا

" او کیا بابا " وہ اکدم سے بولا مگر مجھ کو دیکھ کر " نہیں بابا چھ سو نہیں سات سو۔ دیکھتے ہی ہو تندرست مال ہے تم کو جب لگتا ہے نمکین، ساونلی سلونی سکھی "

" پھر تم لگے گڑبڑ کرنے لگے " اور میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا " تم سے سودا نہیں ہوگا یار "

" اچھا اچھا۔ وہ بولا۔ فرسٹ کلاس مال تو دیکھ لو۔ پھر سودا کرنا "

میں اس کے ساتھ چلا۔ ساونلی شرمیلی لڑکی سچ مچ میرے دل میں کھپ گئی تھی۔ اب تک میں اس آدمی کے ساتھ محض تفریحاً چلا آیا تھا اور میں لڑکی خریدنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ مگر اب اسے کسی قیمت پر ضرور لے لینا چاہتا تھا اور پھر اس کی قیمت بھی کل چھ سو روپیہ تھی۔ اس کے تصور میں محو ہو کر میں یہ بھی بھول گیا کہ کہاں جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اکدم سے میں ایک کشادہ شکستہ محل میں آگیا جس میں ایک بڑا چبوترا تھا اور اس کے بعد محرابوں دار بارہ دری تھی چبوترے پر ایک درجن بالکل چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک ننھی چھوٹی لڑکی چبوترے کے پیچھے تھی۔ چبوترے کے اوپر والی لڑکیاں نیچے اتریں اور نیچے والی لڑکی کو متوجہ کرتیں۔ جب وہ انہیں پکڑنے دوڑتی تو پھر ہنس کر چبوترے پر چڑھ جاتیں۔ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ " اونچی نیچی " کا کھیل کھیل رہی تھیں۔

ان کے مالک نے چبوترے کے قریب پہنچ کر کہا " کیا کھیل لگایا ہے۔ چلو۔ چلو "

لڑکیاں ڈر کر محرابوں والی بارہ دری میں بھاگ گئیں۔ وہ شخص چبوترے پر آگے آگے چلا میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں بارہ دری کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی محرابوں پر مینا کاری کے کہیں کہیں نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ اوپر کے کنگورے سب گر چکے تھے لکھوری اینٹیں ہر جگہ دکھائی دے رہی تھیں۔ " آثار کہ رہے ہیں عمارت قدیم ہے " میں نے دل میں کہا۔ وہ شخص بائیں کنارے کی محراب کے پاس پہنچا جس

کی اسٹولیں لے آیا اور چبوترے پر رکھ کر بولا "بیٹھو صاحب"۔ "کچھ چائے پانی ہو جائے"
میں بیٹھ گیا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں محرابوں کے پیچھے سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ سب پیاری پیاری تھیں۔ ان کو عورت
بنانے کے لئے لینا ان پر ظلم کرنا تھا۔

وہ آدمی باہر آیا۔ ایک لڑکی کو متوجہ کر کے بولا "جا جا۔ گجو سے کہو چائے لائے۔ دو پیالی"
چار پانچ لڑکیاں چبوترے پر بھاگتی ہوئی ادھر کی طرف گئیں جدھر سے میں آیا تھا
"یہ تو بہت چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں" میں نے کہا
"اور باکرہ لڑکی چھوٹا سی ہوگا تو کیا بڑا ہوگا"
"میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ابھی اس قابل نہیں ہیں۔۔۔"
"تم لوگ" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "انگریزی پڑھ کر یہ معلوم کیا بولتا۔ ہے بابا۔ یہ تازہ مال بڑھا ئیس زمیندار ہی کہتا
"مگر یہ تو ابھی جوان بھی نہیں ہوئیں"
"او، تم کیا بولتا ہے۔ عورت ادھر نو برس کا ہوا اندر مرد کا ہاتھ لگا بس جوان ہو جاتا"
"گرم ملک میں نو برس میں جوان ہوتی ہوگی یہاں اٹھارہ برس سے کم کی جوان نہیں ہوتی"
"یہ تمہارا انگریز تمہیں پڑھایا۔ جھوٹا۔ وہ تو بولتا بیس برس ادھر جوان نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں بولتا ہے تیسی اور گیسی"
"تو یہاں بھی یہی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں"
"نہیں۔ ان سے بڑا بھی ہے۔ اندر ہے۔ اندر۔ بابا ان کا بڑا احتیاط کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا گارنٹی ہے۔ دیکھ لو خود دیکھ لو بابا ادھر
ہے۔ تمہیں پہچان نہیں ڈاکٹر کو دکھا لو"
"اچھا تو جب تک چائے آئے مجھے تم ان بڑی لڑکیوں کو دکھا دو"
"او۔ وہ دیکھو وہ آ گیا۔ اب چائے پی کے دیکھنا"

میں نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کھیلتی ہوئی چلی آ رہی تھیں اور ان کے پیچھے وہی عورت جس کو میں نے چولہا پھونکتے دیکھا تھا ایک
کشتی میں چائے کی دو پیالیاں رکھے ہوئے آ رہی تھی۔ لڑکیاں بارہ دری کے اندر چلی گئیں۔ وہ عورت ہم لوگوں کے پاس آئی کشتی کو پہلے
میرے سامنے جھکایا میں نے پیالی اٹھائی اور اس کو غور سے دیکھا۔ وہ مجھے اب اور بھی اچھی معلوم ہوئی۔ پھر اس نے اپنے مالک کے
سامنے کشتی کی۔ اس نے بھی پیالی اٹھالی۔ وہ خالی کشتی لئے ہوئے چلی گئی۔ میں چائے کے گھونٹ پیتا ہوا سوچتا رہا کہ گھریلو کاموں کے لئے
یہ لڑکی بڑی اچھی رہے گی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص شاید اسی وجہ سے اس کو علیحدہ نہیں کرنا چاہتا کہ یہ اس کا سارا گھر سنبھالے ہے۔

"یہ لڑکی تو میں خرید ہی لوں مگر تم دو سو روپیہ بہت مانگتے ہو" میں نے چائے کی پیالی کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ لو۔ یا دوسرا لو۔ دو سو سے کم نہیں ہو سکتا۔ بابا۔"
"اگر ڈیڑھ سو تو ابھی دے دوں"
"نہیں بابا ایک بات"
"مگر یار میں اسے گھر لے جاؤں اور کل کوئی آدمی آ کر کہے میری جورو ہے اور پولیس بلا لائے تو کیا ہوگا"
"او ہو۔ بابا پولیس۔ پولیس کیا بولتا۔ پولیس والا ہمیں یہ لڑکی دے جاتا ہے۔ ان کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بولے۔ تم

لڑکیوں کا بیوپار ہوتا ہے، بڑا کھڑا ہوا اور لڑکی کو اس کے ساتھ کردیا۔ میں لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ لڑکی کو باہر پہنچا کر آیا اور بولا "اب وہ چڑیا تو اُڑ گیا۔ اب تم بتائے کیا لے گا"

"میں کوئی نہ لوں گا" میں نے کہا۔

"تو ہمارا وقت بیکار خراب کیا۔ تم پڑھا لکھا آدمی سب ایسا ہوتا ہے۔ کبھی اُدھر کبھی اُدھر۔ آخر میں نہیں بول دیا۔ دفتر کا لوگ ایسا ہوتا ہے۔ تم کو اسکول میں یہی پڑھایا جاتا ہے"

اس کی یہ بات مجھے تیر سی لگی میں نے کہا "اب میں یہاں سے ایک لڑکی لے کر ہی جاؤں گا"

"اب تم بولا آدمی کے موافق"

"اچھا ایک تو وہ جو چائے لائی تھی۔ دو سو روپیہ اور ایک وہ جس کو چھ سو کا تم نے کہا تھا"

"چھ سو نہیں سات سو"

"اب بات نہ بدلو۔ چھ ہی سو ہوں گے۔ تم پڑھے لکھوں کو تو کہتے ہو اور اپنے کو نہیں دیکھتے کہ اتنی جلدی بات پلٹ دیتے"

"اچھا بابا۔ آٹھ سو میں دونوں لے جاؤ۔ اور اگر ڈھائی ہزار خرچ کرسکتے ہو تو سترہ سو میں ہم ان بالکرد میں سے بھی ایک دے سکتا ہے۔ جو تم پسند کرو۔ ہاں لینا اپنے موافق"

نہیں یہی دو لوں گا، ایک کام کرنے کے لئے اور ایک نکاح کے لئے۔

"تو نکالو پیسہ"

"میرے پاس اس وقت تیس چالیس روپیہ جیب میں پڑے ہیں۔ مگر ابھی بینک کا وقت ہے۔ تم میرے ساتھ ان دونوں کو لیکر چلو روپیہ لے لو۔ ان کو میرے ساتھ کردو"

"ایسا بابا ہم کبھی نہیں کیا۔ ہم گاڑی منگاتا ہے تم، روپیہ لے کر آؤ اور دونوں کو لے جاؤ"

"اگر اسی گاڑی میں تم اور وہ دونوں بیٹھے میرے ساتھ چلے چلیں گے تو کیا ہوگا۔ میں یہاں واپس آکر کیا کروں گا۔ تم پیسے لے کر چلے آنا۔ میں اپنے گھر چلا جاؤں گا"

"تم ہم سے نئی بات کراتا ہے" کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر منہ پر ہاتھ پھیرا اور مجھے دیکھا۔ پھر خاموش رہا اندر گیا کوٹ پہن کر آیا اور دروازے کا تالہ لگاتے ہوئے بولا۔ اچھا بابا جو تم بولا وہی کرے گا چل"

کوثر چاندپوری

نشیب و فراز

بلن بھیا ادھیڑ عمر کے خوبصورت آدمی تھے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ نئی اور پرانی تہذیب کا سنگم تھے ان کی ظاہری وضع
ہدت اور قدامت دونوں کا اظہار ہوتا تھا ، منڈی ہوئی داڑھی ، چھوٹی چھوٹی مونچھیں ، آنکھوں پر سنہری کمانی کا فری سائز چشمہ ، سر
ریزی بال اور ان کے درمیان سیدھی مانگ جو خلوص اور مامتا کے درمیان کھنچی لکیر کا حق ادا کرتی تھی ۔ چوڑے پائنچوں کا غرارہ نما پاجامہ ،
ایک ململ کا کرتہ ، جس کے گریبان اور کندھوں پر خوشنما بیل ٹکی رہتی تھی ، کرتے کے اوپر صدری ، ان کا رنگ بہت گورا چٹا تھا ، بال ہلکے سنہری
اور آنکھوں میں آسمان کی سی نیلاہٹ جھلکتی تھی ، جب وہ سیاہ یا بلو سوٹ پہن لیتے اور سر پر ہیٹ لگا لیتے تو بالکل انگریز معلوم ہوتے
ق اور عادات میں ندرت بھی تھی اور انفرادیت بھی ، اپنے اصول کے بہت پابند تھے ، مشہور تھا کہ ان کے ہاتھ میں جنت رہتی ہے دوسرے
دوزخ ، کمال یہ تھا کہ جنت کی ٹھنڈی ہوائیں دوزخ کے انگاروں کو کبھی نہ بجھا سکیں اور جہنم کی گرمی ، فردوس بریں کی خنکی کو گرمی میں نہ
سکی ، انھوں نے دس بارہ سال تک انجینئری کے محکمہ میں نوکری کی تھی ، اس زمانہ میں جہنم خوب دہکتا رہا تھا ۔ چالیس برس کی عمر میں
مت چھوڑ کر ٹھیکیداری شروع کر دی تھی ، پہلے سڑکیں اور پل بناتے رہے تھے ۔ ان کے بنائے ہوئے پل پہلی ہی برسات میں بہہ جایا
تے تھے ۔ اس لئے انھوں نے عمارتوں کے ٹھیکیداروں میں اپنا نام رجسٹرڈ کرا لیا تھا ۔ جب عمارتوں کے متعلق انھوں نے ٹپکنے کی شکایت
تو اس دھندے کو بھی چھوڑ دیا ، یوں تو چھتوں کا ٹپکنا ٹھیکیداروں کے لئے بدنامی کا باعث نہ تھا ، کیونکہ ٹھیکیداروں کی بنائی ہوئی
ی چھتیں ٹپکا کرتی ہیں مگر بلن بھیا کی ٹھیکیداری میں بنی ہوئی بلڈنگس بارش تھمنے کے چھتیس ۳۶ گھنٹے بعد تک مینہ برساتی رہتی تھیں ، ان کے
دوست نے بہت کہا کہ دیواروں کو آپ مکمل کر دیا کریں ، چھتیں میں ڈال دیا کروں گا ، لیکن بلن بھیا راضی نہ ہوئے ، وہ نوحہ گر کو ساتھ رکھنے
مقدور رکھتے ہوئے بھی رونا یا رُلانا پسند نہ کرتے تھے ، وہ اپنے وطن چلے آئے ، جس وقت انھوں نے ٹھیکیداری چھوڑی ہے ان کا
بینک بیلنس تین لاکھ سے کچھ اوپر ہی تھا ، اور دو آدمیوں کے لئے اتنا سرمایہ بہت تھا ، اولاد کوئی تھی نہیں ، البتہ باپ کہلانے کی آرزو ہر وقت
دل میں دھڑکتی رہتی تھی ، کبھی کبھی کوئی طاقت بخش مرکب بھی کھا لیا کرتے تھے ، جاڑوں میں انڈوں کا حلوا اور مربہ ہی کھایا کرتے تھے ، مگر تے
بلن بھیا نے دل بہلانے کے لئے بہت سے کبوتر پال لئے ، کبوتر بازی کا انتخاب کرنے میں عجلت اس لئے کی گئی کہ بعض لوگ شطرنج کھیلنے
ترغیب دے رہے تھے ، بعض فلیش کھیلنے کی ، اور کچھ ایسے بھی تھے جو شکار کو اس عمر کا بہترین مشغلہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے ، بلن
بھیا نے اپنے باپ دادا کی تاریخ زندہ کرنے کے لئے کبوتر پال لئے اور بلیوں کا شکار کرنے لگے ، کبوتر بازی سیدوں کے اس خاندان کی تاریخی
خصوصیت ہے ، جس کی نمائندگی کا بوجھ اب بلن بھیا کے کندھوں پر آ پڑا تھا ، جلد ہی پڑوس والوں کو معلوم ہو گیا کہ بلن بھیا بلیوں سے
[illegible] کرنے لگتے ہیں ، محلہ کے ایک [illegible] والے نے ان کے مقابلہ کی [illegible]

اعلان کردیا کہ وہ شکستہ جمع کر رہا ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان کبوتروں پر جھپٹ کر خون گرم رکھنے کی مشق کریں گے۔ یہ سن کر بلن بھیا گھبرائے اور انھوں نے کچھ روپے دے کر دادا کو شکرے پالنے سے روک دیا اور آئندہ بلیوں پر بندوق نہ چلانے کی قسم کھائی۔

بلن بھیا کا مکان عرصہ سے بینک کا کام دے رہا تھا۔ آس پاس کی بڑی بوڑھی عورتیں محنت مزدوری کرکے دس بیس روپے اکٹھا کرتیں تو انھیں اسی بینک میں رکھ آتیں، اسی طرح ایسے بیمار جنھیں بچنے کی آس نہ رہتی اپنا سارا اندوختہ لے کر چھوٹی اینٹوں سے بنے اسی دومنزلہ مکان ہی کا رخ کرتے جس میں سو سال پہلے بلن بھیا کے دادا میر علی نقی رہا کرتے تھے، فیروزہ کی تسبیح ان کے گلے پڑی رہتی تھی، انگوٹھیوں پہ یاقوت اور فیروزے کے بڑے بڑے نگ جڑے رہتے تھے اور سرہانے ان کا وہ شجرہ لٹکا رہتا تھا جس میں تمام بڑے بڑے اماموں کے نام بہت خوشخط لکھے ہوئے تھے، میر علی نقی کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کے راستے جنت سدھارے تو بلن بھیا کے والد سید موسیٰ رضا اس کے مالک ہوئے اور سب بھائیوں نے ان کی خلافت تسلیم کرلی، وہ بھی امانت داری کے فرائض ادا کرتے رہے، اب چار سال سے بابو سید علی رضا عرف بلن بھیا ان پرانی روایات کے محافظ تھے۔ جو اس محل سے وابستہ چلی آرہی تھیں وہ داڑھی منڈاتے تھے، سوٹ بھی پہنتے تھے، انگریزوں کے ساتھ ڈنر میں بھی شریک ہو جایا کرتے تھے، نماز روزے سے دور بھاگتے تھے لیکن محلہ والے پھر بھی انھیں امین ہی سمجھتے تھے اور آج بھی لکڑی کی اس پرانی الماری میں ہزاروں روپے کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ہر خانے پر کاغذ کی چٹ لگی ہوئی تھی جس پر کسی نہ کسی کا نام لکھا ہوا تھا۔

رحمت اللہ ولد نصیب اللہ ـ چاندی کے دو جوڑ بٹن

بھوری بیوہ اللہ دیا — ایک عدد کرندا نقرئی شکستہ

جمانا بالغ ولد نتھو تیلی — پچیس کلدار نقد

تلسا پنڈتائن — چوڑی طلائی ایک عدد

الماری میں جتنے خانے تھے ان پر اتنی ہی چٹیں تھیں، امانتوں کی طرح کبوتروں کا بھی اس محل سے تاریخی تعلق تھا۔ سو دو سو کبوتر ہمیشہ بانس کی بنی ہوئی بڑی بڑی کابکوں میں بند رہا کرتے تھے، ان میں ہر نسل کے کبوتر ہوا کرتے تھے، گولا، شیرازی، شاہ جہاں پوری، چور، کوٹیا، یاہو کے جوڑے یہاں تک کہ نامہ بر کبوتروں کی نسل کے بھی چند جوڑے اب تک محفوظ چلے آرہے تھے، فجر کی اذان کے وقت یاہو کے جوڑے 'یاہو' 'یاہو' کا ذکر کرتے تو در و دیوار پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور رحمت سی برستی محسوس ہوتی۔ لال چونچ، سرخ پنجوں اور لہو کے رنگ کی نیلی آنکھوں کے "لکھ نیا" سفید براق پروں میں چھپے مصحفی کے مرغانِ ذوالجناح کی طرح پانی سے بھرے کونڈے کے آس پاس غٹرغوں کرتے تو خود بلن بھیا جھوم جاتے، بلن بھیا کا روپیہ بینک میں رہا کرتا تھا اور زیورات کے لیے بھی انھوں نے ایک تجوری لے رکھی تھی لیکن بیماروں اور بوڑھی عورتوں کا بینک خود ان کا گھر تھا، اور موجودہ زمانہ میں اس کے چوکیدار بلن بھیا۔ جو ذرا سے کھٹکے پر رات کو جاگ جاتے اور 'یا علی' 'مولا علی' 'مشکل کشا علی' کا ورد کرتے، ایک ایک خانہ کو لیمپ کی روشنی میں دیکھتے تھے — کوئی دراز کھلی تو نہیں! — کسی خانے کی امانت تو کوئی نہیں نکال بھاگا!

وہ مذہبی خیال کے آدمی نہ تھے، محرم کو کھچڑا تک نہیں پکاتے تھے۔ کونڈے کھانے بھی کہیں نہ جاتے تھے، چند روایات کے پابند ضرور تھے، ان میں سے ایک روایت "امانت" کی تھی جس کی تاریخ ان کے خیال میں اس شجرے کی طرح لمبی اور معتبر تھی جو اب تک میر علی نقی کی چوکی کے قریب ٹنگا، خاندان کی اصالت اور نجابت کی گواہی دے رہا تھا۔ امانت رکھنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا جس وقت دیوان خانے میں آکر کوئی شخص دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتا، بلن بھیا [illegible]

ہکر الماری میں رکھ آتے، یا کوئی امانت لوٹانے کی ضرورت ہوتی تو الماری سے نکال کر آنے والے کے حوالے کر دیتے۔ دروازے
ب طرح کی زنجیر عدل تھی، اس کا بجنا فریادی کے آنے کی علامت تھی، اسے سُن کر ان کا باہر آنا لازمی تھا۔ بلّن بھیا کی کیفیت
ہ کبوتر اڑانے میں مشغول ہوں یا انھیں جگانے میں یہاں تک کہ کھانے کی میز پر بھی ہوتے تو فوراً باہر جا کر امانت لیتے اور اسے
بس جاتے اور الماری پر لانے والے کے نام کی چٹ چپکا دیتے، یا کوئی چیز واپس کرنے کی صورت میں احتیاط سے اس کے نام کی
ھتے، پھر دراز کھولتے اور کپڑے میں بندھا زیور یا روپیہ اسی طرح اٹھا لاتے اور اصل مالک کے حوالے کر دیتے۔
ایک مرتبہ ۱۱ بجے رات کو زنجیر کی آواز کانوں میں آئی، بلّن بھیا کو بخار چڑھا تھا، سر میں سخت درد تھا اور سیدانی سرہانے
ل شفا سونگھا رہی تھیں، سردی بہت شدید تھی، برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں، وہ اوور کوٹ پہن کر باہر جانے کے لئے
ے تو سیدانی نے روکتے ہوئے کہا،
"بدن پسیج رہا ہے، ٹھنڈی ہوا لگ گئی کہیں دشمنوں کو تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"
بلّن بھیا بولے "کچھ بھی ہو زنجیر کی آواز سُن کر میں یہاں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ میری ذمہ داری بہت نازک ہے بیگم!"
انھوں نے کمرہ کھولا اور صحن میں آ گئے پھر ڈیوڑھی سے گذر کر باہر نکلے، وہاں لالٹین ہاتھ میں لئے کوئی کھڑا تھا۔

"کون ہے؟" انھوں نے پوچھا
"میں ہوں جی تمہارا گُلام" (غلام)
"نام بتاؤ کون ہو؟"
"آپ کی رعایا، بندو جلاہا!"
"اچھا بنیاد علی!"

ایک چھوٹی سی کالونی محل کے پیچھے بسی ہوئی تھی۔ اس میں جلاہے رہا کرتے تھے۔ کرائے کے نام سے ان میں سے کسی نے
ک بلّن بھیا کو ایک پائی تک نہ دی تھی، ان کا کام صرف یہ تھا کہ بلّن بھیا کے یہاں پرانے لحافوں اور گدوں میں سے جو روئی نکلتی
ے کات کر دری، چوہی، کھیس یا نواڑ بن دیا کرتے تھے اگر کوئی شدید ضرورت آ پڑتی تو بلّن بھیا ان میں سے کسی تیز رو جلاہے کو
ئی خط تھماتے ہوئے کہتے۔
"جمن ابھی بجنور چلے جاؤ یہ پرچہ رائے صاحب وکیل کو دے آؤ!۔ خبردار راستہ میں کہیں رکنا نہیں۔ حقہ کا دم لگانے
نہ ٹھہرنا۔ بس کتے کی چال چلے ہی جانا۔ پنشن کا خط ہے، خزانہ بند ہونے سے پہلے مختار کو مل جانا چاہیئے۔"
اور جانے والا ان کے حکم کی پوری تعمیل کرتا۔ پھر کبوتروں کو اب سدھایا نہیں جا رہا تھا وہ صرف دانہ چگنے اور ہوا میں
ب لگانے اور قلابازیاں کھاتے ہی رہ گئے تھے۔ ان کے فرائض اس کالونی میں رہنے والے جلاہے انجام دے رہے تھے اور
یروں ہی کے بیس بیس میل اڑا کرتے تھے، اور اس طرح بلّن بھیا کا ایکسپریس ڈیلیوری خط جلد سے جلد مکتوب الیہ کو
جاتا تھا۔

"کیسے آئے اس وقت؟" بلّن بھیا نے اوور کوٹ کی جیبوں میں کہنیوں تک ہاتھ ٹھونس کر پوچھا۔
"گہنا لایا تھا رکھنے کو!"
"اس وقت ...؟"

"جی ہاں چھاتی میں درد ہو رہا تھا، بڑے زور کا سانس اٹکنے لگا تو سوچا کہ صغیرن کا یہ گہنا میاں کو دے آؤں!"

"دکھاؤ کیا ہے؟"

بندو نے کپڑے کی جالی دار تھیلی میں سے چاندی کی ایک ہیکل، دو چوڑیاں اور ایک جوڑ جھانجن نکال کر سامنے ڈال دیں۔

"یہ ہیں میرے میاں!

"اتنی چیزیں تو تیری کٹھیا میں ہی پڑی رہتیں۔"

"سرکار کو معلوم ہے کہ صغیرن کی ماں مر چکی ہے، سوتیلی ماں پر بھروسہ نہیں کل کو ایسی ویسی ہو جائے تو نہ جانے کس کا تھامے، میں چاہتا ہوں کہ صغیرن کا بیاہ ہونے لگے تو آپ خود اپنے ہاتھ سے یہ چیزیں اسے پہنا دیں۔"

بلّن بھیا نے منہ سے کچھ نہ کہا، تھیلی لے کر دروازہ بند کر لیا۔ بندو لالٹین ہلاتا اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے دل کا سا یا بوجھ اتر گیا لگے روز شام کو وہ دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ صغیرن کی سوتیلی ماں جمیلہ نے گھر کا کونہ کونہ کھود ڈالا اور ایک صندوق چھان مارا، زیور کہیں نہ ملا تو اس نے صغیرن کو مار پیٹ کر کے معلوم کر لیا کہ سب چیزیں بلّن بھیا کے یہاں رکھی ہیں، جمیلا سی بلّن بھیا کے پاس گئی وہ دونوں ہاتھوں میں کبوتر لئے کھڑے تھے اور انھیں اوپر اچھالنے ہی والے تھے کہ جمیلہ نے ماتھے پہ پورا ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور پھر دعائیں دینی شروع کر دیں۔

"اللہ میرے میاں کو جیتا رکھے، ہزاروں برس کی عمر، مولا علی مراتبہ (مرتبہ) دونا کر دیں۔"

"کیسے آئی بندو کی گھر والی؟"

"اجی انھوں نے گہنا دیا تھا آپ کو وہ لینے آئی ہوں، تم جانو روٹی دینی پڑے گی برادری کو اس میں نٹو سے کیا کم خرچہ ہوگا۔

پھر؟ بلّن بھیا نے آسمانی دھنی ہوئی کبوتروں کی ایک ٹولی کو دیکھتے پوچھا، جو تاروں کی طرح آکاشں کی نیلاہٹ: بکھری ہوئی تھی۔

"اسی گہنے کو بیچ کر خوراک دونگی..."

"میرے یہاں بندو نے کچھ نہیں رکھا جا اپنا کام کر"

بلّن بھیا نے اسی طرح آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا اور داہنے ہاتھ کا کبوتر ہوا میں اچھال دیا، پھر فوراً دوسرا بھی، زور سے پر پھٹانے کی آواز آئی اور جمیلہ غور سے بلّن بھیا کو دیکھتی رہی، تاریخ بانس پر چڑھے ہوئے بازی گر کی طرح ایک دم پلٹا کھا گئی، جہانگیر نے نورجہاں کی جگہ لے لی اور نورجہاں، جہانگیر بن گئی، شیر افگن (بندو) پہلے ہی اپنی موت مر چکا تھا، جمیلہ کا جی چاہا کہ میاں سارے کبوتر اسی طرح ہوا میں اچھال دیں اور وہ یہیں کھڑی تماشہ دیکھتی رہے۔

"میں کہتا ہوں رستہ ناپ اپنا۔"

"وہ تو ناپنا ہی ہے، — میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، اس گہنے کے سوا میری گرہ میں ایک پائی تک نہیں۔ پاؤں پڑتی ہوں آپ کے؟"

"جا دور ہو یہاں سے گہنا میرے پاس نہیں ہے۔"

ایک عورت نے پہلی مرتبہ بلّن بھیا کی خوشامد کی تھی، ان کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے، پاؤں پڑنے کو بھی کہا تھا، محض اس کی خاطر اسے ڈانٹ کر وہ ذرا تکلیف محسوس کر رہے تھے۔

جمیلہ نے اسی دن برادری والوں سے کہدیا کہ وہ روٹی نہیں دے سکیگی، میاں کی نیت بگڑ گئی، انھوں نے گہنا دبا لیا، خوراک
نے کی کوئی صورت نہیں۔
یہ آواز بالکل نئی تھی، اور نئی آوازیں کانوں کو ہمیشہ بھلی لگا کرتی ہیں، بہت سے سُن کر چُپ ہو گئے مگر بہتاں اُن کے کانوں میں بھی گھلتا رہا
ت سے بلّن بھیا کو بُرا بھلا کہنے لگے۔
"بے ایمان ہے سالا!"
"سُود کھاتا ہے!"
"نام ہی کا سیّد ہے، اندر سے پکا یزید ہے"
رحمت اللہ سرپنچ کرگہ میں بیٹھے بیٹھے بولا ـــ "کلجگ ہے کلجگ!"
جمیلہ نے میاں کی بدگوئی تو کر دی مگر اسے کچھ اچھا نہیں لگا، اس کی آس ٹوٹی نہیں تھی وہ روز ہی اب محل میں جانے لگی، سیدانی
ہاتھ پاؤں بھی جوڑے اور نہ جانے کیا سوچ کر انھوں نے جمیلہ کی ڈھارس بندھائی، گھبراؤ مت گہنا اس سے زیادہ مل جائے گا۔
ن ایک بات ماننی پڑے گی، جمیلہ کئی دن تک اس بات کی کھوج لگاتی رہی، اور ایک روز جو وہ محل میں گئی تو پھر باہر نہ آئی، جلاہوں
ں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔
"کمال ہے بھائی سیّد جلاہا بن گیا"
"بلّن بھیا نے بنیاد علی کی جگہ لے لی"
"مگر کیوں ـــ؟"
"لالچ کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے"
"اتنے سے زیور کا کیا لالچ!"
"پھر اولاد کے لئے انھوں نے جمیلہ کو محل میں روک لیا"
"سارے ہی سیّد دھوبنوں، جلاہیوں، اور نائنوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کون سیدانیاں ان کے سانجھ آئی تھیں"
صغیرن جو آہستہ آہستہ جوان ہوتی جا رہی تھی، بلّن بھیا سے بڑی نفرت کرنے لگی تھی، انھوں نے اس کا گہنا بھی ہضم کر لیا تھا
ور اس کی سوتیلی ماں کو بھی نگل گئے تھے۔
صغیرن چودھویں سال میں لگی تو رحمت اللہ سرپنچ نے سب پنچوں اور پوری برادری کی مدد سے اس کے بیاہ کا بندوبست
دیا، صغیرن کوٹھری میں دلہن بنی بیٹھی تھی، اور اپنے باپ بندو کو یاد کر کے رو رہی تھی، کبھی کبھی اسے باپ پر جھنجھلاہٹ بھی آجاتی تھی۔
ل ٹھکانے نہیں رہی تھی، بیماری میں جب ہی تو اس بیاج خور کو سارا گہنا دے آیا تھا۔ صغیرن کی شادی ہو رہی تھی لیکن ہاتھ اور
ن تک ننگے تھے۔ انگلیوں میں ایک چھلّا تک نہ تھا، روتے روتے اس نے جی ہی جی میں بلّن بھیا کو ایک بڑی سی گالی دی۔
"بے ایمان کہیں کا! ـــ اپنی ماں کا خصم! ـــ"
اسی وقت باہر کسی نے کہا "میاں آ رہے ہیں!"
رحمت اللہ سرپنچ ایک ٹوٹا سا مونڈھا اٹھا کر دوڑا اور زور سے اسے زمین پر رکھتے ہوئے بولا
"بیٹھئے میرے میاں! ـــ میرے سرکار!!"

تلن بھیا بیٹھے نہیں سیدھے صغیرن کی کوٹھری کی طرف چلے۔

"نا بچے بیٹھی ہے میرے میاں!"۔۔۔ رحمت اللہ نے عاجزی کے ساتھ اطلاع دی۔

تلن بھیا نے کوئی جواب نہ دیا وہ برابر چلتے رہے، رحمت اللہ اور پنچایت کے دو ممبران کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے،

"صغیرن!"۔۔۔ انھوں نے کپڑے کی جالی دار تھیلی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ باہر نکالو"

اور جب صغیرن نے ہاتھ باہر نکال دیئے، انھوں نے دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں پہنا دیں، اور گلے میں ہیکل ڈال دی، اور دھیرے سے بولے

"پاؤں بھی نکالو!"

صغیرن نے مہندی میں رچے پاؤں بھی نکال دیئے۔ تلن بھیا نے دونوں پیروں میں ڈھیلم ڈھالے جھانجن ڈال دیئے۔ رحمت اللہ سرپنچ کی گردن ندامت سے جھک گئی۔ صغیرن کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی اور تلن بھیا چپ چاپ باہر نکل آئے۔ آسمان پر کبوتروں کی ٹولیاں اڑ رہی تھیں۔ انھوں نے اوپر دیکھنا شروع کر دیا، جیسے ان کی نگاہ بہت بلند ہو، رحمت اللہ اور صغیرن سب نیچے کی چیزیں ہوں۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد جمیلہ کے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوا، وہی محل کی ساری وراثتوں، امانتوں اور روایتوں کا امین تھا۔ اس کے خون میں فیروزے کی سبزی اور یاقوت کی سرخی تھی اور کچے سوت کی نازک سی سفیدی بھی!

نوید انجم

ہلکی ہلکی مہک

بواجی نے دُکھ سے بوجھل ایک چیخ ماری اور پھر ان کا سر جھک گیا۔

بھابھی جی نے دوڑ کر انھیں سنبھالا، اور رضو کو زور سے آواز دی "اے جلدی سے پانی لا" اور راکھ کی سی رنگت والے بالوں کو ہولے ہولے سہلانے لگیں۔

بواجی کے چہرے پر خون کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس بے رنگ چہرے پر ایک مُردنی چھا رہی تھی اور دُکھ کے ایسے لمحے میں بوڑھی پلکیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ آنکھوں کے کونوں کے گرد پھیلی ہوئی جھریاں ایک دم بہت زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور ماتھے پر چھوٹی چھوٹی لکیروں کا ایک جال بچھ گیا تھا۔ بوڑھے بے رس ہونٹ لرزتے اور گلے سے خرخر کی سی عجیب آواز آئی —— اس خرخر نے بھابھی جی کو ڈرا دیا ——

"اے میں نے کہا ذری حوصلہ کرو، بواجی!"

"بواجی —— بواجی آنکھیں تو کھولو —— دیکھو میں ہوں تمہاری رضو!" رضو پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے جانو التجا کر رہی تھی —— بواجی نے منہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا اور یوں آنکھیں کھولیں، جیسے پلکوں پر پڑے وزنی بوجھ کو اٹھا رہی ہوں اور بڑی نحیف آواز میں بولیں —— "اے بی یہ کیا غضب ہو گیا ——"

بھابھی نے ان کی آواز سنی تو جیسے جان میں جان آئی —— "بواجی تم مانو نہ مانو پر میں نے بھی بات ٹھیک ہی کہی تھی!"

رضو نے گلاس بوا کے لبوں سے لگا دیا —— "اور کیا بھلا شریفوں میں کبھی یوں بھی ہوا ہے؟"

بواجی نے بڑی بے بسی سے اپنے سامنے کھڑی رضو کو دیکھا اور پھر گلاس میں جھانک کر ٹھنڈے پانی کو دیوانوں کی طرح دیکھا اور پھر جیسے ان سے صبر نہ ہو سکا اور اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کو پانی میں ڈبو دیا —— "بی وہ مر کیوں نہ گئی —— اتی سی شرم ہوتی تو ڈوب نہ مرتی!"

"شرم کی بھی ایک ہی کہی —— دیدوں کا پانی ڈھل جائے تو شرم کہاں رہتی ہے!" بھابھی جی نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور اب جیسے وہ بھی اس سوچ میں ڈوب گئیں کہ واقعی غضب یہ کیا ہوا تھا اور جوں جوں انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہونے لگا، ان کے چہرے پر بھی خون کی حدت چھلکنے لگی —— "میں کہوں بواجی —— اس کتیا کو یہ گل چھرّے اڑانے سے پہلے ہی زندہ درگور کیوں نہ کر دیا ——!"

ماتھے پر دو ہتڑ مار کر بواجی چلائیں "اے یہ خبر ہوتی تو گلا نہ گھونٹ دیتی نامراد کا —— خاندان کی عزت اسی مردار کے ہاتھوں مٹی میں ملنی تھی؟"

"اب جو ہونا تھا ہوگیا، اب یوں رونے دھونے سے کیا ہوگا!" رضو نے کہا

"اور کیا خاندان کی ناک کٹنی تھی سو کٹ گئی اب مٹی میں لتھڑی ہوئی عزت تو واپس آنے سے رہی۔"

بواجی نے رعشہ سے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سختی پیدا کی۔ "ہائے ہائے مجھے خبر ہوتی تو ان ہاتھوں سے اس کا گلا نہ دبا دیتی۔ تُف ہے مجھ پر — میں نے ان ہاتھوں سے اسے ڈبونے کی بجائے اس کی ہر ہر بات کو پورا کرنے میں خوشی سمجھی —" انھوں نے اپنے دونوں بازوؤں کو ایک جھٹکا دیا۔

"سچ پوچھو تو بواجی — تمہارے بیجا لاڈ پیار ہی نے اسے بگاڑا۔" بھابھی نے تیکھی آواز پہ قابو پاتے ہوئے کہا

آنگن میں اداسی کی ہوا کا ایک سرد جھونکا دھیرے سے آیا اور ہر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دیوار کے نزدیک لگے ہوئے پیڑ کے پتے ہوا سے سرسرائے جیسے ہائے ہائے کہہ رہے ہوں اور بواجی کی خشک آنکھوں میں سے آنسو امڈنے لگے۔

رضو نے گھبرا کر آسمان کی دیکھنا شروع کر دیا اور بھابھی جی نے بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور دائیں ہاتھ سے وہ اپنے گریبان سے کھیلنے لگیں۔

"آندھی کے آثار نظر آتے ہیں!" رضو نے آہستگی سے کہا

بواجی نے ایک گہرا سانس لیا اور ماتھے پر ہاتھ رکھے ویسے ہی بیٹھی رہیں۔

تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا تو بواجی چونکیں پھر جیسے چیخ کر انھوں نے خود سے کہا "فہمیدہ بدنصیب! طلاق لینے سے تو اچھا تھا کہ کچھ کھا کے مر رہتی، یوں خاندان کی مٹی تو نہ پلید ہوتی!"

سچ پوچھو تو فہمیدہ تھی بڑی خوبصورت — بواجی تو دیکھتے ہی ریجھ گئی تھیں۔ بے اختیار ہو کر بہن سے بولیں "آپا یہ بچی میری —"

"اے تمہاری ہی سہی —" وہ مسکرا کر بولیں

"اے یوں نہیں۔ اسے تو اب میں ہی پالوں گی —" انھوں نے اپنی گود میں اسے لے کر کہا اور بچی نے مسکرا کر اپنا دایاں ہاتھ بواجی کے لبوں پر رکھ دیا۔

بواجی نے اپنے لبوں میں آہستہ سے ننھی منی انگلیاں دبائیں تو سارے تن بدن میں ایک نشہ سا چھانے لگا۔ بہن کا بازو جا تھام کر انھوں نے ممتا سے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "سچ کہتی ہوں آپا — بیٹی کی حسرت ہی رہی، پر اب باقی نہیں — یہ گڑیا تو اب میری —"

پیار اور خلوص سے کہے ہوئے یہ الفاظ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہے اور بواجی ہنستی بولتی گڑیا سے اپنی گود بھرے واپس گھر لوٹ آئیں۔

گھر میں یہ ننھی گڑیا کیا آئی کہ بہار اور چھا گئی۔

ننھی ذرا کسی بات پہ اڑی نہیں کہ بواجی نے سارا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ "اے رحمو بی کدھر ہو۔ دیکھتی نہیں اتنی سی جان کیسی بلک رہی ہے میں کہوں تمہارا دل ہے یا پتھر کہ ان آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھی نہیں پسیجتا —!"

ہر وقت وہ تو اسے یوں بنا سجا کر اپنے قریب بٹھائے رہتیں جیسے چینی کی گڑیا کی حفاظت میں لگی ہوں۔ ذرا کسی کا ہاتھ لگا نہیں کہ ٹکڑا ٹکڑا ریزے ریزے ہوگیا۔

ننھی کی اتنی خاطرداری دیکھ کے بواجی کے اپنے بیٹے اس سے جلنے لگے۔ بڑا تو خیر ذرا سمجھدار تھا، البتہ چھوٹا بات بے بات ننھی کو بواجی ادھر کو ہوئیں اور اس نے موقعہ دیکھ کر ایک چٹکی کاٹ لی۔ وہ زور سے بلبلا اٹھتی اور بواجی کی آواز آنگن میں سے گونجنے لگتی "ابھی آ جان" اور پھر بیٹے کو وہاں سے کھسکتے دیکھ ان کی میٹھی زبان کڑواہٹ سے بھر جاتی۔ "جانے کس پر گیا ہے کہ سنتا ہی نہیں — سلیم بیٹے

جان کو ہلکان کرے ہیں ؟ "

سلیم چڑ کر چیخا ۔ " بس بوا ۔ ہم کو تو یہ زہر لگتی ہے ۔۔"

" آخر گیا ہے نا اپنے باپ پر ۔۔"

" اونہہ ! " وہ ناک کی پھننگ پر ہاتھ پھیرتا ۔ " قلفی والے سے قلفیاں لے لے کر کھلاتی ہو ' ادھر ہم ذرا قلفی کی بات ہی کریں تو سو سو گالیاں سننی پڑتی ہیں ۔۔"

" اے تو کیا تم بھی اتنے سے بچے ہو ۔۔ " بوا بڑی شان سے کہتیں " بچے کی ضد کے آگے تم اپنی ہانکو گے تو گالیاں تو سنو گے نا "

وہ جل بھن کر چپکا ہو رہتا پر بس چلتا تو ایک بار اس کلموہی کی گوشت سے بھری ہوئی کلائی میں اپنے دانت گاڑ دیتا اور پھر اس کی چیخیں سنتا ۔ یہ نیلی نیلی آنکھوں والی چڑیل چلاتی بھی تو بہت تھی ۔ حلق میں تو جانو لاؤڈ اسپیکر کیا پورا ریڈیو لگا ہوا تھا ۔ اکثر بواجی کی آنکھ بچا کر جب سید ریڈیو کا بٹن گھما کر آواز اونچی کر دیتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے فہمیدہ حلق پھاڑے رو رہی ہے اور کئی بار تو بواجی بھی دور سے یہ سمجھیں کہ وہ رو رہی ہے اور برآمدے میں اندر تیزی سے آتے ہیے وہ اپنی مخصوص آواز میں چلائیں " آئی میری جان ۔ ٹھہر تو جا سلیم کے بچے میں ابھی تیری خبر لیتی ہوں "

منہ بسورے اس نے مٹی سے اپنا سر بھر لیا " واہ بوا ۔۔ یونہی کوستی رہتی ہو ۔۔"

" اے بو میں سمجھی تھی تو نے میری گڑیا کو چھیڑا ہے ۔۔" بوا نے کونے میں بیٹھی کپڑے کے چیتھڑوں سے کھیلتی ہوئی فہمیدہ کو دیکھ کر کھسیا ہو کر کہا ۔ " یہ تو بتا اتنی زور سے ریڈیو لگانے میں کیا ملے ہے تجھے ۔ کیوں رے ؟ "

اس سے بڑے نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی ۔ " بوا اس چڑیل کی خاطر تم نے تو سارون کا ناک میں دم کر رکھا ہے ! "

" چل رے ۔۔ بڑا آیا مجھے سمجھانے ۔۔" بوا نے ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگا دی اور ننھی سی گھنگریالے بالوں والی گڑیا سے اپنی گود بھر لی ۔ یہ نیلی نیلی آنکھوں اور سیاہ گھنگریالے بالوں والی چھوٹی سی کانچ کی گڑیا دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی تیز و طرار حسینہ کے روپ ڈھلی کہ بواجی دانتوں تلے اپنی انگلی دابے بس دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں ۔

یوں حقیقت یہی ہے کہ بڑا بھی اپنے دل کی ساری بھڑاس بھول گیا ۔ اس چیخنے چلانے والی آفت کی پرکالہ نے جب ایک بار شرما کر " بڑے بھیا ہمیں کوئی پڑھنے کو کتاب ہی لا دو نا ۔ یوں اکیلے بیٹھے رہنے سے جی نہیں لگتا " تو وہ جیسے اپنی ستی ہی بھول گیا ۔ وہ جو دل میں سوچے بیٹھا تھا کہ تنک کر کہوں گا " بواجی سے مانگو " ۔۔ سب کچھ بھول بھال گیا اور اس شام جب بواجی سے چھپ کر اس نے دو ناول اسے لا کر دیں تو کچھ شرم کے مارے زبان میں لکنت سی محسوس ہونے لگی تھی ۔ " فہمو " اس فہمو کے لفظ میں جانے اتنی مٹھاس کہاں سے آ گئی تھی ۔۔ " بواجی سے چھپ کر پڑھنا ۔۔"

" اے واہ کیوں ؟ " اس بار وہ بالکل صبح والی شرمیلی حسینہ نظر نہ آ رہی تھی

" یہ میں پڑھ رہا تھا نا تو مجھے بوا نے ڈانٹا تھا ۔" اس نے اس کے بات کرنے والے اس برے انداز کو نظر انداز ہی کر دیا

" اے ہمیں نہیں روکیں گی ۔" اس نے بڑے فخر سے کہا

اور یہی ہوا کہ رات کو آٹھ بجے کے قریب بتی جلائے وہ بواجی کی چارپائی پہان کے سرہانے بیٹھی مزے سے ناول پڑھ رہی تھی بواجی آنکھیں موندیں ہوئے ہوئے کہہ رہی تھیں ۔ " اے بٹیا ! ذرا زور سے پڑھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کیا داستان ہے ؟ "

اسے آتا دیکھ کر فہمیدہ نے شرارت سے پلکیں جھپکائیں ۔۔ " بوا کسی کام کی کتاب نہیں ۔۔ ہے ہے بالکل فضول ہے ۔ گندی ہے گندی ! "

"گندی؟" ــــ بوا نے کہا

اس کا سانس جیسے رک گیا

"ہاں ــ ہاں ــــ" وہ مسکرائی ــ "کسی بات کا سر ہے نہ پیر، فضول ہی تو ہوئی ــ" اس نے لاپرواہی سے کتاب سرہانے پٹخ دی۔

اس کا دل چاہا جھپٹ کر کتاب اٹھالے پر یونہی اُسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا اور دوسری صبح بواجی کے سامنے اس نے اس بے پروا
سے بات کی جیسے نئی کتاب خریدنے کے لئے پیسے مانگ رہا ہو۔ "بواجی میری شادی کر دو ــ!"

بواجی تو جیسے اس بات کی منتظر بیٹھی تھیں، جھٹ سے تیار ہو گئیں اور جب انھوں نے اپنی ہونے والی بہو کا نام لیا تو چونک کر اس
نے ..... اپنی ماں کو بڑی گہری نظروں سے صرف ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر کچھ کہنے کو جیسے اس نے تھوک گلے سے نگلا۔ لیکن ہونٹوں کے
کھلنے، بس ذرا سے لرز کر رہ گئے اور پھر بواجی کے بھائی کے گھر کی روشنی نجمہ دلہن بن کر آ گئی، کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ منگنی تو بچپن
ہی میں ہو چکی تھی! ادھر سلیم تھا کہ جیسے اس پر فہمیدہ کے حسن کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوا تھا ــ اور وہ تھی کہ اسے سلیم ایک آنکھ نہ بھاتا پر بواجی ا
ہر دم بہوں پر سلیم کے بیاہ کا ذکر لئے رہتیں اور پھر کن انکھیوں سے فہمیدہ کی طرف دیکھتیں۔ ایسے میں نجمہ بھابھی جی مسکراتی اور پھر فہمیدہ کے
کہنی مارتی اور کھلکھلا کر ہنس دیتی ــ فہمیدہ چونکتی اور بڑے بھیا کے چہرے کے خدوخال اس کے ذہن کے دریچے میں آ کر جھانکنے لگتے ــ اس کی
آنکھیں اپنی نمی چھپانے کو سمٹ سی جاتیں اور ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی!

پر ایک روز جب سلیم کی نوکری کی خوشخبری لئے بواجی بہن کو سنانے آئیں تو ساتھ ہی انھوں نے ایک اور بات بھی بڑھا دی "بس اب تو
یہی تمنا ہے کہ سہرے کے کھلے ہوئے پھول دیکھوں"

بہن کو بھلا کیا انکار ہونا تھا ــ "تم نے پالا ہے تمھاری ہی چیز ہے مگر ــــ"

"مگر کیا ــــ؟"

"بھئی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں ــــ" وہ بولیں "دراصل برات ہمارے گھر آنی چاہیئے ــ"

"کیوں نہیں ــــ کیوں نہیں ــــ" بواجی نے خوشی سے پاگل ہو کر کہا

یوں بڑے بھیا کی شادی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد فہمیدہ دل میں ایک نامعلوم سی کسک لئے، ذہن کے ہلکے ہلکے پردوں تلے درد کو
چھپائے اپنے گھر آ گئی ــ اس گھر میں جہاں اس کی ولادت ہوئی تھی اور جہاں سے بواجی اسے دیکھ کر ریجھ گئی تھیں، پر ادھر کی ہر چیز جیسے اس
سی تھی، لیکن یہ اجنبیت کچھ زیادہ دیر نہ رہی اور پھر وہ گھل مل کر جیسے ان سب میں رچ بس گئی۔

چند دن گزرے اور بواجی نے منگنی کی خوشی کر ڈالی پر اس کے بعد تو بات جیسے رک سی گئی۔ منگنی سے آگے کی منزل کچھ اتنی دور نظر آنے
لگی کہ بواجی حیرت کے مارے بہن سے بار بار پوچھتیں "آپا اب تاریخ دو نا ــــ آخر انتظار کس بات کا ہے؟"

اور وہ عورت کہ جس کے سینے میں ماں کا دل تھا بار بار اپنی بیٹی کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتی اور پھر جیسے ایک گہری سوچ
میں ڈوب سی جاتی۔

"آپا کچھ پتہ بھی تو چلے بات کیا ہے آخر؟"

"کچھ نہیں بہن" ماں دل کو سنبھال کر کہتی ــــ "یوں ہی جی اداس ہو جاتا ہے ــــ اتنی دیر کے بعد تو وہ خیر سے اپنے گھر آئی ہے
اتنی جلدی رخصت کر دینے کے خیال سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔"

لیکن بواجی کا اصرار رائیگاں نہ گیا اور نکاح کر دیا گیا ــــ

اور جو غضب ہونا تھا وہ اب نکاح کے بعد ہوا — وہ اجنبیت کی برف جو فہیدہ کے دل کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی، ہولے ہولے پگھل کر بہہ گئی اور پھر ایک روز ماں کے آگے روتے ہوئے اپنی بڑی باجی کا سہارا لیتے ہوئے اس نے صاف صاف کہدیا — "مجھے اچھا نہیں لگتا — مجھے سلیم اچھا نہیں لگتا —" اور یہ کہتے ہوئے وہ جیسے خود کو یہ یقین دلا رہی تھی کہ سلیم نہیں — اُسے تو بڑے بھیا نہیں لگتے!!

اب تو جیسے چاروں اور دھماکے سنائی دینے لگے — بواجی اب دلہن کی رخصتی کا تذکرہ کرتیں تو فہیدہ کی ماں گہری سوچ میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی اور پھر چونک چونک کر پوچھتی "کیا کہا بہن"

بواجی جھنجھلا کر کہتیں "اے یہی نا اب رخصت کر دو نا میری بچی کو —"

ایسے میں فہیدہ کی باجی اپنی کسی سہیلی کا قصہ لے بیٹھ جاتی "اے اماں پتہ ہے کلثوم نے زہر کھا لیا"

"اے ہے ہاک ہاک! بدنصیب!"

"اے بی کیا ہوا اُسے"

"ہونا کیا تھا مرضی کے خلاف —"

"کیا ہوا مرضی کے خلاف؟" بواجی نے پوچھا

"بیاہ!" منہ پھلا کر اس نے کہا

بواجی قدرے چونک سی گئیں اور پھر جیسے بات آئی گئی ہو گئی۔

اور پھر ایک روز بواجی نے پھر اپنا مطالبہ دُہرایا تو فہیدہ کی ماں بولی — "بہن دراصل ابھی بڑی بیٹھی ہے — بڑی کے ہوتے ہوئے چھوٹی کا بیاہ کیسے ہو جائے —؟"

بواجی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اب دونوں بہنوں کے دلوں میں تالا سا لگ گیا۔ ادھر وہ کُڑھتی رہتیں کہ کاہے کو فہیدہ کو اس کے گھر بھیجا اور ادھر وہ سوچ میں ڈوبی رہتیں یہ ہوا کیا — ارے دونوں ایک گھر میں پلے اور پروان چڑھے پر دل نہ ملے تو کیا اب بیاہ کے بعد نباہ ہو جائے گا —؟

پھر ایک روز دونوں بہنیں بیٹھیں تو بڑی دیر تک کانوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی پھر بواجی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئیں ہاتھوں میں رعشہ اور آنکھوں کی پلکیں لرزنے لگیں۔ فہیدہ کی ماں کے ماتھے پر گہری لکیریں اور آنکھوں کی مدھم چمک سینے میں سے اٹھتے ہوئے آہوں کے طوفان کا ساتھ دینے لگی۔

بواجی جب بہن کے پاس اُٹھ کر واپس آنے کو برقعہ پہن رہی تھیں تو ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ساتھ کے کمرے میں بڑے بھیا کا ایک پرانی تصویر لئے فہیدہ گم سم بیٹھی تھی!

واپس آتے وقت انھوں نے فہیدہ کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش تک کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی بہن کے گلے ملیں — بس اکھڑی اکھڑی سانسوں میں اپنی ہچکیاں چھپاتے وہ واپس آ گئیں۔

گھر آ کر ان پر جیسے رونے کا دورہ پڑ گیا اور ایسے میں بھابھی جی نے موقعہ دیکھ اپنی بہن رمتو کو اپنے پاس بلوا لیا اور دونوں بہنیں بواجی کی دل و جان سے خدمت کرنے لگیں۔ پر وہ تو جیسے اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرا کرتیں اور فہیدہ کا نام جپتی رہتیں — "اے میری گڑیا تیرا دل ہے کہ پتھر —!"

اور اس دن تو جیسے بواجی کے ذہن اور دل پہ ایک پہاڑ ٹوٹ گیا۔ وہ لوگ طلاق کا مطالبہ کر رہے تھے!
سلیم میاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے طلاق نامہ لکھدیا اور رضو سے دبے دبے لہجہ میں سارا قصہ کہہ کر بواجی سے نظریں اپنے کسی دوست کے ہاں چلے گئے۔
" طلاق لے کر کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی نا "
" کیا کہا۔ طلاق! "
بواجی نے دُکھ سے بوجھل ایک چیخ ماری اور پھر ان کا سر جھک گیا
بھابھی جی نے دوڑ کر انھیں سنبھالا اور راکھ کی سی رنگت والے بالوں کو ہولے ہولے سہلانے لگیں۔
دیوار کے نزدیک لگے ہوئے جامن کے پیڑ کے پتے ہولے سے سرسرائے جیسے ہائے ہائے کہہ رہے ہوں تو بواجی نے چیخ کر کہا " فہمیدہ بدنصیب! طلاق لینے سے تو اچھا تھا کچھ کھا کر مرجاتی۔ اسے یوں خاندان کی مٹی تو نہ پلید ہوتی! "
" عزت کا خیال نہ ہو تو یوں ہی ہوتا ہے بواجی! " بھابھی جی نے کہا
" تف ہو مجھ پہ جو اب کبھی آپا کے گھر کا منہ بھی دیکھوں! " بواجی نے ہاتھ منہ پہ پھیر کر کہا
پھر دن ہولے ہولے رینگ رینگ کر گزرنے لگے اور جامن پہ کئی بار بہار آئی۔ کئی بار موسم بدلے پر بواجی کی کہی ہوئی بات نہ بد
اس دوپہر جب نائن نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا تو بواجی کا اپنا دل اس لمحے جیسے دھک دھک ان کے غم کے دروازے کے کواڑ کھٹکھ
" اے فہمیدہ بی کے......."
" رہنے دو جی ـ" بھابھی جی نے نائن کو بات ہی نہ کرنے دی ـ" ہمیں معلوم ہے اس کا بیاہ ہونے والا ہے "
نائن جھجکی رہی اور چپ چاپ ہی واپس چلی گئی ـ بواجی نے اس سے یہ تک نہ پوچھا ـ کہاں ہو رہا ہے کس کے ساتھ ہو رہا ہو رہا ہے ـ انھوں نے کچھ بھی نہ پوچھا ـ بس ایک دو لمحے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر بھابھی جی سے بولیں " اپنی رضو بڑی نیک بچی ـ نصیب نیک کرے ـ آمین! "
بھابھی جی مسکرائی " اے بوا تمھاری بچی ہی تو ہے ـ"
بواجی اٹھ کر اندر آگئیں ـ اس وقت اگر بھابھی جی اندر جھانک کر دیکھتی تو انھیں پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا پاتی!
رضو سلیم کی دلہن بن کر آئی پہ بواجی کے ہونٹوں پر وہ جھلمل کرتی مسکراہٹ نہ آئی جو ننھی سی کانچ کی گڑیا سے گود بھرتے سمے پر کھیلنے لگتی تھی ـ اب وہ دیوار کے ادھر کھرپی سے کچی مٹی کھود کر پھولوں کے بیج بونے میں لگی رہتی تھیں اور مٹر پھولوں کے ننھے ننھے پودوں کے لئے جب وہ چھوٹی چھوٹی تیلیاں لگا رہی تھیں تو اس بار بھی نائن نے ہی دروازہ کھٹکھٹایا ـ
کھرپی ہاتھ میں لئے انھوں نے پوچھا ـ" اب کیا خبر لائی ہو؟ "
پر اس کے چہرے پر بواجی کی نظریں پڑیں اور پھسل کر رہ گئیں ـ" فہمیدہ کی ماں ـ تمھاری آپا بی اس جہاں سے رخصت ہوگئ ان کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی ـ
دھیمے دھیمے قدم اٹھاتیں وہ کمرے میں چلی گئیں ـ اور دوسرے دن شام تک باہر نہ نکلیں ـ
اس رات رضو نے کہا بھی ـ" بواجی منہ ہی دیکھ آؤ ـ" پر وہ تو ایسی بری طرح چلائیں تھیں کہ کچھ نہ پوچھو " نہیں نہیں جاؤں گی ـ اس گھر میں ـ میرے لئے تو وہ اسی روز مر گئے تھے ـ آج نہیں مرے، وہ تو مدت ہوئی مر گئے تھے ـ" بواجی پھوٹ

روئیں اور سینہ کوبی کرتے ہوئے انھوں نے سر کے بال تک نوچے!

بھابھی جی نے جلدی سے انھیں سنبھالا ——"بواجی کیا ہوا —— ہوش میں آؤ بواجی!"

بواجی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور بے بسی سے مسکرائیں — بھابھی جی کا اپنا دل ان کی مسکراہٹ دیکھ کر دہل گیا۔

"یاد نہیں میں نے کیا کہا تھا؟" بواجی نے بڑی کمزور آواز میں کہا "تف ہو مجھ پہ جو اب کبھی آپا کے گھر کا منہ بھی دیکھوں!"

رضو نے دلاسہ دیا —— "ٹھیک ہے بوا، پر آنا بھی کیا۔ آخر کو تمھاری بہن تھیں"۔

"بہن؟" انھوں نے چیخ کر کہا "نہیں کوئی بہن نہیں — میرا کوئی نہیں —— ارے میں سچ کہتی ہوں میرا کوئی نہیں ہے!"

بواجی نے بہن کی شکل نہ دیکھی پر ان کے چہرے کی ساری بچی کھچی رونق جیسے بہن کے مرنے کی خبر سن کر اسی کے ساتھ منوں مٹی تلے دب کر رہ گئی

اب وہ سارا سارا دن پھولوں اور پودوں کے پیچھے دیوانی ہوئی پھرتیں قسم قسم کے پھولوں سے انھوں نے آنگن کو سجا رکھا تھا۔ ذرا سی ہوا چلتی اور پھولوں کی مہک سارے میں پھیل جاتی — چنبیلی، موتیا اور رات کی رانی سے لدی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا میں نکھری ہوئی بواجی ایک پاگل ایک دیوانی کی طرح کھُر[illegible] اٹھا میں نئے پھولوں کی طرف اشارہ کر کر کے چلاتیں — "اے رضو بی دیکھنا تو یہ پھول کیسا خوبصورت ہے!"

"بواجی تو پاگل ہو گئی ہیں جی!" بھابھی جی نے کئی بار شوہر سے کہا

"فہمیدہ چیز ہی پاگل کرنے والی تھی!" ترنگ میں آکر وہ بولا

"اے میں جانتی ہوں حضور بھی اس پر لٹو ہو رہے تھے۔ وہ تو کہو مری قسمت میں ہی یہ بھوگنا لکھا تھا!" وہ منہ بنا کر کہتی اور رضو بواجی کی طرف ماتھے پر تیوریاں چڑھائے دیکھا کرتی —"بوا کوئی کام کرو کر فائدہ ہو یونہی وقت گنواتی ہو —"

پر بواجی جیسے اس کان سن اس کان اڑا دیتیں!

ڈھلتی ہوئی اس دوپہر کو آنگن میں بہت سے پھول کھلے ہوئے تھے — رنگ رنگ کے پیارے پیارے، اور خوشبودار اور بواجی انھیں دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھیں —

"بوا ذرا یہ کرتا تو سی دو —" رضو نے سلیم کا کرتا سامنے کر کے کہا

"اچھا بی ——" وہ جانے کس ترنگ میں تھیں کہ جھٹ سوئی تاگہ لئے اندر کمرے میں آ بیٹھیں۔ وہ اپنے کام میں مگن تھیں کہ بھیڑے ہوئے دروازے چوکھٹ سے ٹکرانے لگے۔

"اے بوا آندھی کے آثار نظر آتے ہیں —" رضو نے دور سے چلا کر کہا

بھابھی جی نے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے۔

باہر کا دروازہ کوئی بڑے زور سے کھٹکھٹا رہا تھا — بھابھی جی نے دروازہ کھولا

"اے بی کون ہے؟" انھوں نے دانت سے دھاگہ توڑتے ہوئے پوچھا

"اے وہی نصیبن کی اماں!"

نائن کی آواز سن کر ان کا جی دھڑکا ——

ایک خوف نے جیسے ان کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا —

وہ ان کے قریب آکر فرش پر ہی بیٹھ گئی ——"بواجی ——" اس نے کھانس کر کہا

[illegible] سا آنے لگا۔

"بواجی فہمیدہ کے بچہ ہونے والا تھا ـــ"

"اوہو ـــ" انھوں نے حلق صاف کیا

"بچی ہوئی ہے" نائن نے جیسے سانس لے کر کہا

وہ چپ رہیں - سوئی دھاگا ان کے ہاتھوں میں سے چھوٹ کر چارپائی کی پٹی پر پڑا تھا ـ

"بڑی بدنصیب ہے بواجی ـــ بچی جنتے ہی اللہ کو پیاری ہوگئی!"

بواجی نے دکھ سے بوجھل ایک چیخ ماری اور پھران کا سر جھک گیا

بھابھی جی نے دوڑ کر انھیں سنبھالا، اور رضو کو زور سے آواز دی "ارے جلدی سے پانی لا" اور راکھ کی سی رنگت لئے ہوئے ہونے سہلانے لگیں ـــ

بواجی کے چہرے پر خون کا نام و نشان تک نہ تھا - اس بے رنگ چہرے پر ایک مردنی چھا رہی تھی اور دکھ کے ایسے لمحے میں بوڑھی تھرتھر کانپ رہی تھیں - آنکھوں کے کونوں کے گرد پھیلی ہوئی جھریاں ایک دم بہت زیادہ گہری ہوگئی تھیں، اور ماتھے پر چھوٹی چھوٹی لکیر ایک جال بچھ گیا تھا - بوڑھے بے رس ہونٹ لرزے اور گلے سے خرخر کی سی عجیب آواز آئی - اس خرخر نے بھابھی جی کو ڈرا دیا۔

"بواجی! بواجی آنکھیں کھولو ـــ دیکھو میں ہوں تمہاری رضو!" رضو پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے جانو التجا کر رہی تھی۔

بواجی نے منہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا اور یوں آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں پر بڑے وزنی بوجھ کو اٹھا رہی ہوں اور بڑی کھنچ میں بولیں ـــ "اے بی یہ کیا غضب ہوگیا ـــ"

اور پھر اس لمحے جیسے ان میں ایک دم بڑی ہمت سی آئی - چارپائی پر سے نیچے اترتے ہوئے انھوں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا

"رضو جلدی سے برقعہ پہن ـــ اس کی بدنصیب بچی رو رہی ہوگی ـــ ہائے اب اور کون اس کی سنے گا؟"

بواجی کی آنکھوں تلے آنکھوں میں بجھتی ہوئی چمک اس لمحے بڑی تیز ہوگئی تھی!

الطاف پرواز

مورکھ بانی

جگ جیون کے روپ نرالے، پیار کرو، دُکھ پاؤ
اندر اندر بِس پھیلا کر، جگ جُگ عیش مناؤ
جاگتی آنکھوں لوٹ مچاؤ، سب ہیں تمہارے یار
سوتے بالک کا منہ چومو، اور بیری کہلاؤ

○

جگ جیون کے رنگ نیارے، سمجھو، سمجھ نہ آئے
رات کو سورج چڑھتا دیکھیں دن کو ڈھلتے سائے
اُجلے تن میں ڈھانپ رکھو تم اپنے من کا میل
جو سچ بولے، پورا تولے، سو ہی گھاٹا کھائے

○

جگ جیون کی ریت انوکھی، بولیں دھوپ کو چھاؤں
لاٹھی والا بھینس ہنکائے، ہاتھی والا ناؤں
جان لڑا کر بھوک ملے تو جان اچھی یا بھوک
بنو سیانے، بیٹھ رہو تم توڑ کے ہاتھ اور پاؤں

○

جگ جیون کا روگ جو بانٹے، وہ مورکھ کہلائے
روگی من پرواز ہمارا پھر بھی باز نہ آئے

محبوبؔ خزاں

سوچ کی ایک لہر

وادیٔ ظلمت ظلمتِ رنگیں — دیکھ بہارِ جادۂ تمکیں
چمپا کی دیوانی خوشبو — آنکھوں میں لہرا گئے آنسو
دنیا اب دیکھی نہیں جاتی — تو ہے کہاں اے جوہرِ ذاتی
کتنی جادوگر ہے جوانی — مٹی پر سونے کا پانی
دل اپنی دنیا میں مگن ہے — حسن، مزاجِ برگ سمن ہے
کتنی دور وفا جاتی ہے؟ — بات سمجھ میں آجاتی ہے

رنگِ چمن آنکھوں پہ گراں ہے
اے دن والو، رات کہاں ہے

مغنی تبسم

واپسی

وہی رستہ ہے۔
پیپل کا گھنا سایہ ہے۔
جھرنے کا وہی نغمہ ہے۔
لوٹ آیا ہوں ایک مدت کے بعد اس گاؤں میں،
جو میرے بچپن کے حسین خوابوں کا گہوارہ، جوانی کے شگفتہ رُو سویروں،
دشت پیما سانولی شاموں کا مسکن ہے۔

بجز اک چشمِ تنہائی،
یہاں اب کوئی بھی ایسا نہیں جو مجھ کو پہچانے۔
یہاں اب کوئی بھی ایسا نہیں جو دل کو سمجھائے
کہ اے ناداں! مآلِ دید ہے خونِ جگر پینا۔

حسن حمیدی

زندگی کے لئے

شب ہے تاریک پھر بھی تاب کہاں
مے سمجھ کر ہی زہرِ غم پی لیں
اپنے لب زخم کی طرح سی لیں
چند چہروں کی تازگی کے لئے
چند محلوں کی روشنی کے لئے

وقت کی کروٹوں کے دوش بدوش
تیشۂ و سنگ نے فسانے لکھے
عظمتِ زیست کے ترانے لکھے
ذوقِ تکمیل آگہی کے لئے
صرف آسودہ زندگی کے لئے

دوستو! قحطِ خونِ دل تو نہیں
ہر قدم کہکشاں بناتے جائیں
زورِ قاتل بھی آزماتے جائیں

ہم کو چلنا ہے روشنی کیلئے
ہم کو مرنا ہے زندگی کے لئے

بازگشت

کل بھی آیا تھا میں گھر رات گئے
آج بھی میرے قدم کرتے ہیں گلیوں کا طواف
ڈھونڈتا ہوں تری آہٹ تری چاپ
تیری خوشبو ترے پیراہنِ گلگوں کی مہک
تیری آنکھوں کا تقدس ترے عارض کے گلاب
تیری باتوں کا فسوں تیرے لبوں کا سُرخاب
کسی پاگل کسی زنجیر بہ پا کی مانند
آج بھی شہر کی گلیوں میں ہوں آوارہ خرام

آج بھی کل کی طرح شہر کے دروازوں پر
اُسی گھمبیر خموشی کا لگا ہے پہرہ
وہی بے مہر سپاہی یہاں استادہ ہیں
اپنے ہاتھوں میں اندھیروں کی کمانیں لے کر
آج بھی سہنا پڑے گا وہی چرکا وہی زخم
اور لوٹ آؤں گا بے نیلِ مرام
اپنے کاندھے پہ اٹھائے ہوئے برسوں کی تھکن
اُسی منزل اُسی مسکن کی طرف
جس کے دروازے پہ دم توڑ کے رہ جاتی ہے
میری سہمی ہوئی، ٹھٹھری ہوئی بے جاں دستک !

ثقافتی ورثہ

تاج سعید

پشتو لوک گیت

تیرے پیار بنا او پیاری
میرے من میں، کچھ بھی نہیں ہے
میرے من کا پیالہ پیاری
تیرے پریم کی مدرا سے یوں چھلک رہا ہے
جیسے نیل کنول سے چھلکیں اوس کے موتی

○

تم کو گود میں لے کر پیارے
دنیا کا کچھ خوف نہیں ہے
دنیا لاکھ بنائے باتیں
(تیری پریت کے بدلے پریتم)
جھیلوں گی میں دکھڑے سارے

○

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

ہم قلم ادبی انعامات کے قواعد

۱۔ یہ انعامات ادارۂ مصنفین پاکستان کی طرف سے دیئے جائیں گے۔

۲۔ انعامات کے لئے صرف انہیں تخلیقات پر غور ہوگا جو مختلف پاکستان کے (اردو) جرائد و رسائل میں یکم جولائی ۱۹۶۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء تک کے عرصے میں شائع ہوئی ہیں۔

۳۔ یہ انعامات حسبِ ذیل اصنافِ ادب پر دیئے جائیں گے۔ اور ہر انعام کی رقم مبلغ چار سو روپے ہوگی۔

ا۔ تنقید و تحقیق

ب۔ شاعری (جملہ اصناف)

ج۔ نثر (افسانہ، طنز و مزاح، انشائیہ)

د۔ ڈرامہ

ہ۔ علاقائی زبانوں کے اردو میں تراجم

۴۔ نمبر "ہ" کے علاوہ تمام انعامات طبع زاد نگارشات پر دیئے جائیں گے۔

۵۔ مقابلے میں حصہ لینے والے ادیبوں کا پاکستانی شہری ہونا لازمی ہے۔ البتہ ادارۂ مصنفین پاکستان کا رکن ہونا ضروری نہیں۔

۶۔ مرحوم مصنفین کی نگارشات بھی مقابلے میں شامل کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ ان کی پہلی اشاعت کی تاریخ مقررہ میعاد یعنی یکم جولائی ۱۹۶۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۶۲ء کے اندر ہو۔

۷۔ تمام نگارشات کے تین تین نسخے ۵ دسمبر ۱۹۶۲ء تک مرکزی دفتر ادارۂ مصنفین پاکستان (اسٹریچن روڈ۔ کراچی) میں پہنچ جانے چاہئیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تینوں نسخے مطبوعہ صورت میں ہوں۔ ایک نسخہ مطبوعہ اور بقیہ دو نسخے نقول کی صورت میں بھیجے جا سکتے ہیں۔

۸۔ مصنف کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی مصنف کی نگارشات بھجوا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں اسے یقین دلانا ہوگا کہ مصنف کی منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔

۹۔ انعامات کا اعلان گلڈ کی سالگرہ کے موقع پر ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو کیا جائے گا۔

۱۰۔ اگر کوئی مصنف انعام کے اعلان سے پہلے انتقال کر جائے تو اس کا انعام اس کے قانونی ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۱۱۔ انعام کا فیصلہ ادارۂ مصنفین کے مرکزی معتمد کے نامزد کردہ ججوں کی کمیٹی کرے گی۔

-شائیے کے بعد شرکاء کا گروپ -

ادارۂ مصنفین کی طرف سے دیئے گئے عشائیے کا ایک منظر

پروفیسر جان مارک کراچی میں

ادارۂ مصنفین پاکستان ، حلقہ کراچی کی دعوت پر پروفیسر جان مارک نے اردو زبان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ اس موقع پر پروفیسر موصوف حاضرین کے ساتھ دھنی طرف سے آٹھویں نمبر پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔

بیرونی روابط

لونی آرکراؤن کی آمد

امریکہ کی ایشیا سوسائٹی (نیویارک) کی ڈائرکٹر مطبوعات مسز لونی آرکراؤن اکتوبر کے آخری ہفتے میں جمیل الدین عالی صاحب کی دعوت پر پاکستان تشریف
اکتوبر سے ۳۰ اکتوبر تک انہوں نے کراچی میں مختلف علمی و ادبی اداروں کا معائنہ کیا اور مختلف ادیبوں اور ناشروں سے ملاقاتیں کیں۔ ۲۶ اکتوبر کی شام کو ادارۂ مصنفین
کی طرف سے ایک عصرانہ دیا گیا جس میں ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ کراچی کے بعد مسز کراؤن لاہور تشریف لے گئیں جہاں انہوں نے ادارۂ مصنفین
پر لاہور کے ادیبوں اور ناشروں سے طباعتی و اشاعتی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ موصوفہ ڈھاکہ بھی تشریف لے جائیں گی۔

سر یان مارک

چیکوسلواکیہ کی چارلس یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور مستشرق یان مارک ۱۳ نومبر کو شام کے ۶½ بجے پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی ریجن) کی دعوت
دفتر میں ایک استقبالیہ میں تشریف لائے۔ اس موقع پر علاقائی سیکریٹری شاہد احمد دہلوی صاحب نے حاضرین سے پروفیسر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے
پروفیسر صاحب چیکوسلواکیہ کی یونیورسٹی کی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں اردو زبان کے محقق ہیں اور ان دنوں چیکوسلواکیہ کی اکیڈمی آف سائنس کے
کے وظیفے پر پاکستان تشریف لائے ہیں اور یہاں پاکستان کی جدید تاریخ کے سلسلے میں تحقیق کریں گے۔

"اپنی زندگی میں مجھے ایسے دو غیر ملکی ملے ہیں جو نہایت روانی سے اردو بول سکیں۔ ایک تو جاپان کے ڈاکٹر ڈوئی اور دوسرے آپ۔ تعجب ہے انگریز سالہا سال
یہاں رہے مگر نہ کبھی اردو بولنے پر قادر نہ ہو سکے۔ پروفیسر صاحب نے تراجم کے سلسلے میں کئی کام کئے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر اقبال کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور
چہار درویش کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اس امر پر روشنی ڈالیں کہ اردو کے سلسلہ میں وہ کیا کچھ کام کر رہے ہیں۔ اور اتنی اچھی
کی اردو انہوں نے کہاں سے سیکھی۔"

شاہد احمد دہلوی صاحب کے تعارفی کلمات کے بعد پروفیسر یان مارک نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ ان کے ملک میں اردو کی تعلیم کب شروع
ور کن کن اداروں میں دی جاتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اردو زبان کی تعلیم انہوں نے کس طرح حاصل کی۔ اردو تراجم کے بارے میں انہوں نے کہا۔

"چیک زبان میں اردو ادب کی کئی اہم نگارشات ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ مجاز کا مجموعہ کلام "آہنگ" خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کا ایک مختصر مجموعہ اور
ناول، کرشن چندر کا ایک ناول "دل کی وادیاں سو گئیں" ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو شعرا کا ایک انتخاب بھی ترجمہ ہوا ہے جس میں جوش
، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور دوسرے اہم شعرا کا کلام شامل ہے۔"

پروفیسر صاحب نے خود بھی اس سلسلہ میں خاصا کام کیا ہے۔ جس کی تفصیل انہوں نے ان الفاظ میں بیان کی۔

"میں نے کرشن چندر کی تیرہ کہانیاں ایک مجموعے کی صورت میں ۵۷ء میں شائع کی تھیں۔ اقبال اور فیض کے کلام کا بیشتر حصہ بھی چیک زبان
میں منتقل کر چکا ہوں۔" پروفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ چیکوسلواکیہ کے علمی جرائد میں پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور ادب کے بارے میں مضامین
ہوتے رہتے ہیں۔ "باغ و بہار" کا ترجمہ بھی زیر طبع ہے جو پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوگا۔

خبرنامہ

(اطرافِ عالم)

اہور میں یوم ظفر علی خاں منایا گیا

۲۷ نومبر کو لاہور میں بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کو شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وزیر ریلوے مسٹر عبدالوحید خاں نے مشورہ دیا ہے کہ مولانا مرحوم کے بارے مقالات اور ان کی نگارشات کے مجموعے شائع کئے جائیں تاکہ اسلام کے اس بطل جلیل کی قومی خدمات سے نئی پود کو موثر طور پر روشناس کرایا جائے۔

مولانا ظفر علی خاں کی یاد میں یونیورسٹی پریس کلب کے زیر اہتمام مرکز تعمیر نو میں ایک جلسہ آج تیسرے پہر منعقد ہوا اس میں مولانا صلاح الدین احمد، حکیم احمد شجاع اور ڈاکٹر اسلام خورشید نے مقالے پڑھے مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے تقریر کی۔ اس اجتماع میں مولانا ظفر علی خاں کی غیر سیاسی شاعری، عشق رسول، جذبہ حریت، قومی زندگی ہمہ جہتی جدوجہد، صحافت، منفرد اسلوب نگارش پر مقررین نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

وزیر ریلوے مسٹر عبدالوحید خاں نے مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی کے چند واقعات سنائے۔ آپ نے کہا کہ مولانا مرحوم کی زندگی کے حالات فی الحقیقت ان سیاسی تحریکوں کے خات ہیں جن سے وہ وابستہ رہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی ادبی و سیاسی زندگی میں امتیاز مشکل ہے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تحریکوں میں مولانا مرحوم صف اول میں تھے تمام عرصے میں انہوں نے عوام کو ایک نصب العین کی نشاندہی کی اور ان کے جذبات کی ترجمانی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں مسلم لیگ وہ مردانِ حُر ہیں جنہوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کا طلسم توڑا تھا۔ مسٹر عبدالوحید خاں نے پیش کش کی کہ اگر مولانا مرحوم کی سوانح اور نگارشات کے مجموعے شائع کئے جائیں تو وہ کے مصارف میں جزوی طور پر حصہ لینے کو تیار ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے غیر سیاسی شاعری کے موضوع پر اپنے مقالہ میں کہا کہ یہ صنف سخن کسی بیرونی تحریک کے بغیر قلب کی خلوتوں میں جنم لیتی ہے اس میں شاعر ذہنی جوش و خروش کے پہلو بہ پہلو ایک فطری موسیقی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ نے کہا تاریخ اسلام پر کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ کو چھوڑ کر اور شبلی کے سوا بیشتر شعرا کا اس موضوع پر کلام وہ مقام حاصل نہیں کر سکا جس کا شرف مولانا ظفر علی خاں نے پایا ہے آپ نے مزید کہا کہ مولانا نے عام فضا سے ہٹ کر جو نظمیں ی ہیں وہ ایک خاص شعری ادا اور سلیقہ کی رچی بچی کیفیت رکھتی ہیں۔

حکیم احمد شجاع نے مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی و صحافی زندگی کو ایمان کی آزمائش میں بے جگری اور حوصلہ مندی کا مظہر قرار دیا اور کہا کہ انہوں نے مسلم آزار خارجی ت اور اپنوں کی دل شکن مخالفت کے دور میں کلمۂ حق بلند کیا اور اپنے مسلک کے مطابق طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے، وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اس لئے ہندی مسلمانوں علاوہ ترکی، فلسطین، عراق، بلقان اور مراکش کسی بھی جگہ اگر مسلمان کو تکلیف پہنچتی تو وہ مضطرب ہو جاتے، وہ فطری صلاحیتوں کے پیکر عظیم اور عشق رسول میں سرشار تھے

مولانا نصراللہ خاں عزیز نے ہندوستانی مسلمانوں کے دو مکاتیب فکر کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مولانا ظفر علی خاں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی لیکن انہوں نے علمائے دیوبند سے اسلام کا ادب بے باکی کے علاوہ حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی قوم کو بیدار اور منظم کرنے کا جذبہ پایا۔ یہی دونوں مدرسہ ہائے فکر ان کی ساری زندگی پر محیط ہیں قابلیت علی گڑھ سے لی، مزاج اور روح کا جوش دیوبند کے علمائے کی۔ انہیں اسلام سے گہری محبت تھی اور وہ عمر بھر اسی جوش اور ولولے سے قوم کی خدمت کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے "ستارۂ صبح" کے پہلے پرچے کے چند اقتباسات پیش کئے اور کہا کہ ستارۂ صبح علم و ادب کا نادر مخزن تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کی یاد میں اخبار فروشش یونین کے زیر اہتمام اخبار مارکیٹ میں بھی ایک جلسہ ہوا جس میں بابائے صحافت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مولانا کوثر نیازی نے تقریر میں کہا کہ مولانا صرف ایک اخبار نویس ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے انگریزوں کے پر آشوب دور میں آزادی کا نعرہ بلند کیا اور قوم کو سیاسی راہنمائی دی۔ آپ عشق رسول میں سب سے آگے اور مست ہونے کے علاوہ انہیں زبان پر بھی پورا عبور تھا۔ آپ نے کہا کہ ہمیں اپنی قوم کے محسنوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئیے لیکن اس طرح سال کے سال یوم منانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اس طرح تو ہم ماتم گساروں کی قوم بن جائیں گے۔ آپ نے کہا کہ ہمیں مولانا کے نعرہ حریت کو بلند کرنا چاہئیے اور اب اپنے ملک کے استحکام اور بحالی صحیح جمہوریت کی جانب توجہ دینی چاہئیے۔ آپ نے اس سلسلے میں اخبار نویسوں پر زور دیا کہ وہ مولانا کی طرح اس نازک دور میں قوم کی رہنمائی کریں۔

خوشنویس یونین لاہور کے جنرل سیکرٹری پیر عبدالحمید نے مولانا ظفر علی خاں اور روزنامہ "زمیندار" کے ابتدائی ایام پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا کہ مولانا نے جس دور میں مسلمانوں کی رہنمائی کی ان دنوں کسی کو انگریز کے خلاف بولنے کی جرأت نہ تھی۔ روزنامہ وقت کے ایڈیٹر خواجہ یاسین بٹ نے کہا کہ بابائے صحافت کی مجاہدانہ تقاریر اور حریت آفریں تحریروں نے ہندوستان کے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کیا۔ ان میں آزادی کی روح پھونکی اور انہیں ایک نئی منزل کی جانب گامزن کیا۔ مولانا محمد بخش مسلم نے کہا کہ ملک کے نوجوانوں کو مولانا کے پیغام کو عملی جامہ پہنانا چاہئیے اور ملک کی سالمیت اور آزادی کے لئے ہر ملکی اقدام کرنا چاہئیے

اس جلسے میں مقامی اخبار فروشوں کے علاوہ اخبارات کے ایڈیٹروں اور گوجرانوالہ، پشاور اور بعض دوسرے شہروں کے نیوز ایجنٹوں نے بھی شرکت کی۔

ڈاکٹر غلام یزدانی کا انتقال

۱۲/ نومبر کو حیدرآباد دکن میں ڈاکٹر غلام یزدانی نے اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم سابق ریاست حیدرآباد کے محکمہ آثار قدیمہ کے اور ہندوستان کے اہم ترین ماہر فن سمجھے جاتے تھے انہوں نے یورپ میں آثار قدیمہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور یورپ سے واپسی پر حیدرآباد کے آثار قدیمہ کی نئے سرے سے تحقیقات شروع کی۔ ایلورا اور اجنتا کی سنگ تراشی اور رنگ کاری پر جو انہوں نے کتابیں لکھی ہیں انہیں علمی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

غلام یزدانی مرحوم جہاں ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت سے مشہور تھے وہاں وہ ایک اچھے ادیب اور صاحب طرز مضمون نگار بھی تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے ہم جماعت تھے اور حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا ہموار کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ حکومت ہند نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور علمی خدمات کے صلے میں انہیں "پدم بھوشن" کا خطاب بھی دیا تھا۔

اردو کالج کے لئے صدر کا گراں قدر عطیہ

کراچی۔ اردو کالج اور انجمن ترقی اردو کے اعزازی سیکرٹری مسٹر جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ صدر ایوب کی طرف سے پانچ لاکھ روپے کی خصوصی امداد کی بدولت اردو کالج کی گذشتہ تمام پریشانیاں دور ہو گئی ہیں انہوں نے کہا کہ صدر مملکت کے حکم سے کالج کی مستقل امداد میں بھی نمایاں اضافہ کر دیا گیا ہے اور دو لاکھ روپے زیادہ رقم کالج کی تعمیر کے لئے دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کالج کو خصوصی ادارہ کا امتیاز دیا گیا ہے اور اسے عنقریب رہائشی کالج بنا دیا جائے گا۔

کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز نے اپنے اجلاس میں مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل گورننگ باڈی منتخب کی ہے۔ انجمن کے صدر مسٹر اختر حسین، مغربی پاکستان ہائیکورٹ
اور جسٹس [illegible]

۔۔۔ے انجمن کے کتب خانہ خاص کی دیکھ بھال اور ترقی کے لئے ۲۵ ہزار روپے دیئے گئے ہیں۔

لاہور میں یوم سرسید

۱۷ اکتوبر کو علی گڑھ کے طلبائے قدیم کے ایک اجلاس میں سرسید احمد خاں مرحوم کو نہایت شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ یہ اجلاس مرکز تعمیر نو میں یوم سرسید کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ صدارت کے فرائض سابق جسٹس مسٹر خورشید الزماں نے انجام دیئے۔

سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تعمیر نو کے ڈپٹی ڈائرکٹر مسٹر فضل حبیب نے کہا۔ "سرسید احمد خاں کی زندگی کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے مفاد یا اپنی منفعت کو قربان کر دیتے تھے جبان کے مشن میں ان کا ہم نوا ہوتا اس کے ساتھ ہو جاتے اور جو کوئی مقصد کی راہ میں حائل ہوتا اس سے کٹ جاتے۔ سرسید احمد خاں اپنی پرخلوص مساعی اور قربانی سے اپنی عظمت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔"

جسٹس خورشید الزماں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ سرسید احمد خاں ہندی مسلمانوں کے سب سے بڑے محسن تھے جنہوں نے مسلمانوں کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ان احسانات کا اعتراف کیسے کرتے ہیں۔ آپ نے کہا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ لاہور جیسے بڑے شہر میں جہاں ۵ ہزار کے قریب اولڈ بوائز موجود ہیں صرف ۵۰ کے قریب حاضرین یہاں موجود ہیں آپ نے کہا یہ صورت حال زندہ قوموں کے شایان شان نہیں۔ ہمیں کوئی ایسی یادگار قائم کرنی چاہیئے جو سرسید کا نام زندہ رکھے ورنہ دو نسلوں کے بعد قوم کو سرسید کا نام بھی یاد نہیں رہے گا۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ اسکولوں کے نصاب میں سرسید کی زندگی سے متعلق بھی ایک باب شامل کیا جائے۔ آپ نے کہا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ علی گڑھ اولڈ بوائز پارٹی بازی اور انتشار کا شکار ہو گئے ہیں۔ اپنی تقریر کے اختتام پر مسٹر خورشید الزماں تشریف لے گئے اور مسٹر عبد الحمید خاں ریٹائرڈ کلکٹر کسٹمز نے کرسی صدارت سنبھال لی۔

مسٹر طہٰ اے قریشی نے تقریر کرتے ہوئے کہا اسکول اور کالج کھولنے سے سرسید کا نام زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ قوم میں اس خوابیدہ جذبہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ نامساعد سے نامساعد حالات سے ٹکر لینا ہی زندگی ہے۔ سرسید کی آخری یادگار پاکستان ہے اگر ہم نے اس جذبہ کو عام نہ کیا تو ملک بے اثر، بے جان اور بے رنگ ہو کر رہ جائے گا۔ ہمیں دانشمندی سے نامساعد حالات کا مقابلہ کر کے اپنے دشمنوں کو اپنے موقف کی صداقت کا قائل کرنے کا ڈھنگ سیکھنا ہوگا۔ سابق پرنسپل ڈاکٹر عابد احمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر ہم سرسید کے متعین کردہ خطوط پر ایک ہائی اسکول ہی بنا ڈالیں تو قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ آپ نے کہا سرسید کے مشن کو عام کرنے کے لئے ہمیں ملک کے نوجوانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہوگا۔

"اقبال اور گوئٹے نے پاکستان اور جرمنی کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے" (صدر مغربی جرمنی)

لاہور۔ مغربی جرمنی کے صدر ڈاکٹر لیبکے نے آج شام یہاں شالامار کے تاریخی باغ میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے دی گئی ایک استقبالیہ دعوت میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور مغربی جرمنی کو روحانی اور ذہنی لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب لانے میں حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال اور جرمنی کے ممتاز فلسفی شاعر گوئٹے نے نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ آپ نے توقع ظاہر کی کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اور قریب آ جائیں گے۔

جرمنی کا شہرہ آفاق فلسفی اور شاعر گوئٹے اہل مشرق کے ان کارناموں سے بہت متاثر تھا جو انہوں نے ثقافت کے میدان میں دکھائے ہیں چنانچہ اس نے انہیں سے متاثر ہو کر ایک شہرۂ آفاق دیوان لکھا جس کے آغاز میں اس نے بحروف عربی "بسم اللہ" لکھی تھی۔

صدر لیبکے نے شاعر مشرق علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے لاہور میں وفات پائی۔ علامہ اقبال جرمنی میں قیام کیا اور ہائیڈل برگ اور میونخ یونیورسٹیوں میں حصول تعلیم کے زمانے میں جرمنی کی ثقافت سے روشناس ہوئے وہ گوئٹے کے بہت مداح تھے۔ گوئٹے کے نام علامہ اقبال نے اپنی نظمیں بھی منسوب کیں اور تاحیات گوئٹے کے فلسفیانہ خیالات سے روشنی حاصل کرتے رہے۔ دو قوموں کے درمیان ثقافتی رابطے کی اس سے بہتر مثال اور کوئی نہیں مل سکتی۔

ں نے ملوں قوموں کو روحانی اور ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے

راچی میں کتابوں کی نمائش

کراچی۔ ۹ ہراکتوبر کی شام کو یہاں تھیوسوفیکل ہال میں پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کی طرف سے کتابوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے
ب الیس کے دہلوی معتمد وزارت خارجہ نے کہا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد اچھے تعلقات استوار کرنا اور تمام اقوام عالم سے تعاون کرنا ہے تاکہ تمام
ملوں کے لئے امن و خوشحالی کی ضمانت ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان صاف گوئی اور خیر سگالی کے راستے پر یقین رکھتا ہے اور قوموں میں خیر سگالی پیدا کرنے
کے لئے اخلاقی طریقوں کے استعمال پر بھروسہ کرتا ہے انھوں نے کہا کہ دفتر خارجہ اور پاکستان کے دیگر ممالک میں سفارت خانے اس مقصد کے حصول کی کوشش میں مصروف
ہیں انھوں نے نمائش منعقد کرنے پر پاکستانی پبلشروں کی زبردست تعریف کرتے ہوئے کہا کہ قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کتابیں بڑا اہم کردار ادا کرتی رہی
ہیں انھوں نے بابائے اردو کو بھی زبردست خراج عقیدت پیش کیا جن کی کتابیں نمائش میں رکھی ہوئی تھیں انھوں نے کہا کہ وہ اردو کے عظیم اسکالر تھے اور ان کا عقیدہ
تھا کہ کتابیں آدمی کی بہترین اور مستقل دوست ہیں کتابوں کے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان خیر سگالی اور تعاون کے نظریے کو ترقی دی جا سکتی ہے۔

اردو ڈراموں پر انعامات

ادارہ تعمیر نو مغربی پاکستان کی طرف سے ڈراموں کا جو انعامی مقابلہ منعقد ہوا تھا اس میں حسب ذیل مصنفین کو بالترتیب پانچ سو، تین سو اور دو سو روپے
کے انعامات دیئے گئے

آغا ناصر	ڈرامہ	"گھر کی رونق"
انور عنایت اللہ	"	"صبح کا بھولا"
رحیم گل	"	"خونی چٹان"

پروفیسر سید وقار عظیم، سید امتیاز علی تاج اور اشفاق احمد خاں نے ججوں کے فرائض انجام دیئے۔

دنیا کی سب سے بڑی سائنسی کتابوں کی لائبریری

لندن ۸ر نومبر۔ سائنسی اور صنعتی تحقیقات کے محکمہ کے زیر اہتمام بوسٹن (لنکن شائر) میں حال ہی میں اعلیٰ تر سائنس کا ایک کتب خانہ قائم ہوا۔
اس میں کتابوں کی کل قیمت کا اندازہ ۳۰ لاکھ پونڈ لگایا گیا ہے۔ کتب خانے کی الماریوں میں تقریباً ۲۲ ہزار سائنسی جرائد ہوں گے ان میں سے اکثر آنے شروع ہو گئے
ہیں اور باقی آنے والے ہیں۔ اس لائبریری میں مائکرو فلم کا جو ذخیرہ ہے اس کی لمبائی ۱۲۵ میل ہوگی یہ سب چیزیں لائبریری کے لئے ۱۰۹ ملکوں سے لائی گئی ہیں
اس لائبریری کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کے سائنسدانوں اور ماہروں کو جدید ترین سائنسی ادب جو کہ دنیا کے گوشے گوشے میں تیار کیا جا رہا ہے بذریعہ ڈاک مہیا کیا جا سکے
دس سال میں اس کتب خانے میں اعلیٰ سائنس کی ہر کتاب اور رسالہ مل سکے گا۔

میرپور خاص میں جشن جوش منایا گیا

میرپور خاص میں ۲۶ر نومبر کی رات کو نہایت شاندار طریقے سے جشن جوش منایا گیا۔ جشن جوش کی صدارت ڈپٹی کمشنر تھرپارکر سید عطاء اللہ رضا نے
اور مشاعرے کی صدارت مصطفیٰ زیدی نے کی۔ جشن جوش کا آغاز مولانا ماہر القادری کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا اس کے بعد جناب ... گل ... افتتاحیہ

رسم ادا کی گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر چودھری محمد علی، شاہد احمد اور دیگر حضرات کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ اعظمی اور مجتبیٰ حسین نے مقالے پڑھے۔ سید مصطفیٰ زیدی نے جوش کا تعارف اور استقبالیہ پڑھا۔ جناب جوش ملیح آبادی نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جناب سید مصطفیٰ زیدی کی صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں جوش ملیح آبادی، مولانا ماہر القادری، مصطفیٰ زیدی، رئیس امروہوی، سراج الدین صہبا لکھنوی، مشاعر لکھنوی، عیش ٹونکی، سحر انصاری، اقتدار قدر، منظر احسن، سیف سلطانپوری، قمر صدیقی، وقار اجمیری، انجم اعظمی، اقبال صفی پوری، محسن شکیل احمد ضیا اور دیگر شعرا نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔

قرۃ العین حیدر نے بھارتی شہریت کی درخواست دیدی

باخبر حلقوں کے مطابق پاکستان کی مشہور ناول نگار اور "آگ کا دریا" کی مصنفہ قرۃ العین حیدر نے بھارتی شہریت اختیار کرنے کے لئے حکومت بھارت کو درخواست دی ہے۔ قرۃ العین حیدر اس وقت بمبئی میں مقیم ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ایک بھارتی فلم "ایک مسافر ایک حسینہ" کے لئے مکالمے بھی لکھے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا تیسرا کراسہ

لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی کی ایک اطلاع کے مطابق اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی جلد اول کا تیسرا کراسہ شائع ہو گیا۔ اس میں آسام سے آفی مسجد تک مقالے شامل ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل مقالے مشہور علماء سے خاص طور پر لکھوائے گئے ہیں۔ اور بعض مقالے براہ راست ترکی معارف اسلامیہ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ آشنا، آق سنبر، آفرینہ، آغا خان، آصفی، آصف خاں، آق مسجد، آف تولو نلو۔ اس کراسے کی قیمت بھی ... ہے اور پنجاب یونیورسٹی سیلز ڈپو سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

شاعروں کا فٹ بال کے کھلاڑیوں کے خلاف اعلان جنگ

بوڈاپسٹ ۲۹ اکتوبر۔ ہنگری کے شاعروں نے فٹ بال کے کھلاڑیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ ہنگری کے ایک مشہور شاعر جو باگی نے ایک مقامی میں ہنگری کے شاعروں کی حالت زار کا مقابلہ فٹ بال کے کھلاڑیوں کی پرمسرت زندگی سے کیا ہے جو باگی کا کہنا ہے کہ ہنگری میں صرف ۰۰ شاعر ہیں جن میں بمشکل ۳۰ شاعر ایسے ہوں گے جو ادبی حلقوں میں مقبول ہیں یونیورسٹی کے طالب علم شاعروں سے زیادہ کھلاڑیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور کوئی طالب علم پانچ سے زیادہ شاعروں کے نام نہیں جانتا ہے۔ اس کے جواب میں فٹ بال کے تقریباً ۲۰۰ کھلاڑیوں میں جو پورے ملک میں مشہور ہیں۔ جو باگی نے بتایا ہے کہ فٹ بال کے کھلاڑیوں میں ایک کھلاڑی کو بالکل مفت تنخواہ ملتی ہے وہ اپنی ملازمت پر حاضر نہیں ہوتا دوسرے مشہور کھلاڑی بھی اکثر و بیشتر اپنی ملازمت سے غائب رہتے ہیں لیکن ان سے کوئی جواب طلب نہیں کرتا۔

فیض صاحب کا استعفےٰ آرٹ کونسل نے منظور کر لیا

لاہور ۱۲ نومبر۔ پاکستان آرٹ کونسل کی مجلس منتظمہ کا اجلاس جسٹس ایس اے رحمان کی صدارت میں آج منعقد ہوا۔ کونسل کی سکریٹری شپ سے مستعفی اعزازی فیض احمد فیض کا استعفےٰ منظور کر لیا ہے۔ فیض صاحب کا استعفےٰ چند روز قبل لندن سے موصول ہوا تھا۔ اور اس میں انہوں نے بتایا تھا کہ میں سردست پاکستان واپس نہیں آ سکتا۔ فیض صاحب کوئی چار ماہ قبل امن کا لینن انعام وصول کرنے کے لئے ماسکو گئے تھے اور وہاں سے لندن چلے گئے۔ ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے ایشیائی اور افریقی ادیبوں کی تخلیقات کے چند مجموعے مرتب کرنے کا کام قبول کر لیا ہے جو لندن کا ایک ناشر شائع کرے گا۔

محکمۂ اوقاف کا لائبریری فنڈ

... مغربی پاکستان کے محکمہ اوقاف نے ایک لائبریری فنڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فنڈ سے محکمہ نادر کتابیں اور قومی نوادرات حاصل کرے گا اور ان کی حفاظت کا اہتمام کرے گا۔ یہ محکمہ لاہور میں اسلامی کتابوں کی ایک لائبریری بھی قائم کر رہا ہے۔

شاعر مشرق کی یادگار

شالامار کی تقریب کے دوران مغربی جرمنی کے صدر اور مغربی پاکستان کے گورنر نے تحائف کا تبادلہ کیا۔ ملک امیر محمد خاں نے صدر جرمنی کو شالامار باغ کا خوبصورت نقرئی ماڈل پیش کیا اور ڈاکٹر لیبکے نے صوبائی گورنر کو جرمنی کے ایک شہر رسلنگن کی خوبصورت پینٹنگ پیش کی۔ آپ نے بتایا کہ اس شہر کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پاکستان کے عظیم مفکر اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہ تصویر جرمنی کے ایک مصور نے تیار کی ہے اور یہ علامہ اقبال کی یادگار کے طور پر محفوظ رہے گی۔

بھارتی مورخ ڈاکٹر سین انتقال کر گئے

کلکتہ ۲۰ نومبر۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین (ایس این سین) معروف مورخ اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ۲۰ اکتوبر کو ۷۰ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔ وہ گزشتہ چار سال سے بیمار تھے اور بھارت میں مرہٹوں کی تاریخ پر ایک اتھارٹی تصور کئے جاتے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر بھی ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

”چیکوسلاویکیہ میں پاکستان کے لئے زبردست خیرسگالی پائی جاتی ہے“ (پروفیسر مارک کا بیان)

کوئٹہ ۱۲ نومبر۔ چیکوسلاویکیہ کے پروفیسر جان مارک نے مقامی گورنمنٹ کالج کے لڑکوں کو اردو میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چیکوسلاویکیہ میں پاکستان کے عوام کے لئے بہت جذبہ خیرسگالی پایا جاتا ہے انہوں نے بتایا کہ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چیکوسلاویکیہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں اردو اور فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے ملک کے عوام پاکستان کے ادب اور یہاں کی تہذیبی زندگی سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے شستہ اردو میں لڑکوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاکستان آنے کا مقصد یہ ہے کہ میں پاکستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی سے آگاہی حاصل کروں۔

انہوں نے کہا کہ میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا دورہ کر رہا ہوں تاکہ ان ملکوں کے حالات معلوم کر سکوں۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں چیکوسلاویکیہ کے عوام کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے مجموعہ کلام ”پیام مشرق“ اور ان کی غزلیات کا ترجمہ چیکوسلاویکیہ کی زبان میں کیا جا چکا ہے۔

اردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی جلسہ

حیدرآباد ۲۹ اکتوبر۔ اردو مجلس حیدرآباد (دکن) کا ماہانہ ادبی جلسہ اتوار ۲۶ اکتوبر کو شام کے ۵ ½ بجے اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر راج کشور ریڈر شعبہ ہندی جامعہ عثمانیہ نے صدارت کی اور رائے جانکی پرشاد صاحب صدر اردو مجلس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا اور انہیں پھول پہنائے۔

مسٹر غلام ربانی نے ”کھڑی بولی“ کے زیر عنوان اپنا تحقیقی اور عالمانہ مضمون سنایا اور تاریخی اور لسانی ماخذات کے حوالوں سے کہا کہ ”ہندوستان میں جس طرح کی زبانوں اور بھانت بھانت کی بولیوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے اور ہر بارہ کوس پر پانی اور وانی بدل جاتے ہیں یہ کہاوت عملی پر پوری اترتی ہے“

جوہر یانی، برج، میواتی اور کھڑی بولی کا سنگم ہے۔ اور یہ چاروں زبانیں الگ الگ روپ میں بھی اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ مال جاتی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔"

کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر غلام ربانی نے کہا کہ "کھڑی بولی جس علاقے میں بولی جاتی ہے اس کا کوئی نام نہیں برج بھاشا والوں نے طور پر اسے کھڑی بولی کہنا شروع کیا۔ جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یہ زبان اپنے قدیم رنگ روپ میں موجود تھی، مگر اس کا کوئی نام نہیں مسلمانوں نے اس کو دہلوی کہا۔ یہ زبان گجرات میں گجری، دکن میں دکھنی، ہندی اور ریختہ بھی کہلائی۔" کھڑی بولی کے مولد و مسکن اور اس زبان کے ادب کی اشارہ کرتے ہوئے مسٹر غلام ربانی نے کہا کہ "کھڑی بولی مغربی روہیل کھنڈ اور دوآبہ کے شمالی حصے میں رائج تھی جس میں مرادآباد، بجنور، میرٹھ اور سہارنپور کے ضلعے شامل تھے۔ دہلی اور گڑگاؤں کا مشرقی حصہ بھی اس کے رقبے میں شامل تھا۔ اس کے رواج دینے میں صوفیوں اور درویشوں کا بڑا ہاتھ چنانچہ کھڑی بولی کی نثر کی پہلی کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" ہے اس زبان کو اس بات کا بھی امتیاز حاصل رہا ہے کہ شاعری کی ابتدا گولکنڈہ اور بیجاپور کے فرماں رواں سے ہوئی۔"

محفل شعر و سخن میں متین سروش، حکیم یوسف حسین خاں، طالب رزاقی، ایڈورڈ ریحانی، خورشید نذیر، دفا رخلیل، مسافر نلگنڈوی، صلا نیتر، کرن پرشاد کرن، فیض الحسن خیال، ناز حیدر، غم کرنولی اور یار جامی نے تازہ کلام سنایا۔

ڈاکٹر راج کشور پانڈے نے صدارتی تقریر میں کہا کہ "کھڑی بولی کا پہلا شاعر امیر خسروؒ ہے ان سے پہلے کھڑی بولی کے دو شاعر شرف بوعلی قلندر اور بابا فرید گنج شکر بھی گزرے ہیں۔ رحیم خان خاناں کی تحریروں میں بھی کھڑی بولی کے اثرات ملتے ہیں۔ اردو اور ہندی کا ادب ملی جلی زبان زیادہ فروغ پائے گا اور ہم سبھوں کو اس طرف توجہ کرنے کی آج کے حالات میں سخت ضرورت ہے۔"

مسٹر محمد منظور احمد معتمد اعزازی اردو مجلس کے شکریہ پر جلسے ختم یہ اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچا۔

ادارۂ مصنفین پاکستان

حلقۂ مغربی پاکستان

شعراء کی حق تلفی، حلقۂ مغربی پاکستان کی عاملہ کی قرارداد

ادارۂ حلقۂ مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ اس امر پر شدید افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ ریڈیو پاکستان کے ارباب اختیار ہمارے ان شعراء کی سا کر رہے ہیں جو قسلم سے وابستہ ہیں۔ مجلس عاملہ کو بڑی حیرت ہے کہ فرمائشی پروگراموں میں فرمائش کرنے والے ان بیسیوں افراد کا نام تو نشر کر دیا جاتا ہے جن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس نغمے کے خالق کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا جاتا۔ یہ صورت حال نہ صرف شعراء کی توہین کے مترادف ہے بلکہ شہرت کو نقصان پہونچانے کی نادانستہ شکل بھی سامنے آتی ہے۔ اس لئے مجلس عاملہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس کرنے کے لئے تمام ریڈیو اسٹیشنوں کو ہدایت کریں کہ فلمی نغموں کے ساتھ شعراء کا نام بھی نشر کیا جایا کرے۔

حلقۂ کراچی

تعزیتی قراردادیں

نمبر (۱)۔ ادارہ مصنفین پاکستان حلقۂ کراچی کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ سابق چیف جسٹس مسٹر ایم آر کیانی کی وفات پر اپنے دلی رنج و

لقے کی رائے میں جناب کیانی صاحب ملک کے ایک لائق جج، معتدل منتظم، ایک صاحب طرز ادیب اور بیباک مقرر تھے۔ ان کی وفات سے ملک و ملت کو
ان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ یہ جلسہ ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت
ے۔

بر(۲) ادارہ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جناب نوح ناروی اور جناب قابل اجمیری کی وفات حسرت آیات
دغم کا اظہار کرتا ہے۔ خدا مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ذیلی حلقہ نوابشاہ

اردو لائبریری کا قیام

۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء کو نوابشاہ میں بابائے اردو لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ یہ لائبریری یونین کمیٹی نمبر ۲ نے اپنے علاقے میں قائم کی ہے۔ اس کا
مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی نے کیا اور تقریب افتتاح کی صدارت جمیل الدین عالی مرکزی معتمد ادارہ مصنفین نے کی۔ عالی صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان
نفین، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، لارک پبلشرز کراچی اور مکتبۂ اسلوب کراچی کی طرف سے تقریباً تین سو علمی و ادبی کتابیں تحفتاً پیش کیں۔ اسی روز
ختر انصاری اکبرآبادی کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شمس زبیری، نظر جعفری، م م فرشوری، طفیل احمد جمالی، حماد انصاری، اختر
دی اور دیگر شعرا نے شرکت کی۔

ذیلی حلقہ کوہاٹ

پاکستان رائٹرز گلڈ اور انجمن ترقی اردو کوہاٹ کا ایک مشترکہ اجلاس زیر صدارت کرنل صفدر دفتر ہمدم کوہاٹ میں بتاریخ ۱۹ نومبر جسٹس کیانی مرحوم
ے میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل قراردادیں اور تجاویز منظور کی گئیں۔
پہلی قرارداد میں جسٹس کیانی مرحوم کی ناگہانی موت کو ملک و ملت کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت
ے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ دوسری قرارداد میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے درخواست کی گئی کہ تاندہ بند کے افتتاح کے موقع
س کا نام "جسٹس رستم بند" تجویز فرمایا جائے۔
تیسری قرارداد میں بلدیہ کوہاٹ سے استدعا کی گئی کہ وہ شہر کی کسی موزوں شاہراہ کو جسٹس کیانی کے نام سے موسوم کرے۔
یہ تجویز بھی قرارداد میں شامل کی گئی کہ جسٹس کیانی مرحوم کی شایان شان یادگار قائم کی جائے۔ نیز شہر کے کسی موزوں مقام پر ان کے نام پر ایک دارالمطالعہ
قائم کیا جائے۔

آخر میں یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کو کمپنی باغ کوہاٹ کے وسیع سبزہ زار میں بعد نماز ظہر یوم جسٹس کیانی منایا جائے کیونکہ اس دن
رحوم نے اہل کوہاٹ کو خطاب کرنے کی دعوت منظور کی تھی۔ جس کی تیاریاں بڑے اہتمام سے کی جا رہی تھیں۔
اس اجلاس کی صدارت آغا شورش کاشمیری مدیر "چٹان" لاہور کریں گے اور اس اجلاس میں شرکت کے لئے جناب احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی
کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔

پنجابی لسانی گروپ (لاہور)

رپورٹ ۔ اکتوبر نومبر ۶۲ء

۱۔ گروپ نے پنجابی زبان و ادب سے متعلق لائبریری کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی کام شروع کر دیا ہے۔ عنقریب ایک منصوبے کے تحت کام شروع کیا جائے گا۔ جس میں تفصیل کے ساتھ لائبریری کے قیام اور بجٹ وغیرہ کے متعلق طے کیا جائے گا فی الحال وہ کتابیں اکٹھی کی جا رہی ہیں جو عطیہ کے طور پر مصنفین اور ادارے عنایت کریں گے۔ اب تک پنجابی ادبی اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر محمد باقر نے لائبریری کی طرف سے اور جناب تنویر عباسی (سیکریٹری سندھی گروپ) نے اپنے گروپ کی طرف سے پنجابی گروپ کو کچھ کتابیں عنایت کی ہیں۔ انفرادی طور پر بھی یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

۲۔ اراکین کے نام جو سوالنامہ بھیجا گیا تھا اس کے جواب آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان تفصیلات کے فراہم ہو جانے پر گروپ دوسرے اداروں اور ناشروں سے تعلق قائم کرے گا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ان معلومات کو نشر کرتا رہے گا تاکہ ضرورت مند اصحاب خود رکن متعلقہ سے تعلق قائم کر سکیں۔

۳۔ گروپ کے متعدد اجلاس ۱۲ اکتوبر سے شروع ہو گئے ہیں۔ دو مہینے کے پروگرام اکٹھے شائع کئے جاتے ہیں۔ اور دو ماہی کا آغاز سمپوزیم اور مشاعرہ اختتام کسی ایک سربرآوردہ پنجابی ادب کے ساتھ شام منانے کے ساتھ ہوتا ہے۔ باقی پروگرام دوسری ادبی مجلسوں کی طرز پر ہوتے ہیں۔ راجہ رسالو صاحب نے مقامی اجلاس Conduct کرنے کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

۱۲ اکتوبر کے سمپوزیم کا موضوع "ہماری مشکل اور حل" تھا۔ صدارت مسٹر سنتام محمود نے کی۔ مقررین میں منیر نیازی، ڈاکٹر محمد افضل، جوشوا فضل، رفیع پیرزادہ، اور رؤف ملک شامل تھے۔ انتظار حسین صاحب نے اہل اردو کی طرف سے ان مشکلات کا ذکر مضمون کی صورت میں کیا جو پنجابی کلچر کی تفہیم میں پیش آتی ہیں۔ سمپوزیم کی روداد مقامی اخبارات کے علاوہ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے ۱۴ ستمبر ۶۲ء کے شمارے میں چھپ چکی ہے۔ ادارہ لیل و نہار نے اس سمپوزیم پر مباحثہ بھی شروع کرا دیا ہے۔

۱۹ اکتوبر کے اجلاس میں شاد امرتسری صاحب کو مضمون پڑھنا تھا تشریف نہ لائے۔ سعید مرزا کی جگہ اکرم بٹ نے ڈرامہ پڑھا اور قتیل شفائی صاحب نے گیت پیش کیا۔ صدارت صوفی تبسم صاحب نے کی۔ اس اجلاس میں مرکزی سیکریٹری مسٹر جمیل الدین عالی بھی موجود رہے۔

۲۶ اکتوبر کے اجلاس کی صدارت اشفاق احمد نے کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مضمون، شفقت تنویر مرزا نے نظم اور عزیز اثری نے مزاحیہ مضمون پڑھا۔ ۲ نومبر، صدر قتیل شفائی تھے۔ محمد آصف خاں نے مضمون، تابش رضوی نے نظم اور جوشوا فضل الدین نے کہانی پیش کی۔ نومبر کے مہینے کے پروگرام گزشتہ شمارہ میں چھپ چکے ہیں۔ دسمبر کے پروگرام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۷ دسمبر — سمپوزیم اور مشاعرہ

۱۴ دسمبر — صدر مسٹر سنتام محمود — مضمون منیر احمد شیخ
نظم وحید الطہر — کہانی اشفاق احمد

۲۱ دسمبر — صدر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — مضمون نذر الحق محمود
نظم احمد ندیم قاسمی — کہانی محمد آصف خاں

۲۸ دسمبر — صدر منیر نیازی — مضمون ناصر کاظمی
نظم ریحان قیوم — کہانی اکمل علیمی

قدیم طبی دانش اور جدید تحقیق
کے مطابق تیار کیا ہوا
قوت بخش ٹانک
ماءاللحم
(دوآتشہ)
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - چاٹگام - لاہور

پونر پری آکاس

شیخ ایاز

پاکستان رائیٹرز گلڈ

فوری خدمت

— اور وہ بھی گھر بیٹھے

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بسنے والے کروڑوں آدمیوں کو مٹی کے تیل کی ضرورت ہے چنانچہ برماشیل کا عملہ ہمہ وقت اس بات کیلئے کوشاں رہتا ہے کہ آپ کی ضرورت گھر بیٹھے ہی پوری ہو سکے۔
آپ کی مزید سہولت کیلئے برماشیل نے جابجا "کیروسین فلنگ اسٹیشن" بھی بنائے ہیں تاکہ آپ حسب ضرورت مٹی کا تیل خرید سکیں۔

برماشیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

(برماشیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(پاکستان میں قائم شدہ۔ کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود)

BSP 47
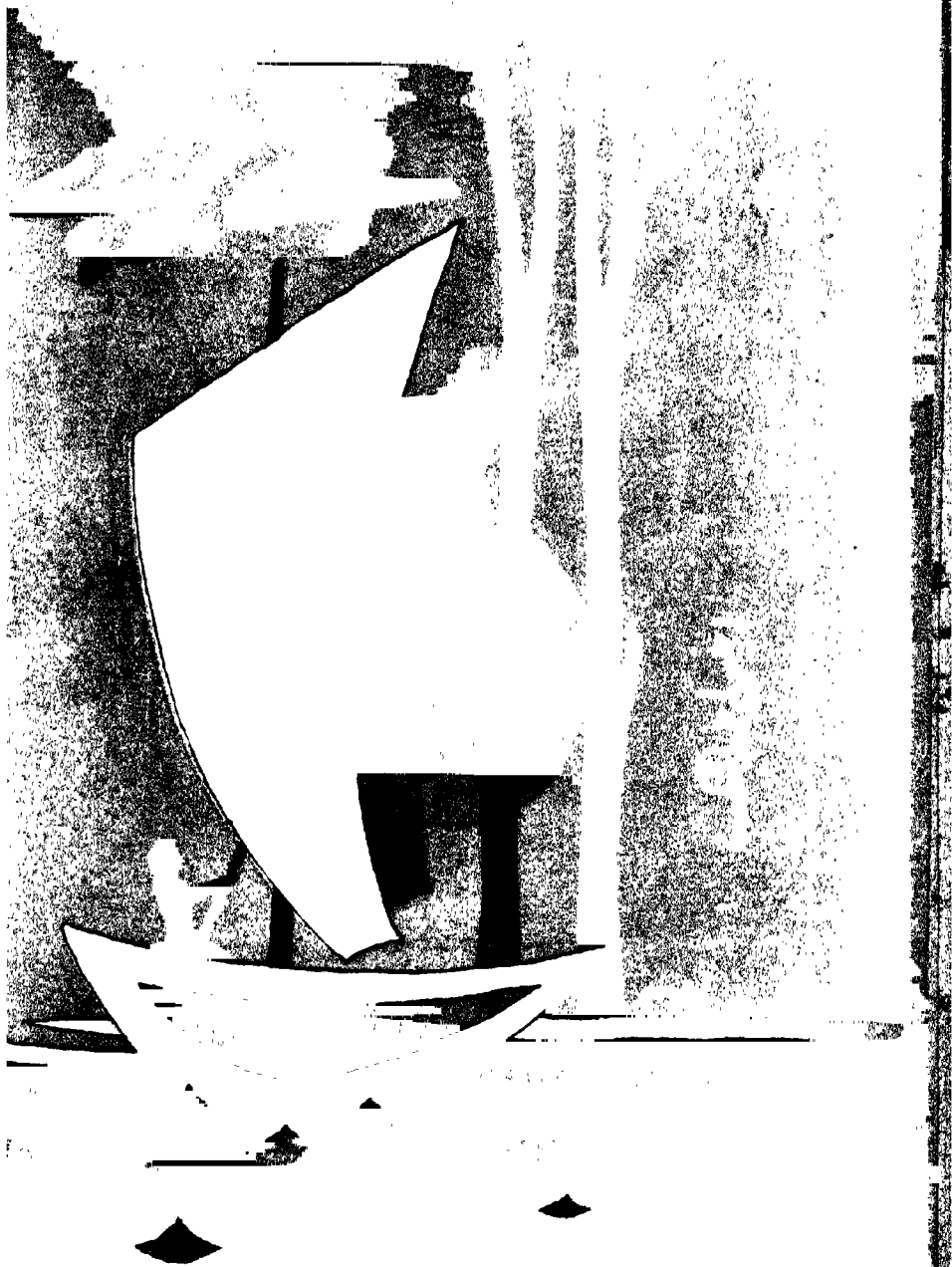
اِدارۂ مصنفین پاکستان

عوام کی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں کو باطل اوہام و عقائد کا مرکز بنا دینا کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے کردار جا بجا نظر آتے ہیں۔ جو ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو "مزار پرستی" کا خوگر بنا دیتے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم سے نہیں بیگانہ رکھتے ہیں "لال چادر" ایک ایسے ہی مزار کی چادر ہے جس کا مجاور سادہ دل عوام کو مافوق فطرت کرشموں سے اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ سید ولی اللہ نے عوامی زندگی کے اس خاص پہلو کو بڑی خوبی سے اپنے ناول میں پیش کیا ہے ناول کے یہ جملے ہماری سماجی زندگی کی کتنی واضح تصویر ہیں: "جب گھروں میں ڈھیروں دھان جمع ہو جاتے تو پیر کا سفر شروع ہوتا۔ ان کی ہر جگہ خوب خاطر و مدارات ہوتی لیکن جب قحط پڑھتا اور گھروں میں چاول کا ایک دانہ تک نہیں ہوتا تو یہ پیر صاحبان اپنے مریدوں کو دلی تسکین دینے کے لئے بھی اپنے گھروں سے نہیں نکلتے تھے"

یہ ناول اسی اجمال کی تفصیل ہے اور اسمیں جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے عوام کی سادگی اور مذہب کے نام پر غلط اور مضرت رساں رجحانات کو فروغ دینے والوں کی سیرت کشی کی گئی ہے۔ صفحات ۲۰۴، قیمت ۱ روپے ۵۰ روپے۔

گلڈ اشاعت گھر اسٹریچن روڈ کراچی
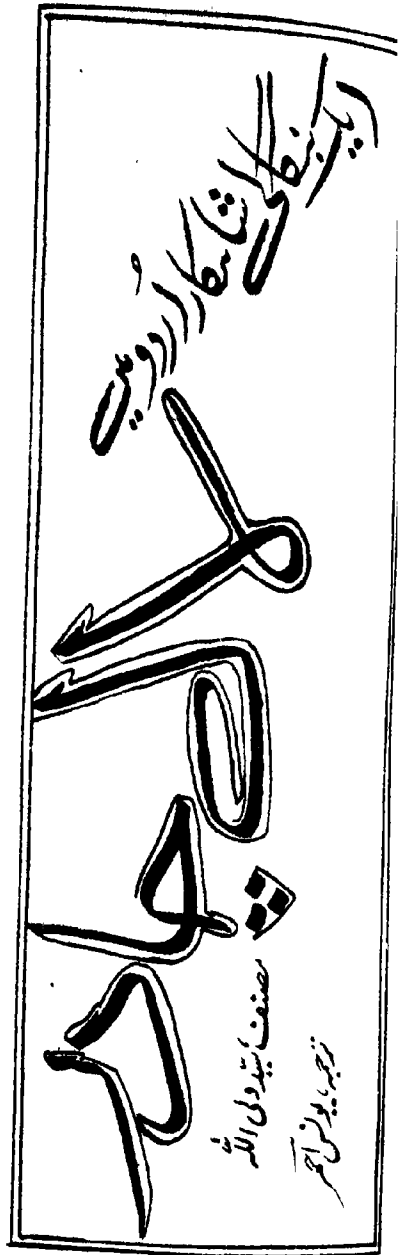
ہاجرہ مسرور نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی "فنی سلیقہ مندی"
کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانے ہمارے ادب میں
مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو کو جو افسانہ نگار دیئے ہیں ان
میں ہاجرہ مسرور اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ انھوں نے روشِ عام کی پیروی میں "فن"
اور "صحافت" کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا اور فن کے تقاضوں کو "ہنگامی
تقاضوں" پر ترجیح دی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری خوب سے خوب تر کی
تلاش میں سرگرداں ہے جس کا واضح ثبوت ان کا نیا افسانوی مجموعہ "تیسری منزل" ہے
اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع کرداروں
کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ہاجرہ مسرور کا مشاہدہ بہت وسیع ہے
وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہیں جس کا اندازہ اس مجموعے کے ہر افسانے
سے ہوتا ہے ——— ان کا اندازِ بیان بہت جاندار ہے اور جہاں کہیں وہ
طنز و مزاح سے کام لیتی ہیں۔ وہاں یہ رنگ اور بھی نکھرتا ہے۔

صفحات ۳۷۶ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

(۱) قاموس الکتب ، (جلد اوّل) مذہبیات سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اُردو کتابوں کی مکمل فہرست صفحات (۱۴۰۰) سائز $\frac{۲۰+۳۰}{۸}$ قیمت چالیس روپے

داستان زبان اُردو — ڈاکٹر شوکت سبزواری — قیمت پانچ روپے

جیتا جاگتا — اندلس کے فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حیّ بن یقظان" کا ترجمہ از ڈاکٹر محمد یوسف [illegible] قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

مُلّا نصرتی — (ملک الشعراء بیجاپور) بابائے اُردو۔ قیمت پانچ روپے

اُردو تنقید کا ارتقا — ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ — قیمت سات روپے

سر و انجم — مارٹن ڈیوڈسن کی کتاب کا ترجمہ از ثناء الحق صدیقی۔ قیمت چار روپے ۵۰ پ[illegible]

خیالات عزیز — عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ۔ — قیمت چار روپے پچاس پیسے

رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری۔ — ڈاکٹر لطیف حسین ادیب۔ قیمت چھ روپے ۵۰ پیسے

قدیم اُردو — بابائے اُردو۔ — قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

مضامین سلیم — (تین جلدوں میں) وحید الدین سلیم کے نایاب مضامین کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے ۵۰ پیسے

رومیو جولیٹ — شیکسپیئر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ از عزیز احمد قیمت ۵ روپے

فاؤسٹ — گوئٹے کے شاہ کار کا منظوم ترجمہ۔ از مولوی عبد القیوم با[illegible] مرحوم۔ قیمت پانچ روپے۔

داس کیپٹال — (حصہ اول) کارل مارکس کی عہد آفرین کتاب کا ترجمہ از سید محمد [illegible] قیمت سات روپے ۵۰ پیسے

فن شاعری — بوطیقا از ارسطو کا ترجمہ مع حواشی از عزیز احمد۔ قیمت دو روپے [illegible]

اردو تھیٹر — (جلد اوّل) از ڈاکٹر عبد العلیم نامی۔ قیمت سات روپے

اُردو تھیٹر — (جلد دوم) " " " " " " "

مرحوم دہلی کالج — بابائے اُردو۔ — قیمت ۴ روپے

ملنے کا پتہ

اُردو اکیڈمی سندھ

بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

عبدالعزیز خالد کی تصانیف
سرودِ رفتہ :-
یونان کی "ریحان نفس ولالہ رخ وسنبل مو شاعرہ سیفو"
مسحور کن اور متحیر کرنے والے نغمات اُردو نظم میں
قیمت چار روپے
گلِ نغمہ :-
بنگلہ زبان کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب کا
قیمت چار روپے
سلومی :-
دوسرا ایڈیشن - نظر ثانی کے بعد مع اضافہ ترنم (زیر طبع)
ورقِ ناخواندہ :-
ترتیلی تمثیلیں (زیر طبع)
دُکانِ شیشہ گر
منظوم ڈرامے۔ قیمت ۲ روپے
زنجیرِ رمِ آہو
منظومات اور غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت ۲ روپے
مشتاق بک ڈپو
شیلٹن روڈ ـــ نزد اردو کالج ـــ کراچی نمبر
(۱)
مارُوی کے دیس میں
(وادیٔ مہران کی عوامی کہانی)
(۲)
ریگزار کے موتی
(چند اہلِ قلم کی منتخبہ تخلیقات کا مجموعہ)
(۳)
بابائے اُردو وادیٔ مہران میں
(مرتب :- آفاق صدیقی)
(۴)
سکھر ـ ماضی اور حال (انگریزی)
(تصنیف :- شیخ راز)
(۵)
پیھی پنجھ پاتال
(شیخ راز کا سندھی مجموعۂ کلام)
پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سکھر کی مطبوعات
سول ایجنٹ
آفتاب بک ڈپو
نیم کی چاڑی سکھر

مرزا ادیب نے یک بابی ڈرامے کی صحت مند روایت ہمارے ادب کو دی ہے اور اس طرح اردو ڈرامہ نگاری میں جو گراں قدر اضافہ کیا ہے اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "فصیل شب" تیسرا مجموعہ ہے جس میں نو ڈرامے شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کا فن روز بروز نہایت عمدگی اور خوبی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ یوں تو اس مجموعے کے سبھی ڈرامے اعلیٰ ادبی معیار کے حامل ہیں۔ لیکن "اماں۔ اماں جان" "شیشے کی دیوار" "جمیلہ" اور "کالا آدمی" ایسے ڈرامے ہیں جنہیں اس مجموعے کی جان کہا جا سکتا ہے خصوصیت سے آخر الذکر دو ڈراموں میں تو میرزا ادیب کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ الجزائر کی مجاہدہ جمیلہ کے بارے میں اردو میں بہت سی چیزیں لکھی گئی ہیں لیکن اس ڈرامے سے بہتر کوئی ادبی تحریر منظر عام پر نہیں آئی۔ میرزا ادیب نے جمیلہ کے کردار کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اس ڈرامے سے الجزائر کی جدوجہد آزادی کی داستان بھی پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ "کالا آدمی" رنگ و نسل کی کش مکش کے خلاف ایک پر زور صدائے احتجاج ہے

صفحات ۳۰۸ قیمت چار روپے

مکتبہ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ کراچی

بابائے اردو کی چند لافانی کتابیں

اردو صرف و نحو

اُردو صرف و نحو پر یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل ہے یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جو سائنٹیفک بنیادوں پر لکھی گئی بابائے اُردو مرحوم سے پہلے اس موضوع پر جن مصنفین نے قلم اُٹھایا انھوں نے عربی فارسی زبانوں کی قواعد کو مشعل راہ بنایا اور زبان کے مزاج و منہاج کو نظر انداز کر دیا۔ بابائے اُردو نے عربی فارسی قواعد کو مشعل راہ حد تک پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک اس کی ضرورت تھی انھوں نے اُردو زبان کی خصوصیات کو پوری طرح سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی اور پہلی بار اس حقیقت کا احساس دلایا کہ اُردو قواعد عربی و فارسی کا چربہ نہیں ہے بلکہ بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو صرف اسی سے مخصوص ہیں ——— قیمت دو روپے پچاس پیسے

افکار عبدالحق

مرتبہ

آمنہ صدیقی دایم۔ اے بی ایڈ

جس میں بابائے اُردو کی وہ تمام تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جن میں ادب اور زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے، یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بابائے اُردو کے نظریات اور ذہنی رجحانات پوری وضاحت اور تفصیل سے سامنے آتے ہیں۔ مرتب نے کتاب کے شروع میں طویل اور فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں بابائے اُردو کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب بڑے اہتمام سے ٹائپ میں اعلےٰ درجہ کے کاغذ پر شائع کی گئی ہے

قیمت دس روپے

★

چند ہمعصر

انسان کا بہترین مطالعہ خود انسان ہے"۔ یہ کتاب اسی اجمال کی تفصیل ہے جس میں بابائے اردو نے اپنے ہمعصروں کی شخصیت کے نقوش واضح کئے ہیں قیمت چھ روپے

انتخاب داغ

داغ اک آدمی ہے گرما گرم داغ کی اپنے متعلق یہ رائے سو فیصدی درست ہے، اس پر اتنا اضافہ ضرور ہونا چاہیئے کہ وہ آدمی اور شاعر بھی "گرما گرم" قسم کا تھا داغ نے زندگی کے رومانی پہلو کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں نمایاں کیا ہے اس سے غزل کے حسن میں اضافہ ہوا ہے داغ حسن کا شاعر تھا اس نے زندگی بھر حسن کی پرستش کی اور وہ اس انداز سے کہ مستی اور سوز نے مل کر برابر سمجھا بابائے اردو نے داغ کے کلام کا یہ انتخاب اس جذبے میں کیا تھا جب انسان دنیا پر ایک تماشائی کی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے لیکن اس میں بابائے اُردو تماشائی نہیں بلکہ جزو تماشا ہیں اس وجہ سے یہ داغ ہی کے کلام کا بہترین انتخاب نہیں بلکہ بابائے اُردو کے ادبی ذوق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت ۴ روپے

اُردو اکیڈمی سندھ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ۔ کراچی

روپیہ ہماری معاشیات میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے
اسکی قیمت
کو برقرار رکھیے
ONE RUPEE
منظور شدہ ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰
جاری شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
ادا شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
زر محفوظ ۳۰,۰۰,۰۰۰
زر امانت ۳۰ جون ۱۹۶۲ء تک ۲۳,۵۴,۰۰,۰۰۰
موزوں اور مستعد خدمت
روپیہ بچائیے اور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
میں جمع کیجئے
ہیڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی

ہم قلم

ماہنامہ

ہم قلم

جلد ۳ نمبر ۸

اپریل ۱۹۶۳ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفین پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی اعلیٰ قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دُنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

طابع، ناشر اور مدیر جمیل الدین عالی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ مصنفین پاکستان (کراچی) سے شائع کیا

فہرست

......باعثِ تاخیر

ہم قلم کا یہ شمارہ بھی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے

عام شکایت ہے کہ "ہم قلم" پابندئ وقت سے شائع نہیں ہوتا۔ درست ہے کہ کچھ عرصے سے ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ وہی جو عام طور پر رسائل اب تک بیان کرتے رہے ہیں۔

ہماری کوشش ہے کہ آئندہ ایسا نہ ہو "ہم قلم" وقت پر شائع ہو، اور ظاہری و معنوی طور بہتر ——— ہماری کوششوں کا اندازہ آنے والے شماروں سے ہوگا، جن میں اعلیٰ فن پارے اور علمی و معلوماتی فیچرز پیش کئے جا رہے ہیں۔

"ہم قلم" ادارۂ مصنفین پاکستان کا ترجمان ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہے کہ گوناگوں سرگرمیوں کا ماہانہ جائزہ پیش کرنا۔ اس کے پروگراموں سے اراکین کو باخبر رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں گلڈ کی شاخوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات پابندی سے روانہ کرتے رہیں۔ ادبی محفلوں میں پڑھے جانے والے مضامین نظم و نثر کا انتخاب اشاعت کے لئے بھیجیں اس طرح نہ صرف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ ان میں ادبی تخلیق کی لگن دوچند ہوگی۔

ہم توقع کرتے ہیں کہ قارئین خصوصیت کے ساتھ اراکین گلڈ ہماری ان کوششوں میں نہ صرف تعاون کریں گے بلکہ "ہم قلم" کی توسیع اشاعت میں بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں گے ———

موت سے کس کو رستگاری ہے

——لیکن یہ حقیقت اس وقت بڑی تلخ معلوم ہوتی ہے، جبکہ ایسے لوگ نشانۂ اجل بن جاتے ہیں جن کی زمانے کو ابھی ضرورت رہتی ہے، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع۔ ہماری تہذیب و شائستگی کی زندہ تاریخ تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اسلامی روایت اور مسلم ثقافت سے غیر معمولی شیفتگی تھی۔ خورشید انور جیلانی ہماری علمی سرگرمیوں کی جان —— صابر دہلوی شفیق جونپوری، اُردو شاعری کی آبرو تھے —— پھر ابھی حال میں اطلاع ملتی ہے کہ مولوی عبدالرشید تبسّم بھی چپکے سے وادیٔ موت کی طرف جا کر گم گئے۔

فرانسیسی مستشرق پروفیسر لوئی میتو کو اسلامیات سے جو شغف تھا اس سے کون واقف نہیں، انہوں نے دنیا کو صلح و آشتی اور اخلاص و محبت کا جو پیغام سُنایا اُسے کون بھول سکتا ہے۔

——امریکی شاعر—— امریکی ادیب—— جان فراسٹ — یہ بھی دنیائے آب و گل سے رخصت ہوئے اب ایسے دیدہ ور، اور نکتہ شناس لوگوں کا نہیں معلوم دنیا کو کب تک انتظار کرنا پڑے

(ادارہ)

ادارہ کی سرگرمیاں

سلسلۂ روز و شب

شعبۂ فلمیات کا قیام

پاکستان میں صنعت فلم سازی کی روز افزوں ترقی نے پاکستانی ادیبوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اب وہ اچھی کہانیوں کے متلاشی فلمی صنعت کے لیے۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ اس طرح نہ صرف [illegible] ہوگا بلکہ زندگی کے مختلف مسائل فلم کا موضوع بن سکیں [illegible] ہماری فلموں میں ناپید ہیں۔

بعض فلم سازوں نے اس سلسلے میں ادارۂ مصنفین (مغربی پاکستان) [illegible] چاہا ہے۔ ادارہ مصنفین نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد شعبہ [illegible] اضافہ کر دیا ہے۔ اس شعبہ کے ناظم مشہور افسانہ نگار [illegible] ادیب [illegible] ادارۂ مصنفین مغربی پاکستان کے دفتر میں قائم کیا گیا ہے۔ اس [illegible] یہ ہوگی کہ وہ مصنف اور فلم ساز کے درمیان روابط استوار [illegible] انجام دے۔

جن حضرات کے پاس ایسی کہانیاں موجود ہیں جنہیں وہ فلم [illegible] موزوں سمجھتے ہیں وہ ناظم شعبۂ فلمیات سے خط و کتابت کریں۔ [illegible] کے مکمل مسودات کے بجائے اس کا مختصر خاکہ روانہ [illegible]ے۔

[illegible] اسکیپ کے چار صفحات سے [illegible]

گلڈ کی کتاب پر انعام

ڈاکٹر سید شاہ علی (استاد شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی) کی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" کو بہترین تنقیدی و تحقیقی کتاب قرار دیتے ہوئے مجلس ترقی ادب (لاہور) نے مصنف کو ۲ ہزار روپے نقد انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ کتاب گلڈ اشاعت گھر سے شائع ہوئی ہے۔

ذیلی حلقہ لائلپور

ادارۂ مصنفین ذیلی حلقہ لائلپور کے زیر اہتمام ہفتہ ۱۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو سات بجے شب ایک مشاعرہ جناب عیش فیروزپوری کی صدارت میں میونسپل لائبریری میں منعقد ہوا۔ جس میں عیش صاحب کے تجویز کردہ مصرع طرح "سینہ بن جانے کے آثار نظر آتے ہیں" پر صدر مشاعرہ کے علاوہ مندرجہ ذیل شعراء نے اپنی غزلیں سنائیں۔

حافظ لدھیانوی، حزیں لدھیانوی، طاہر دیوبندی، منظور احمد منظور، رومی کنجاہی، نسیم سید، جمیل [illegible]، حبیب اللہ حبیب، سلیمان جیلانی، ابراہیم حافظ، حکیم محرم، انصار محسن، احمد ریاض [illegible]

حامد خاں حامد۔

غیر طرحی دور میں حسب ذیل شعراء نے اپنا کلام سنایا۔
وصفی مرادآبادی، طالب جالندھری، یوسف تنویر جیلانی، فراز
صدیقی، ریاض مجید اور نادر جاجوی۔
یہ مشاعرہ جو کوئی چار گھنٹے میں اختتام پذیر ہوا خاصا کامیاب
رہا۔ طرحی غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار بے حد پسند کئے گئے۔

سجدۂ شکر کے آثار نظر آتے ہیں
گھر میں نقشِ قدمِ یار نظر آتے ہیں
عیش فیروزپوری

کنجِ خلوت جو میسر ہو کبھی غور کرو
لوگ کیوں جینے سے بیزار نظر آتے ہیں
حافظ لدھیانوی

کشتی نہ ہر نہ ڈوبے گی ہمارے ہوتے
لاکھ ٹوٹے ہوئے پتوار نظر آتے ہیں
نسیم سید

جبر سے ماہ سے واقف ہوں ازل کے دن سے
آپ کے آئینہ بردار نظر آتے ہیں
حبیب اللہ حبیب

اس جگہ پیار دعا پائیں گے کیا خاک جہاں
سب تمہارے ہی طرفدار نظر آتے ہیں
روحی کنجاہی

شامل حال ترا لطف و کرم ہوا ے دوست
مرحلے عشق کے دشوار نظر آتے ہیں
[illegible]

صاف گوئی سے نہ الزام کا اس دنیا میں
ایسے مجرم ہی سردار نظر آتے ہیں
بسمل

اتنی ہی دور ہے کہیں جنوں کی منزل
جتنے دامن میں ابھی تار نظر آتے ہیں
اسرار محسن

کیا یہ منزل مقصود کہ اپنے ہی اصول
راہ میں صورت دیوار نظر آتے ہیں
منظور احمد منظور

زندگی کے جو ہیں اسرار نظر آتے ہیں
وہی دیوانے سردار نظر آتے ہیں
حزیں لدھیانوی

یہ بڑی بات ستمگر ترے اصنام میں ہے
چپ ہیں اور مائل گفتار نظر آتے ہیں
سلیمان [illegible]

شکوۂ جور کریں کیا کہ بہ احساس وفا
ہم ہی خود ان کے خطاوار نظر آتے ہیں
طاہر دیوبندی

سامنا جو میری آنکھوں کا نہیں کر سکتے
وہ مرے دل کے طلبگار نظر آتے ہیں
ابراہیم حافظ

دیکھتے ہیں تو ہر اک چیز ہے اپنے بس میں
غور کرتے ہیں تو لاچار نظر آتے ہیں
نایاب

بیرونی روابط

بنزان میں

لبنان کے مشہور ادیب ایمل لبنانی کے اعزاز میں ۲۷ر جنوری
دارہ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) نے ایک عصرانہ دیا۔ مہمان ادیب
پاکستانی ادیبوں سے ملنے اور ان کے خیالات سے واقفیت حاصل
لے کے بعد دلی مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے پاکستان و لبنان کے
افتی تعلقات کو استوار کرنے پر زور دیا۔

○

۶ر فروری کی شام کے چھ بجے شبزان میں امریکہ کے مشہور
اعر ادیب پال انیگل کو ایک دعوت استقبالیہ دی گئی۔ پاکستانی
راشان الحق حقی، حمید نسیم اور جمیل الدین عالی نے اپنا کلام سنایا
رساتھ ہی معزز مہمان کی تفہیم کے لئے انگریزی میں ترجمہ بھی پیش کیا۔
اردو شعرا کے خیالات اور ادبی روایات میں دلچسپی کا اظہار
تے ہوئے پال انیگل نے اردو غزل کو بہت سراہا۔ انہوں نے فرمایا
پاکستانی شاعری کی چند ایسی خصوصیات ہیں جنھیں امریکی شاعروں
اپنانا چاہیئے۔ آخر میں مسٹر پال نے اپنی چند نظمیں پیش کیں۔

ادم سیناپوری کراچی میں

ہندوستان کے مشہور محقق اور نامور ادیب جناب نادم سیتاپوری
ادارہ مصنفین (حلقہ کراچی) نے ۹ر مارچ کو دفتر گلڈ واقع اسٹریچن روڈ
پر شام کے ۶ بجے دعوت استقبالیہ دی۔ اس دعوت میں ۲۵ کے قریب
مقامی ادیبوں نے شرکت کی۔ پہلے شاہد احمد دہلوی نے معزز مہمان کا
تعارف کراتے ہوئے ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کی ستائش کی۔
آخر میں نادم سیتاپوری نے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی
ترویج و ترقی کی تفصیلات بیان کیں۔

چینی ادیبوں کیلئے گلڈ کا تحفہ

پیکنگ — انجمن مصنفین پاکستان کے سکریٹری جنرل مسٹر
قدرت اللہ شہاب نے کل چینی رائٹرز یونین کو پاکستان
کی دس کتابیں پیش کیں۔ وہ یونین کے دفتر ایک مختصر
سی تقریب میں اس کے عہدے داروں سے ملاقات
کرنے کیلئے گئے تھے مسٹر شہاب نے جو کتابیں پیش کی
ہیں ان میں سے ایک پاکستانی علاقائی نظموں کے
ترجمے پر مشتمل ہے۔ اسے انجمن مصنفین پاکستان نے
چھاپا ہے۔ چینی رائٹرز یونین چینی مصنفین کی قومی
انجمن ہے جس کے تقریباً چار سو ممبر ہیں۔

فاخر ازایک ترکی ادیب

۴ مارچ کو ادارہ مصنفین (حلقہ لاہور) نے گلڈ ہاؤس کے لان میں ترکی کے مشہور ادیب فاخر از کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ اس تقریب میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، میرزا ادیب، الطاف حسین قریشی (ایڈیٹر اردو ڈائجسٹ)، حکیم نیر واسطی اور دیگر علم دوست اصحاب نے شرکت کی۔

عصرانے سے قبل معزز مہمان نے جو ایک بلند مرتبہ نقاد، شاعر اور ادیب ہیں، ترکی ادبیات پر ایک مقالہ پڑھا اور سامعین کو ترکی ادبیات کے مختلف ادوار کے ادب اور ترکی کے ادیبوں سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد انہوں نے سوالات کے جواب دیئے اور ادارہ مصنفین کے اس جذبے کی ستائش کی کہ وہ غیر ملکی ادیبوں کی عزت افزائی کرتا ہے۔

شروع میں حکیم نیر واسطی نے معزز مہمان کا تعارف کرایا۔

اظہار تعزیت

ادارہ مصنفین پاکستان نے ہندوستان کے سابق صدر، ڈاکٹر راجندر پرشاد کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تار بھیجا تھا۔

"پاکستان رائٹرز گلڈ، ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، وہ ایک بہت بڑے ادیب اور عظیم علمی شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اسلامی ثقافت اور اردو فارسی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔

ازراہ عنایت ان کے لواحقین اور عقیدت مندوں تک ہماری گہری ہمدردیاں پہونچا دیں۔"

پروفیسر ولز لے مورر

۲ اپریل کی شام کو ادارہ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی جانب سے سفیران میں امریکی ادیب، ماہر تعلیم پروفیسر ولز لے مورر کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ کراچی کے ممتاز ادبا و شعرا نے اس تقریب میں شرکت کی جن میں حفیظ ہوشیارپوری، شاہد احمد، شوکت صدیقی، حمید نسیم اور طفیل احمد جمالی کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوران تقریب پروفیسر مورر سے پاکستانی ادبا نے مسائل پر بات چیت کی۔ یہ گفتگو بڑی دلچسپ رہی۔ پروفیسر مورر نے ہر موضوع پر کھل کر بات کی۔

تقریب کے اختتام پر ریجنل سکریٹری شاہد احمد نے گلڈ کی چند انگریزی مطبوعات پروفیسر مورر کو پیش کیں۔

ضروری اعلان

گذشتہ شمارے میں آدم جی ادبی انعامات کے اعلان میں سہواً منصفین کے نام شائع ہونے سے رہ گئے۔ اِس بار مندرجہ ذیل منصفین نے کتابیں ملاحظہ کی تھیں

اردو

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
الطاف گوہر (انھوں نے کوئی تحریری رائے نہیں دی)
سید وقار عظیم
مختار صدیقی
شیخ ایاز

بنگلہ

ڈاکٹر محمد شہید اللہ
ڈاکٹر انعام الحق
ڈاکٹر سجاد حسین
پروفیسر عبدالحئ
پرنسپل ابراہیم خاں

سلام مچھلی شہری

میرزا غالب

"قطب" کی محفلِ تخیّل کی اک ماہ پارہ تھی
جو موجِ رنگ و نکہت، نورِ نغمہ تھی، شرارہ تھی
مگر گھبرا بھی جاتی تھی خود اپنے خوابِ رنگیں سے
ابھی کم سن تھی اور واقف نہ تھی آدابِ تزئیں سے
زمانہ گزرا، اور اُس مہ جبیں پر بھی شباب آیا
یہی دن تھے کہ فنِّ شاعری میں انقلاب آیا
دیارِ تاج سے اک شاعرِ اعظم ہُوا پیدا
سراپا شعلۂ گُل، نغمۂ شبنم ہوا پیدا
"قطب" کی محفلِ تخیّل میں اک روشنی آئی
نگارِ ناز اب آئینے میں لیتی تھی انگڑائی
چراغِ سرد اس کے حسن کے پَرتو سے جل اٹھا
وہ عالم تھا کہ خود شاہجہاں کا دل مچل اٹھا
اُدھر شاعر جوانی اور جوانی کی بہاروں میں
خود اپنی عظمتِ افکار کے نازک شراروں میں
نکھر کر ایک دیوتا بن گیا تھا شعر و نغمہ کا
"مگر اک عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ تھا"

بس اک بزمِ قطبؔ بزم ولیؔ کی ماہ پارہ تھی
جو اس کی جنّتِ افکار کا رنگیں نظارہ تھا
بہ ہر صورت، وہ اب دلّی کی محفل کا ستارہ تھا
یہ مانا اپنی ہی پروازِ فکر و فن سے ہارا تھا
مگر خوشبو اسی کی گل فشاں محلوں میں رہتی تھی
اسی کی لَے ظفرؔ کی دکھ بھری غزلوں میں بہتی تھی
کیا تھا گفتگو سے پہلے، مہ پارہ جسے میں نے
وہ اب الھڑ نہ تھی، واقف تھی ہر آدابِ تزئیں سے
نکل کر محفلِ گُل، تنگ آکر شورِ بلبل سے
ضیائے فکر و دانش لیکے شاعر کے تخیّل سے
الجھ سکتی تھی نورِ کہکشاں و ماہ و اختر سے
وہ اب آنکھیں ملا سکتی تھی ورجلؔ اور ہومرؔ سے
غرض اُس نو بہارِ ناز کو اردو زباں کہیے
وطن کی مشترک تہذیب کا روشن نشاں کہیے
جو ہر فن کار سے آرائشِ اردو کا طالب تھا
خدائے شعر و نغمہ کی قسم، وہ صرف غالبؔ تھا
وہ غالبؔ جس نے اردو شاعری کو روشنی بخشی
ضیائے علم و دانش دے کے، تازہ روشنی بخشی
وہ جس نے بربطِ ہندی پہ نغماتِ عجم گایا
وہ جو حافظؔ کو بھی فردوسِ خسروؔ کے قریں لایا
وہ غالبؔ، حسن کارِ زہرۂ اردو جسے کہیے
گلستانِ ادب میں، جانِ رنگ و بو جسے کہیے
ہزاروں شاعرانِ ریختہ رس دلّی میں رہتے ہیں

قمر ہاشمی

وصل

جیسے الفاظ کا باہمی ربط مفہوم کی دلکشی کو بڑھا دے
چمن اوس کے سازِ تقطیر سے بج اُٹھے
اور پھولوں کی آغوش کا لمس محسوس کرتا ہوا
قطرۂ شبنمی
خوشبوؤں کے سمندر میں ہو غوطہ زن
جیسے اک ابر پارے پہ اک اور ابر کثیف
اپنے سائے کا پردہ کیے
بادلوں سے ہم آغوش ہو
جیسے کانسی کی تھالی میں پارہ
بکھرتا سمٹتا رہے
ذہن کی بانسری کی سُبک لے سے نغمے اُبل کر
فضا میں کہیں ڈوبتے اور اُبھرتے رہیں
بحر کی موج در موج آغوش کی تہہ میں
کتنے صدف اپنے منہ کھول کر
ابر نیساں کے قطروں کو پیتے رہے
آرزو کے گہر مسکراتے رہے
روح کی ناچتی، گنگناتی طرب گاہ کی سمت
اک رقص آوارہ ہوتا رہا
کتنی محرومیوں کے گناہوں کو دھوتا رہا

آلدو پالازیسکی
خواجہ ریاض منور

ری او بو

تین گھروندے
چھت نوکیلے
ہرا بھرا میدان
ری او بو، بل کھاتی ندی
ہنستے کھیت کھلیان
چھوٹا موٹا گاؤں ہے گرچہ
یہ گمنام سا گاؤں
دور آکاس پہ جلتا تارہ
پیارا پیارا تارہ
ری او بو کے
سرو کی اونچی شاخ سے لگ کر
تاک رہا ہے
جھانک رہا ہے
ایک ستارہ! پریت کا مارا!
شاید شہروں کی بھی نہیں ہو جس سے جان پہچان

ری او بو: شاعر کے تصور کا ایک مثالی گاؤں

م۔ م۔ راجندر

دو دل

کالو کی دکان گاؤں کے باہر جیت گڑھ کو جانے والے راستے پر تھی۔ یہ دکان کالو کا گھر بھی تھی اور وہ اس میں اپنی لڑکی لچھی کے ساتھ مدت سے رہ رہا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ اس دکان میں دو اور افراد بھی کام کرتے تھے۔ ایک بوڑھا شو سنگھ جو کالو کا بہت پرانا دوست تھا اور جسے لچھی چاچا کہتی تھی اور دوسرا شیرو جو چھ مہینے ہوئے جیت گڑھ سے آیا تھا اور اسی دکان میں کام کرنے لگ گیا تھا۔ اس دکان کے گاہک زیادہ تر جیت گڑھ اور اس کے آس پاس کے پہاڑی گاؤں کی طرف جانے والے یا اس طرف سے نیچے اترنے والے راہی تھے۔ اسی دکان میں بھوک اور پیاس مٹانے والی کئی چیزیں ملتی تھیں۔ مثلاً دال روٹی، چائے، گڑ کے شکر پارے اور مکی کے بھنے ہوئے دانے اور چنے۔

اس دکان کے تقریباً ہر روز آنے والے گاہکوں میں بھیکو چودھری بھی تھا۔ اس کا گاؤں اس دکان سے تقریباً تین کوس پر ہوگا مگر وہ ہر روز آجاتا اور کسی کسی روز شام کو یہیں رہ جاتا۔ اسے اس دکان کی دال روٹی اور چائے بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ بھیکو پیسے والا آدمی تھا، وہ پینتالیس سال کا تھا مگر ابھی تک کنوارا تھا۔ کالو کبھی کبھی اس سے روپے بھی ادھار لیتا تھا اور اس لئے بھی اس کے دل میں بھیکو کی بڑی عزت تھی۔ اس کے علاوہ کالو کو پینے کی عادت تھی اور بھیکو کبھی کبھی اپنے گاؤں کی کشید کی ہوئی شراب بھی لے آتا۔

لچھی کوئی سترہ سال کی تھی۔ وہ گٹھیلے جسم کی گول مٹول سی لڑکی تھی جس کے گال سیب کی طرح سرخ، چکنے اور سڈول تھے۔ اس کی آنکھوں میں چڑھتی جوانی کی مستی سے بھرپور لپکتے، دوڑتے اور چنچل شرارے تھے۔ اس کی چال میں ہرن کی چوکڑی کی سی تیزی اور لپک تھی۔ وہ اپنی تنگ چولی اور لہنگے میں ادھر ادھر پھدکتی رہتی اور اس کے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے کنڈل جھولتے رہتے۔ دکان کے لئے روٹی اور چائے وہ خود ہی تیار کرتی تھی اور دکان میں سب سے زیادہ دال روٹی اور چائے ہی بکتی تھی۔ بھیکو نے تو کئی دفعہ کہا تھا کہ لچھی کے ہاتھ میں بڑی مٹھاس ہے، جو چیز تیار کرتی ہے اس میں شکر سی گھل جاتی ہے۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، بھیکو نے اب تک عورت کی مزاحمت کی تھی لیکن وہ لچھی کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ کچھ عرصے سے وہ یہ سوچ رہا تھا اگر اس کی شادی لچھی سے ہو جائے تو اس معاملے میں اس کے اب تک کے نقصان اور غفلت کی تلافی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ کالو کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ کالو لچھی کے لئے بر ڈھونڈ بھی رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ بھیکو کس طرح بات چھیڑے۔ اس نے پہلے سوچا کہ شو سنگھ سے ذکر کر دے اور شو سنگھ کالو سے بات کرے گا۔ لیکن بعد میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا خود شو سنگھ یا کالو سے بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس کے لئے اس نے اپنے گاؤں کے رام اوتار کو تیار کر لیا جو اسی روز کالو کے پاس چلا آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کالو، لچھی اور شو سنگھ دو چار پارٹیوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔ شیرو کہیں باہر گیا تھا۔ رام اوتار نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ کسی خاص کام کے لئے نہیں آیا تھا۔ اس نے چائے پی اور کالو کے پاس بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد لچھی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چھوری کے لئے دیکھ لیا کوئی بر؟"

"سیرد کا چھورا دیکھو نے"

"وہ تو بارہ تیرہ سال کا ہوگا"

"ہاں ہے تو چھوٹا ہی۔ اور یہاں پٹواری بن کر بولا۔ چودھری بھیکو بھی تو بیاہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اگر وہ مان جائیں تو کیا کہنے۔ چھوکری راج کرے گی۔"

لچھی یہ سنتے ہی اٹھ کر چلی گئی۔ شو سنگھ بھیکو کا نام سن کر پہلے چونکا، پھر پٹواری کی طرف زیادہ متوجہ ہوگیا۔ کالو بولا۔

"رام اوتار جی میں چھوٹا آدمی ہوں۔ چودھری کا گھر بڑا اونچا ہے۔"

"کالو یہ نہ کہہ۔ چھوری کے بھاگ ہوں تو محل میں بھی چلی جائے۔"

یہ کہہ کر پٹواری نے شو سنگھ کی طرف دیکھا اور اس نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ کالو بولا۔

"پر میری تو ہمت چودھری سے کہنے کی نہ پڑے۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ، جیسی تیری چھوری ویسی میری۔ یہاں لین دین کا کوئی سوال ہے نہیں اور چھوری سینکڑوں میں ایک ہے"

پٹواری کچھ دیر اور بیٹھا اور پھر ایک گلاس اور چائے پی کر اور کالو سے وعدہ کرکے روانہ ہوگیا۔ کالو پٹواری کے جاتے ہی شو سنگھ کی طرف مڑا اور بولا

"شو سنگھ یہ تو گھر بیٹھے گنگا آگئی۔ تو ایسا کر لچھی سے بھی بات کرے۔ درخت کے نیچے بیٹھی ہوگی۔"

شو سنگھ پیچھے سے باہر نکل آیا۔ لچھی درخت کے نیچے نہیں تھی۔ شیر سنگھ نے آواز دی لیکن صرف درخت کے اوپر بیٹھی ہوئی ایک کوئل اڑ گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ لچھی شاید سامنے درختوں کے جھنڈ میں ہو مگر جھنڈ میں صرف سہانی ہوا تھی اور دھوپ اور چھاؤں کی کچھ لکیریں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ شو سنگھ کو سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ برگد کے درخت کے نیچے ایک ٹھنڈی چھاؤں والے گڑھے میں ایک پتھر پر شیرو اور لچھی بیٹھے تھے۔ شو سنگھ کو دیکھتے ہی لچھی تڑپ کر علیحدہ ہوگئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور گال تمتما رہے تھے۔ پیشانی پر گھبراہٹ اور حیا سے پسینہ پھوٹ آیا۔ شیرو کا چہرہ بھی تمتما رہا تھا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئی تھیں۔ اس کے کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کا سینہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔

شو سنگھ لوٹ آیا اور اس کے پیچھے پیچھے لچھی آگئی۔ تھوڑی دیر بعد شیرو بھی آگیا۔ شو سنگھ نے یہ بات کالو کو نہیں بتائی۔ شیرو نوجوان تھا۔ لچھی نوجوان تھی اور اس نے دو محبت بھرے دلوں کو ملتے دیکھا تھا۔ دونوں روپ اور جوانی کی امڈتی ہوئی ندیاں تھیں، جو شور مچاتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ شیرو کے مقابلے میں بھیکو تھا جس کی جوانی کے ذرے مانند پڑ چکے تھے۔ جس کے چہرے پر ایک ڈسنے والی سنجیدگی اور بڑھاپا تھا، جس کے سینے میں جذبات کا کوئی طوفان موجزن نہیں تھا، جو بالکل برگد کی طرح پھیلا ہوا خاموش، سرد اور سیاہ تھا۔

لچھی کے بارے میں کالو کی براہ راست بھیکو سے بھی بات ہوگئی۔ شو سنگھ بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ کالو نے بھیکو سے وعدہ کر لیا اور شو سنگھ کو پھر یاد دلایا کہ وہ کبھی لچھی کے کان میں بھی یہ بات ڈال دے۔

اس کے کئی دنوں بعد کی بات ہے۔ کالو کی طبیعت کچھ خراب سی تھی اور وہ صبح سے ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ شیرو برتن وغیرہ صاف کرکے درختوں کو گیا ہوا تھا۔ شو سنگھ گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کالو کی طرف دیکھتی ہوئی لچھی بھی باہر چلی گئی۔ لچھی کے جانے کے کافی دیر بعد بھیکو آیا۔ اس کا چہرہ بہت پریشان تھا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے کالو کی طرف دیکھا جو منہ ڈھانپے لیٹا ہوا تھا۔ بھیکو گدی پر ہی چڑھ گیا اور شو سنگھ سے بولا۔

"شو سنگھ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے میرا خون کھول رہا ہے۔ کالو نے آستین کا سانپ پال رکھا ہے۔"

"کیا ہوا چودھری؟" شو سنگھ نے پوچھا۔

"جھنڈ کی طرف شیرو لچھی سے ہنسی ٹھٹھا کر رہا ہے۔ اس نے لچھی کی کلائی بھی پکڑی ہوئی تھی۔ کالو کو جگا کر سب کچھ بتا دیتا ہوں"

"نانا چودھری ایسا نہ کرنا" شوسنگھ بولا "کالو کا غصہ تم کو معلوم ہے۔ ابھی خون خرابہ ہو جائے گا اور پھر بدنامی اپنی ہے۔"

اتنے میں لچھی اور شیرو بھی آگئے اور بھیکو چپ ہو گیا۔ وہ ایک چارپائی گھسیٹ کر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ شیرو کی ایک ایک حرکت کو وہ دیکھ رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ اس نے رات بھر وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ عام طور پر دکان کے پچھواڑے میں کالو، شوسنگھ اور لچھی سوتے تھے اور دکان کے آگے چارپائی ڈال لیتا تھا۔ آج شیرو کے علاوہ دکان کے آگے بھیکو اور کالو کی چارپائی بھی تھی لیکن کالو اور بھیکو کی چارپائیوں اور شیرو کی چارپائی کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔ شیرو چونکہ دن بھر سخت محنت کرتا تھا، پڑتے ہی سو گیا۔ کالو کی طبیعت اب کچھ اچھی تھی۔ بھیکو کالو کی چارپائی پر بیٹھ کر بولا۔

"کالو میں کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر یہ ہم دونوں کی عزت کا سوال ہے۔"

"کیا بات ہوئی" کالو نے گھبرا کر کہا۔

"بس زیادہ کیا پوچھو گے۔ شیرو کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"آخر بات کیا ہوئی" کالو بے تاب ہو کر بولا "کیا شیرو نے کوئی ایسی ویسی . . . . . ."

"کالو" بھیکو بات کاٹ کر بولا "آگ اور پانی کا کیا میل۔ تم نے پتہ نہیں جوان آدمی کو دکان میں کیسے رکھ لیا تھا۔ میں نے خود آج دن دھند میں شیرو لچھی کی کلائی پکڑے کھڑا تھا۔

"نہیں ——!"

کالو غضبناک ہو کر چلایا۔ وہ تیزی سے چارپائی پر سے اٹھا اور دکان میں سے لاٹھی نکال لایا۔ غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا اور وہ زور سے بولنے لگا۔ اس کی آواز سن کر بڈھا شوسنگھ بھی باہر آگیا اور بھیکو اور شوسنگھ نے شیرو پر حملہ کرتے ہوئے کالو کو کمر سے پکڑ لیا۔ بھیکو نے کہا کہ لڑائی جھگڑے سے بات پھیلے گی اور بدنامی ہو گئی تو لچھی کی شادی مشکل ہو جائے گی۔ مگر کالو کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا وہ اب ایک منٹ بھی شیرو کو یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر لپکا اور اس نے زور سے لاٹھی شیرو کے پاؤں کی طرف ماری جو کچھ چارپائی کی پٹی پر اور کچھ ٹانگوں پر لگی۔ لاٹھی پڑتے ہی شیرو ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"بدمعاش فوراً یہاں سے چلا جا ورنہ ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔" کالو کڑک کر بولا۔

شیرو چند لمحہ مبہوت اور ساکت کھڑا رہا۔ کالو کی لاٹھی شوسنگھ نے پکڑ لی تھی اور بھیکو نے کالو کا بازو تھاما ہوا تھا۔ شیرو بھیکو کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ماجرا کیا ہے۔ شوسنگھ بولا۔

"شیرو تیری اب اسی میں خیر ہے کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جا۔"

"نہیں نہیں صبح کس سالے کی" کالو پھر چیخ کر بولا "ابھی اسی وقت دفع ہونا ہو گا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

"ہاں ہاں اسے ابھی جانا ہو گا" بھیکو بولا۔

کالو نے ایک بار پھر لاٹھی چھڑانے کی کوشش کی۔ شیرو نے معاملے کی نزاکت کو فوراً محسوس کر لیا۔ اس نے اپنا کمبل اٹھایا، پگڑی سمیٹی اور باندھ لی اور جوتے پاؤں میں ڈال کر ٹیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور شیرو چند ہی لمحوں میں تاریکی میں گھل گیا۔ اس کے جاتے ہی کالو اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ گم سم سا ہو کر لیٹ گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے کروٹ لی اور بھیکو سے بولا۔

"اب چودھری ایسا کرو۔ کوئی نزدیک کی تاریخ طے کر کے میرا بوجھ ہلکا کر دو۔"

"میں تو تیار ہوں۔ شوسنگھ کوئی تاریخ سمجھو الیں۔" بھیکو بولا۔

"شوسنگھ اس کام کو کل کر لو اور جاؤ اب پیچھے چلے جاؤ۔ لچھی اکیلی ہو گی۔"

شوسنگھ دکان کے پچھواڑے آگیا۔ لچھی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی یہ شور سن کر جاگ گئی تھی اور دکان کے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اس نے
ڑا دیکھ لیا تھا، ایک ایک بات سن لی تھی۔ شوسنگھ کے پہنچتے ہی اس نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور بولی۔
"چاچا میں زہر کھا لوں گی لیکن بھیکو سے شادی نہیں کروں گی"
لچھی رونے لگی۔ شوسنگھ گھبرا گیا اور اس نے لچھی کو اپنے پاؤں سے الگ کرتے ہوئے اسے فوراً" سو جانے کو کہا کیونکہ کالو ابھی جاگ رہا تھا۔ اس
دلاسا دیا کہ وہ کل اس بارے میں بات کرے گا۔
لچھی اس کا کہنا مان کر لیٹ گئی لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔ اس کی نظریں کبھی لپک کر تاریکی میں ڈوبے آسمان میں کھو جاتیں یا کبھی سامنے بھوت
کھڑے ہوئے ٹیلے میں اٹک جاتیں۔ اس کا شیر داس سے دور سامنے ٹیلے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی نیزے بنی ہوئی وہاں سے لچھی کو دیکھ
رہی تھیں۔ بھیڑیوں کے ڈر سے وہ ابھی ٹیلے سے نیچے جنگل میں نہیں اترا ہوگا مگر چند گھنٹوں میں ہی وہ وہاں سے چل پڑے گا اور پھر کوئی بھی لچھی کو دیکھ
نہ سکے گی۔ بھیڑیوں کے ڈر سے وہ ابھی ٹیلے سے نیچے جنگل میں نہیں اترا ہوگا مگر چند گھنٹوں میں ہی وہ وہاں سے چل پڑے گا اور پھر کوئی بھی لچھی کو اس کے
پاس نہیں لا سکے گا۔
لچھی آنکھیں پھاڑے چپ چاپ لیٹی سوچتی رہی حتیٰ کہ کئی گھنٹے ہو گئے۔ ٹیلے پر اور جنگل میں گیدڑوں کی آوازیں اب کم ہو گئی تھیں۔ لچھی اٹھ بیٹھی
اور گرد اب بھی بہت اندھیرا تھا۔ پھر کہیں دور کنوئیں میں ڈول گرنے کی آواز آئی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ شوسنگھ سینے تک کمبل اوڑھے سو رہا پڑا تھا۔
آہستہ سے اس کا منہ اور سر بھی ڈھک دیا۔ پھر اس نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور دبے دبے پاؤں وہاں سے جلدی کچھ دور چلنے کے
دوڑنے لگی۔ وہ دوڑتی چلی گئی اور ٹیلے پر پہنچ کر ہی دم لیا۔
اس کے چند ہی لمحوں بعد ایک ہی کمبل میں لپٹے ہوئے لچھی اور شیر داس دھند اور تاریکی کو چیرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ نیچے ان کے سامنے کئی راستے تھے،
ان سے مختلف، ایک نئی وسیع دنیا جہاں شاید دو دل جی سکیں، مل سکیں۔ وہ ایک راستے پر ہو لئے اور تقریباً دوڑنے لگے کیونکہ پو پھٹنے سے پہلے ہی
سے بہت دور بھاگ جانا تھا۔

جوگندر پال

(افسانہ)

داستاں در داستان

گواہی

جاپانیوں کا خیال ہے کہ لمبے پیروں والی عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ وفادار نہیں ہوتیں۔

لیکن میری جاپانی محبوبہ شی شو کے پیر ننھے ننھے تھے اور وہ ہمیشہ موقع ملتے ہی اپنے خاوند سے بہانہ کرکے میرے پاس چلی آتی۔

"شی شو!" میں نے اس کے کھلونوں جیسے پیر پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: "تمہارے پاؤں کتنے پیارے ہیں۔ کتنے چھوٹے!"

"ہاں"، وہ فخر سے کہنے لگی: "ہر وفادار عورت کے پیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"وفادار؟" میری آنکھیں میری من کی بات نہ چھپا سکیں: "تم تو اپنے مرد سے چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے کے لئے ترستی رہتی ہو۔"

"کیا تمہیں یقین نہیں؟" اس نے میرے من کی بات بوجھ کر کہا: "کہ میرے مرد تم ہو ۔۔۔ میں تم سے بے وفائی کروں گی تو گنہگار عورتوں کے پیروں کی طرح میرے پیر بھی بھدّے اور بھاری ہو جائیں گے۔"

"لیکن شی شو، تمہارا اپنا مرد تو تمہارا گھر والا ہی ہے نا؟"

"نہیں"، اس نے اپنا پاؤں میرے ہاتھوں سے نکال کر میری آنکھوں کے آگے کرکے کہا: "دیکھو ۔۔۔ خدا بھی میری گواہی دے رہا ہے۔"

پرانی گونج

"آپ ایک نامور اکیوسٹ ہیں۔"

"اکیوسٹ؟"

"جی، روزِ اول سے فضا میں جن آوازوں کی گونجیں محفوظ رہ گئی ہیں، آپ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے بوڑھے اکیوسٹ کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا تو مجھے اس کا ضعیف وجود بھی خلاؤں میں ڈوبتی ہوئی چیخ کر سنائی دینے لگا۔

"میں نے کئی ایسی گونجیں محفوظ کر رکھی ہیں جو لاکھوں برس پرانی ہیں" ایکسپرٹ نے بتایا۔

"اچھا! کیا یہ آوازیں نہایت واضح طور پر سنائی دیتی ہیں؟"

"اکثر آوازیں ماند پڑ چکی ہیں لیکن انسانی آواز کی ایک نہایت پرانی گونج اب بھی صاف سنائی دیتی ہے۔"

"کیا ہے وہ؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بھوک بھوک۔"

عالیشان بلڈنگ

میں بمبئی میں ایک عالیشان عمارت کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی منزلیں گننے لگا۔

"کیا نام ہے اس بلڈنگ کا؟" میں نے دریافت کیا۔

"چوکیدار کی کھولی" میرے ساتھی نے جواب دیا۔

"چوکیدار کی کھولی!" میری متعجب نظریں بلڈنگ کی آخری منزل تک پہنچ گئیں۔

"ہاں" میرا ساتھی کہنے لگا۔ "اس عمارت کے بننے سے پہلے یہاں ایک بوڑھے چوکیدار کی کھولی تھی۔"

"اور جب وہ چوکیدار مر گیا" میں نے ٹوک کر کہا۔ "تو کن چوروں نے یہ شاندار عمارت کھڑی کر لی!"

حقیقت اور افسانہ

میرے ناول کا ہیرو موہن بلا جھجک سادھنا کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "میں تم سے محبت کرتا ہوں سادھنا۔"

اور یہ لکھتے لکھتے میں رک گیا، اور سوچنے لگا کہ میں خود کیوں وشی سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس قدر جھجکتا ہوں۔

اسی اثنا میں وشی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ناول لکھ رہے ہو شرمن؟"

"ہاں۔"

اور میرے دل نے ہولے سے مجھے صلاح دی "اب کہہ دو نا۔"

"مجھے تمہارے ناول بڑے اچھے لگتے ہیں شرمن۔ تمہارے لہجے کی سچائی میرا دل موہ لیتی ہے۔"

"اب کہہ دو نا" میرا دل مجھے سمجھا رہا تھا۔

"وشی، لیکن میرا ارادہ زبان پر آتے آتے پھر حلق میں جا دوبا۔

"شرمن" وشی کا منہ پڑے دلکش انداز میں ہل رہا تھا۔ "ہر اچھی کہانی کو زندگی کے مطابق ہونا چاہیے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں وشی، ہر اچھی زندگی کو کہانی کی طرح ہونا چاہیے!"

انتظار

بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی تھی، سراپا انتظار!

"اب چلو، کیوں سردی میں اکڑ رہی ہو!"

"نہیں، مجھے اس پر بھروسہ ہے، وہ ضرور آئے گا۔"

"بے وقوف نہ بنو، چلو اب۔"

"نہیں میں اس کا انتظار کروں گی، وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

لیکن تھوڑی دیر بعد سڑک پر اس کا ٹھٹھرا ہوا سایہ لہرایا اور چلنے سے پیشتر وہ بڑی حسرت سے بولی۔

"اگر وہ نہیں آیا تو کوئی اور ہی گاہک آ جاتا۔"

روپ بہروپ

گیتا کا مرحوم شوہر اس سے بڑا پیار کرتا تھا۔

ایک دن اچانک گیتا کی ملاقات پرشاد سے ہوگئی۔ پرشاد ہو بہو اس کے شوہر کا ہم شکل تھا۔ اس نے پرشاد سے شادی کر لی۔

مگر گیتا کا مرحوم شوہر تو اسے پیار کرتے کرتے دیوانہ ہو جاتا تھا اور پرشاد صرف اس لئے دیوانہ ہو جاتا کہ وہ اس سے اتنا پیار کیوں مانگتی ہے۔

آخر ایک دن تنگ آ کر اس نے گیتا سے علیحدگی اختیار کر لی۔

روتے رہتے گیتا کے تین ساون بیت گئے۔

اس کے مرحوم شوہر سے اپنی بیوی کا دکھ نہ دیکھا گیا اور وہ بے چین ہو کر ایک اجنبی روپ میں سنسار میں لوٹ آیا۔

کیشو کی شکل گیتا کے مرحوم شوہر سے قطعی مختلف تھی مگر اس کا پیار محسوس کر کر کے گیتا کو اب یہی محسوس ہوتا کہ اس کا پتی سچ مچ آیا ہے!

موت کا کنواں

مشرقی افریقہ کے ساحل پر ممباسہ میں پرتگیزوں کا ایک قلعہ ہے، فورٹ جیزس، خدا کے اپنے بیٹے یسوع مسیح کے نام پر، جس نے زہر آلود مسکراہٹوں سے صلیب کا عذاب چوم لیا تاکہ انسانیت کا مستقبل تاریک نہ ہو جائے۔

اس تاریخی قلعے میں ایک نہایت گہرا، تاریک کنواں ہے "موت کا کنواں" جس میں یسوع کے پیروکار اپنے دشمنوں کو الٹا لٹکاتے ہیں یہاں تک وہ مر جاتا ہے۔ ہر بار وہ اپنے روحانی پیشوا کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ جنت کے پرسکون ماحول سے لوٹ آئے، اور صلیب کو ایک بار پھر سہے۔

قبرستان سے واپسی

میں پردیس میں اپنی بیوی کی لاش کو دفنا کر قبرستان سے سیدھا ریلوے اسٹیشن چلا آیا۔
میری ننھی بچی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جب ہم نے اس کی ماں کو قبر میں لٹایا تو وہ چپ چاپ سانس روکے دیکھتی رہی۔ قبر میں مٹی گرا ... اور لاش کے ساتھ ساتھ میری بچی کی سہمی سہمی نظریں بھی دفن ہوتی رہیں۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا — وہ بے جان سی نسط... تھی —

ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہم دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔ گاڑی چلنے لگی تو میری بچی اچانک سراسیمہ ہو کر رونے لگی۔
"کیوں بیٹی!"
"گاڑی چھوٹ بھی گئی ہے ابّا — امی — ہم یہیں رہ گئے ہیں!"

حسین چہرے

"پھول مجھے حسین چہرے بن بن کر دکھائی دیتے ہیں"
"اور حسین چہرے دیکھ کر میری نگاہوں میں پھول اُگ آتے ہیں"
"بات یہ ہے بھائی، کہ یہ مشابہتیں ہماری چاہت کی لَو لگاتی ہیں، یہ نہ ہوں تو ہمیں اپنی چاہت بھی بھولی بسری سی ہے۔"

یونس ہمزی

صلیب و دار سے آگے ——

رات کا سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور وقت کی رفتار اچانک سست اور مدھم پڑ گئی تھی۔ نیند کی قوسیں قزح عنکبوت میں اس احساس مکڑی کی طرح غیر متحرک ہوتا جا رہا تھا۔ سنگریزوں والی سڑک پر چلتے چلتے اس کے قدم اب سست اور ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ہاتھ بے حسی رچتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ میکانکی انداز میں کوک دیئے ہوئے کھلونے کی طرح اب تک جادہ پیمائی کر رہا تھا۔ سردی اور چپک اٹھی تھی۔ اس نے اور کوٹ کے کالر کو گردن کے متصل الٹ لیا جس کی گرمی وقت کے ساتھ شاید کم ہو چکی تھی۔ جھکا جھک کرتے ہوئے بیرونی سروس کے طیارے ہوائی اتر رہے تھے، ایک، دو تین، چار، پانچ وہ ایسے کتنے ہی طیاروں کا شمار کر چکا تھا اور ریناروں کی سرخ سبز اشاراتی روشنیاں اس کے ذہن میں جاگ رہی تھیں۔ ڈائمنڈ کی سگرٹ کی بو اب اس کے نتھنے میں جلنے لگی تھی۔ کاریں اب بھی زناٹے کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ ہر طیارہ کی آمد پر اور ہوائی مستقر جاگ اٹھتا تھا۔ آوازوں کی گہما گھمی بڑھ جاتی تھی۔ پورٹرز کی دوڑ بھاگ، جوتوں کی کھٹا کھٹ بہت صاف سنائی دینے لگتی۔ کاروں کی، ہوجاتی، ہوائی سروس کی بسیں زوں زوں کرتی ادھر سے گذر جاتیں۔ کوئی نسوانی قہقہہ بلند ہو کر اچانک رات کے سناٹے کو توڑتا ہوا منتشر ہو کر بکھیرتا معدوم ہو جاتا، پھر زمین و آسمان کے درمیانی خلاء میں آواز ابھر کر ڈوب جاتی۔ ہنسی اور قہقہہ کی آواز اس خلاء کا پیوند بن جاتی کی لہریں سمٹ سمٹ کر پھیل رہی ہوں، پھیل پھیل کر سمٹ رہی ہوں۔ ایر ہوسٹس کی کار بھی گذر گئی۔ اب قومی تیارہ بھی ہوائی مستقر سے پرواز اور اچانک رات کا سناٹا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ وقت کی رفتار بہت سست اور مدھم پڑ گئی۔

اس نے دھیرے دھیرے آگے قدم بڑھائے۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ بھوک سے اس کی آنتوں میں گرہ لگ رہی تھی، اور نیند بوجھل —— کولتار کی لمبی سڑک زندگی کی طویل حسرتوں کی طرح اس کے سامنے لیٹی تھی۔ وہ وقت گذاری کے لئے الیکٹرک پول گننے لگا۔ زیر لب گنگناتا رہا —— آج دو روز کے فاقہ کے بعد گھر پر کسی انجانے ہاتھ کی دستک سنائی دی تھی۔ ورنہ سکینہ کا پرانا ہوٹی دنوں سے یونہی بیکار پڑا تھا جسے اس نے شادی کی پہلی سالگرہ پر بڑے پیار سے اسے پیش کیا تھا۔ اس کا فلش بلب کتنا عمدہ تھا۔ جیسے پیشانی پر دمکتا ہوا جھومر —— لیکن اب بیوٹی بکس پر ادا کی ہوئی قیمت قسطوں میں وصول ہو رہی تھی۔

افسر خریداری —— اس نے زیر لب دہرایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیلتے ہی اس نے معاً ہونٹ بھینچ لئے۔ اپنی خشخشی داڑھی کو بڑی نرمی سے چھوا، اور سردی کی وجہ سے آنکھوں میں بھر آنے والے پانی کو کوٹ کی آستین سے راستہ میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر لگا دی ——

پرچیز آفیسر —— اس کے ذہن میں پھر زخمی پرندہ کی سی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہوئی اور جیسے خون رس رس کر ذہن

[illegible]

دعا کرلیا۔ ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور معاً اس کا سکڑا سکڑا یا وجود تن کر سیدھا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود آئی اور
نے سینہ پھلا کر اپنی گردن اونچی کرلی۔ اس ملازمت پر وہ کس قدر خوش تھا پہلے دن ہی تقرری کے بعد اس کے باپ نے اس سے کہا تھا
"Always hold your head h" اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے اگر تم ایمانداری سے کام کرو۔ لیکن جب وہ اس کاروبار
یا میں داخل ہوا تو گردن اونچی رکھنا مشکل بات بن گئی۔

اشرف صاحب آج ڈنر کھائیے ہمارے ساتھ ——— آپ ابھی نئے نئے آئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کاروباری اونچ نیچ
گاہ کردوں ——— میں آپ کی دعا سے اس فرم کا بہت خدمت گار رہوں۔ کپاس اور اون کی سپلائی کا پچاس فیصد حصہ میں فراہم کرتا ہوں"
اور جب وہ کپاس اور اون کے سب سے بڑے سپلائر کی کوٹھی پر پیدل پہونچا تو جمال الدین انگشت بدنداں رہ گئے "حد کردی آپ نے
پ کہتے ہیں خود گاڑی لے کر حاضر ہو جاتا بھئی اتنی غیریت اچھی نہیں۔

"عادت خراب ہو جائے گی جمال صاحب ———" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اجی یہ آپ کی کسر نفسی ہے۔ میرے خیال میں کل سے آپ میری نئی آسٹن استعمال کیا کریں۔ بیکار ہی پڑی ہے۔

"جی شکریہ! ——— اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

اور جب وہ اسے لے کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو سارے مہمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "گیسٹ آف آنر" ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں
ایں طرف بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں کے خوبصورت ہونٹوں پر خوبصورت استقبالیہ مسکراہٹ آگئی۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اور کپڑوں کی سلو
درست ہونے لگیں۔ ساڑی کا فال ——— شلوار کی چُنریاں گھومنے لگیں۔ سینہ پر دوپٹہ کی لکیریں مختصر ہو گئیں کچھ مرمریں شانے برہنہ ہو گئے
ساڑی کے پلو سینہ کی گولائیوں سے پھیل پڑے۔ شانوں پر تراشیدہ بال لہرائے ——— چوٹیاں جھوم اٹھیں، پانی بل بل کھا گئے۔

"معزز مہمان جناب اشرف!" اور آپ ہیں مسٹر چٹنی والا، مسز چٹنی والا۔ پروپرائٹر جیری اینڈ جیری شراب کے واحد تاجر تین بیگیا
کے مالک ہیں۔ تھری ڈائمنشن تصویریں پسند ہیں۔ تین بیویاں پسند ہیں۔ دنیا کی تین عظیم کاریں پسند ہیں، ریس میں تین نمبر کا گھوڑا پسند ہے نمبر
لکی نمبر ہے۔ ہفتہ کے تین دن پسند ہیں"۔ اور آپ ہیں سکندر علی ——— بلو اینڈ وٹ کمپنی کے معمار اعلیٰ ——— ان کی لڑکیاں ———
سونی، رانی، اور گڈی ——— میری لڑکی صوفیہ ——— اور زاہدہ جمال الدین ——— میرا لڑکا اکبر ——— جمال الدین جو بزنس
پراجیکٹ کے لئے لندن گیا ہوا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہے آپ مشہور کیبرے ڈانسرز، ایمی مینی اور شوگی، ہاؤ ڈو یو ڈو ——— تین آوازوں
بیک وقت اُسے گھیر لیا۔

ڈنر شروع ہوا ——— ختم ہوا ——— پھر دَورِ جام چلا ——— اور اس کے بعد رقص کیوں کہ رقص کے بغیر زندگی نامکمل
معلوم ہوتی ہے۔ رقص ہی سے کائنات کا وجود ہے، رقص ہی سے لوگ اور پرلوک چلتے ہیں۔ رقص ہی آبشار ہے، رقص ہی سبزہ زار
——— رقص ہی ہوا کی سرگوشی ہے۔ سانس کی آمد و شد ہے۔ ہر انسان کی پیدائش ایک طربیہ رقص ہے اور موت المیہ رقص۔
ہماری اس خوبصورت سی دنیا کا محور رقص ہے۔ ہال میں سارے لوگ رقص کر رہے تھے، بس ایک وہ تھا جو خاموش ایک گوشہ میں بیٹھا
ٹلا رہا تھا کہ اچانک صوفیہ جمال الدین نے اسے چونکا دیا۔ آئیے رقص کریں، اس نے ہاتھوں سے سفید دستانے اتارتے ہوئے کہا۔ اور وہ گم

"معاف کیجئے میں رقص نہیں جانتا ———"

"بس چند سٹیپس (STEPS) سے کام چل جائے گا ——— پلکوں میں سیاہی گہری ہو گئی۔ سُرخ ہونٹوں پر شبنمی مسکراہٹ پھیل گئی
بازو ڈر سے بہکتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھ آئے۔ خوشبو اور گہری ہو گئی اور آواز کی کشش کچھ اور پُراسرار بن گئی۔

"معاف کیجئے مجھے کچھ بھی نہیں آتا"

"پھر سیکھ لیجئے" وہ اس کے قریب ہی صوفہ میں دھنس گئی۔ پھر جھکتا ہوا ہاتھ بڑھا اور اس کا جلتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ صوفیہ کے ہاتھ کی نر[illegible] کی طرح دھڑک اٹھی۔

ریشم کے لچھوں کے تانے بانے پھیلنے لگے۔ اس کی ہتھیلی میں کیسی خوشگوار گرمی تھی۔ ہلکی ہلکی ملائم سی آنچ دیتی ہوئی آوارہ خوشبو کی طرح بہ[illegible] تھی۔ اور اس خوشبو نے بڑھ کر اسے چپکے سے چوم لیا۔ دل میں پہونچ کر گرمی بھر دی۔ اور دل سے ہوتی ہوئی دماغ کے دریچہ میں آکر مسکرا[illegible] جھیوں میں پہونچ کر کپکپا اٹھی اور وہ ہال کی ڈم روشنی میں اس کے ساتھ ہولیا۔ ایک دو تین۔ وہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ نازک ہاتھوں کی گرمی ب[illegible] بانگ رہی تھی۔ اس کی ہتھیلی پر جیسے پھول بن کر کھل اٹھی تھی اور اس کی تیز خوشبو سے اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

آئیے ——— اوپر آجائیے ——— وہ اسے اپنے کمرہ میں لے آئی۔ اور ٹیپ آن کر دیا۔ موسیقی کی لہر کمرہ میں پھیل گئی " آئیے اتنی جلدی ———

کیوں نہیں ——— دیکھئے کتنی جلد میں آپ کو ناچنا سکھا دوں گی ——— اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا۔ اور اس کی کمر کے گر[illegible] ہاتھ ڈال دیا ——— ناچئے ——— "ون ——— ٹو، تھری ———

ون فرسٹ سٹیپ ——— سکنڈ سٹیپ ٹو ——— تھری ——— ون ٹو، تھری ——— ون ٹو، اس کا جسم کئی بار لہرا[illegible] پھر وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا ہو گیا۔ آپ رک کیوں گئے۔ ناچئے ناچئے ——— ون ٹو ——— اس نے تالی بجائی۔ لیکن وہ سا[illegible] کھڑا رہا ——— لڑکی نے بڑے غور سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں دیکھا اور آہستہ سے مسکرا دی ——— اور اس[illegible] اسے محسوس ہوا جیسے رات کی تاریکی ہولے ہولے ستاروں کی جوت میں ڈوب رہی ہے۔ اور رات کے بیکراں سنّاٹے کا سحر ٹوٹ رہا ہے۔"

بڑے سوئٹ آدمی ہیں " ——— لڑکی نے کہا۔

"مگر آپ سے کم ———"! اور لڑکی نے اس کی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ کل شام آپ ضرور آئیں۔ میں آپ کو ناچ[illegible] سکھا دوں گی" ——— اور جب وہ رات گئے جمال الدین کی ڈاج میں گھر آرہا تھا تو پچھلی نشست پر ساتھ بیٹھے ہوئے جمال الدین -سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔ کل ذرا میرے بل کا خیال رکھئے گا۔

"کیوں نہیں ——— یہ تو میری ڈیوٹی ہے ———

"مگر آپ کو دس فیصد منظور ہے نا ——— ؟

"دس فیصد ——— ؟ کیا مطلب ہے میں سمجھا نہیں ———

"اشرف صاحب بیٹے [illegible] اسے ہم ۱۵ فیصد کئے دیتے ہیں۔ میں تو کمپنی کا پرانا خدمت گار ہوں"

آپ کا مطلب کمیشن سے [illegible] مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

دیکھئے تکلیف نہ کیجئے۔

"مگر یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں کل آپ کی گانٹھیں دیکھنے کے بعد بل ضرور پاس کر دوں گا"

"یعنی کہ گانٹھیں دیکھیں گے آپ؟ جناب گدام میں گھسئے تو دم نکل جائے۔ آج تک کوئی پرچیز آفسر گدام نہیں گیا۔ یہ کام اس[illegible] ماتحت کر لیتے ہیں"

مگر میرا فرض کیا ہے جمال صاحب؟ صرف بل پاس کرنا؟

اور دوسرے دن جب وہ گودام میں سپلائی کی چیکنگ کر رہا تھا۔
صوفیہ آدھمکی ——— چلئے میرے ساتھ میں نے ایک عمدہ گانا ٹیپ کیا ہے۔ اور جمال الدین نے آگے بڑھ کر کہا۔ چلے جا لیے صوفیہ کے سا
رنہ بچاری کا دل چھوٹا ہو جائے گا۔ مال کی کوالٹی کے بارے میں آپ اطمینان رکھئے۔ یہ کام آپ کا سپروائزر بھی کر سکتا ہے۔ اور نجانے کیوں وہ صو
درخواست نہ ٹھکرا سکا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ گھنٹہ بھر تک ٹیپ سنتا رہا۔ صوفیہ سے ڈانس سیکھتا رہا۔ اور جب یکبارگی اس کی کمر کے گرد لپٹے ہو
اتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی تو اسے اپنا پورا وجود ریشم کے تانے بانے میں الجھا ہوا محسوس ہونے لگا ——— دن تو ——— تھری ———
ڑکی نے سرگوشی کی ——— آواز کی تھرتھراہٹ میں جذبات کی بیچینی سانس لے رہی تھی اس کے نتھنے پھڑک اٹھے اور سانسوں کی خوشبو اس کے
چہرہ پر چلنے لگی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ اس کے ذہن کے دریچہ میں کئی چاند چمک اٹھے۔ کئی سورج رقص میں آگئے...
زندگی کا سویرا لڑکی کی آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا بے نام کارواں کی طرح۔
اب میں چلوں گا' اس نے اس کی گرفت سے نکلنا چاہا۔ لیکن اس کے بازوؤں کی گرفت بڑی مضبوط تھی' پھر اس نے مسکراتے ہوئے اسے
بازوؤں کے حلقہ سے آزاد کر دیا ——— اور جب دفتر پہونچا تو بل اس کی دستخط کے منتظر تھے۔ اور اس نے بلوں پر دستخط کر دئیے۔
اور دوسرے دن شام کو جب وہ جمال الدین کی کوٹھی پر پہونچا تو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا" یہ لیجئے بڑی حقیر سی رقم ہے م

پانچ ہزار ———
صرف پانچ ہزار ——— اس کی آنکھوں میں چمک ابھر کر ڈوب گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنی جھکی ہوئی گردن سیدھی کر لی۔
شکریہ! ——— اس نے کچھ سوچ کر چیک لے لیا' اتنے میں صوفیہ آگئی اور وہ اسے لے کر اپنے کمرہ میں آگئی۔
"یہ لو پانچ ہزار کا چیک ——— تمھارے پیار کی قیمت تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔"
"آپ بناتے ہیں ——— اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور چیک لے کر پرس میں ڈال لیا۔"
"نہیں یہ واقعی بڑی حقیر سی رقم ہے تم اس سے اپنے لئے تحائف خرید لینا' اور جواباً صوفیہ جمال الدین نے اسے اپنی آغوش میں ل
اور دوسرے دن جب جمال الدین نے چیک کی واپسی کا ذکر کیا وہ بھڑک اٹھا۔
"آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ میں کاٹ کا الو نہیں ہوں۔"
"میاں صاحبزادے ہوش کے ناخن لو ——— بیکار مورلیسٹ بننے کی کوشش نہ کرو ———" وہ دفتر سے اٹھ کر چلا گیا۔
" اور جمال الدین کے مال کی دوسری کھیپ جب گوداموں میں آئی تو اس نے سختی سے سٹاک چیکنگ کی اور ایک نمبر کے کہے ہوئے مال کو
اور تیسرے نمبر پر پاس کیا" جمال الدین نے کلیجہ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ——— دوسرے دن ہی اسے نوٹس ملی ———
"مال کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔ آیندہ خیال رکھیں ورنہ سپلائی کا کوٹہ ختم کر دیا جائے گا ———" اس نوٹس پر خود اشرف نے دستخط کیا تھا
اور ایک دن کا ذکر ہے جب وہ اون کے سپلائر مسٹر لولو کے سٹاک کی کوالٹی دیکھ رہا تھا کہ کسی نے بڑی خوبصورتی اور ہوشیاری سے
سے ایک گانٹھ اس طرح کھسکائی کہ وہ بری طرح نیچے گرا ——— اور فرسٹ ایڈ تک کی نوبت آگئی ——— لیکن اس حادثہ کے باوجود وہ صرف
رہ گیا ———

کچھ ہی دنوں بعد وہ شہر سے سینکڑوں میل دور ایک ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا ہوا تھا کہ اس کی ملاقات مسٹر لولو سے ہوئی۔ وہ اُن کا سب سے
سپلائر تھا۔ اُس نے تعارف کراتے ہوئے کہا" میں غریب لولو ہوں جناب" اور وہ قیمتی سوٹ میں ملبوس لولو کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ پتہ نہ
وہ کیسا غریب ہے۔

"جناب غریب لولو آپ کی خدمت میں تھری ایکس رم پیش کرتا ہے جو اس علاقے میں بالکل نایاب شے ہے"

"مگر میں شراب نہیں پیتا"

"تو حضور کو اور چیزوں سے دلچسپی ہے۔"

"ہر انسان کی دلچسپیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ آپ اون کی کاشتیں کب دکھلا رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ گدام میں پہونچنے سے قبل ہی گانٹھ کی جانچ ہو جائے۔

"غریب لولو بہت جلد آپ کو مال دکھا دے گا جناب۔ بہت جلد دکھا دے گا۔

اور رات کے ٹھیک بجے اس کے کمرہ پر دستک ہوئی۔

"غریب لولو حاضر ہے جناب ——

"بات کیا ہے؟"

"یہ لڑکیاں ہیں جناب —— وہ کمرہ کے اندر آگیا" غریب لولو بڑی مشکل سے انھیں لایا ہے۔

غریب لولو بڑی پریشانی کے بعد انھیں قریبی شہر سے لایا ہے۔ یہ خوبصورت ترین لڑکیاں ہیں جناب، آپ دیکھ سکتے ہیں۔

"مگر اس ہوٹی پیریڈ کی ضرورت کیا تھی —— وہ مسکرایا۔

"غریب لولو ورائٹی کا قائل ہے —— آپ یقیناً اس تل والی لڑکی کو پسند کریں گے"

"مجھے کچھ بھی پسند نہیں سمجھے —— تم فوراً ہوا ہو جاؤ —— اور وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر چلا گیا۔

وہ آوازیں دیتا رہا "ارے بھئی انھیں تو لیتے جاؤ —— مگر وہ جا چکا تھا۔ پھر اس نے تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا "آپ تینوں جا سکتی ہیں۔

"وٹ لولو" —— تل والی لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"ہم تو آپ کی خدمت کو آئے ہیں" —— دوسری لڑکی نے کہا۔

"اچھا تو ایک کہانی سناؤ۔ جس کی کہانی پسند آئی اس سے شادی کر لوں گا۔

"وٹ —— تم شادی بنانگا —— ہم شادی والا لڑکی نائی ہے ——

"پھر تم گٹ آؤٹ ہو جاؤ ——" "مگر وہ لولو کا بچہ روپیہ چھین لینگا ——"

"ہم اس کو سمجھا دے گا —— تم جاؤ ——" اور وہ واقعی چلی گئی۔ بقیہ دو لڑکیاں اس پر جھک آئیں۔ اور اس نے ان کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا "تم دونوں اس بستر پر لیٹ جاؤ —— میں ابھی آتا ہوں ——" اور باہر آکر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

دوسری صبح جب لولو نے خیریت دریافت کی تو وہ چیخ پڑا —— "غریب لولو تم الو کی دم ہو فوراً ان لڑکیوں کو لیکر بھاگ جاؤ"

"صاحب آپ کتنا عجیب ہے، پچھلا صاحب لوگ کتنا خوش رہتا تھا ہم سے"

"میں جانور ہوں —— سمجھے!

اور مال کی چیکنگ کے باوجود جب لولو نے بھرتی کا مال سپلائی کیا تو وہ پھر برہم ہوا۔ اس نے بڑی بیدردی سے اس کا مال بوگس قرار دیا۔ لولو بہت چیخا چلایا "غریب لولو مر جائے گا جناب رحم کرو —— لولو کا دیوالہ —— مگر وہ نہ مانا۔ پھر جاتے جاتے لولو نے سفارش کی —— بیس ہزار کی رقم آفر کی —— مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا —— صوفیہ نے بھی کئی حربے آزمائے —— وہ اسے اپنی خوابگاہ تک لائی

داور بے جان تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد شہر کے نامور غنڈے اس کی تاک میں سائے کی طرح پھرنے لگے ـــــ جمال نے اسے گولی مار دینے کی دھمکی دی
س پر کوئی اثر نہ ہوا ـــــ ایک سال بعد اس کی تنخواہ میں معقول اضافہ ہوگیا ـــــ بورڈ آف ڈائرکٹر اس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھا۔
ڈائرکٹر نے کئی بار اسے اپنے کمرہ میں بلا کر تعریف کی۔ انھیں دراصل ایک ایسے ہی آدمی کی تلاش تھی۔

جمال کے منافع کا بازار بہت دنوں سے ٹھنڈا تھا ـــــ اور لوبو نے ایک بار خودکشی کی بھی کوشش کی تھی۔ اسی عرصہ میں اشرف نے کمپنی سے
یک اسسٹنٹ بحال کرالیا۔ دھیرے دھیرے وہ اس پر اعتماد کرنے لگا اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اُسے اسٹاک چیکنگ کے لئے کہہ دیتا
موقع تھا جو جمال الدین کے ہاتھ آگیا۔

نہ ہی اس نے گولی چلائی اور نہ ہی غنڈوں نے اس پر حملہ کیا ـــــ بلکہ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ پچاس ہزار کا ایک بوگس بل اس نے اسسٹنٹ
اد کرتے ہوئے پاس کر دیا ـــــ اور اتنی بڑی رقم سے بے پروا جمال نے خود اس کی اطلاع اعلیٰ حکام سے کردی ـــــ اور اس معاملہ کی تفتیش
ر اُسے ایک دن غبن کے الزام میں برطرف کر دیا گیا ـــــ

اور ایک صبح کا ذکر ہے جب وہ سکینہ کے مرمریں بازو پر سر ڈالے سویا ہوا تھا پولیس نے دروازہ پر دستک دی اور اُسے گرفتار کرکے لے گئی۔
نے ہزار دہائی دی۔ اس کی بیوی سکینہ بیہوش ہوگئی۔ بہن بین کرتی کرتی رہی لیکن وہ ان سب کی نگاہوں سے دُور جا چکا تھا۔

اور اس دن پہلی بار اشرف کی گردن جھک گئی۔ ملازمت سے اس کی برطرفی خود اعلیٰ حکام کے لئے ایک حادثہ سے کم نہ تھی۔ اور اسے خود اندازہ
دفتر کی انکوائری مکمل ہونے پر اس کی سچائی اور ایمانداری مان لی جائے گی۔ لیکن انھوں نے اس کے برعکس معاملہ پولیس کے حوالہ کر دیا تھا۔ اور
س کے ہاتھوں میں ہتھکڑی جھول رہی تھی جیسے سچائی اور ایمانداری کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا ہو۔"

ایک سال تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی اور اسے یہ معلوم کرکے اب زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ جو بھی مال اس کے اسسٹنٹ نے پاس کرکے
سے دستخط کرائے تھے اکثر بوگس تھے۔ وہ ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن رہا سہا سرمایہ مقدمہ کی پیروی کی نذر ہوگیا۔ پھر سکینہ کے زیورات یک
۔ پھر کپڑوں کی باری آئی تو سہاگ کے جوڑے تک نہ بچے ـــــ وہ اندر ہی اندر جلتا رہا۔ گھٹتا گیا۔ اور جس دن مقدمہ کا فیصلہ ہوا وہ
تھوک رہا تھا۔ اسے تین سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی ـــــ اور جمال الدین نے اس لمحہ سرگوشی کے لہجہ میں اس سے کہا تھا "دیکھ لیا موراسٹ
کا انجام" اور جواباً اس نے پولیس وین کی طرف جاتے ہوئے تھوک دیا مگر اس میں اس کے پھیپھڑوں کا خون شامل تھا۔

اور تین سال بعد جب وہ جیل سے رہا ہوکر گھر پہونچا تو اس کی حالت نازک تھی ـــــ

"میں تمھیں مرنے نہیں دوں گی ـــــ سکینہ نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

اور ایک رات جب وہ کھانسی کے جھٹکے میں اپنی سانس ٹٹول رہا تھا اس نے سکینہ کو آواز دی۔ سکینہ ـــــ سکینہ ـــــ سنو سکینہ
اس کی پیشانی کھانستے کھانستے عرق آلود ہوگئی تھی اور آنکھوں میں لالٹین کی روشنی خزاں کے زرد پتے کی طرح جھلملا رہی تھی اور اس جھلملاہٹ میں
ت کا غبار بڑی تیزی سے شامل ہوتا جارہا تھا۔ دوسرے کمرہ سے جب سکینہ اس کے پاس آئی تو ہانپ رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر سیاہ دھبے
رہے تھے۔

"پانی سکینہ ـــــ! اور سکینہ نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اور پانی پینے کے بعد اس کی رگ حمیت پھڑک اٹھی ـــــ
س نے اسے للکارا ـــــ "کہاں تھیں تم ـــــ؟" اس کے اندر کا مرد اچانک جاگ اٹھا۔

"چپ! ـــــ سکینہ نے بڑا ہی سرگوشی کی اور اسے لٹا دیا۔

اور جب صبح اس کی بیوی سکینہ دودھ کا گلاس لے کر اس کے پاس آئی تو اس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا اور اپنا منہ دوسری طرف
"لو دودھ پی لو ـــــ تم نے کبھی یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارا کی کہ اس تین سال کے عرصہ میں ہم کیسے اپنی کفالت کرتے رہے ہیں ـــــ
حالات سے سمجھوتہ کر لو ـــــ تم صحت یاب ہو جاؤ پھر زندگی کی اعلیٰ قدروں کے بارے میں سوچنا ـــــ زندگی کی بہاریں تمہارے دم
اور اس نے واقعی حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دودھ کا گلاس لے لیا اور اس نے دودھ کے گلاس میں جھانکتے ہوئے
اس کائنات کو روشن رکھنے والا آفتاب گلاس کی تہ میں کہیں غروب ہو گیا ہے۔ اور چاروں طرف اندھیرا بے حد گہرا ہے اور اس اندھیرے میں
وجود ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا ہے۔ دودھ کے قطرے شاید اسے ڈھونڈ نکالیں شاید سکینہ کی لائی ہوئی دوائیں پھر آفتاب کو گلاس سے باہر
اور یہ دنیا ایک بار پھر اس کے لئے روشن اور منور ہو جائے۔ ممکن ہے بہت ممکن ہے ....

اور کچھ دنوں بعد اس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔

رات گئے جب اس کے گھر کے دروازہ پر دستک ہوتی تو وہ باہر چلا جاتا۔ اور جب کوئی دستک نہ ہوتی تو گھر کے لوگ فاقہ سے لگ
یہ دستک بڑی دلکش تھی۔ یہی دستک کبھی دوا اور کبھی روٹی میں ڈھل جاتی تھی۔ اور سبھوں کے کان اسی دستک پر لگے رہتے تھے۔ ایک
یہی سلسلہ قائم تھا۔ اور اس نے زندگی سے کچھ اس حد تک سمجھوتہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی سکینہ کسی مرد کو دوسرے کمرہ میں سلا کر اس کے ساتھ آ کر لیٹ
سکینہ کو پیسے دینے والا اس کی آغوش سے علیحدہ کر کے اسے اپنے کمرہ میں لے جاتا تھا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سکینہ کے تیور بھی بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ وہ تھک سی گئی تھی کبھی کبھی بڑی اداس اور مضمحل نظر آتی۔
وہ اس کی اپنی خالہ زاد بہن تھی جس کے والدین بچپن ہی میں مر گئے تھے اور جب سے اس کی ماں نے ہی اس کی پرورش کی تھی اور پھر اشرف
سے شادی کر لی ـــــ اب وہ اکثر اسے جھڑک بھی دیتی، ـــــ موقع بے موقع طنز کے نشتر چبھوتی، اب کیا ان ہڈیوں کا چونا کرو
زندگی نے مجھے دیا کیا ہے ـــــ کچھ بھی تو نہیں۔

اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ ماں نے چپ سادھ لی تھی، رونے کے لئے اس کی آنکھوں میں اب آنسو نہ تھے۔ دن رات جا
بچھائے بیٹھی رہتی۔ ایک جوان بہن تھی جس کے چہرہ پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، دن رات چولھے کا
رہتی۔ ہر روز سکینہ کی شلوار اور پیٹی کوٹ دھوتی اور اس لمحے کے پھندے اس کے حلق میں پڑنے لگتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بلبلا اٹھتی
سارا وجود کانپنے لگتا اور جب اسی لمحہ بھائی کے مافوق چہرہ کی جانب دیکھتی تو پسلیوں کی خلاء میں دل کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگ
سارے گھر پر آصفہ کی حکمرانی تھی، گھر میں جو وہ چاہتی وہی ہوتا تھا۔ گھر کے تمام افراد کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتے

رات کے تقریباً دو بجے اس نے دروازہ پر ہولے سے دستک دی۔ یوں تو وہ باہر ہی پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ جاتا لیکن بھو
سے وہ تڑپ اٹھا تھا۔ دروازہ خلاف توقع جلد ہی کھل گیا۔ اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک زمانہ کے بعد سکینہ خوبصورت لب
تھی۔ اس نے جارجٹ کی ساڑی اور عمدہ سلک کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ چہرہ پر غازہ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بڑی گہری تھی۔

"میں جا رہی ہوں" ـــــ سکینہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
"کہاں کب آ جاؤ گی پھر ـــــ؟" اس نے مضمحل لہجہ میں دریافت کیا۔
"میں اب کبھی نہیں آؤں گی ـــــ"
"سکینہ ـــــ!" وہ چیخا۔
"گھبراؤ نہیں ـــــ تمہیں دوائیں ملتی رہینگی اور کھانا بھی ـــــ تم سچائی اور ایمانداری کے پرستار ہو۔

چپ رہ حرامزادی آوارہ ——

خاموش رہو —— ہنگامہ نہ کرو۔ میں آخر کب تک خود کو بیچتی۔ میرے بھی ارمان ہیں۔ تمنائیں ہیں۔ اور یہ دنیا بڑی وسیع ہے۔ ہمارے نکل ہی آتے ہیں۔

یں اس زندگی سے بہت تھک گئی تھی۔ مگر میں اتنی ظالم بھی نہیں میری جگہ تمھاری بہن آصفہ نے سنبھال لی ہے۔ ذرا اناڑی

لفا ——

آصفہ نے؟ ——

ہاں آصفہ نے ——

اور اسے محسوس ہوا کہ دھرتی ڈانواڈول ہے اور وہ بستیوں کی طرح لڑھکتا چلا جارہا ہے۔ پھر اُسے بڑے زور کا چکر آیا اور وہ زمین پر ڈھے گیا۔ اُس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا سکینہ باہر جارہی تھی ——

اختر انصاری دہلوی

گریہ عادت ہے پوچھتے کیا ہو!
درد فطرت ہے پوچھتے کیا ہو

تیرگی اور روشنی کی تلاش
یہی قسمت ہے پوچھتے کیا ہو

گفتنی تو کبھی نہ تھے حالات
اب جو حالت ہے پوچھتے کیا ہو

قصّہ اپنی تباہیِ دل کا
اِک کہاوت ہے پوچھتے کیا ہو

ہر خوشی جس پہ دوڑتا ہے خیال
درسِ عبرت ہے پوچھتے کیا ہو

گُل فشاں قہقہوں کے دامن میں
خونِ حسرت ہے پوچھتے کیا ہو

آج تک زندگی پہ سایہ فگن
شبِ فرقت ہے پوچھتے کیا ہو

ستمِ چرخ میں کمی کیسی!
دل سلامت ہے پوچھتے کیا ہو

دل اگر ہے تو حسرتِ دل سے
کب فراغت ہے پوچھتے کیا ہو

مشقِ وارفتگی ہے کیش اپنا
غم شریعت ہے پوچھتے کیا ہو

کافرِ عشق ہو کے جینا بھی
اِک عبادت ہے پوچھتے کیا ہو

عشق کی شرع میں ازالۂ کفر
صاف بدعت ہے پوچھتے کیا ہو

مر رہے پھر بھی زندگی کی ہوس
بے نہایت ہے پوچھتے کیا ہو

جیتے جی چھوٹ جائے ، ناممکن
زیست وہ لت ہے پوچھتے کیا ہو

یہ جو دل پر گھٹا سی چھائی ہے
ابرِ رحمت ہے پوچھتے کیا ہو

یہی کاہش، یہی خلش، یہی کرب
جانِ راحت ہے پوچھتے کیا ہو

جاں گزائی بھی، دل فروزی بھی
غم کی طینت ہے پوچھتے کیا ہو

حسرتوں سے لپٹ کے رونے میں
کیسی لذّت ہے پوچھتے کیا ہو

نامرادی کے نور میں مضمر
سازِ عشرت ہے پوچھتے کیا ہو

خون سے پُر سہی دلِ معمور
بڑی نعمت ہے پوچھتے کیا ہو

زخمِ دل کے شگفتہ رہنے میں
خیر و برکت ہے، پوچھتے کیا ہو

سینہ زخموں سے چور، چہرہ زرد
عینِ صحت ہے، پوچھتے کیا ہو

دل ہے داغ میری نظروں میں
داغِ سیرت ہے، پوچھتے کیا ہو

روحِ آلودہ ہی مرے نزدیک
روحِ عفت ہے، پوچھتے کیا ہو

جس کی فطرت لہو لہان نہیں
ننگِ فطرت ہے، پوچھتے کیا ہو

پاسِ ناموس اگر ہے شرط تو پھر
عشق تہمت ہے، پوچھتے کیا ہو

کوچۂ شوق کی گدائی بھی
خسرویت ہے، پوچھتے کیا ہو

قعرِ رسوائی مذاقِ جنوں
اوجِ حرمت ہے، پوچھتے کیا ہو

دردِ عشق اور نشۂ افلاس
اک قیامت ہے، پوچھتے کیا ہو

حوصلے، ولولے، تمنائیں
جینا آفت ہے، پوچھتے کیا ہو

بے نواؤں کی آرزومندی
گنجِ ثروت ہے، پوچھتے کیا ہو

اپنی ارماں بھری تہی دستی
بڑی دولت ہے، پوچھتے کیا ہو

موجۂ سوز از روئے آہنگ
ساز کی گت ہے، پوچھتے کیا ہو

تازہ زخموں کی جستجو میں نہاں
ذوقِ ندرت ہے، پوچھتے کیا ہو

زخمِ تازہ سے، داغِ کہنہ سے
غم کی زینت ہے، پوچھتے کیا ہو

میرے فکر و شعور کی تفسیر
رنگ و نکہت ہے، پوچھتے کیا ہو

میرے سوز و گداز کی تعبیر
کیف و نزہت ہے، پوچھتے کیا ہو

میرے جذب و خروشِ غم سے عیاں
رازِ بہجت ہے، پوچھتے کیا ہو

ناز والوں کی تند خوئی میں
جو نزاکت ہے، پوچھتے کیا ہو

تیکھی چتون کی ضرب کاری میں
جو لطافت ہے، پوچھتے کیا ہو

بے زبانوں کی بے زبانی میں
جو بلاغت ہے، پوچھتے کیا ہو

ٹھنڈے سانسوں میں، سرد آہوں میں
جو حرارت ہے، پوچھتے کیا ہو

شاعری کے دروغِ پُرفن میں
جو صداقت ہے، پوچھتے کیا ہو

فکرِ شاعر کی لڑکھڑاہٹ میں
جو صلابت ہے، پوچھتے کیا ہو

عشق و مستی کی خیرہ چشمی میں
جو بصیرت ہے، پوچھتے کیا ہو

یادِ ماضی کے تلخ و شیریں میں
جو حلاوت ہے، پوچھتے کیا ہو

کاروبارِ نظر کی لذت میں
جو اذیت ہے، پوچھتے کیا ہو

ہم ہیں اور عیشِ سایۂ دیوار
اپنی ہمت ہے، پوچھتے کیا ہو

اپنی عادت یہ خون رونے کی
فرقِ عادت ہے، پوچھتے کیا ہو

ناز فرما مری تباہی پر
خود مشیت ہے، پوچھتے کیا ہو

بزم بھی ہم سے دل زدوں کیلئے
کنجِ خلوت ہے، پوچھتے کیا ہو
غم شماری کے مشغلے کے طفیل
غم سے فرصت ہے، پوچھتے کیا ہو
فکر کے جال میں اگر پھنس جائے
غم مسرت ہے، پوچھتے کیا ہو
جو کبھی غم سرا تھی اب وہ نظر
وقفِ حیرت ہے، پوچھتے کیا ہو
نالہ معمول تھا کبھی اور اب
وہ بھی زحمت ہے، پوچھتے کیا ہو
زیست کوشی بھی جان دینے کی
اچھی صورت ہے، پوچھتے کیا ہو
مالِ مسروقہ ہے نشاط و طرب
درد امانت ہے، پوچھتے کیا ہو
نیک اعمال اور وعدۂ حور
اک تجارت ہے، پوچھتے کیا ہو
دوزخ اور قہرِ آتشِ دوزخ
ہتکِ جنت ہے، پوچھتے کیا ہو
نظمِ سرمایہ آدمی کے لئے
طوقِ لعنت ہے، پوچھتے کیا ہو

زرگرانہ ثقافت و تہذیب
بربریت ہے، پوچھتے کیا ہو
سب سے ناپاک شئے زمانے میں
نا شنیت ہے، پوچھتے کیا ہو
مثلِ بدروح آج بھی زندہ
ماقبیت ہے، پوچھتے کیا ہو
آدمی سے بھی کچھ سوا مقہور
آدمیت ہے، پوچھتے کیا ہو
جبرِ انساں کے آگے جبرِ سپہر
بے حقیقت ہے، پوچھتے کیا ہو
شعر و فن کا جواز و حسن و ثبات
مقصدیت ہے، پوچھتے کیا ہو
زندگی ہو تو زندگی خود ہی
اپنی غایت ہے، پوچھتے کیا ہو
دورِ صہبا ہے ردِّ دورِ زماں
ابھی فرصت ہے، پوچھتے کیا ہو
فرصتِ یک نظر کے آگے ہیچ
ابدیت ہے، پوچھتے کیا ہو
کام جوئی میں اختر ناکام
بے حمیت ہے، پوچھتے کیا ہو!

شاد عارفی

بدلی ایسی زُلف کی لَٹ میں شامل کر کے الجھن کوئی
میری خاطر — بال سکھاتے — بھانپ رہا ہے آنگن کوئی

گدرائی کلیوں کی صورت کب چھُپتا ہے جوبن کوئی
تھام رہا ہے بانہیں کوئی — کھینچ رہا ہے دامن کوئی

تیرا، چودھا کی عمروں میں لازم ہے محتاط رہیں ، ہم
کیا ایسی پھلتی عمروں کو کہہ سکتا ہے "بچپن" کوئی

ایسی للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اس کافر کو
جیسے اُس کے "جھومر بُندے" تاک رہا ہو رہزن کوئی

تنہائی میں ہم دونوں کی آنکھیں ہیں اور کنوار کے جھلّے
جس موقع سے ہم روتے ہیں ۔ کیا برسے گا ساون کوئی

مستقبل میں رفتہ رفتہ گھل مل کر افسانے ہوں گے
اب تک چلتے پھرتے جملے ..... وہ رسماً ضمناً کوئی

مشکیں زلفوں کا لہرانا دور سے کچھ ایسا لگتا ہے
جھذن لیسے ہر شلنے بہ جیسے کالی ناگن کوئی

تُو نے میری ہمدردی میں آج جو اتنی جراَت برتی
کل ہوتے ہی بڑھ جائے گا تیرے حق میں "بندھن" کوئی

اُلفت کے آکاش پہ جھلمل جھلمل کا نظارہ کیجے
تخمیناً دس لاکھ ستارے "مدھم" کوئی "روشن" کوئی

لفظیں موضوعات سے ہٹ کر اپنا مقصد کھو دیتی ہیں
محبوبہ کے نظارے کو ۔ کہکر دیکھیے "درشن" کوئی

اس کی خوشنودی کے خواہاں رہتے ہیں اس کے شیدائی
چوم رہا ہے چوکھٹ کوئی ۔ وار رہا ہے تن من کوئی

خلوت میں بھی پَرتو اس کا اس کا ہالہ بن جاتا ہے
بے پردہ مل آنے والو بیچ میں ہوگی چلمن کوئی

فیضانِ ساقی سے اندر آتے ہی تعمیرِ یقیں رخصت
میخانے سے باہر آکر ۔ کوئی شیخ ..... برہمن کوئی

اُلجھن اڑچن سے گھبرا کر پینے والے جتنے بھی ہیں
ان کے ساتھ لگی رہتی ہے ۔ الجھن کوئی اڑچن کوئی

شعروں میں اظہارِ حقیقت سے اغماض کہاں ممکن ہے
شاد میری طنزوں سے بڑھ کر کب ہے میرا دشمن کوئی

جعفر طاہر

○

ہلہ اے گروہِ سخنوراں کوئی شعرِ تر گلِ تازہ رس
یہ بہار میں بھی خموشیاں نہ سرِ جنوں نہ پئے ہوس

یہ ہے میکدہ جو بڑھا کے ہاتھ اٹھا لے جام اسی کا ہے
نہ یہاں پہ کاوشِ بیش و کم نہ یہاں پہ تہمتِ پیش و پس

شررِ طبیعتِ عاشقاں سببِ تجلیٔ گلستاں
یہ حنائے شوقِ شفق شفق یہ مئے نشاطِ نفس نفس

ہے سیاہ پوش نظر نظر ہے نفس نفس نئے نالہ گر
وہی تیرہ بختیٔ اہلِ دل وہی ظلمتِ شبِ تار و بس

تہِ تارِ کسوتِ عنکبوت یہ طائرانِ طرب نوا
سرِ تختِ فرقِ ہما ہما بعد عافیت ہے مگس مگس

یہ کماں کشانِ زرہ عزر پھر رہے ہیں کس کی تلاش میں
وہ جو باغِ جاں کی بہار تھے وہ بسا چکے ہیں قفس قفس

یہ فضائے دشتِ شعور باغ نشاط و خلدِ بسر در ہے
نہ سخن کی ہرزہ خروشیاں نہ لبِ صدا نہ دمِ جرس

ابھی پھولا پھول ہے جاں بلب یہ تپ بلا طپش غضب
ابھی کھل کے ابرِ کرم برس ابھی اور کھل کے برس برس

کبھی اس طرف بھی گزر کرو کبھی اس طرف بھی نظر کرو
میں فقیرِ گلکدۂ وفا مرے برگ ساز یہ خار و خس

ضا ابن فیضی

○

نفس نفس کو شکستِ صدا تو جانے ہے — حیات پنا مقامِ فنا تو جانے ہے

بچا سکے گی نہ تہمت سے خود کو نکہتِ گل — خبر نہیں ہے کلی کو، صبا تو جانے ہے

مری ادائے جنوں کی تمہیں خبر نہ سہی — تمہاری چشمِ فسوں آشنا تو جانے ہے

نہ چھپ سکے گا تری خلوتوں کا راز کوئی — کہ بوئے زلف کو تیری ہوا تو جانے ہے

بلا سے قدرِ وفا کی نہ ہو سکی اس سے — یہی بہت ہے کہ نامِ وفا تو جانے ہے

ترا خیال چلا میرے ساتھ ساتھ کہاں — مرا شعورِ طلب، راستا تو جانے ہے

یہی بہت ہے مری شہرتِ جنوں کے لئے — کہ مجھ کو اک گلِ رنگیں قبا تو جانے ہے

حقیقتوں سے خود اپنی ہے بے خبر لیکن — یہ آدمی، روشِ ارتقا تو جانے ہے

کبھی رہا ہوں چمن میں رفیقِ گل میں بھی — مجھے یہ موجِ نسیمِ صبا تو جانے ہے

پڑا ہوا ہوں تری راہ میں بہت ہے یہی — زمانہ مجھ کو ترا نقشِ پا تو جانے ہے

ہوں ایک راز مگر خود کھلے تو کھل جاؤں — یہ فیصلہ ترا بندِ قبا تو جانے ہے

جنوں نہ ہو تو نہ راہوں میں یہ چراغ جلیں
خرد کی تیرہ نصیبی فضا تو جانے ہے

فارغ بخاری

○

آج کب مرگ بخط وہم و گماں چاہتے ہیں
چاہنے والے ہر اک بات عیاں چاہتے ہیں

جو کبھی جلوۂ موہوم میں کھو جاتے تھے
اب وہ عشاق بھی احساس جواں چاہتے ہیں

آشیانوں میں سُلگنا جنہیں مرغوب رہا
آج وہ تنکے بھی اک برق تپاں چاہتے ہیں

زندگی جن کی بہاروں کی تمنا میں کٹی
ان پہ یاروں کو گماں ہے کہ خزاں چاہتے ہیں

کوئی کیونکر انہیں شبنم کی ردا پہنا دے
وہ خیالات جو شعلوں کی زباں چاہتے ہیں

سرِ پُر شور سلامت ہے زمانے سے کہو
فارغ اک اور ابھی سنگ گراں چاہتے ہیں

ف بلالی

○

مجھ سے غزل ہوئی بھی تو ایسی غزل ہوئی　　ہر بات میری سینہ بہ سینہ چلی گئی

دو چار گام چل کے مری سانس رک گئی　　شاید تری گلی ہے یہ شاید تری گلی

اب اس مقامِ حسن پہ ضو باش ہے نظر　　دنیا تمام کوچۂ دلدار بن گئی

بس اکتسابِ نور سے ہے واسطہ ہمیں　　وہ غم کی دھوپ ہو کہ مسرت کی چاندنی

جانے کہاں بچھڑ گئے منزل شناس لوگ　　منزل اگر ملی بھی تو بے رنگ و بو ملی

اہلِ جنوں سے اہلِ خرد کا مقابلہ　　جیسے خضر سے حضرتِ موسیٰ کی ہمسری

کیا قامتِ حسیں پہ تبسم ہے نغمہ سنج　　چھڑنے لگی ہے ساز پہ گویا اساوری

بگڑا کچھ اس طرح سے مزاجِ ہوائے دل　　اب اپنی دسترس میں نہیں یادِ یار بھی

ایسی ہوا چلی ہے کہ کانٹا نہ پوچھئے

کچھ دشمنی سے کم نہیں یاروں کی دوستی

جوہر میر

○

درد کی آنکھ سے تیرے غم کا لہو
بن کے سیلاب بہنے لگا چار سُو

دامنِ دل جھٹک کر کوئی چل دیا
گنگناتی رہی دیر تک آب جُو

خشک شاخوں نے دھرتی کا غم کہہ دیا
زرد پتوں کی نچ ہی گئی آبرو

بین کرتی ہواؤں کی آشفتگی!
چھین کر لے گئی کاوشِ جستجو

دیکھنے سوگوارانِ یوسف ہمیں
کتنے پیغمبروں کی لٹی آبرو

پھول اپنی تمازت سے سنولا گئے
لاکھ پھیلا رہا دامنِ رنگ و بو

اپنی سانسوں پہ یوں بدگمانی سی ہے
کوئی کاٹے بدن تو نہ نکلے لہو

میرجی وہ مغنی کہاں کھو گیا
ہم تو گھوم آئے ہیں دربدر کو بہ کو

ن۔ احسان

O

شہرِ احساس میں ہر سمت چراغاں تھا کبھی
صورتِ شمع کوئی دل میں فروزاں تھا کبھی

اب تو غنچے کی طرح دل میں سمٹ آیا ہے
تھا یہی دل کہ سوادِ چمنستاں تھا کبھی

میرے آغوش کی زینت ہے وہ گلفام کہ جو
میرے سائے کی طرح مجھ سے گریزاں تھا کبھی

اے مرے شہرِ تصور میں نہ آنے والے
تو وہی ہے کہ جو پیوستِ رگِ جاں تھا کبھی

حسرتیں خاک بسر نوحہ بلب پھرتی ہیں
دل کے لٹ جانے کا ایسا بھی نہ امکاں تھا کبھی

عمر گذری افقِ چشم کی زینت نہ بنا
وہ ستارہ کہ حریفِ شبِ ہجراں تھا کبھی

دل میں تعمیر ہوئے اب در و دیوارِ طلب
دشت کی طرح یہ گھر بے سر و ساماں تھا کبھی

اے مرے چاہنے والے تو مجھے بھول گیا
میں وہ محسن ہوں کہ جس پہ ترا احساں تھا کبھی

ابن فرید

رشید احمد صدیقی بحیثیت نقاد

رشید صاحب کی ناقدانہ حیثیت پر لکھتے ہوئے بے ساختہ رشید صاحب کے ایک صدارتی خطبے کے وہ جملے یاد آتے ہیں جو انہوں نے نقادوں کو رشد دلانے کے لئے فرمائے تھے۔

> "تنقید اور تنقید نگار کے سلسلے میں یہاں ایک بشارت کا اعلان ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے بچپن میں ایک روایت سنی ہوگی کہ جب ملک الموت ہر ایک کی روح قبض کر چکیں گے تو باری تعالیٰ فرمائے گا کہ اب ملک الموت کی روح قبض کرو۔ اس وقت یہ چیختے چنگھاڑتے کبھی مشرق کو بھاگیں گے کبھی مغرب کو، کبھی اتر کو کبھی دکھن کو، کبھی نیچے، کبھی اوپر، لیکن ان کی ایک پیش نہ جائے گی اور ان کو پچھاڑ کر ان کی روح قبض کر لی جائے گی۔
>
> ہمارے تنقید نگار ملک الموت کے اس انجام کو نہ بھولیں۔"

رشید صاحب ادب میں "ملک الموت" کی حیثیت سے کم اور "رشید صاحب" کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا اصل موضوع طنز و مزاح سے بھرپور انشائیہ نگاری ہے جس میں انہوں نے نازک خیالی، ژرف نگاہی، ندرت بیان، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن انشائیہ نگاری سے ہٹ کر انہوں نے کبھی کبھی تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ تنقید ان کا اصل میدان نہیں ہے اس لئے وہ اس طرف شاذ و نادر ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ مگر جب توجہ کرتے ہیں تو بقول کلیم احمد "ٹھنڈے دل سے سمجھ بوجھ کر" لکھتے ہیں اور سنجیدگی اور متانت کا برابر خیال رکھتے ہیں۔ رشید صاحب کی تنقید کے انہی اوصاف نے انھیں بھی "ملک الموت" بنا دیا ہے اور اب چاہے وہ مشرق کو بھاگیں یا مغرب کو، اتر کو یا دکھن کو، نیچے یا اوپر، لیکن تنقید نگاروں سے ان کی ایک بھی نہیں جاتی، کیونکہ بقول کلیم الدین احمد "ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں" اور جب مل جاتے ہیں تو چاہے لاکھ پردوں میں چھپیں، پہچان لئے جاتے ہیں۔ رشید صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ باوجودیکہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جس قدر بھی لکھا ہے نقادوں کے حلقے میں اس کا اعتراف کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

رشید صاحب نے صرف تنقید کی ہے بلکہ تنقید میں بھی اپنا منفرد اسلوب اختیار کیا ہے۔ تنقید نگار خواہ ملک الموت ہی کیوں نہ ہو، لیکن انہوں نے کبھی اس بدمذاقی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ وہ روح قبض کرنے بھی آتے ہیں تو انتہائی شرافت، مروت اور دل داری کے

م لیتے ہیں۔ ان کے اس مزاج کو اکثر ناقدین نے غلط سمجھا ہے چنانچہ کلیم الدین احمد نے اسے ان کی "کجروی" قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور کے
زدیک "وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے .... وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے" پرنسپل عبدالشکو
ر کہتے ہیں کہ "رشید صاحب کی تنقیدی نظر کسی حد تک محدود ہے" رشید صاحب پر یہ تنقید یں، تنقیدیں نہیں محاکمے ہیں، کیونکہ رشی
د صاحب تنقید کرتے ہوئے کبھی جارحیت کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ ان کی سنجیدگی اور متانت انھیں کچھ حدود کے اندر رکھتی ہے جس کی بنا
، غالب و اقبال کا بھی اعتراف کرتے ہیں اور فانی و اکبر کا بھی۔ اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے وہ اپنی نظر صرف متعلق باتوں پر رکھ
یں، غیر متعلق باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ ان کے یہاں تنقیدی موازنہ ہوتا ہے لیکن مرعوب کرنے کے لئے چھوٹے بڑے ناموں
کا ذکر کرنے کی کوشش نہیں ہوتی۔ یہ اصول ان کے یہاں وزن اور وقار پیدا کر دیتا ہے۔ نقادوں نے ان کے اس سنجیدہ اور پاکیزہ شعور کا اعتراف
کرنے کے بجائے انھیں "کج رو" یا "محدود تنقیدی نظر کا حامل" قرار دے دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید میں ایک معتدل
اور صحت مند رجحان کو متعارف کرایا ہے۔ وہ تنقید کو ایک خوشگوار فریضہ بنانا چاہتے ہیں۔ تخریب یا تبلیغ کا آلہ نہیں۔ چنانچہ
خود فرماتے ہیں کہ :-

میں ادب میں تخلیقی اپج کی خود روی یا بیگانہ روی کو جتنا سراہ سکتا ہوں تنقید میں اسی قدر اصولوں
سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی کا قائل ہوں"

اصولوں سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی ان کی تنقیدوں میں قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ جو انھیں صرف ناقد ہی نہیں بلکہ اد
ب مزاج داں بھی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ ادیب یا ادب پارہ میں حسن کے پہلو زیادہ تلاش کرتے ہیں اور ان کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ لغزشوں
پر پیچ و تاب نہیں کھاتے بلکہ دور اندیش مصلح کی طرح دل جوئی سے کام لیتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ بات تنقید کے لئے کچھ زیادہ موزوں و مناسب
معلوم نہیں ہوتی، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ علیگڑھ رشید صاحب کے ہر موئے بدن میں سرایت کر چکا ہے۔ سر سید نے اپنی اصلاحی تحریک
میں اس حکمت کو پیش نظر رکھا تھا، حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں بڑی جرأت سے کام لیا تھا۔ لیکن احترام و اعتراف کا دامن ان سے بھی کسی
مرحلے پر نہیں چھوٹا تھا۔ رشید صاحب نے بھی علیگڑھ کے اس اصلاحی انداز کو اختیار کیا اور نہ صرف شوخی و بذلہ سنجی میں اسے مدنظر رکھا،
بلکہ تنقید میں بھی اسے برتنے پر مجبور ہو گئے۔ جس نے ان کے یہاں حلم و بردباری، سنجیدگی، متانت اور وقار پیدا کر دیا۔ رشید صاحب بھی اگر
تنقیدی رجحان کے اعصابی تشنج کے سیلاب میں بہنے لگتے تو شاید ان کے یہاں وہ خامیاں نظر نہ آتیں جو اب نظر آرہی ہیں۔
"تنقید کے سلسلے میں رشید صاحب کے کچھ واضح تصورات ہیں جن کے ذریعہ نہ صرف اصول تنقید سے آگہی ہوتی ہے بلکہ رشید صاحب کے تنقید
نظریات کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان کی تشریح ان ہی کے الفاظ میں کی جائے۔

"تنقید کی دو بڑی اور منفرد حیثیتیں ہیں ــــ ادبی اور انسانی ــــ ادبی تنقید تمام تر کارناموں سے
سروکار رکھتی ہے اور انسانی تنقید شخصیتوں سے۔ یہاں وہاں ایک دوسرے سے خلط ملط
ہونے کے باوجود ان دونوں قسم کی تنقیدوں کی الگ الگ سرحدیں آسانی سے پہچانی
جا سکتی ہیں۔ جن کے پیش نظر ہمیں ہر دور میں تنقید کے دو مختلف دبستان نظر آتے ہیں
ان میں آپس کے بعض فروعی اختلافات کے علاوہ ایک بڑا فرق ہمیشہ اس فنی یا انسانی ہمدردی
کا رہا ہے۔

زاویہ نظر کی ایک ذرا سی تبدیلی تنقید کے دو اور پہلو اجاگر کرتی ہے۔ یعنی مقصد کی تلاش یا
تجزیہ محض سے خلط ملط ہونے کے امکانات یہاں بھی کچھ کم نہیں، لیکن تنقید کا رجحان
دیر تک چھپا نہیں رہتا، اور ہم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ناقد نے بے کم و
کاست تجزیے کے ایماندارانہ نتائج کو پیش کر دینا ہی کافی سمجھا ہے یا اس کی توجیہ و
تعبیر کے لئے اس کے سبب اعتقاد اور مقصد کا تعین بھی ضروری خیال کیا ہے۔

تفصیلات میں آئیں گے تو ان پہلوؤں کی نوعیت تبدیل ہوتی جائے گی اور تنقید کا خام موا د
ہمیں زندگی اور اس کی عکاسی کی مختلف شکلوں اور منزلوں میں ملے گا۔ مثلاً تنقید
کے روایتی مطالبات صداقت سے متعلق ہیں۔ یعنی ناقد ادیب سے کس زندگی کی عکاسی
کا طالب یا خواہاں ہے۔ وہ جو موجود ہے یا وہ جو ہونی چاہیے۔ یا مثلاً حسن و صداقت
میں سے کونسی قدر اعلیٰ اور برتر ہے۔ اور جب ایسے مواقع یا مرحلے آئیں کہ حسن کا مطالبہ
کچھ اور ہو اور صداقت کا تقاضا کچھ اور تو کس کو ترجیح دی جائے۔

ان امور کی روشنی میں اگر ہم رشید صاحب کی تنقید کا جائزہ لیں تو ہمیں وہ نہ تو خالصتاً ادبی نقاد نظر آئیں گے اور نہ خالصتاً انسانی نقاد۔ بلکہ ان سے ہ
ان دونوں حیثیتوں کا ایک حسین امتزاج نظر آئے گا۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے وہ اصولوں سے تربیت اور میانہ روی پر زیادہ زور دیتے ہیں، جیسا
انھیں نہ صرف عبدالرحمٰن بجنوری بلکہ حالی کے یہاں بھی "ایک طرفہ پن" نظر آتا ہے۔ حالی کے یہاں انھیں آرنلڈ کی طرح ہلکی سی رومانیت نظر
آتی ہے۔ وہ (حالی) "اصلاح پسندی میں جذب کر کے تنقید کو جانچتے نہیں بلکہ تبلیغ کرنے کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔

یہ ان تمام بے راہ رویوں کی بڑی اچھی نمائندگی کرتے ہیں جنھوں نے تنقید کو اس
کے جائز منصب سے ہٹا کر اسے تبلیغ، شاعری یا مبالغے میں محدود کر دیا ہے۔

انسانی نقاد کی حیثیت سے وہ ادب و شخصیت کی باہمی اثر اندازیوں کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ فقرہ ادب اور ادیب
کے تعلق کے سلسلے میں بہت مشہور ہے کہ "کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو" تنقیدی نظریہ کی حیثیت سے اس
رائے سے شدید اختلاف کیا گیا ہے۔ لیکن رشید صاحب جس پہلو پر زور دینا چاہتے تھے اس پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ فقرہ واضح طور پر اس حقیقت
کا غماز ہے کہ رشید صاحب ادب میں مقصدیت کے علم بردار ہیں۔ یہ مقصدیت بقول آل احمد سرور ادب کے ایک اخلاقی تصور کی نمائندگی
کرتی ہے۔ لیکن مقصدیت کے سلسلہ میں وہ بے محابہ تجلی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں۔ اس حجاب و نقاب
کے باوجود رشید صاحب کو اعتراف ہے کہ

فن کو شخصیت یا شخصی رجحانات سے الگ رکھنا اور دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے "اندرون قعر
دریا" "تختہ بند کر دیئے جانے والوں سے "دامن تر مکن" کی توقع رکھی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب خود بھی فن کو اپنی شخصیت یا اپنے شخصی رجحانات سے الگ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ وہ
فانی پر قلم اٹھاتے ہیں تو انھیں غالب و اقبال سے بھی آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ فانی کے یہاں غم کے ساتھ وفاداری ہے۔ اسی طرح
جب جگر کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "موجودہ بحرانی و ہیجانی دور میں غزل جگر ہی کے سہارے آگے بڑھے

کے سلسلے میں یہ فیصلے اگر ایک طرف فنی ہیں یا "ادبی" تو دوسری طرف شخصیاتی یا انسانی بھی ہیں۔ کیونکہ رشید صاحب کے ذہن پر
تذکار کی شخصیات کے بڑے حسین اثرات ہیں۔ وہ اصولی حیثیت سے فن اور ادب کی تقسیم تو کر لیتے ہیں لیکن عملاً یہ تقسیم ان کے
ہیں ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک:

فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے
اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

چنانچہ جب بھی وہ نقد و تبصرہ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو تنقید کی انسانی حیثیت کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔ مقصد کی تلاش کو وہ
یت دیتے ہیں۔ تنقید محض کی وہ کوشش ضرور کرتے ہیں، لیکن جلد ہی ان اصولی باتوں سے گھبرا جاتے ہیں۔
کلیم الدین احمد کے نزدیک "رشید احمد صاحب نے بعض بنیادی مسئلوں کی طرف توجہ دی ہے" اس لئے کہ اردو ادب کے بنیادی
صول ادب سے ان کی واقفیت گہری ہے۔ رشید صاحب کے اس وصف کا اعتراف تقریباً ہر نقاد نے کیا ہے۔ کہ ان کا رجحان
ی کی طرف ہے وہ اپنے ماضی سے وابستہ رہنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد کے خیال میں اس رجحان
تی نقاد بنا دیا ہے۔ لیکن ادب کے معاشرتی ورثہ اور تہذیبی پس منظر کو اگر ذرا بھی اہمیت دی جائے تو جدید ادب کو اس کے ماضی سے
جا سکتا۔ ادیب و شاعر کا ذہن ایک دن میں نہیں بنتا، معاشرے کی قدریں چند ثانیوں میں متعین نہیں ہوتیں اور نہ علائم و
ک ہی عام فہم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ادیب و شاعر نسلاً بعد نسلٍ خیال و فکر کی دنیا آباد کرتا رہتا ہے تب کہیں جا کر وہ اور اس کا قاری
مانوس ہوتے ہیں۔ یہی حال قدروں کا بھی ہے جن کے استحکام اور قبولیت عام کے لئے رفتہ رفتہ ذہن انسانی کو ہموار ہونا پڑتا ہے۔ تہذیبی
ماجی قدروں کے اس استحکام کے بعد ہی رموز و علائم متعین ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ایمائیت کے پس منظر میں بھی تہذیب اور یہی اقدار
کا ہیں جو ہر فرد کے ذہن سے قریب تر ہوتی ہیں۔ ان حقائق کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا
ایک مزاج ہوتا ہے اس مزاج سے اگر آگاہی نہ ہو تو نقاد ادب کی پہنائیوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ وہ ناخن ہوش سے حرا شیں
رتا رہے گا لیکن عقدے حل نہ کر سکے گا۔ اس طرح اس کا فیصلہ سطحی تو ہو گا سخن سنجانہ نہیں۔ رشید صاحب نے کلاسیکی ادب
یت کو محسوس کیا ہے اس وجہ سے وہ نہ صرف بنیادی مسئلوں کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اپنے ادب کے بنیادی مسئلے
اور حل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ "اردو شاعری" — "اردو نثر کے بنیادی اسلوب" — "اردو کا ارتقاء" وغیرہ ان مسئلوں
میں سے ہیں جن پر رشید صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ اور تنقیدی بصیرت کا کچھ ایسا ثبوت دیا ہے کہ کلیم الدین احمد کو بھی
پڑا ہے۔ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں بالعموم ذہن میں جو تصور آتا ہے وہ "ادب محض" کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس سے قدرے
ہے کیونکہ رشید صاحب ہی کے الفاظ میں فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ کلاسیکی ادب کے خالق بھی انسان ہی
قدروں کے حامل بھی اس لئے اسے مقصدیت سے عاری تصور کرنا زیادہ بصیرت افروز بات نہیں ہے۔ اردو ادب کو خوش قسمتی
ہی سے زندگی سے قریب تر رہنے کی ضرورت پڑی تھی۔ دکن میں بہمنی و عادل شاہی ادوار میں بیشتر کام مذہبی مجالس کے
شمالی ہند میں بھی یہ سلسلہ متروک نہیں ہوا۔ صوفیا کی اشاعت دین کی جد و جہد کے علاوہ خاندان ولی اللہ کی ادبی خدمات سے
کر سکتا ہے؛ میر "خانہ خرابی" کی طرف مائل ہوئے تو وہ بھی "خانہ ویرانی" کی وجہ سے۔ غدر کے گرد و پیش دہلی میں
پورے ہندوستان میں جو آفت و خیز ہوگا اس نے بقول نیاز فتحپوری مومن ایسا پہلا مقصدی شاعر اور بقول کلیم
ر امن الیاد ہی سے پیدا کیا غالب، ظفر، آزردہ، وغیرہ کی مقصدیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے شاعرانہ

سرسید کی اصلاحی تحریک بھی نشوونما پانے لگی تھی جس نے اردو ادب کو مقصدی ادب کے جذبے سے مالامال کر دیا۔ چنانچہ اردو ادب کا عروج میں شعوری طور پر مقصد کی طرف راجع ہو گیا۔ مقصدیت کا یہ رجحان ہمیں اردو ادب کے پورے کلاسیکی مرحلے میں ملتا ہے۔ چنانچہ ہر تحریری وابستگی رکھنے والے میں بھی مقصدیت کا رجحان ہونا لابدی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں مقصدیت کی تلاش کا جو رجحان ملتا ہے وہ اسی کلاسیکی ادب کا مرہون منت ہے۔ شاعری کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مقصدیت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے

> شاعری کو حقیقت اور "انسانیت" کا ترجمان ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ کس زبان کس قوم، کس ملک، کس زمانہ اور کن روایات کی ترجمان ہے۔ شعرائے اردو کے سامنے میر، غالب، انیس، حالی، اکبر، اقبال، حسرت، اصغر، فانی و تسلیاز ہونے چاہئیں لیکن ان کے سامنے الوہیت کے وہ اسرار ہونے چاہئیں جن سے انسانی ہستی مرکب ہے۔ جن کے دریافت یا اظہار کرنے کی آرزو، شرف انسانیت و معیار ترقی ہے اور جن کا حصول انسانی زندگی کا مقدس نصب العین ہے۔

اس امر کی مزید وضاحت وہ "شگفتہ بیانی میری" میں کرتے ہیں۔

> میں مذہب و اخلاق کو افکار و اعمال میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسکس کو شعر و ادب میں۔

ایک اور مقام پر وہ اپنے مقصدی رجحان کا اظہار تنقید کے سلسلے میں بھی کرتے ہیں۔

> اعلیٰ تنقید ہمیشہ اعلےٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیقات کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنے والا کائنات کی عظمت اور فن و زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں۔

لیکن مقصد کی تلاش میں وہ سیاسی انتہاپسندی کے قائل نہیں ہیں۔ ادب بہرحال ادب ہے۔ اس لئے ادب کا نقطۂ نظر ہونے کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونا چاہیئے۔ ایک ادب پارہ یا ادبی تنقید میں اگر فن کو نظریاتی عصبیت پر قربان کر دیا جائے رشید صاحب کے نزدیک مستحب نہیں ہے۔ ادب پارہ میں اگر فن کے بنیادی اوصاف نہیں ہیں تو وہ ادب نہیں ہے کم صورت میں اس کا جائزہ ادبی صنف کی حیثیت سے نہیں لیا جا سکتا۔ اسے تو بس ایک سیاسی یا تبلیغی تحریر تک محدود اس امر کا احساس رشید صاحب کو شدت کے ساتھ ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

> سیاسی استیلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ آرٹ اور ادب کے خدمت گذاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا مسرت شارنہ ہونا چاہیئے کہ وہ ادب کے صحیح خدوخال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔

رشید صاحب باوجود اس کے کہ ہمیشہ ادب کے اخلاقی نظریہ کی طرف مائل رہے لیکن انہوں نے اس کے ساتھ کی تائید کی یا اس سے جزواً اتفاق کیا۔ جس میں انھیں ادب کی صالح قدروں کا احترام نظر آیا ایک عرصے تک وہ اس بنا پر کئے جاتے رہے۔ اس لئے کہ انھوں نے اس تحریک میں انسانی رجحان کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ مگر جب سیاسی استیلا کا

رکشی اختیار کی۔ وہ اپنے ادبی نظریے سے ہمیشہ سے مخلص ہیں۔ اس چیز نے فائدہ پہونچایا ہو یا نقصان یہاں اس سے بحث نہیں، البتہ یہ مزید
نھیں ان کے توازن کو کھونے نہیں دیا۔ ایک تنقید نگار میں توازن باقی رہے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی؛ وہ کچھ عرصے کے لئے نظرانداز تو کیے
ہے لیکن جب لاتعلقی (Detachment) کے ساتھ جائزہ لیا جائیگا تو اس کی دیانت، دانشمندی اور احترام کا اعتراف ناگزیر
ہوگا۔

کلاسیکی ادب کی طرف رجحان کی وجہ سے رشید صاحب کے یہاں تاثراتی تنقید کا پرتو نظر آتا ہے۔ تاثراتی تنقید کو بالعموم اچھی نظر سے
دیکھا جاتا۔ کیونکہ اس نوع کا نقاد وجدان کو معیار قرار دیتا ہے۔ خارجی عوامل کی اس کے یہاں زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ انفرادی فیصلہ کا یہ
احترام کرتا ہے۔ کیفیت اور کمیت پر دوسری صفتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ رشید صاحب کے یہاں بھی یہ امور ایک حد تک دخیل ہیں۔
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رشید صاحب ادب پر اجتماعی اثرات کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں مشرق اور مغرب کا فرق کارفرما ہوتا ہے۔
مغربی اور مشرقی کلاسیکی ادب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی:۔

(مغربی) کلاسیکی تنقید کا یونانی ذہنیت سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے اس میں ادب پر
بھی منطق کے قابو کو اہمیت دی جاتی ہے برخلاف اس کے رومانی تنقید تخیل کو تمام تر
اہمیت دیتی ہے۔ عمل کے دائرے میں آکر یہ دونوں قسم کی تنقیدیں یہ صورت اختیار کرتی ہیں
کہ کلاسیکی تنقید کچھ روایتی اصولوں کو قائم مان کر ان کے مطابق ادب کو جانچتی ہے اور رومانی
تنقید افراد کی صلاحیتوں کا جائزہ "تاثرات" کے انداز سے لیتی ہے۔

اگر ہم بہ نظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت ہم پر واضح ہوجائے گی کہ مغربی کلاسیکی ادب کے برخلاف مشرقی کلاسیکی ادب کا رجحان تخیل کی
ہے۔ اس لئے ہر وہ نقاد جو مشرقی کلاسیکی ادب کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، رومانی تنقید کی طرف مائل ہوجائے گا۔ اس طرح رشید
کے یہاں تاثراتی پرتو کا وجود حق بجانب ہے۔ وہ مشرقی ادب کا جائزہ اس کے حدود میں رہ کر اور اس کے عوامل کے ساتھ ہمدردانہ
جائزہ لیتے ہیں۔ انگریزی تنقید سے استفادے نے جہاں ہمارے ادب میں سنجیدگی، فنی بصیرت اور وسعت مطالعہ پیدا کیا ہے وہاں اس
بھی بری طرح پروان چڑھایا ہے کہ ہم اپنے ادب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے اجنبی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ
نہ ہم اپنے ادب کے ساتھ مخلص رہ سکتے ہیں نہ اس کے مزاج کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ تعمیری فریضہ انجام دینے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔
تہذیب شتر گربگی پیدا ہوجاتی ہے۔ رشید صاحب کے نزدیک یہ طوائف الملوکی ناقابل برداشت ہے۔

تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا، وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کارناموں
کے پرکھنے کے لئے انتہائی دیانت، دانشمندی اور احترام سے کام لینا پڑے گا۔ نکتہ رسی
کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونی چاہیئے۔ تنقید نگار نہ تو پولیس کی مانند روزنامچہ تصنیف
کرتا ہے نہ فرشتہ شیخین فرشتوں کی مانند اعمال نامے مرتب کرتا ہے۔ یہ کیسی تنقید ہے کہ
امت زید کی ہو، پیغمبر عمرو کا، خدا بکر کا اور جنت و دوزخ خالد کی، ہر امت کا حشر اس
کے پیغمبر کے ساتھ اور اس کے خدا کے سامنے ہوتا آیا ہے۔ یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی
ناکام ہیں اس لئے کہ سرسید کامیاب رہے اور سرسید ناکامیاب رہے اس لئے کہ کانگریس
کامیاب رہی اور کانگریس اس لئے ناکامیاب رہی کہ چین پر روس کا قبضہ ہوگیا اور روس

ناکامیاب رہے گا اس لئے کہ رشید صدیقی جگر صاحب پر کچھ فدا رہے ہیں۔ میں اپنے اکثر نقادوں سے کہوں گا

دل نہ بہی بجوب ما طعنہ مزن بزشت ما

رشید صاحب کی تنقید میں بھی دیانت، دانشمندی اور احترام رچا بسا ہوا ہے۔ وہ اپنی تنقید کے لئے اگر مشرق کی امت کا انتخاب کرتے تو یورپ کا پیغمبر، یونان کا خدا اور دوسروں کی جنت و دوزخ کو ایک ہی میدان حشر میں مجتمع کرنے کی سعی رائیگاں نہیں کرتے۔ وہ تنقید کرتے ہیں صرف ادب سے وفادار رہتے ہیں بلکہ اس تہذیب، معاشرے اور اخلاقی اقدار کے ساتھ بھی مخلص رہتے ہیں جس میں اس ادب نے نشوونما پائی۔ اس طرح ان کے تخیل کو اہمیت دینا تاثرات کا احترام کرنا اور کیفیت و کمیت کو جائز مقام دینا اس مخصوص تنقیدی بصیرت کی غمازی ہے سے مستفاد ذہن اب تک فیضیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ وصف رشید صاحب کی محدودیت یا بے بضاعتی نہیں ہے بلکہ ان کی نقادانہ پختگی فنی ژرف نگاہی ہے۔ اگر اردو ادب کو چند ایسے ہی ہوش مند نقاد میسر آ جائیں تو ادب کی تقدیر ہی بدل جائے۔

رشید صاحب کی تنقید بھی ان کے تخلیقی مضامین کی طرح تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ تاثراتی تنقیدوں میں بھی اصولاً تخلیقی تنقید ہے۔ اس لئے رشید صاحب کے یہاں تنقید کا تخلیق بن جانا تعجب خیز امر نہیں ہے۔ تنقید میں ان کا اسلوب اپنے اندر بڑی ندرت رکھتا ہے۔ اس میں تازگی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ یہ تازگی اور شگفتگی ان کے مزاج کی شوخی کی پیداوار ہے۔ تنقید میں بھی وہ ایسے چونکا دینے والے فقرے چست کرتے جاتے ہیں کہ قاری پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے۔ مثلاً "غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں" "جس شخص میں شریفوں کے نہ ہوں، اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں"۔ "غالب نے نثر اور نظم دونوں کو دلیری بھی دی دلبری بھی" "میں شاعری میں کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں"۔ ایسے جملوں میں صرف شوخی ہی نہیں بلکہ ذہانت بھی پائی جاتی ہے اور یہ ذہانت اس وقت تک اثر نہیں ہو سکتی جب تک بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی روایت کا صحیح شعور نہ ہو۔ رشید صاحب کے پختہ شعور میں کلام نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے ماضی کی روایت اور اس کی اقدار کو خوب اچھی طرح سمجھا اور پرکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ مختصر سے جملے میں بہت بڑی حقیقت کو تراش کر کی طرح رکھ دیتے ہیں۔ ایسے جملوں کو بالعموم بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لیکن ان میں پنہاں نئے اور اچھوتے خیال کی قدر نہ کی جاتی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:-

> اس طرح رشید صاحب کے تنقیدی اسلوب میں ایک بڑا دل موہ لینے والا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس انداز کو لوچ اور بانکپن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تیکھا پن اس کو کہہ سکتے ہیں یہ تیکھا پن رشید صاحب کے تنقیدی اسلوب میں جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔

یہ تیکھا پن رشید صاحب کے یہاں ایک رعنائی اور حسن پیدا کر دیتا ہے۔ تنقیدی حقائق کو زندگی بخش دیتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رشید صاحب کی تنقید میں انسان دوستی اور ہمدردی کے عوامل نمایاں کر دیتا ہے۔ تیکھے پن، بذلہ سنجی اور شوخی میں وہ سے دور نہیں جا پڑتے بلکہ اور بھی زیادہ قریب آ جاتے ہیں۔ ان کا یہ انداز اختلافی مراحل میں بھی میانہ روی سے دست بردار نہیں دیتا بلکہ اس اسلوب ہی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی تنقید میں ایک خوشگوار فضا اور رجائی (Optimistic) زاویۂ نظر کو پیش کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

ان کے اس اسلوب کی مثال اردو تنقید میں نہیں ملتی۔ آل احمد سرور نے رشید صاحب کے اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ وہ رشید صاحب کی جیسی شوخی اور شگفتگی پیدا نہ کر سکے بلکہ جلد ہی مذہب دستی میں کھو گئے۔ یوں بھی دونوں

...ادی فرق کی وجہ سے ایک کے لیے دوسرے کے اسلوب کا اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس طرح رشید صاحب نہ صرف تنقیدی
... کے لحاظ سے تنقید نگاروں میں منفرد ہیں بلکہ اپنے تنقیدی اسلوب کے لحاظ سے بھی منفرد ہیں۔ کلیم الدین احمد نے اردو
تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے حالانکہ رشید صاحب کو بھی نہیں بخشا ہے لیکن جیسا اعتراف انھوں نے رشید صاحب کا کیا ہے شاید کسی
...نگار کا نہیں کیا۔

اگر رشید صاحب دماغی کاہلی سے دست بردار ہوکر غور و فکر کی عادت ڈالتے، اگر وہ
طبیعت کی کج روی کو سلامت روی میں تبدیل کر سکتے تو زیادہ کامیاب ہو سکتے۔

...عتراف ہی اس امر کی دلالت ہے کہ رشید صاحب نے حالانکہ تنقید کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے، لیکن ان چند تنقیدی
...ن کی بنا پر جو انھوں نے گاہے گاہے لکھے ہیں اپنی بے پایاں تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اگر بحیثیت انشا پرداز اور طنز نگار
ہیں تو بحیثیت نقاد بھی ممتاز مقام پر ہیں۔

ڈاکٹر رب نواز لوہرک زئی

رحمٰن بابا ــــــ میدان عشق میں

ہر قوم کا ماضی بعض ایسی ہستیوں سے وابستہ ہوتا ہے جن پر اس قوم کی تاریخ بجا طور پر فخر و ناز کرتی ہے۔ اور انھیں وقتاً فوقتاً خراجِ محبت و عقیدت کیا اپنے اور کیا غیر، ہر کسی کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی ہستیاں سیاسی بھی ہو سکتی ہیں، سماجی بھی، لیکن بلند ترین مقام اُن ہی کے حصے میں آتا ہے، جنھیں فن سے محبت اور فن سے زندگی ملتی ہے اور پھر اُن کی یہ فنی محبت اور فنی زندگی ابد کے سانچے میں ڈھل جانے کے بعد امر ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی امر مشہور پشتون شاعر عبدالرحمٰن بھی تھا جس کی امر ہستی آفاقی تھی، جس کا فن آفاقی تھا اور جس کی محبت آفاقی تھی۔ اور اسی لئے میرا خیال ہے، کہ اگر آفاق سے پرے کہیں کوئی اور جگہ ہے، تو پھر رحمٰن ــــــ جو رحمٰن بابا بن کر آج ہر پشتون کے دل کی حیات پر حکمران ہے، اُس جگہ کا مکین تھا۔ اور اُس کی منزلِ حیات یہ دھرتی اور اس دھرتی پر رہنے والی بے نام، بے رنگ اور بے بو زندگی نہیں تھی، بلکہ کوئی اور زندگی تھی، جو عشق کے وجدان میں ڈھلی۔ چھپی بظاہر معدوم، لیکن بباطن موجود ہے ــــــ

زندگی کی دوڑ میں ہر قوم کے کاروانِ حیات نے اپنے اپنے رہبر پیدا کئے اور وہ ہر میدان میں منزلِ حیات کو پانے کے لئے رہبری کا حق بھی اپنی سعی و کاوش کے مطابق ادا بھی کرتے رہے لیکن جس قسم کا حق فنکار رہنگامۂ حیات میں ادا کرتے رہے، اس کا تخیل سب سے بلند اور پاکیزہ تھا۔ کیونکہ وہ صرف زندگی کے مادی و سماجی اور سیاسی و ثقافتی منزلوں کے علمبردار ہی نہیں تھے، بلکہ تصور و تخیل، خیال و وجدان اور روح و دل کے بھی حکمران تھے اور ان کی حکومت جذبہ و احساس اور محبت و عشق کی ریاست پر ہمیشہ قائم رہی اور آئندہ بھی رہے گی، بشرطیکہ سچائی کا دیپ اُن سے جلتا رہے اور محبت کا پر اُن سے نور کی کرن کی طرح جگمگاتا رہے۔ ان کی یہ فنی منزل جو اُن کو عام زندگی سے الگ کرتی ہے، اور فرش سے عرش پر پہنچاتی ہے، اس کو پانے کے لئے اُن کی زندگی کتنی جد و جہد کرتی ہے اور کس قدر بھینٹ فن کی محبوبہ کی خوشنودی کے لئے چڑھاتی ہے۔ اس کا اندازہ اس زندگی۔ اس رینگتی ہوئی بھوک اور ان غمناک حقیقتوں سے ہوتا ہے، جو اُن کی زندگی کو مادی عیش و آرام، جذباتی سکون و احترام، ذہنی طمانیت و مسرت سے محروم کر دیتا ہے اور دل کے درد کو کبھی آنکھ کی راہ سے، اور کبھی دل کی راہ سے خون و آنسو کے رنگ میں ایک نہ تھمنے والے سیلاب کی طرح بہا دیتا ہے۔ اُن کی زندگی آنسوؤں کے سیلاب پر بھٹکی ہوئی کبھی موت کے منجدھار میں پہنچ جاتی ہے اور کبھی کے پُرسکون ساحل پر موجوں کے پُرشور و پُرآشوب ہنگاموں سے بچ کر پہنچ جاتی ہے۔

یہ بے حال زندگی ــــــ یہ مجنونانہ وارفتگی ــــــ اور یہ والہانہ محبت کسی خوش قسمت ہی کے حصے میں آتی ہے اور خوش قسمت صرف فنکار ہی ہو سکتا ہے۔ جس کی اپنی زندگی تباہ و برباد سہی، لیکن جو فن کی زندگی کو بناتے سنوارتے ہیں اور فن کے نقوش اپنی تخلیقی و فنی صلاحیتوں سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں۔ دنیا کم ظرف ہے، کہ وہ فنکارانہ ہستیوں کو بھی دیوانوں کا نام دیتی ہے اور کبھی کچھ اور ــــــ اور حد تو یہ ہے، کہ زندگی بھر تو دنیا کا اُن سے نفرت کرتا ہے معاشرے کا بھلا اُن کی انا سے ٹکراتا ہے لیکن موت کے بعد بھی دنیا کا مزاج اور یہی معاشرے کا بھلا [illegible]

بن کران کی قبروں پر پھولوں کے چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور
نت نئے القابات اور خطابات سے نوازتے ہیں اور پھر بھی
کا دوران کی زندگی پر موت کے چھا جانے کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔
لیکن یہ بعد از وقت ہیر پھیر کس کام کی؟ کیا یہ ہیورت سے
چھین سکتی ہے، کیا یہ روٹھی ہوئی زندگی ان فنکاروں کو دلا سکتی ہے
اُن سے ان کی وہ چھین اور قرار کی تلاش میں بھٹکی ہوئی رسیدہ
نار پا سکتی ہے، جو زندگی بھر بھوک و افلاس، صعوبت و احتیاج
تلے اتنی دب جاتی ہے، کہ مسرت کا احساس بھی نہیں کر سکتی۔ پھر
زندگی کام نہیں کرتی۔ ذہن، جذبہ اور قلم کام کرتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کس قدر بے حس اور ظالم ہے، کہ
ہیں تو کسی فنکار کو نہ سہی کسی اور شخص کی زندگی کو بچانے کے لئے
بند سکے دولت کے ـــــ چند ٹکڑے روٹی کے اور چند چیتھڑے
ں کے نہیں دے سکتی، کہیں موت کے بعد مٹی کے تودوں کے نیچے
ں دفن کرنا باعثِ شرم و عار سمجھتی ہے اور ان پر اپنا مزید احسان
نے کے لئے بڑے بڑے پتھروں اور سلوں کے مقبرے بنا دیتی ہے،
کے نیچے اُن کی مردہ ہستی بھی احساس کے بوجھ سے مضطرب ہو جاتی ہے۔
انہیں اس بے وقت عنایت سے بھی نقصان و زوال پہنچتا ہے۔
اُن کی روح کا وہ جیتا جاگتا شعور ان دنیا والوں کے طور طریقوں
پر خند کرتا ہے اور بزبانِ خاموشی چیخ چیخ کر کہتا ہے، کہ اے
والو ہماری موت کے بعد اگر تم نے ہماری قبر میں سونے کی بھی
ادیں، تو ہمیں کیا فائدہ۔ زندگی میں تم نے ہمیں زندگی کا ایک تنکہ
نہیں دیا اور اب ہماری موت پر یہ تمہاری اس خوشی کا اظہار
ہا ہے، جو ہماری موت سے تمہیں ہوئی ہے ـــــ

جبر یہ دنیا کی پرانی ریت ہے یہ ایک ایسا فرسودہ وطیرہ ہے،
دنیا کے فرسودہ نظام نے روز ازل سے اپنا رکھا ہے اور شاید
ستک اپنائے رکھے گی، کیونکہ وہ فن ضرور چاہتی ہے۔ فن کی قیمت
ب دینا چاہتی۔ محبت چاہتی ہے، لیکن محبت دینا نہیں چاہتی زندگی
ہتی ہے لیکن زندگی دیتی نہیں ہے اور اس کی یہ ضرور تمیں
کہ کوئی فنی زندگی اخلاص و راستی نیکی و انسانیت کے نام پر
ور ...

ایسی ہی فنی زندگی پشتو کے عوامی شاعر رحمٰن کی بھی تھی، لیکن
وہ دیوانہ مشہور تھا، اس لئے کہ اس کی زندگی نے بھی اسی فرسودہ نظام
کے تحت دنیا میں آنکھ کھولی تھی، یہ اور بات تھی، کہ اس کا فن ایسا دنیاوی
نظام سے بالاتر تھا۔ اور اس دھرتی کی بدنام حدود سے باہر تھا اور دنیا
کے مزاج اور معاشرے کے ہونے کی پہنچ سے باہر تھا۔
عبدالرحمٰن ـــــ کو جسے دنیا رحمٰن بابا کے نام سے جانتی
تھی اور آج بھی جانتی ہے، دنیا والوں سے بیزار و جگر سوختہ تھا، اُسے
اپنے عشق سے جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا، محبت تھی۔ اس کے لئے
زندگی عشق، اور اعلیٰ عشق کی منزل تصوف تھا اس کا مسکن عرش تھا،
اس کا بچھونا یہ دو دنیا ہو دھتی۔ وہ جانتا تھا، کہ عشق ہی زندگی کا اصل
پالن ہار ہے اور اس کے بغیر یہ زندگی کبھی بھی سکھ کا سانس نہیں
لے سکتی لیکن اس کا عشق خام نہیں تھا، پختہ کار تھا، وہ مکتبِ عشق کا
طالب علم نہیں، بلکہ معلم تھا اور اسی لئے تو وہ اپنی ایک غزل میں کہتا ہے۔

کہ چالا رہ عاشقی دَ ورکه کړی
زَهٔ رحمٰن دګمراهانو رهنما یم

(ترجمہ) اگر کسی نے عاشقی کا راستہ گم کر دیا ہے، تو میں رحمٰن کا
گمراہوں کا رہنما ہوں ـــــ

وہ واقعی رہنما تھا۔ اور اس قسم کا بانگِ دہل اعلان ایک
رہنما کی زبان سے ہی ہو سکتا ہے، کسی مقلد یا پیروکار کی زبان سے نہیں۔
دنیا رحمٰن کو دیوانہ دیوانہ پکارتی تھی، لیکن رحمٰن کی انا اس سے
بے نیاز تھی، کیونکہ اُسے نہ دولت کی پرواہ تھی اور نہ اچھے سلوک کی تمنا
بلکہ اُسے اپنے کام سے سروکار تھا اور اُسے اپنی درویشانہ حالت پر ناز
تھا۔ اسی لئے تو کہتا ہے

کہ قسم په کردګار را باندے کاندے
چه رَم په کور کښې دَه درهم او نه دینار

(ترجمہ) خداوند کردگار کی قسم مجھ سے لے لو کہ نہ گھر میں درہم
رکھتا ہوں اور نہ دینار

یہ تو اس مستغنی شاعر کی وہ فقیرانہ حالت تھی جو ہمیشہ صاحبِ دل
لوگوں کے حصے میں آتی ہے، اب آگے دیکھئے صبر و استغنا کی اس
عظیم المرتبت شخصیت نے اپنے اس شعر میں کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے۔

که دنیا د نپ کھٹے دنیا بے نه کے

که خیل زړه دنیا سپے تمام بهٔ نه کے

(ترجمہ) اگر دنیا (دولت) کو تم اپنانا چاہتے ہو، تو نہیں اپنا سکتے۔ اگر اپنے دل کو (دولت) بنانے ہو، تو تمام نہیں کر سکو گے۔

اس سے شاعر کا مطلب صاف ظاہر ہے، کہ دولت لاکھ اپنانے سے بھی اپنی نہیں ہوتی اور اس کی حرص کی آگ برابر تیز ہوتی ہی رہتی ہے اور حرص کی اس بڑھتی ہوئی رفتار سے اطمینانِ قلب زائل ہو جاتا ہے اس لئے دل کی دنیا پر یعنی دل کے مال و دولت پر صبر و قناعت ہی ناتمام سرمایہ ہے۔ اور اسی سے تونگری کا بھرم قایم رہ سکتا ہے جیسا کہ فارسی کا ایک مقولہ ہے :-

؎ تونگری بدل است نه که به مال

رحمٰن بابا کا عشقیہ تصور نسب و ذات سے کس قدر بلند اور آفاقی تھا، اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

رهٔ عاشق یم سروکار ری دی له عشق

نه خلیل، نه داؤد زی یم نه مومند

(ترجمہ) میں عاشق ہوں اور میرا سروکار (کاروبار) عشق سے ہے، نہ میں خلیل، نہ داؤد زی نہ مومند ہوں ——

یہ مذکورۂ بالا تین قبیلے ہیں، جن میں سے ذات و نسب کے اعتبار سے رحمٰن بابا مومند فرقہ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن وہ مئے عشق کا مے نوش، اعجازِ عشق کا والا وشیدا اس تفرقہ جاتی امتیاز کا مذاق اڑاتا ہے اور خود کو صرف عشق کے مسلک و مذہب، قوم و ملت کا پابند بتاتا ہے۔

عشق میں اپنی بے ریائی اور زندگی میں اپنی حالتِ زار کا نقشہ ایک غزل کے ان دو شعروں میں کتنے اچھے رنگ میں کھینچتا ہے، کہتا ہے

دغنچه قیصه په سل ژبه خاموش یم

لکه بوئی هستی په پیغوله گویا یم

په خپل شکل د هر چا نه کند پیژنیم

آئینی غوندی بے رویه بے ریا یم

(ترجمہ) (۱) غنچے کی طرح سو زبانوں سے خاموش ہوں اور خوشبو کی طرح چپ منہ خاموش (زبان) سے گویا ہوں۔

(۲) اپنی شکل میں ہر کسی کو نظر آتا ہوں اور آئینہ کی طرح بے رو اور بے ریا ہوں یعنی بالکل پاک و صاف اور کذب و ریا سے ہوں۔

ایک اور شعر میں شمع کی مناسبت سے یوں اپنی ویرانی و... کا ماتم کرتا ہے :-

؎ په خنده کښې می تر بادهٔ لکه شمع

که عالمه پټ پټ ژاړم د خان په ویر یم

(ترجمہ) شمع کی طرح میری ہنسی میں رونا اور عالم سے (چھپا ہوا) بھی اپنے ماتم میں ہوں۔

اب ذرا اگر انسانی فکر اپنی غلط روی کی بنا پر ٹھوکر نہ کھائے تو رحمٰن بابا کے اس شعر سے ہر کسی کو یقین ہو جائے گا۔ کہ زندگی وایثار ہے۔ اور اس شعر میں اس نے کس قدر شائی پیرا... سدا بہار حقیقت اور اس کی ہمہ گیر فروزاں اصلیت کو ...

اورنگ زیب او شاهجهان غوندي اشراف

صدقه شه ستا منصور غوندي نداف

(ترجمہ) اورنگ زیب اور شاہجہاں جیسے اشراف (جاہ و مرتبہ لوگ) منصور جیسے نداف (بظاہر حقیر اور ظلم کا نشانہ بننے والے) پر صدقہ (قربان) ہوں۔

اب کوئی سوچے، کہ اورنگ زیب اور شاہجہاں ... کے مغل حکمراں تھے اور حکومت کی وجہ سے ہر کہ و مہ کے فخر تھے لیکن رحمٰن کا دل ان کی شرافت و عزت کو تسلیم نہیں کرتا ان سے بغاوت اختیار کرتا ہے اور ان کی جگہ اس منصور کے مقام کو اعلیٰ و برتر مانتا ہے جو محض عشقِ حقیقی —— دعویٰ کے باطن کی بنا پر دنیا والوں کی خواہش پر لقمۂ اجل ہو گیا جس کا باطنی وجود موت کے بعد بھی انا الحق کی عشق افزا صدا بلند کرتا رہا اور اور اس کی صداقت پر یقین، دلیل دیتا رہا کو اس معتوب منصور کا ایثار زیادہ عزیز تھا، بہ نسبت اورنگ زیب اور شاہجہاں کے ظاہری نسب و ثروت کے۔

پٹھانوں ہیں بھی وہ عشق چاہتا ہے دل کی چشم بینا سے

ے اسی لئے ایک جگہ اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ :-

) بہت سے نامی پٹھان اس زمانے (ایام) سے

ے میں لیکن جن کا عشق نہیں تھا' وہ تمام بے نام (گمنام) ہیں۔

) افسانوں میں [illegible] کا مذکور ـــــــــ ذکر ہر جگہ ہوتا ہے

ے تک آدم خان یوں یاد نہیں کیا جاتا رہے گا۔ واضح رہے

خان پشتون سماج میں عشق کا وہی مقام رکھتا ہے جو جیسے

جاب میں لیلیٰ مجنوں نجد میں' وامق عذرا عرب میں اور دوسرے

ستم رسیدہ اپنے ماحول و معاشرے میں رکھتے ہیں۔ مزید وضح

آدم خان کی محبوبہ کا نام "درخانی" تھا اور "آدم درخانی"

قصہ پشتون دنیا کے گھر گھر مشہور ہے۔

(۳) برادر! یہ تمام عشق کی دولت ہے' کہ عاشق قیامت تک

ہیں۔

اندازہ کیجئے کہ عشاق کی ناموری اور عشق کی لافانی حیثیت

کرنے کے لئے ـــــ یہ اشعار کتنے پر حقیقت و پُر مغز ہیں

اپنے زندگی کا ہر مسئلہ عشق کی زبان سے بیان کیا ہے کیونکہ

سے بہتر اور زود اثر زبان کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے اور عشق

دوا ہے جو بیمار روحوں کے لئے مسیحا کا کام دیتی ہے۔

اپنے شعر کے متعلق کس قدر حسین تصور پیش کرتا ہے۔

سہ ہسی خوندکہ چہ بیاض و رحمن شعر
لکہ زلفی د خوبانو چہ رخسار

(ترجمہ) بیاض میں رحمن کا شعر اس طرح لطف دیتا ہے یا
شعر بیاض پر ایسا پرکیف ہوتا ہے۔ جیسا خوبرووں کے

پر زلفیں ـــــــــ

کوئی اس فنی نزاکت کا اندازہ تو کرے' کہ شعر و بیاض کو
رخسار کی تشبیہ میں کس خوبصورتی سے نبھایا ہے ایک اور جگہ
سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

سہ کاش کہ زہ خاوری امیری دستا دوروی
چہ قدم دی ہمیشہ حما چہ سر دی

ترجمہ:۔ کاش کہ میں تمہارے در کی خاک اور راکھ ہوتا۔ تاکہ
تمہارے قدم ہمیشہ میرے سر پر ہوتے۔

رحمن بابا کا تمام وجود صنعت شعری اور وصف عشق سے
معمور ہے' یہ تو صرف چند اشعار میں' اور محض اس کے کلام عشق کے
چند نمونے ہیں' ورنہ اس کا معجز بیان عشق تو شعر کے لباس میں اس
کے دیوان کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے۔

اگر وقت نے اجازت دی اور زندگی رہی' تو اس آفاقی فنکار
ـــــ اور فطری شاعر کے کلام پر نقد و تبصرے کا سلسلہ آئندہ
بھی جاری رکھوں گا ـــــ تاکہ اس عظیم فن کار سے ہر کسی کا احساس
روشناس ہو جائے' جس نے رحمن بابا کو صرف پشتو کا محبوب تغزل گو
شاعر ہی نہیں بلکہ فنِ عشق کا امام الامام بھی بنا دیا ہے۔

لطافت پرواز

ثقافتی ورثہ

پوٹھوہاری لوک گیت

——— اور اس کا اُردو ترجمہ

پوٹھوہاری

ونگیارن ——— گلی گلی ونگیارن پھر دی
ونگاں لوڈ چڑھانی کڑیو
——— ونگاں لوڈ چڑھا

کڑیاں ——— کوٹھے تے چڑھ ہوکا ماراں
ساڈی گلی وار آ ونگارییے
ساڈی گلی وار آ

ونگیارن ——— تیری گلی نوں کیکر آ لواں
میں پردیسن مار نہ کھانواں
سس ہے بڑی بلا ——— ونگا لوڈ چڑھا

کڑیاں ——— سس کولوں پچھیا ناں کولوں پچھیا
سس وی نہ بولی ناں دی نہ بولی
آپے لئیاں چڑھا
ساڈی گلی وار آ ونگیارییے
ساڈی گلی وار آ

ماہیا ساڈے دل وچ وسدا
باہر ودا آیا ہسدا ہسدا
ماڑے لیا پڑھا
ساڈی گلی وار آ ونگیارییے
ساڈی گلی وار آ

اُردو ترجمہ ———

بنجارن ——— گلی گلی بنجارن گھومے
بانکیں لو چڑھاؤ بیبیو
بانکیں لو چڑھاؤ

لڑکیاں ——— کوٹھے پر چڑھ کے بلاؤں
گلی ہماری آؤ بنجارن
گلی ہماری آؤ

بنجارن ——— تیری گلی میں کیسے آؤں
میں پردیسن مار نہ کھاؤں
ساس کو پہلے مناؤ
بانکیں لو چڑھاؤ بیبیو
بانکیں لو چڑھاؤ

لڑکیاں ——— ساس سے کہا پوچھا نند سے بھی پوچھا
ساس بھی نہ بولی نند بھی نہ بولی
خود ہی آ کے چڑھاؤ
گلی ہماری آؤ بنجارن
گلی ہماری آؤ

پیا ہمارے دل میں سمایا
ہنستا ہوا باہر سے آیا
ماں کا چل گیا داؤ
گلی ہماری آؤ بنجارن
گلی ہماری آؤ

خبرنامہ

خسرو کی یاد میں

لاہور ۲۲ مارچ. بزم ثقافت کے زیر اہتمام اتوار کو حضرت امیر خسرو کا ... منائی گئی. تقریب کی صدارت مسٹر جسٹس سجاد احمد جان اور افتتاح ... شیخ مسعود صادق نے کیا. پہلی نشست شام کو ۵ بجے ... آڈیٹوریم میں ہوئی. ڈاکٹر وحید مرزا، مولانا علم الدین سالک، ... شجاع، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عشرت رحمانی، اور پروفیسر ... نے تقاریر کیں، دوسری نشست اتوار کو ۸ بجے شب ڈویژنل ... ریم (نزد عجائب گھر) میں ہوئی اس میں مشہور فنکار حضرت امیر خسرو ... اور ان کے ایجاد کردہ راگ سنائے گئے.

... غالب

یکم مارچ ۱۹۶۳ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری کی نئی عمارت میں ... پاکستان کی ممتاز ادبی و ثقافتی انجمن فردوس خیال کے زیر اہتمام ... غالب منائی گئی. اس اجلاس کی تین نشستیں ہوئیں. پہلی نشست ... غالب" کے عنوان سے ہوئی جس کی صدارت مشرقی پاکستان کے وزیر ... اطلاعات جناب اے ٹی ایم مصطفےٰ نے کی. اس کا افتتاح ... غالب کی پہلی غزل سے کیا گیا پہلے پروفیسر حنیف فوق نے ... پڑھا. ان کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی صدر شعبہ اردو و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی اور پروفیسر سید عزیز الرحمٰن ہاشمی اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم مشرقی پاکستان نے غالب کی زندگی اور ان کی ادبی حیثیت پر تقریریں کیں.

آخر میں صدر جلسہ نے غالب کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا.

اس نشست کے بعد "فیض غالب" کے عنوان سے مشاعرہ ترتیب دیا گیا. جس کی صدارت ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کی. مشاعرے میں صدر کے علاوہ حنیف فوق، نوشاد نوری، اعجاز الحق اعجاز، سرور بارہ بنکوی، اشرف الہ آبادی، انور فرہاد، ادیب انجم، ذکی صدیقی، عیش برنی اور دیگر شعراء نے اپنا کلام سنایا.

شام غالب کا آخری اجلاس "ہم آہنگ غالب" تھا جس میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے فلمی موسیقاروں محبوب رحمٰن خان عطاء الرحمٰن، احمد اللہ صدیقی، اے جی نواز اور محمد اشرف نے غالب کی غزلیں پیش کیں.

اس پروگرام کے اختتام پر "فردوس خیال" کے معتمد اعلیٰ پروفیسر اعجاز الحق اعجاز نے خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کیا.

کتاب بہترین ساتھی

سکریٹری مجلس احباب کتاب (فرینڈز آف بک سوسائٹی) لاہور

نے ایک مستقل مراسلہ جاری کیا ہے جس کے ذریعہ "کتاب بہترین ساتھی ہے" کے عنوان سے ... کی اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات کو اردو اور بنگالی زبانوں میں مقابلہ کا انعامی مضمون لکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مراسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مقابلہ میں پرائیویٹ طلبا بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

اول، دوم اور سوم آنے والے طلبا میں مبلغ ایک ہزار روپے کی رقم تقسیم کی جائیگی۔ مزید تفصیلات کے لئے مجلس آداب کتاب (فرینڈز آف بک سوسائٹی) کمرہ ... م۔ بی شاہ عالم گیٹ لاہور سے جوابی کارڈ لکھ کر معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اس مجلس کی شاخیں کراچی اور ڈھاکہ میں بھی قائم ہیں۔

لڑکیاں اور رومانی ناول

گو جبرانوالہ میں لڑکیوں میں لڑکوں کی نسبت رومانی ناول پڑھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس بات کا اندازہ شہر کی ... لائبریریوں کے ایک جائزہ سے ہوا۔ جائزہ سے معلوم ہوا کہ ایک آنہ یومیہ کرایہ پر ناول حاصل کرنے والے ہر دس افراد میں سے سات لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جائزے کے مطابق آٹھویں سے بارہویں جماعت تک کی لڑکیوں میں یہ رجحان سب سے زیادہ ہے جب کہ آٹھویں سے میٹرک تک کے لڑکے زیادہ تعداد میں رومانی ناول پڑھتے ہیں۔

قیمتی دستاویزات

کراچی میں گذشتہ ماہ سر شاہ محمد سلیمان کی پانچویں برسی منائی گئی اس موقع پر فریر ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں سر شاہ سلیمان کے صاحبزادے مسٹر احمد سلیمان نے اپنے والد کے جمع کردہ صدیوں پرانے قرآن شریف کے قلمی نسخے، تاریخی دستاویزیں اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "اضافیت کی جدید تعبیری" کا مسودہ قومی عجائب گھر کو پیش کیا۔ قرآن پاک کے یہ قیمتی نسخے اور تاریخی دستاویزات بیگم سلیمان انتہائی رازداری کے ساتھ پاکستان لائی تھیں۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ... نے اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے سر شاہ سلیمان کو ... خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ سر شاہ [illegible] تھے۔

راجہ صاحب محمود آباد نے سر شاہ محمد [illegible] پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس برصغیر کے ان [illegible] میں سے تھے جو ملک کی آزادی پر یقین رکھتے تھے اور [illegible] تھے۔ ان کی زندگی ہر دور میں عوام کے لئے مشعل راہ [illegible]

مسٹر احمد سلیمان نے قومی عجائب گھر کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے والد علی گڑھ یونیورسٹی کے چانسلر تھے اور انہوں نے ... علی گڑھ یونیورسٹی کو دے دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میری بیگم نے قرآن پاک کی ... جلدیں لا سکی تھیں جو میں قومی عجائب گھر کے [illegible] کر رہا ہوں۔

قومی عجائب گھر کے ڈائرکٹر مسٹر ... نے کہا کہ پاکستان کے عجائب گھر کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ جب کسی نے اتنی قیمتی دستاویزات اور کتابیں عجائب گھر کو دی ہیں۔ انہوں نے اپیل کی کہ اگر ان کے پاس قیمتی اور تاریخی دستاویزات ہوں تو قومی عجائب گھر کو دے دیں۔

رومن رسم الخط کی تجویز

ترک ماہر تعلیم اور ادیب پروفیسر فاخراز نے لاہور میں خیال ظاہر کیا کہ اردو اور بنگالی زبانوں کے لئے رومن رسم الخط اختیار کرنے سے نہ صرف دونوں زبانوں میں یکانگت پیدا ہوگی بلکہ ... بھی بلند ہوگا۔ پروفیسر فاخراز نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے دیے جانے والے ایک عصرانہ میں تقریر کرتے ہوئے مزید کہا کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے بچوں کو خاص طور پر سہولت رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ ترکی میں بھی ایسی ہی مصلحتوں کی بنا پر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تھا۔

ایک طالب علم چار زبانیں

مغربی پاکستان ریلوے کے وزیر مسٹر عبدالحمید خاں نے کہا کہ ٹیچروں کو تعلیم دینے سے ذاتی طور پر بہت دلچسپی رکھنی چاہیئے تاکہ اعلےٰ معیار کے لیڈر تیار ہو سکیں۔ ڈون پوسکو ہائی اسکول کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عوام اور خصوصاً دیہاتی عوام میں یہ جذبہ پھیل رہا ہے کہ ان کے بچے تعلیم پائیں مگر اچھے ٹیچروں کی کمی افسوسناک ہے، محض ٹیچروں کی تعداد سے کام نہیں چلتا۔ ٹیچروں کو باعزت اقتصادی و سماجی معیار ملنا چاہیئے تاکہ وہ اگر دوں کی طرف خصوصیت سے توجہ دے سکیں، اگر بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو طالب علم کی شخصیت بن سکتی ہے، ہمارے سامنے مشکل یہ ہے کہ طالب علم گھر پر علاقائی زبان بولتا ہے سماجی حلقوں میں قومی زبان دفتری کام میں انگریزی زبان اور مذہبی تعلیم میں عربی زبان استعمال کرتا ہے۔

دانشور اور لسانی تعصبات

راجہ صاحب محمود آباد نے ماہرین تعلیم پر زور دیا ہے کہ وہ اپنا نقطۂ نظر بدلیں اور اچھے منتظموں کی بجائے اچھے شہری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ایچی سن کالج لاہور میں تقسیم انعامات کے موقعہ پر راجہ صاحب صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ راجہ صاحب نے اردو میں تقریر کی جو کالج کی تاریخ میں پہلی اردو تقریر تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے کالج کی طرف سے تقریب کی صدارت کرنے کی دعوت پر حیرت ہوئی کیونکہ اب تک ان لوگوں کو یہ اعزاز حاصل ہوتا رہا ہے جن کے بچے اس ادارے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جن کے لئے یہ کالج بنا ہے۔

انہوں نے کہا کہ میں نے اس طبقے سے مدت ہوئی بغاوت کی تھی کیونکہ میرے خیال میں اب اس طبقہ کے وجود کے لئے یہ زمانہ مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے طلبا کو صوبائی، قومی، لسانی اور مذہبی تعصبات سے خبردار کیا اور کہا کہ علم اور دانشوری کے حصول کی راہ میں یہ تعصبات بڑی رکاوٹ ہیں۔

اردو اور بنگلہ میں سائنسی کتابیں

سائنس اور قومی زبان کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں لاہور میں ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج نے کہا ہے تجربہ کار استاد سائنسی کتابوں کی کمی کو پورا کریں اور اپنی تصنیفی توانائی کو بروئے کار لا کر طلبہ کے لئے اردو اور بنگلہ میں سائنسی کتب لکھیں علاوہ ازیں ایک اور منصوبے پر فوری طور پر عمل کیا جائے کہ مطالعہ تو انگریزی زبانوں کا کیا جائے لیکن اساتذہ کو لکچر دینے اور طلبہ کو اپنے نوٹ تیار کرنے اور ان کی مدد سے امتحان دینے میں انگریزی یا قومی زبانوں میں سے کسی ایک کو استعمال کرنے کا اختیار ہو۔

سائنس اور قومی زبان کانفرنس کی افتتاحی تقریب بڑی بارونق تھی اس میں مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ اس کا اہتمام مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے کیا تھا۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج نے کی۔ اٹامک انرجی سینٹر لاہور کے ڈاکٹر انوار حسین نے استقبالیہ خطبہ پڑھا جسے بنگالی میں بھی چھاپا گیا۔ ان کے علاوہ افتتاحی خطاب ڈاکٹر مظہر حسین ڈھاکہ یونیورسٹی نے کیا۔

صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر نذیر احمد نے تعلیمی کمیشن رپورٹ کو دور حاضر کی اہم دستاویز قرار دیا اور کہا کہ اس میں واضح طور پر یہ صراحت کی گئی تھی کہ قومی زبان کو ہر درجہ کے لئے ذریعہ تعلیم بنانا ہمارا نصب العین ہے جس کی طرف ہمیں بتدریج قدم بڑھانا چاہیئے، ہمارے لئے یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہمارے ثانوی بورڈوں اور یونیورسٹیوں نے اس نصب العین کے حصول کے لئے عملی اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ امر خوش آئند ہے کہ ثانوی بورڈوں نے انٹرمیڈیٹ تک قومی زبان کو ذریعہ تدریس بنانے کی اجازت دے کر انتہائی اہم

جہاں نما

دلی میں یوم چکبست

۱۷ فروری کو انجمن تعمیر اردو کی ہفت روزہ نشست میں اردو کے مشہور شاعر و ادیب پنڈت برج نرائن چکبست کو دلی کے ادیبوں کی طرف سے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

پروفیسر راجیندر ناتھ شیدا نے جلسے کی صدارت کی اور اپنی تقریر میں چکبست کو اپنے دور کے عظیم قومی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے پیش کیا۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی نے چکبست کی ذاتی زندگی پر روشنی ڈالی اور ان کے بعد اسلم پرویز نے چکبست پر ایک نظم پڑھی۔

آخر میں باقی ایم اے اور عاشق نے اپنی غزلیں تنقید کے لئے پیش کیں۔

نریش کمار شاد، گلزار دہلوی، سلام مچھلی شہری، جمیل سعیدی، اور گوپی ناتھ امن لکھنوی نے حاضرین کی فرمائش پر اپنا کلام سنایا۔

فرانسیسی مستشرق کا انتقال

فرانس کے مشہور مستشرق پروفیسر لوئی مسینو کی وفات کی خبر آئی ہے۔ لوئی مسینو پیرس یونیورسٹی میں استاد تھے۔ اسلامیات پر فرانسیسی زبان میں وہ ایک معیاری اور پر وقار رسالہ نکالتے تھے ان کا خاص موضوع اسلامی تصوف تھا۔ چنانچہ انھوں نے منصور حلاج کی کتاب الطواسین ان کی ترتیب و تہذیب سے شائع ہو چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرحوم مسینو حلاج کے متعلق ایک مستقل مسلک رکھتے تھے۔

۱۹۳۸ء میں لاہور میں جب عالمی پیمانے پر اسلامی ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی تھی اس میں مرحوم لوئی مسینو نے بھی شرکت کی تھی۔ لوئی مسینو کی وفات سے ایک ایسے عظیم اسلامی عالم کی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کی سرگرمیاں صرف اسلامیات کے لئے وقف تھیں۔

بلیک میل شیکسپیئر

برطانیہ کے ایک دانشور ... نے دعویٰ کیا ہے کہ شیکسپیئر ... سے عاری ایک بلیک میلر کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اور جو عالمی شہرت کے ڈرامے شیکسپیئر سے منسوب ہیں دراصل وہ سر فرانسس بیکن نے لکھے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کنیتھ عنقریب اپنے اس دعوے کی تائید میں پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک تحقیقاتی مقالہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مقالے کی اشاعت سے تمام حلقوں میں سنسنی پھیل جائے گی۔

مسٹر کنیتھ نے کہا ہے کہ شیکسپیئر کی پر اسرار انداز میں لکھی ہوئی چودہ نظمیں، جن میں اس بارے میں بعض اشارات دیئے گئے تھے، کی کلید شیکسپیئر کے مقبرے سے دریافت کر لی گئی ہے جب ان بارے میں صحیح صورت پیش کی گئی تو لوگ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔

پاکستانی ادب کے ترجمے

ہم نے انگلستان ، مغربی جرمنی ، ہالینڈ ، اٹلی ، سوئٹزرلینڈ ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لئے روابط پیدا کر لئے ہیں ، ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے فی الحال وہاں کے قارئین چند کلاسیکی کتابوں کے علاوہ پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کر لئے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں کی طرف توجہ کریں اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں فی الحال ہم انگریزی ترجموں اور طبعزاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کر لیں گے ۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخاب کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں ۔

۱۔ پاکستانی ثقافت ۔ پس منظر اور حال ۔ ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک سبق یا باب کا ترجمہ پورے ناول یا کتاب کے خلاصے کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کر لیا جائے گا واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں سے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے نظم ، افسانے اور ڈرامے ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا ۔

واضح رہے کہ اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زریں موقع کھو دیں گے ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلامعاوضہ پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو جزوڑا پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے ہم چند مترجمین یا ادیبوں کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک دعوت عام دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں مواقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھالیں گے ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے ۔

اس سلسلے میں [illegible]

نیا ادبی انعام

ترقی اردو بورڈ کراچی ادارۂ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشتراک اور مالی تعاون سے، بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابوں کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کر رہا ہے اس سلسلے میں حسب ذیل موضوعات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر نقد انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے۔

انعامات

عنوانات

ں کا مجموعہ (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)
(۴۵ منٹ کھیل)
انی (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)
ستان (جغرافیہ پاکستان کے دلچسپ تاریخی اور جغرافیائی مقامات کا بیان مع تصاویر)
ے کرشمے یا دلچسپ تجربے۔ ہر عنوان پر مبلغ ۵۰۰ روپے کا ایک انعام پیش کیا جائیگا۔ کتاب صاحب کتاب کی ملکیت رہے گی۔

شرائط مقابلہ حسب ذیل ہیں

ات غیر مطبوعہ ہوں اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی تحریر اور ملکیت ہوں۔ (۲) مسودات مکمل اور قابل اشاعت ہوں۔ (۳) دہ اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہو۔ (۴) انعام پانے والی کتاب مصنف کی ملکیت رہے گی لیکن اس کی پہلی اشاعت کا حق ادارے کو حاصل ہوگا۔ اگر ے اس کی اشاعت منظور کی، اس کی مناسب شرائط مصنف کے ساتھ علیحدہ طے کی جائیں گی۔ (۵) انعامات اور ان سے متعلق جملہ امور کی بابت و بورڈ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔ (۶) کلاسیکی یا دوسری کتابوں کے خلاصے قبول نہیں کئے جائیں گے (۷) مسودات ۳۰ جون تک حسب پہنچ جانے چاہئیں، اس کے بعد وصول ہونے والے مسودات مقابلے میں شریک نہ ہوں گے۔

سکرٹری
ترقی اردو بورڈ
۶۷۲ - اردو منزل۔ جمشید روڈ۔ کراچی ۵

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

دریائے لطافت
(قواعد)
انشاء اللہ خاں انشا
(ترجمہ)
عبدالرؤف عروج
قیمت : ۲ روپے ۲۵ پیسے
ناشر : آفتاب اکیڈمی ۔ اردو بازار کراچی

مسائل نفسیات
محمد فائق بی ۔ اے (آنرز) ایم ، اے
قیمت : ۴ روپے ۲۵ پیسے
ناشر : علی بک ڈپو ۔ اردو بازار ، کراچی

چاند کی بستی
(شاعری)
داؤد چغتائی ایم ۔ اے
قیمت : ۳ روپے ۵۰ پیسے
ناشر : مرکز انوار بارنس روڈ ۔ کراچی

الٹ پھیر
(طنز و مزاح)
شوکت تھانوی
قیمت : ۳ روپے
ناشر : مشتاق بک ڈپو

زرد پتے
(ناولٹ)
جبران خلیل جبران
قیمت : دو روپے
ناشر : مکتبہ ماحول ۔ ک

تذکرۂ اولیائے لاہور
وارث کامل
(سیرت و تاریخ)
قیمت : ۵ روپے ۵۰ پیسے
ناشر : مکتبہ ماحول ۔ ک

سہ ماہی

اُردو

بابائے اُردو نمبر

۱۹۶۲

مرتب

سید وقار عظیم

انجمن ترقّیٔ اُردو پاکستان

قیمت پانچ روپے

روپیہ ہماری معاشیات میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے
اسکی قیمت
کو برقرار رکھیے
منظور شدہ ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰
جاری شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
ادا شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
زر محفوظ ۳۰,۰۰,۰۰۰
زرامانت ۳۱ جنوری ۱۹۶۳ء تک ۲۸,۸۰,۰۰,۰۰۰
موزوں اور مستعد خدمت
روپیہ بچائیے اور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
میں جمع کیجئے
رجسٹرڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی

جلد ۳ نمبر ۹

مئی ۱۹۶۳ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارۂ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

ا۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حبِ وطن کی قدروں کی نشو ونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دُنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

طابع، ناشر اور مدیر جمیل الدین عالی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مصنفین پاکستان (کراچی) سے شائع کیا

فہرست

NATIONAL BANK OF PAKISTAN

اداریہ

مضبوط بنیادیں اور خطرات

آخرکار ہم نے پرنسس ہوٹل لاہور کی قیمت ساڑھے تین لاکھ روپے ادا کر دی ہے۔

باہر سے بیٹھ کر باتیں بنانے والوں کے لئے شاید اس چھوٹی سی سطر کی کوئی اہمیت نہ ہو بلکہ وہ شاید اس کا مطلب بھی نہ سمجھتے ہوں۔ کیونکہ بہرحال ہمارا علاقائی دفتر یہاں دو برس سے قائم تھا۔

لیکن! انھیں اور ہمارے اراکین اور دوستوں اور ہمدردوں کو یہ جان کر خوش ہونی چاہئے کہ گلڈ پہلی بار ایک وسیع و عریض اور مستقل اثاثے کا مالک ہو گیا ہے۔ ہماری رائے میں گلڈ کے قیام کے بعد اس کی تاریخ میں یہ دوسرا اہم ترین واقعہ ہے۔ یہ اثاثہ حاصل کرنے میں اور اس کے لئے قرض لینے میں جو مشکلات پیش آئیں اور انھیں حل کرنے کے لئے ہمارے کارکنوں کو جیسی بھاگ دوڑ کرنی پڑی اور جس طرح ذاتی وقار اور "انا" کی قربانیاں دینی پڑیں ان کی داستان کسی حد تک گلڈ کے ریکارڈ پر موجود ہے اور اگر بیان کی جائے تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ خشک نہ ہو گی بلکہ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہو گی مگر اس خوشگوار یا ناگوار فرض کی ادائیگی ہم اپنے بعد آنے والے کارکنوں کے لئے ملتوی کرتے ہیں۔ اس کامیاب اقدام سے گلڈ کی بنیادیں نہایت ٹھوس اور گہری ہو گئی ہیں اس عمارت کی زمین اور ذرائع سے ہمارے چھاپہ خانے کے منصوبے (دونوں صوبوں میں) پورے ہو جانے کے امکانات تو ہو گئے ہیں۔ یہاں ہم جدید عمارات بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہمارے لئے کھڑے ہونے کو زمین مل گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے مددگار عناصر میں سب سے نمایاں نام اور کام قدرت اللہ شہاب کا ہے لیکن فی الحال ان کی تنظیمی "ماتحتی" کے سبب راقم الحروف ان کی خدمات کی تعریف قرار واقعی نہیں کر سکتا۔

ویسے یوں تو

هزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاکست

مگر اب کارِ مغاں کی کامیابی بے یقینی کے دھندلکوں میں صاف ضرور نظر آتی ہے۔

ہم ایک بار پھر گلڈ کے اراکین دوستوں ہمدردوں اور ناقدین کو اس ادارے کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ اور موجودہ کارکنوں سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ چند منصوبے شرمندہ تکمیل ہیں چند منصوبے تجرباتی غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں اور انھیں بہتر بنانے کی کوشش میں وقت لگا ہے کئی ترقیات میں ہمارے ادارے کی جمہوری تنظیم اور وسائل کی کمی سست رفتاری کا باعث ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں تسلیم ہے بلکہ ہماری فہرست اعترافات طویل تر ہو سکتی ہے اور ہم ان معاملات کے لازمی ردعمل کا شکار بھی ہیں

مگر ــــــ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ چار سال کے مختصر عرصے میں ایک ایسا ادارہ قائم ہو گیا جس کی افادیت سے کسی بدتر سے
بدتر مخالف کو بھی انکار نہیں ہوتا اور جس پر اندرون ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کی توجہ مرکوز
رہ چکی ہے۔
آج گلڈ کے قائم کردہ انعامات (آدم جی اور داؤد اور گلڈ ادبی انعامات) غیر اشتراکی افریشیا میں خطیر ترین
ادبی انعامات ہیں عالمی ادبی ادارے اسے اور اس کی وجہ سے پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کے ادارے
امریکہ روس ہندوستان انگلستان چین اور جاپان تک پہنچتے ہیں۔ غیر ملکی مشاہیر اسکی معرفت پاکستانی ادیبوں
سے رابطے قائم کرتے آتے ہیں اور مقامی مشاہیر کی قدر افزائی مختلف انعامات اعزازات اور تقریبات سے
ہوتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے وفود مسلسل آتے جاتے اور ملک کے باہمی رشتوں اور ثقافتی تعلقات
کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ ہمارے کسی رکن کی لاش بے گور و کفن نہیں رہ سکتی ہمارا کوئی رکن کسی مہلک
بیماری میں مبتلا ہو کر بے علاج نہیں رہ سکتا ہم نے اپنے سیاسی ادبی اور ذاتی اختلافات کی خلیجوں پر ایک
مضبوط پل بنا رکھا ہے جس سے گزر کر یہ خلیجیں آہستہ آہستہ پار ہو سکتی ہیں۔ کم از کم اس پل نے ہمیں ایک دوسرے
کو زیادہ قریب سے جاننے کی سہولت ضرور بہم پہونچا رکھی ہے۔ ہم نے کاپی رائٹ قوانین میں انقلابی ترمیمات
کرادی ہیں اور اپنا اشاعت گھر قائم کر لیا ہے۔ غرض کہ اس ادارے کی مثال کم از کم ہمارے آس پاس کسی بڑے یا چھوٹے ملک میں نہیں ملتی
اس میں شک نہیں کہ ایک مریض اور پریشان اور نو ترقی پذیر معاشرے کے وسیع سمندر میں گلڈ کی حیثیت
ایک چھوٹے سے جزیرے سے زیادہ نہیں لیکن اگر یہ جزیرہ بھی نہ ہوتا تو صورت حال خراب تر ہوتی۔
ہاں! آدرشی گفتگو، آدرشی عزائم ہر نو ترقی یافتہ معاشرے میں ہمیشہ طنز و تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں۔ لوگ اتنے
سراسیمہ بیزار اور پریشان اور ہیجان زدہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی طویل المیعاد منصوبے بندی کسی توقف کسی تاخیر
کو مزاجی طور پر برداشت نہیں کر سکتے اگر تجویز میں کسی فائدے کا امکان ہے تو یہ سب کے سب فوراً اس فائدے کو
حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ ورنہ فوراً اس تجویز اس منصوبے کو ترک کر دیتے ہیں یا اس سے بیزار ہو جاتے ہیں کوئی خو
کچھ کرے تو فیہا گو وہ بھی طنز و تشنیع سے مبرا نہیں رہ سکتا ورنہ عام طور پر منفیت، چڑچڑا پن اور شک کا دور دورہ
رہتا ہے۔ مصلحین استحصال پسند کہلاتے ہیں (اور اکثر اوقات ایسے معاشروں میں وہ استحصال پسند ہو بھی جاتے ہیں)
مفکرین بیوقوف نمائشی اور کارکن مطلبی اور "چھوٹے آدمی" دوسری طرف اجارہ دار اور پہلے سے جمی جمائی قوتیں ابھر
ہوئی توانائیوں کو ہر ممکن طریقے سے ختم کر دینا چاہتی ہیں۔
ہاں کسی نو ترقی پذیر معاشرہ کو ان عناصر ان کیفیات سے مفر نہیں ہے مگر ان ہی عناصر اور ان ہی کیفیات ــ
باوجود کچھ معاشرے ترقی بھی کرتے جاتے ہیں خود آج ہم بیک وقت دو صدیوں کے ادوار سے گزر رہے ہیں پس ماندہ
میں ہم سترہویں یا زیادہ سے زیادہ اٹھارویں صدی کا یورپ ہیں اور علم و اطلاع کے لحاظ سے ہم جدید ترین ترقیات
ایجادات اور معلومات سے آناً فاناً بہرہ ور ہو جاتے ہیں ہمارے ذہنی مطالبات بڑھتے جاتے ہیں ہمارا معیار ترقیات
ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اپنے مادی اور ذہنی وسائل کی پستی اور "شوق کی بلندی" کی آمیزش میں بعض اوقات ہم
شدید منفیت اور کبھی کبھی شدید جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کا مقابلہ "ہم قلم" کے چند اداریوں

ے چند کارکنوں یا ان کے نقادوں یا مخالفوں سے نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے جسے اپنے حق میں تیز تر کرنے کے لئے معاشرے
ہت مند سیاسی سرگرمیوں صنعتوں اور دانشورانہ قوتوں کو حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ بڑے "اپنا فرض پہچانیں یا نہ پہچانیں"
ماری ناچیز کوشش یہ ہے کہ اپنی بساط بھر گلڈ کو ایک ایسی آرام دہ پناہ میں بدل دیں جہاں تخلیقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ
فظ اور ہمت افزائی میسر آجائے۔ باقی کام خود دانشوروں کا ہے۔

اس پس منظر میں ہم آدرشی گفتگو کے خیال سے خود معذرتی اور گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوں گے دو سو برس پہلے جب
نسائیکلوپیڈیا کے مرتبین تنگ و تاریک اور سرد قہوہ خانوں اور بے آرام گوشوں میں بیٹھ کر مشعلوں کی مدھم روشنی میں کام کرتے
تھے تو یقیناً ان کے دکھتے ہوئے پریشان ذہنوں میں انقلاب فرانس کی ایک مدھم سی شمع مبہم سی امید جھلملاتی ہوگی ہمارے
حالات تو یقیناً ان سے بہت بہتر ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی مشعل امید کی روشنی سے شرمائیں ہمیں کہنے دیجئے کہ گلڈ ایک
ری تحریک ایک بڑے عزم کا سرچشمہ بن چکا ہے اور اب اس کی قوتوں کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کا ایک نادر موقع پیدا ہو رہا ہے

اور اب یہاں سے مقام احتیاط شروع ہوتا ہے کیونکہ بہت سے اندرونی خلفشار اور بیرونی قوتیں گلڈ کے مفادات کے خلاف
پ ہی آپ بروئے کار آسکتی ہیں اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بعض بہت بڑی بڑی تحریکیں غلطیوں کی وجہ سے "بڑی"
بننے سے پہلے ختم بھی ہو جاتی ہیں۔

اب تک ہم نے بیرونی مخالفین کا مقابلہ جم کر کیا ہے اور ان کے ہاتھوں زیادہ نقصان نہیں اٹھایا۔ مجملاً یہ بیرونی مخالفین
چند طبقات نوکر شاہی، چند طبقاتِ ناشرین اور چند اخبارات پر مشتمل تھے اور ہماری ان کی لڑائی میں ہماری کامیابی کا
بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے حملے زیادہ تر ہماری مجموعی حیثیت پر ہوتے تھے اور ہم اپنی مجموعی قوت اور مخالفین سے زیادہ طاقتور
ناصر سے سمجھوتوں کی بنا پر ان کے حملے سہہ جاتے تھے۔ شاید یہ حملے اب بھی ہوتے رہیں۔ ان میں سے کچھ ظاہر ہیں اور کچھ
چھپے ہوئے (جن کی داستان ابھی مدتوں نہیں سنائی جا سکتی) لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ کارگر نہ ہوں گے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ہمارا
ایک نیا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ جس سے ہمیں خوف تو نہیں لیکن اس کی فکر ہونی چاہئے ورنہ وہ اور طاقت پکڑے گا جس سے پورے گلڈ
کا وجود خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہے۔

یہ نیا دشمن ہماری اپنی نصب العینی کمزوریوں کا راون ہے جس کا ایک چہرہ لسانی اور علاقائی تنازعات کا ہے۔ یہ دشمن ابھی
سرنگوں کے ذریعہ ہماری بنیادوں میں بارود پہنچا رہا ہے۔ جو کہیں کہیں وقت سے پہلے آگ دی گئی ہے اس لئے ہم اس سے خبردار
ہو گئے ہیں لیکن اگر یہ کارروائی اسی طرح جاری رہی تو ممکن ہے کہ گلڈ کی بنی بنائی عمارت بھک سے اڑ جائے۔ جب تک ہمارا بس چلا
ہم اردو بنگلہ پنجابی سندھی پشتو تنازعات کو اپنی صفوں میں راہ نہیں دے سکتے۔ ان تنازعات کے لئے دوسرے میدان موجود ہیں،
اور کئی ایک زبانی ادارے ملک میں کام کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ وقت نہ آئے لیکن خرابی کا امکان ضرور پیدا ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ
ساتھ اس امر کی ضرورت شدت سے واضح ہو گئی ہے کہ ہم اپنے اختلافات گلڈ کی دستوری حدود میں رہ کر طے کریں اور اس دستور
کی رو سے اراکین پر باہمی اختلافات کے بارے میں بیان بازی کھلے طور پر ممنوع ہے۔

اس وقت ہم اس سے زیادہ اور کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ادیب اہل نظر ہوتے ہیں امید ہے کہ وہ معاملات کو تاریخ و
تجربے کی روشنی میں اچھی طرح دیکھیں گے۔ "ہم قلم" یقیناً روزنامہ نہیں ہے کہ ہماری آواز بہت سے قارئین تک پہنچ جائے مگر جن تک
ہمیں بات پہنچانی منظور ہے ان سے ان گزارشات پر خصوصی اور ہمدردانہ توجہ کی درخواست کی جاتی ہے۔

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

(جمیل عالی)

ایک نادر پیش کش

اردو۔ بنگلہ کے مشترک الفاظ

مؤلفہ

سید شبیر علی کاظمی

ایم۔ اے (علیگ)

زیرِ طبع

یہ کتاب جناب شبیر علی کاظمی نے مشرقی پاکستان میں برسوں تحقیق و توجہ کے بعد مرتب کی ہے اور اس پر ملک کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے گراں قدر تبصرہ فرمایا ہے۔

اس تالیف میں مشترک الفاظ، اردو بنگلہ اور رومن رسم الخط میں چھاپے گئے ہیں تاکہ اردو یا بنگلہ دونوں زبانوں میں سے ایک کے جاننے والے بآسانی اپنی زبان کے مشترک لفظ دوسری میں ڈھونڈ سکیں اور اس کے بدلے ہوئے یا غیر مبدل تلفظ سے واقف ہو سکیں۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے قیمت میں خاص رعایت ہوگی

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

جناب احمد داؤد، داؤد انڈسٹریز کے چیرمین
اور ایک مخلص ادب نواز صنعت کار، جنھوں نے
۲۵ هزار روپئے کے داؤد ادبی انعام کا اعلان کیا
ھے۔ یه انعام پاکستان رائٹرز گلڈ کے زیر اهتمام
هرسال بنگله اور اردو میں شایع هونے والی منتخب
ادبی اور علمی تصانیف پر دیا جائیگا۔ داؤد ادبی
انعام کے قواعد 'هم قلم' کے اس شمارے میں شریک
کئے جارهے هیں۔

زبان کی کلاسیں جو رائٹرز گلڈ کے زیر نگرانی قائم کی گئی ہیں

داؤد ادبی انعام

(قواعد)

(ان قواعد میں انعامات کے اعلان سے قبل اور انعامات سے کسی حیثیت میں بھی متعلق افراد کو پیشگی اطلاع دیے بغیر ترمیم کی جاسکتی ہے)

ام

انعام "داؤد ادبی انعام" کے نام سے موسوم ہوگا۔

دعیت و تقسیم

داؤد فاؤنڈیشن کے جاری کردہ یہ انعام اسی کے سرمایہ سے (ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکزی) کی وساطت سے تقسیم ہوں گے۔ انعام کا اعلان ہر سال یوم آزادی یعنی ۱۴ اگست کو کیا جائے گا۔ انعام کی تقسیم کے طریق کار اور انتظامات کی تمام ذمہ داری چیرمین داؤد فاؤنڈیشن پر عاید ہوگی۔

انعام کی مالیت

۲۵ ہزار روپیہ کی انعامی رقم مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کی گئی ہے۔

دس ہزار روپیہ کی رقم   دو اردو کتابوں کیلئے

دس ہزار روپیہ کی رقم   دو بنگالی کتابوں کیلئے

پانچ ہزار روپیہ جس میں سے ڈھائی، ڈھائی ہزار روپیہ کے دو انعامات انعام یافتہ کتابوں کے بین اللسانی ترجمہ کے لئے مخصوص ہوں گے۔

۔ فہرست موضوعات

دس ہزار روپے کے دونوں انعامات مندرجہ ذیل الگ الگ شقوں کے لئے ہوں گے۔

شق اول ۔ پانچہزار روپے

(ا) تحقیق (ب) تاریخ یا (ج) اردو یا بنگالی ادبی تنقید کے موضوع پر غیر افسانوی نثر۔

شق دوم ۔ پانچہزار روپیہ۔

تحریک پاکستان کے ماقبل آزادی یا بعد آزادی کے ادوار کے کسی (ا) نظریاتی (ب) تاریخی (ج) ثقافتی یا (د) سماجی پہلو سے متعلق نثری تحقیق پر۔

۵۔ استحقاق

مقررہ میعاد (جس کا تعین ذیل میں کیا گیا ہے) کے اندر کسی بھی (زندہ یا مرحوم) پاکستانی شہری (زیر مفہوم قانون شہریت پاکستان) کی پاکستان میں مطبوعہ طبع زاد کتاب کا پہلا اڈیشن جو گلڈ کے مندرجہ ذیل دفاتر کو مطلوبہ طریقہ پر بھیجا جائے، غور کا مستحق ہوگا۔

وضاحت

(ا) مصنف کے لئے ادارۂ مصنفین پاکستان کا ممبر ہونا ضروری نہیں۔

(ب) اگر کسی مرحوم مصنف کی کتاب انعام کی مستحق قرار دی جائے تو اس صورت میں انعام کی نقد رقم اس کے مختار نامزد کردہ شخص یا اس کی ملکیت وراثت کے خلاف کسی ڈگری دار کو نہیں دی جائے گی بلکہ

اپنے مذہبی قانون کے مطابق اس کے قانونی ورثا کو ادا کی جائے گی۔

۔ معیار طباعت

عام :-

ہر سال جون سے لے کر مئی تک کی مطبوعات (مہینوں کی پہلی اور آخری تاریخیں اس میعاد میں شامل ہیں) سال رواں کے لئے۔

موجودہ سال کے انعام کے لئے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء سے ۵ جولائی ۱۹۶۳ء تک کی مطبوعہ کتابوں پر غور کیا جائیگا۔

۔ کتاب بھیجنے کا طریق کار

پاکستان کا کوئی شہری حد استحقاق کے اندر مندرجہ ذیل طریقہ پر انعام کے لئے کتاب پیش کر سکتا ہے۔

(ا) موجودہ سال میں ۵ جولائی ۱۹۶۳ء تک اور اس کے بعد ہر آئندہ سال مئی کی ۳۱ تاریخ تک کتاب کے چھ نسخے دستی طور پر یا ڈاک کے ذریعے ادارہ مصنفین کے مندرجہ ذیل دفاتر میں داخل کئے جائیں۔

مغربی پاکستان کے لئے

پاکستان رائٹرز گلڈ - پی۔ آئی۔ آئی۔ اے بلڈنگ
اسٹریچن روڈ - کراچی - ۴۔

مشرقی پاکستان کے لئے

پاکستان رائٹرز گلڈ - بردوان ہاؤس - ڈھاکہ

(ب) کتابیں فارم داخلہ کے ہمراہ بھیجنی ہوں گی، اس فارم کی نقل کی جا سکتی ہے۔ مطبوعہ فارم استعمال کرنا ضروری نہیں۔

۔ پابندی

گلڈ کے سکریٹری جنرل، مجلس مصنفین کے چیرمین، سکریٹری یا ان کے خاندان کے افراد کی تصنیفات بھی انعام کے لئے غور کی مستحق نہیں ہوں گی۔

۹۔ حکمیت

(ا) سکریٹری داؤد ادبی انعام ہر سال گلڈ کے سکریٹری جنرل کے مشورہ سے متعلقہ شقوں میں انعامات کا فیصلہ کرنے کے لئے مجلس منصفین کے ارکان نامزد کریں گے لیکن مندرجہ ذیل اس مجلس کے مستقل رکن ہوں گے۔

مجلس کے مستقل چیرمین	بنگالی
جنھیں ووٹ دینے کا حق ہوگا	ڈاکٹر محمد شہید اللہ
	اردو
	جناب ممتاز حسن
	ستارۂ پاکستان

داؤد ادبی انعام کے سکریٹری
جنھیں ووٹ دینے کا حق نہیں ہوگا۔ - داؤد فاؤنڈیشن
چیرمین گلڈ کے سکریٹری
جنرل کے مشورہ سے
سال بسال سکریٹری
کا تقرر کریں گے۔

(ب) داؤد ادبی انعام کے سکریٹری اس انعام کے تمام مقاصد کے لئے اعلیٰ انتظامی افسر ہوں گے جو انعام کے فیصلہ سے متعلقہ امور سرانجام دیں گے۔

(ج) منصفین کے ناموں کا اعلان نتائج کے ساتھ ہی کیا جائے۔

(د) فیصلہ منصفین کی کثرت رائے سے کیا جائے گا جن کی کارروائیاں صیغہ راز میں رکھی جائیں گی

(ہ) اگر کوئی جج رائے ظاہر کرنے سے انکار کرے یا وہ اس قابل نہ ہو کہ اپنی رائے کا اظہار کرے تو داؤد ادبی انعام کے سکریٹری گلڈ کے سکریٹری جنرل کے مشورے سے یا اس کے مشورہ کے بغیر بھی (بشرطیکہ گلڈ کے سکریٹری جنرل اس وقت پاکستان میں نہ ہوں) دوسرا جج مقرر کر سکتے ہیں یا اگر اس مقصد

کے لئے کافی وقت نہ ہو تو انعام بروقت فیصلہ اور اعلان کی خاطر جو اقدام وہ مناسب سمجھتے ہوں کرسکتے ہیں

و) مجلس منصفین کے موجودہ سکریٹری یا مستقل چیرمین کے مستعفی ہونے یا وفات پا جانے کی صورت میں گلڈ کے سکریٹری جنرل داؤد فاؤنڈیشن کے چیرمین کے مشورے سے کسی دوسرے شخص کا تقرر کرسکتے ہیں۔

انعام کی ناقابل تقسیم نوعیت

۱) انعام کی رقم کسی صورت میں بھی قابل تقسیم نہیں ہوگی۔ یعنی کسی کتاب پر بھی پانچ ہزار روپیہ سے کم انعام نہیں دیا جائے گا۔

ب) اگر مجلس منصفین کی رائے میں کوئی کتاب بھی انعام کے معیار پر پوری نہ اترے تو اس موضوع کی انعامی رقم روک دی جائے گی اور یہ رقم ایسے مقاصد کے لئے خرچ ہوگی جنھیں داؤد فاؤنڈیشن کے چیرمین گلڈ کے سکریٹری جنرل کے مشورے سے متعلقہ موضوع (مندرجہ بالا فہرست موضوعات) کے مفاد کے لئے مناسب سمجھتے ہوں۔

ہنگامی حالات، قواعد کی تشریح و متفرقات

۱) اگر داؤد ادبی انعام کے سکریٹری، گلڈ کے سکریٹری جنرل کو یہ اطمینان دلائیں کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوگئے ہیں جو انعامات کے فیصلے یا اعلان سے متعلقہ بعض قواعد و مسائل کے سلسلہ میں مخصوص اقدامات کے متقاضی ہیں تو گلڈ کے سکریٹری جنرل یا داؤد ادبی انعام کے سکریٹری ایسے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں گے جو اُس کا اُن کے خیال کے مطابق مناسب ہوں۔

ب) صرف گلڈ کے سکریٹری جنرل یا داؤد ادبی انعام کے سکریٹری ہی قواعد اور انعامات کے متعلق انتظامی امور کی تشریح کرنے کے مجاز ہوں گے۔

ج) یہ فیصلہ کرنا صرف مجلس منصفین کے چیرمین اور ارکان کا کام ہوگا کہ کوئی کتاب فہرست موضوعات کے دائرے کے اندر ہے یا نہیں اور گلڈ کے سکریٹری جنرل یا داؤد ادبی انعام کے سکریٹری اس مسئلہ پر کوئی رائے نہیں دیں گے۔

۱۲۔ فارم

فارم داخلہ گلڈ کے مرکزی یا کسی علاقائی دفتر سے دستی طور پر یا ٹکٹ لگے لفافے بھیجکر مفت حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

آدم جی ادبی انعام

(ترمیم شدہ قواعد برائے سال ۱۹۶۳ء)

۱۔ نام:۔
یہ انعام آدم جی ادبی انعام کے نام سے موسوم ہوگا۔

۲۔ نوعیت اور تقسیم:۔
خانوادۂ آدم جی، کراچی کا جاری کردہ یہ انعام۔ اسی کے سرمایہ سے ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکزی) کی وساطت سے تقسیم ہوگا۔ اس کے انتظامی امور انعام کے مستقل سکریٹری جمیل الدین عالی کے سپرد ہیں۔ انعام کا اعلان ہر سال ادارۂ مصنفین پاکستان کی سالگرہ کے دن ۳۱ جنوری کو کیا جاتا ہے۔

۳۔ انعام کی مالیت:۔
انعام میں دس ہزار روپے کی نقد رقم اُردو کی کسی بہترین ادبی تخلیق پر اور دس ہزار روپے کی نقد رقم بہترین بنگلہ ادبی تخلیق پر دی جاتی ہے۔ انعام کی رقم نثر اور نظم کے مابین دو مساوی حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن گلڈ کے سکریٹری جنرل کی پیشگی اجازت کے بغیر مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ موضوعات:۔
انعام میں داخل ہونے والی کتاب کے لئے لازمی ہے کہ وہ طبع زاد تصنیف ہو اور ادب کی مندرجہ ذیل اصناف سے متعلق ہو۔
شاعری (کوئی بھی صنف) ناول، مختصر افسانہ، ڈراما سفرنامہ، سوانح نگاری، اور دیگر افسانوی نثر۔
اشاعت ثانی۔ ماخذ، ترجمہ وغیرہ انعام میں نا[illegible] ہیں۔

۵۔ استحقاق:۔
مقررہ میعاد (جس کا تعین ذیل میں کیا گیا ہے) کسی بھی (زندہ یا مرحوم) پاکستانی شہری (ر[illegible] شہریت پاکستان) کی پاکستان میں مطبوعہ طبع ز[illegible] پہلا اڈیشن جو ادارۂ مصنفین کے درج ذیل [illegible] طریقے پر بھیجا جائے، غور کا مستحق ہوگا۔

۶۔ وضاحت:۔
(ا) مصنف کے لئے ادارۂ مصنفین پاکستان کا [illegible] ضروری نہیں۔
(ب) اگر کسی مرحوم مصنف کی کتاب انعام کی مس[illegible] جائے تو اس صورت میں انعام کی نقد رقم نامزد کردہ شخص یا اس کی ملکیت داخل[illegible] ڈگری دار کو نہیں دی جائے گی۔ بلکہ اس [illegible] قانون کے مطابق اس کے قانونی ورثا کو[illegible]

۷۔ میعاد طباعت:۔
عام:۔
ہر سال اکتوبر سے ستمبر تک کی مطبوعات ([illegible] اور آخری تاریخیں میعاد میں شامل ہیں)۔
موجودہ سال:۔
انعام کے موجودہ سال میں میعاد طباعت

ا اکتوبر ۱۹۶۳ء ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ
خری تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء تھی)

ب بھیجنے کا طریقہ کار:۔

ن کا کوئی شہری حد استحقاق کے اندر مندرجہ ذیل
ے پر انعام کے لئے کتاب پیش کر سکتا ہے۔
اب کے چھ نسخے دستی طور پر یا ڈاک کے ذریعہ
ستمبر ۱۹۶۳ء تک موجودہ سال کے لئے ادارہ مصنفین
مندرجہ ذیل دفاتر میں داخل کئے جائیں۔

ربی پاکستان کے لئے:۔
رہ مصنفین پاکستان پی آئی آئی بلڈنگ —
ٹریچن روڈ۔ کراچی – ۴

شرقی پاکستان کے لئے:۔
لستان رائیٹرز گلڈ۔ بردوان ہاؤس۔ ڈھاکہ

تابیں فارم داخلہ کے ہمراہ بھیجی ہوں گی۔ اس فارم
نقل بھی کی جاسکتی ہے۔ مطبوعہ فارم داخل کرنا
روری نہیں۔

ابی حدود:۔

ادارہ مصنفین کے سکریٹری جنرل، مجلس منصفین کے
یرمین، سکریٹری یا ان کے خاندان کے افراد کی تصانیف
نعام کے لئے سعور کی مستحق نہیں ہوں گی۔
سال ہائے ماسبق کی بھیجی ہوئی کتابیں ابھی قابل غور
نہیں ہوں گی۔

کمیٹی:۔

ہر سال انعام کے سکریٹری، ادارہ مصنفین کے سکریٹری
جنرل کے مشورے سے موصول کتابوں پر انعامات کا فیصلہ
کرنے کے لئے مجلس منصفین کے اراکین نامزد کریں گے
لیکن مندرجہ ذیل حضرات اس مجلس کے مستقل رکن ہوں گے

یک مستقل چیرمین	بنگالی	اردو
جنھیں ووٹ دینے کا حق ہوگا	ڈاکٹر محمد شہید اللہ	ڈاکٹر سید عبداللہ

اردو اور بنگالی کی مجلس منصفین کے
مستقل سکریٹری (جنھیں ووٹ
دینے کا حق نہیں ہوگا) } جمیل الدین عالی

(۲) انعام کے سکریٹری، اس انعام کے تمام مقاصد کے لئے اعلیٰ انتظامی افسر ہوں گے جو انعام کے فیصلہ سے متعلقہ امور سرانجام دیں گے۔

(۳) منصفین کے ناموں کا اعلان نتائج کے ساتھ کیا جائیگا۔

(۴) فیصلہ منصفین کی کثرت رائے سے کیا جائے گا۔ جن کی کارروائیاں صیغہ راز میں رکھی جائیں گی۔ مگران کا فیصلہ شائع کیا جائے گا۔

(۵) اگر کوئی منصف (جج) رائے ظاہر کرنے سے انکار کرے یا وہ اس قابل نہ ہو کہ وقت مقررہ کے اندر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں تو آدم جی ادبی انعام کے سکریٹری — ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل کے مشورہ سے یا اس کے مشورے کے بغیر بھی (بشرطیکہ ادارے کے سکریٹری جنرل اس وقت پاکستان میں نہ ہوں) دوسرا منصف (جج) مقرر کر سکتے ہیں۔ یا اگر اس مقصد کے لئے کافی وقت نہ ہو تو انعام کے بروقت فیصلہ اور اعلان کی خاطر جو اقدام وہ مناسب سمجھتے ہوں، کر سکتے ہیں۔

(۶) انعام کے موجودہ سکریٹری یا مستقل چیرمین کے مستعفی ہونے یا وفات پاجانے کی صورت میں ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل، آدم جی مصنوعات کے چیرمین کے مشورہ سے کسی دوسرے شخص کا تقرر کر سکتے ہیں۔

(۷) اگر مجلس منصفین اس امر پر متفق ہو کر کوئی کتاب انعام کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ ایسی صورت میں انعام کی رقم روک لی جائے گی اور اس کا مصرف اس طور سے کیا جائے گا جس کو آدم جی مصنوعات کے چیرمین ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل کے مشورے سے انعام کے مذکورہ بالا موضوعات کی ترقی کے لئے مناسب سمجھیں گے

۱۱۔ ہنگامی حالات، قواعد کی تشریح اور متفرقات۔

(۱) اگر انعام کے سکریٹری ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں جو انعام کے فیصلہ یا اعلان سے متعلقہ بعض قواعد و مسائل کے سلسلہ میں مخصوص اقدامات کے متقاضی ہیں تو ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل یا انعام کے سکریٹری ایسے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں گے جو اس / اُن کے خیال کے مطابق مناسب ہوں۔

(۲) صرف ادارۂ مصنفین کے سکریٹری جنرل اور انعام کے سکریٹری ہی قواعد اور انعام کے متعلق انتظامی امور کی تشریح کرنے کے مجاز ہوں گے۔

(۳) یہ فیصلہ کرنا صرف مجلس مصنفین کے چیئرمین اس کا کام ہوگا کہ کوئی کتاب فہرست موضوعات کی اندر ہے یا نہیں اور ادارۂ مصنفین کے سکریٹری یا انعام کے سکریٹری اس مسئلہ پر کوئی رائے نہید

۱۲۔ فارم داخلہ

(۱) فارم داخلہ ادارۂ مصنفین کے مرکزی یا کسی دفتر سے دستی طور پر یا ٹکٹ لگے لفافے بھیجکر ذریعہ مفت حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

سلسلۂ روز و شب
(گلڈ کی خبریں)

...ں نے یوم ڈپٹی نذیر احمد منایا۔

...مئی کو ادارہ مصنفین (شاخ کراچی) کی جانب سے ۳ مئی کو
...راچی میں "یوم ڈپٹی نذیر احمد" منایا گیا۔
...کی صدارت جناب ممتاز حسن (منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل
...پاکستان) نے کی۔ اس موقع پر کراچی کے ممتاز ادیبوں،
...صحافیوں اور علم دوست اصحاب کی بڑی تعداد نے

...ر احمد کی زندگی اور ان کے علمی کارناموں پر پروفیسر
...مین (سابق پروفیسر علی گڑھ یونی ورسٹی و جامعہ ملی کراچی)
...ا ہزاروی۔ مولوی ضیاء الدین برنی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی
...اور جمیل جالبی نے مقالے پڑھے اور تقریریں کیں۔
...جمیل نقوی اور ابو الاثر حفیظ جالندھری نے نذیر احمد
...میں اور نجم آرا نے ڈپٹی صاحب کی ایک نظم نہایت
...کے ساتھ سنائی۔ آخر میں صدر جلسہ جناب ممتاز حسن
...صدارتی خطبہ میں نذیر احمد کے علمی کارناموں اور ان کی شخصیت
...جائزہ لیا۔
...م نذیر احمد کی ادبی نشست کے بعد ادارۂ مصنفین پاکستان
...کی مجلس عاملہ کے رکن صہبا اختر نے نذیر احمد کے مشہور

ناول "توبتہ النصوح" سے میرزا ظاہر دار بیگ کے مشہور کردار کی جھلکیاں ایک ڈرامے کی شکل میں پیش کیں۔ اس ڈرامے میں محمود علی۔ ماسٹر مقصود۔ اکرام ادیب۔ ریحانہ صدیقی اور خود صہبا اختر نے اداکاری کے جوہر دکھلائے۔

یوم نذیر احمد کے ادبی اجلاس اور ڈراما میرزا ظاہر دار بیگ کو بہت پسند کیا گیا۔

جمیل جالبی (خازن ادارۂ مصنفین پاکستان، شاخ کراچی) کی مختصر سی تقریر کے بعد یہ جلسہ اختتام کو پہنچا۔

سنسکرت اور فارسی الفاظ کا استعمال کم کیا جائے
بنگالی سیکھنے والے طلبا کی عید ملاپ پارٹی سے جسٹس حمود الرحمن کا خطاب

لاہور۔ ۶ مئی (اسٹاف رپورٹر) سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس حمود الرحمن نے ملک کے دونوں حصوں کے ادیبوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کو کم کریں مسٹر جسٹس حمود الرحمن پرنس ہوٹل میں رائٹرز گلڈ کی طرف سے بنگالی زبان سیکھنے والے طلبا کے اعزاز میں ہونے والی عید ملاپ پارٹی سے خطاب کر رہے تھے انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات پر بڑی مسرت ہوئی

رائٹرز گلڈ نے مغربی پاکستان میں بنگالی سکھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بحقیقت آج ہم جو کام کر رہے ہیں اس کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہی وہ ایک ذریعہ تھا جس کے ذریعے ہم آپس کی غلط فہمیوں کو دور کر سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم دونوں علاقوں کے عوام کو نزدیک سے نزدیک تر لانے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں دونوں صوبوں میں ایک دوسرے کی زبان سیکھنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کوشش کرنا چاہیے۔

انھوں نے رائٹرز گلڈ میں بنگالی زبان سکھانے والے استاد کو مخاطب کرتے ہوئے تلقین کی کہ وہ طلباء کو سنسکرت آمیز بنگالی نہ سکھائیں۔ کیونکہ جو زبان آپ یہاں پر طلبا کو سکھا رہے ہیں شاید اس کو خود مشرقی پاکستان کے عوام بھی نہ سمجھ سکیں مثلاً آپ نے یہاں طلباء کو بنگالی میں پانی کو جل سکھایا ہے حالانکہ مشرقی پاکستان میں پانی کو "پانی" ہی کہا اور لکھا جاتا ہے۔

انھوں نے بنگالی و اردو کے ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی نگارشات میں سنسکرت اور فارسی کے الفاظ استعمال نہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم دونوں صوبوں کو لسانی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب لانے کے خواہش مند ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بنگالی اور اردو کے مصنفین اپنی نگارشات میں زیادہ سے زیادہ اردو اور بنگالی کے الفاظ استعمال کریں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی (سب ریجن) کی سرگرمیاں

پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی (سب ریجن) کے پچیس نومبر والے پہلے باقاعدہ علمی ادبی اجلاس کے بعد، جس میں سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنا ایک نہایت اثر انگیز خاکہ "ماں جی" پڑھا تھا سب ریجن کو فوراً ہی دو اور جلسوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک جلسہ بتقریب "یوم ظفر علی خاں" ۲ر دسمبر کو منعقد ہوا۔ جس میں جناب عبدالرحمن عاقل فیروزپوری جناب حافظ بشیر احمد اعوان، جناب ڈاکٹر خلیل احمد قریشی، جناب منظور انور قریشی اور صدر جلسہ جناب عبدالعزیز فطرت نے مولانا ظفر علی خاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور پر مغز مقالات پڑھے، اس اجلاس میں متفقہ طور پر منظور کردہ ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت پاکستان بالخصوص صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے یہ درخواست کی انگریزوں کے عہد میں آزادی وطن کا نعرہ بلند کرنے پر مولانا ظفر علی مرحوم کے جو پریس اور املاک ضبط ہوئی تھیں انہیں واگزار کر کے مولانا کے ورثا کے حوالے کیا جائے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی (سب ریجن) کا دوسرا اجلاس کینٹکی (امریکہ) کے دور افتادہ پہاڑی علاقہ کے علاقائی ادیب ڈاکٹر سیٹوارٹ کے ساتھ ایک شام منانے کے سلسلے میں ۱ر دسمبر کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پرنسپل اشفاق علی خاں نے کی۔ جلسے میں پاکستان کے پرنسپل ابراہیم خاں (ایم پی) اور ابوالاثر حفیظ جالندھری شریک تھے۔

پرنسپل اشفاق علی خاں نے مسٹر جیسی سیٹوارٹ کا تعارف اس کے بعد ان سے اپنا کلام سنانے کو کہا۔ مسٹر سیٹوارٹ نے متعدد نظمیں اپنے مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ سنائیں اور ساتھ کے ساتھ بارے میں وضاحت بھی کرتے گئے۔

ان کے بعد جناب عبدالعزیز فطرت نے مسٹر سیٹوارٹ کی نظم کا منظوم اردو ترجمہ سنایا ان کے بعد الطاف پرواز نے اور آخر عطا حسین کلیم نے مسٹر سیٹوارٹ کی انگریزی کی نظموں کے منظوم ترجمے سنائے۔ اس موقع پر الطاف پرواز نے اپنے مجموعۂ کلام "دستک" کی ایک جلد بھی مسٹر سیٹوارٹ کو پیش کی۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے پاکستان کے قومی شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا مسٹر سیٹوارٹ سے تعارف کرا سے اپنی کوئی نظم سنانے کو کہا۔ جناب حفیظ نے اپنی اردو نظم کا انگریزی ترجمہ جناب اے ڈی شیخ نے سنایا۔ جو ان کی منظومات میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

سب سے آخر میں پرنسپل اشفاق علی خاں نے اپنی امریکہ اور پاکستان کے لوگوں کی زندگی کے فرق کو نمایاں کر دونوں ممالک کے ادب و شعر پر نہایت اثر انگیز پیرائے جلسے کے بعد دیر تک مسٹر سیٹوارٹ اور مقامی اہل اور صحافیوں کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو

بیرونی روابط

...سے ایک خط

...ری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ

جناب من!

جناب ثانم الغ زادہ کا آپ کے ملک میں جو پرجوش
...ندم کیا گیا اور جس گرمجوشی کے ساتھ ان کی مہمان نوازی
... اس کے لئے سویت یونین کے ادیبوں کی یونین
...ا اور آپ کے توسط سے پاکستان رائٹرز گلڈ کا
...یہ ادا کرتی ہے۔

جناب الغ زادہ نے حال ہی میں ادیبوں کے ایک
...ع سے خطاب کرتے ہوئے آپ کے ملک کی ترقی پذیر
...ی سرگرمیوں کی بڑے موثر انداز میں تشریح کی ہے
سویت یونین کے ادیبوں کی یونین اور اشاعتی
...رے جناب الغ زادہ کے دورۂ پاکستان کو دونوں
...ک کے ادب کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔ اور یہ خواہش
...تے ہیں کہ اس قسم کے ثقافتی تبادلوں کا سلسلہ آئندہ بھی
...ری رکھا جائے، چنانچہ سویت یونین کے ادیبوں کی یونین
...لڈ کے کسی ایک وفد کو سویٹ یونین کے دو ہفتے کے
...رے پر آنے کی دعوت دیتی ہے۔ تاکہ ہم ایک دوسرے
...ادبی سرگرمیوں سے کما حقہ واقفیت حاصل کریں ہمیں
...یقین ہے کہ آپ ہماری اس تجویز پر خلوص کے ساتھ غور
...ریں گے اور اپنے ایک نمائندہ ادیب کو منتخب کرکے سویٹ
...یونین بھیجیں گے۔

مخلص

الکزی سرکوف

سکریٹری بورڈ آف رائٹرز یونین، سویٹ یونین۔
ماسکو

۱۲ر اپریل ۱۹۶۳ء

امریکہ سے ایک خ...

مرکزی سکریٹری۔ پاکستان رائٹرز گلڈ

جناب من!

آپ نے قیام پاکستان کے دوران جس حسن سلوک کا برتاؤ
کیا تھا اس کا شکریہ ادا کرنے میں مجھے ضرورت سے زیادہ تاخیر
ہوگئی۔ اس وقت سے اب تک میں مسلسل سفر میں رہا۔ حتیٰ
کہ بمبئی میں بیمار پڑ گیا۔

میں بیان نہیں کرسکتا کہ مجھے آپ کا وہ تار وصول کرکے
کتنی مسرت ہوئی تھی۔ جو آپ نے لاہور کے سالگرہ والے
اجلاس کے سلسلے میں مجھے امریکہ بھیجا تھا۔ اس تار کے ملنے
کے بعد مجھے اپنا تمام پروگرام تبدیل کرنا پڑا اور بجائے
ایتھنس اور استنبول رکنے کے میں سیدھا کراچی پہنچا۔ مجھے خوشی
ہے کہ میں نے اپنا سفری پروگرام تبدیل کردیا۔ اس لئے کہ مجھے
اس طرح لاہور کا وہ اجلاس دیکھنے کا موقع ملا جو بہت ہی
پرکشش تھا۔ مجھے خصوصیت کے ساتھ کراچی کی اس شام
لطف آیا جب آپ نے ایک ریستوران کی چھت پر ضیافت کا انتظام کیا
جس میں ہم سب نے اپنی نظمیں سنائی تھیں۔

کیا آپ مجھ پر ایک اور عنایت کریں گے کہ کیا آپ از راہ کرم وہ نظمیں جو لا...
اور کراچی کی صحبتوں میں پڑھی گئی تھیں ان کا ترجمہ مجھ کو بھیج دیں گے نظمو...
یہ انگریزی ترجمہ آپ میرے مستقل پتے پر ارسال کیجئے گا۔ یہ نظمیں میری د...
پر جون تک پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔ میں ان ملاقاتوں کے متعلق کچھ لکھ...
ارادہ رکھتا ہوں۔ نظموں کے ان ترجمے سے مجھ کو بڑی مدد ملے گی۔ کیا آپ...
پاس ان ادبی صحبتوں کی کوئی رپورٹ یا اخباروں میں شائع شدہ انگریز...
کوئی خبر ہوگی؟ اس سلسلہ میں آپ جو بھی مواد ارسال کریں گے، اس کے ...
آپ کا بیحد ممنون ہوں گا۔ میرا مغربی پاکستان کا دورہ بہت ہی پر لط...
اور وہ تمام شاعر جن سے میری ملاقاتیں رہیں وہ سب بڑے اچھے لوگ...
میں آپ کی معرفت ان کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خلوص...
پال اینگ...

آئیوا (امریکہ) ۲۵ر مارچ ۱۹۶۳ء

انجمن ترقی اردو کی نئی کتابیں

قاموس الکتب (جلد اوّل) مذہبیات سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی مکمل
صفحات (۱۴۰۰) سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ قیمت ۴۰ روپے

داستان زبان اُردو ڈاکٹر شوکت سبزواری قیمت ۵ روپے

جیتا جاگتا اندلس کے مشہور فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حیی بن یقظان" کا ترجمہ
از ڈاکٹر محمد یوسف ۔ قیمت تین روپے، ۵ پیسے

ملا نصرتی ملک الشعرا بیجاپور، بابائے اردو ۔ قیمت ۵ روپے

اُردو تنقید کا ارتقاء ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ قیمت روپے

مہ و انجم مارٹن ڈیویڈسن کی کتاب کا ترجمہ از ثناالحق صدیقی ۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

خیالات عزیز عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ ۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری ڈاکٹر لطیف حسین ادیب قیمت ۶ روپے ۵۰ پیسے

قدیم اردو بابائے اُردو قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

مضامین سلیم (تین جلدوں میں) وحید الدین سلیم کے نایاب مضامین کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد اسماعیل
پانی پتی ۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے ۵۰ پیسے

رومیو جولیٹ شیکسپیر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ از عزیز احمد ۔ قیمت ۵

فاؤسٹ گوئٹے کے شاہکار کا منظوم ترجمہ از مولوی عبدالقیوم باقی مرحوم ۔ قیمت

مرحوم دہلی کالج بابائے اردو قیمت ۴ روپے

داس کیپٹال (حصہ اوّل) کارل مارکس کی عہد آفرین کتاب کا ترجمہ از سید محمد
قیمت ۷ روپے ۵۰ پیسے

فن شاعری ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ مع ترجمہ از عزیز احمد قیمت دو روپے ۵۰

اُردو کیٹیلاگ (جلد اوّل) از ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ۔ قیمت سات روپے
" " (جلد دوم) " " " " " " "
" " (جلد سوم) " " " " " " "

مقالات گارساں دتاسی (حصہ اول) (دس روپے)

خطبات گارساں دتاسی (حصہ اوّل) مقدمہ مولوی عبدالحق ۔ قیمت دس روپے
" " (حصہ دوم) " " "

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو اردو روڈ کراچی

اعجاز فاروقی

نیا انسان

(۱)

شام پھر آئی ہے دامن میں اُداسی لے کر
جانے کیسا ہے یہ احساس یہ کچھ انجانا سا
چبھتا رہتا ہے مری روح میں کانٹے کی طرح

یہ خلش مجھ کو ہے شاید مری تنہائی کی
خود پرستاروں کی دنیا ہے یہ بیگانہ سی
جیسے یہ ہے کوئی اندھیر نگر، چور نگر
جس میں کوئی نہیں رہ سکتا سلامت دامن
جس میں احساس و مروّت کا نشاں تک بھی نہیں
جس میں کوئی بھی نہیں صاحبِ دل، گرم لہو

یا خلش کوئی ہے بے چارگیٔ آدم کی
جس کو میکانکی قدروں نے کیا ہے بے بس
جس کے گلشن سے ہوئے محو نقوشِ جذبات
اور الفت کے حسیں پھول مشینوں میں دھواں

کسی کھوئی ہوئی منزل کی کھٹک ہے شاید
کسی محبوب سے پیمانِ وفا باندھا تھا
اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی اُلفت کی جھلک
اس کا سیمیں سا بدن ایک چمن ایک بہار

(۲)

چھوڑ بے کار سی باتیں ہیں یہ اے دل! اے دل!
میں پریشان ہوں، تھکا ہارا ہوں، واماندہ ہوں
آج دن بھر مرا گذرا ہے ہزار الجھن میں
فائلوں کے وہ دفاتر، وہ قراطیسِ سیاہ
اجنبی سے وہ ملاقاتی، وہ مصنوعی ہنسی
ایک بیگانہ سا ماحول کہ دم گھٹتا تھا
چاک دامانی کا ڈر خوف کہ جی کڑھتا تھا۔
جس میں بجھتا ہی گیا میرا وہ کندن سا شعور
اس پہ اے دل! ترے بے کار پرانے جذبات
چھوڑ یہ باتیں مجھے اور پریشان نہ کر
ابھی آئے گی وہ کل جس سے ملاقات ہوئی
آتشیں جسم، حیا سوز، وہ لالہ رخسار
چُست تن زیب کہ جس میں سے نمایاں ہوں خطوط
نیم عُریاں کہ نظر آئے وہ سینے کا ابھار
اور پھر ہوگا وہی رقص، وہی مے نوشی
اور مرے ہاتھ حسیں جسم سے پھر مَس ہوں گے
اور اس آگ میں جل جائیگا پھر میرا شعور
سگرٹوں کا وہی پھر ہوگا دھواں دار غبار
جس میں اُڑ جائے گا احساس دھواں سا بن کر
پھر وہی ہوگی خم و پیالہ و ساغر کی کھنک
جس میں دب جائیگی اے دل! تری بے کار پکار
ساز و دمامہ پہ پھر جاز کے نغمے ہوں گے
جس میں ہو جائے گا گم من کا سرودِ ازلی
اور آغوش میں جب آئے گی وہ سیم بدن
مرے دامن سے بھی دُھل جائیں گے ناکامی کے

تاب اسلم

تذبذب

یہ زمستاں کی شبِ تار، یہ خلوت، یہ سکوت
کتنے سائے ہیں مری آنکھ کے پردوں میں نہاں
اک طرف آہوئے مہتاب ہے سرگرمِ خرام
اک طرف ہچکیاں لیتی ہوئی شمعوں کا دھواں
اک طرف لمسِ بہاراں سے مہکتے ہوئے پھول
اک طرف چیختی چلاتی ہوئی شامِ خزاں
اک طرف مانگ میں سیندور کی روشن تحریر
اک طرف ہیں لب و رخسار پہ زخموں کے نشاں
اک طرف ساز کے سینے سے ابلتے نغمے
اک طرف پاؤں میں روتی ہوئی زنجیرِ گراں
اک طرف محفلِ خوباں میں چھلکتے ہوئے جام
اک طرف پیاس کے شعلے ہیں لبوں پر رقصاں
اک طرف وادیٔ گلنار میں کرنوں کا ہجوم
اک طرف تیرگیٔ شب پہ کراں تا بہ کراں
اتنے سائے ہیں کہ سینے سے لگا بھی نہ سکوں
اتنے آنسو ہیں کہ پلکوں سے چھپا بھی نہ سکوں

زرِ داغِ دل

نثار صدیقی

دل ہو کہ تصور ہو، زباں ہو کہ نظر ہو
استادہ ہیں اک صف میں تمنا کے گنہگار
محبوس کہیں نکہتِ آوارۂ گلشن،
مقتول کہیں جلوۂ رعنائیِ رُخسار
تخلیق کیا جس نے جمالِ قد و گیسو
اُس جذبہ و احساس کی قیمت رسن و دار
مصروفِ عنایات رقیبوں سے زلیخا
اب کوئی نہیں یوسفِ دوراں کا خریدار

ہم اہلِ نظر، صاحبِ دل، سوختہ ساماں
گزرے ہیں کئی بار اسی راہگزر سے
اے وقتِ گنہگار تجھے یاد تو ہوگا،
ایسا بھی تماشا کبھی گزرا ہے نظر سے
تاریک ہیں دل آج بھی ہم شب زدگاں کے
کیا کیا نہ امیدیں تھیں ہمیں نورِ سحر سے
اوراق اُلٹتے رہے بازیچۂ حالات
تاریخ رقم ہوتی رہی خونِ جگر سے

لب چپ ہوں تو آنکھوں کی زباں چپ نہ رہے گی
اس طور بھی ہو جاتا ہے اظہارِ تمنا
سمجھے تو کوئی میری خموشی کا تکلم،
یاں ترکِ تمنا بھی ہے تکرارِ تمنا
ویران نہ ہوں دیدہ و دل راہِ طلب میں
سنسان نہ ہوں کوچہ و بازارِ تمنا
ہاں حسرت و ارماں کا لہو صرف کیے جاؤ
مہکیں گے کبھی تو گل و گلزارِ تمنا

شعور صدیقی

مستقبل

ردائے نور بچھے گی تمام عالم پر
اداس پھر نہ ستاروں کی روشنی ہوگی
روش روش پہ جلیں گے محبتوں کے چراغ
قدم قدم پہ بہاروں کی نغمگی ہوگی

کلی کا حسنِ تبسم گلوں کی رعنائی
جلو میں اپنے لئے نو بہار آئے گی
گھٹائیں جھوم کے برسیں گی سارے گلشن پر
لطافتوں کی سحر نغمہ بار آئے گی

دُھری بن کی دل آویز خوش خرامی پر
نہ جانے کتنے تمنا کے پھول برسیں گے
نسیم جھومتی گاتی چمن سے گذرے گی
تبسموں کے لئے پھر نہ ہونٹ ترسیں گے

مرے رفیق مرے ہم سفر مرے ہمراز
وہ دور خود نہیں آتا ہے لایا جاتا ہے
بنامِ عظمتِ انساں بنامِ عظمتِ حسن
یہ راگ عزم کے سازوں پہ گایا جاتا ہے

عبدالعزیز فطرت

یہ زندگی کا حسین تنوّع

ترا کرم ہے خدائے برتر!
ہزار خوشیاں ہزار انعام نوعِ انساں کا ہیں مقدر
فضائے فکر و نظر منوّر جہانِ ارض و سما مسخّر

ہزار قندیلِ نو رانساں کے ذہن کو جگمگا رہی ہے
ہزار تنویرِ بیقرار اک ذرا سے دل میں سما رہی ہے

یہ زندگی کا جمال یہ رنگ و نور و نغمہ کی دلربائی
حسیں خیالوں لطیف خوابوں کی ہر نفس معجزہ نمائی

یہ ذوقِ وجداں یہ شوقِ عرفاں یہ جوشِ ارماں کا تند دھارا
کہ زندگی کا حسیں تنوّع ہزار رُخ سے ہے جلوہ آرا
ترا کرم ہے خدائے برترا!
تغیّرات ایسے لمحہ لمحہ، کہ دیدہ حیران ہو رہی ہے
نفس نفس طرحِ دلبری ہے نظر نظر شرحِ زندگی ہے

دلوں کی دھڑکن میں ایک پنہاں تجسّس آواز دے رہا ہے
نظر کی ہر بے قرار جنبش میں حسرتِ حُسنِ ماورا ہے

ترا کرم ہے خدائے برتر،

حیات اس نو بہ نو تغیر سے تازہ تحریک پا رہی ہے
ہر اک نئی بات نوعِ انساں کی روح کو گدگدا رہی ہے

یہ وسعتِ ذہن ابنِ آدم۔ یہ فہم و ادراکِ بیکرانہ
بشر کی قدرت میں ہے تری کائنات کا محتشم خزانہ

یہ سوچ کے رنگ رنگ ڈھلے یہ فکر کے زرفشاں ستارے
ترے خزانوں کے، تیرے رازوں کے ہم امیں؟ حوصلے ہمارے

سمجھ عناصر کی کارفرمائیوں کی انساں کو مل رہی ہے
کلی ترے باغ راز کی باغ ذہن انساں میں کھل رہی ہے

ترا کرم ہے خدائے برتر

اب اس کلی کی لطیف خوشبو سے زندگی پُر بہار ہوگی
بشر کی ہر قوت عمل ذوق زندگی پر نثار ہوگی

یہ بخشش دلنواز تیری یہ بے طلب التفات تیرا
کہ زیست کی خوبصورتی میں ہے نور تیرا ثبات تیرا

دیئے ہیں تو نے جو یہ حسین و جمیل انعام آدمی کو
اب آدمی اپنا خونِ دل کیوں نہ دے گا قندیلِ زندگی کو

قمر لدھیانوی

اندھیرے اُجالے

۱

دن بھر انساں پاگل بن کر بازاروں میں گھومیں
بھیڑ میں خود ہی کھو جائیں پھر اپنے آپ کو ڈھونڈیں
اک مرگِ انبوہ کہیں یا رونق اس کو سمجھیں
اس منظر کو دیکھ کے میں کیسے خاموش رہوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا!

جلتے دن اور تپتی راتیں، سونی سونی شامیں
یگ یگ جیون کی آشائیں دل کا دامن تھامیں
راکھ ہوئی سب سوچیں ذہنوں کی خاموش چتا میں
میں اس دکھ کے ساگر میں چپکے سے بہہ نہ سکوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا!

پیار کی جوت جگا کر دل میں لوگ یہاں پچھتائیں
اَن دیکھی خوشیوں کی خاطر کتنے دکھ اپنائیں
زندہ رہنے کی چاہت میں جیتے جی مر جائیں
ارمانوں کے اس بندھن میں کب تک رنج سہوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا!

بادل برسے تو بن جائے اپنی دھرتی آگ
ہوا چلے تو ہر جھونکے سے پھوٹیں غم کے راگ
شاخیں ہلیں تو پتے پتے پر لہرائیں ناگ
اس ماحول سے بچ کر بھاگوں بھی تو کہاں چھپوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا!

چاروں جانب پھیل رہا ہے دھیا دھیا شور
پریت کے سندر جال میں پھنس کر جھنجھیں من کے مور
ڈھول سروں پہ ڈال کے گدرے، تیز ہوا منہ زور
جیسا بھی چاہوں تو اس عالم میں جی نہ سکوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا

سورج ابھرے تو اس بستی میں ظلمت چھا جائے
بھوتوں کی صورت میں ناچیں ٹیڑھے ترچھے سائے
بین کریں یہ روحیں اپنے بالوں کو بکھرائے
اس وحشت آباد میں دل پر کب تک جبر کروں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا

نجم و قمر کی جانب انساں اڑنے کو پر تولے
لیکن چاروں اور سے لیکیں قبریں جبڑے کھولے
آتی جاتی سانس دلوں میں زہرِ ہلاہل گھولے
مصلحت اندیشی کا اپنے سر الزام نہ لوں گا
جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا ہے وہی کہوں گا

سیّد عطا حسین کلیم

ایک یاد

(جیسی سٹیوارٹ کی نظم "HOLD TO A LIVING DREAM" کا آزاد منظوم ترجمہ)

مت چھوڑو تم!
اپنی سندر یاد کا دامن مت چھوڑو تم۔
کتنے رنگیں سپنوں کی تابانی اس میں پوشیدہ ہے۔
سپنا مٹی اور پتھر سی چیز نہیں
بے جان نہیں ہے۔
اس کو تمہارے ذہن اور دل نے جنم دیا ہے
مت چھوڑو تم!
اپنی سندر یاد کا دامن مت چھوڑو تم۔
اس دنیا میں
اس سپنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔
جس کا خالق آپ ہے انساں۔
جس کا مالک آپ ہے انساں
پیری ہو یا عہدِ جوانی
مشکل یا آسان گھڑی ہو۔
چلتے پھرتے ——— نیند میں یا بیداری میں
انسان کے ذہن و دل نے جس کو جنم دیا ہے
اس دنیا میں
اس سپنے اس یاد سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔

مت چھوڑو تم
اپنی سندر یاد کا دامن مت چھوڑو تم
یاد رکھو
مٹی اور پتھر مٹ جاتے ہیں
لیکن یاد ———
لیکن یاد اور سپنا ———
یہ اک ایسا پھول ہے کھل اٹھتا ہے جو ویرانوں میں
اس کی قیمت اس کی وقعت ——— دائم قائم
سب سے بھاری، سب سے بڑھ کر
مت چھوڑو تم
اپنی سندر یاد کا دامن مت چھوڑو تم
اس سے تمہارا ماضی روشن
اس سے تمہارا حال ہے تاباں
یہ تخلیق
تمہاری اپنی زیست کے بیتے لمحوں کا شہکار ہے۔
مت چھوڑو تم
تم اس کو اپنے سینے میں محفوظ رکھو

اطہر پرویز

ادب میں زندگی اور شخصیت کا اظہار

میتھو آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کی تنقید کہا ہے لیکن جس طرح
یں زندگی کی تنقید ملتی ہے۔ اسی طرح نثر میں ہمیں زندگی کی تنقید
ہے۔ اس لحاظ سے ہم نہ صرف شاعری بلکہ مجموعی طور پر ادب کو
کی تنقید کہہ سکتے ہیں۔ ادب چاہے۔ کسی ملک و قوم کا ہو
لکھنے والا مرد ہو یا عورت، اس میں ہمیں انسانوں کے احساسات
خیالات اور جذبات کا اظہار ملے گا۔ وہاں اگر مناظر فطرت کی
لے گی تو اس کے سینے میں ہمیں انسان کے دل کی دھڑکن سنائی
۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اس کا جس سماج سے تعلق ہے۔
ل اور سماج اس کے ادب سے ظاہر ہوگا۔ ادب میں اگر دیو
کا ذکر ہوگا تو ان میں ہمیں انسانی خصلتیں نظر آئیں گی۔ دیوتاؤں
یں و غضب میں انسانی جلال اور السپراؤں کے چہرے پر انسانی
ی جھلکیاں ملیں گی۔ غرض مافوق الفطرت میں بھی فطرت کا اظہار

ہر ادبی تخلیق زندگی سے زندگی حاصل کرتی ہے اور اس کے مطالعے کے
اپنے آپ کو زندگی سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں۔ ادب
ں ایک ایسی دستاویز ہے جس میں انسان نے جو کچھ دیکھا، سمجھا اور
ں کیا ہے سب قلمبند ہے یہاں انسانوں کے تجربوں کی یادگاریں
تی ہیں۔ ادب کا رشتہ ماضی سے بھی اتنا ہی قریب ہے جتنا حال کو
ادب میں انسانی زندگی کی تمنائیں اور آرزوئیں شامل ہوتی ہیں۔
زندگی پانی کے تالاب کی طرح ٹھیرتی نہیں بلکہ آبشار کی مانند
اور صاف شفاف نظر آتی ہے۔ انسان نے جب تہذیبی و تمدنی
ی کی طرف قدم اٹھائے تو ادب نے انسان کی مدد کی۔ چنانچہ زندگی
کے اس قافلے میں ادب کی حیثیت ہم سفر کی بھی رہی ہے اور راہبر کی بھی
ادب کا موضوع تمام انسانی اعمال و خیالات میں گویا ایک طرح
سے ادب بڑے ادب کے ساتھ زندگی کی تبلیغ کرتا ہے۔ اردو کے ایک
نقاد ممتاز حسین کا کہنا ہے کہ "ادب کا تعلق براہِ راست انسانوں کی
زندگی سے ہے۔ ان کے نفسیاتی اور سماجی مظہر سے جن کا مطالعہ
کسی بھی طبقاتی سماج میں غیر جانبدارانہ ہو سکتا ہے۔" اسی مضمون میں وہ
آگے چل کر لکھتے ہیں کہ زندگی کا صرف ایک نقطۂ نگاہ ہے اور وہ نقطۂ نگاہ
متحرک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی ہے۔ زندگی پر تنقید صرف اسی نقطۂ
نظر سے ہونی چاہیے۔

یہ بات اصولی طور پر صحیح ہے لیکن اس اصول کا میکانکی عمل
کسی مصنف کو گمراہ بھی کر سکتا ہے جیسا کہ اردو کے بعض ترقی پسند
ادیبوں کے یہاں ہوا اور انھوں نے زندگی کے اس بحرِ بیکراں کو ایک
جوئے کم آب میں محدود کر دیا اور زندگی کی مخالفت کرتے ہوئے بھی
زندگی کر رہے تھے۔ ادیب یا شاعر زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹتا وہ اسے
ذاتی تعصب کے تحت نہیں پیش کرتا۔ بڑے ادیب کے اندر اس معاملے
میں خدائی صفات ہونی چاہئیں۔

ادب زندگی کی تنقید ہے اور اس رشتے سے ادب حال پر اکتفا
نہیں کر سکتا۔ تنقید کا مقصد ہمیشہ نئی تعمیر ہوتا ہے اور تعمیر کے لئے
مستقبل کے میلان اور اس کے تصور کی ضرورت ہے جس کا دوسرا
نام تخیل ہے اور اسی تخیل کی مدد سے وہ اپنے تصورات پیش کرتا ہے
اور زندگی کے مستقبل اور اس کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہے
اسی لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادیب خواب دیکھتا ہے۔ لیکن ان

خوابوں میں حقیقت کی زبردست آمیزش ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری "کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت، تخیلیت، افادیت اور رجائیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔"

زندگی ایک میلا ہے جس میں رنگا رنگ مناظر نظر کے سامنے آتے ہیں اور جو ایک دوسرے میں ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ان رنگوں میں کبھی کبھی تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زندگی ایک سیل رواں ہے جس میں سبک اور تند موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی رہتی ہیں۔ ایک قوس قزح ہے، جس میں بیشمار کرنوں کی جلوہ گری ہے کچھ ایسا ہی حال انسان کے دل کا ہے۔ محبت اور نفرت، خود پسندی اور ایثار، ہمدردی اور لاتعلقی، رحم اور بے رحمی۔ یہ تمام متضاد کیفیتیں انسانی دل پر گزر جاتی ہیں۔ ادب انھیں احساسات کا آئینہ دار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ آئینہ محض عکاسی نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے اس میں رنگ آمیزی بھی کرتا ہے۔

ایک انگریز نقاد نے صحیح کہا ہے کہ ہم ادب کا مطالعہ اس لئے نہیں کرتے کہ اس میں ہمیں کسی غیر معمولی تجربہ کی گہرائی نظر آئیگی۔ لیکن ہم ادیب سے یہ توقع ضرور کرتے ہیں کہ وہ کچھ لکھے وہ اُس کی شخصیت کا بہترین اظہار ہو اور یہ بات اس کی اپنی ہو۔ یہ مانگے کا اجالا نہ ہو اور جو ادب اس طرح تخلیق ہوگا، لوگ اس کی طرف توجہ دیں گے۔ یہ ضروری ہے کہ ادیب یا شاعر کا تجربہ وسیع ہو یا یہ کہ جن لوگوں نے زندگی میں زیادہ تجربات حاصل نہیں کئے ہیں وہ ادبی تخلیقات نہیں کر سکتے بلکہ جو تجربہ بھی ہو وہ خارجی یا داخلی طور پر اس پر گزر چکا ہو۔ یہ تجربہ مختصر ہو سکتا ہے، لمحاتی ہو سکتا ہے لیکن ادیب اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اس تجربے کے ہر پہلو پر نظر رکھے اور پورے طور سے اپنی شخصیت میں سمو کر پیش کرے۔ واقعات اور تجربات کو ہر پہلو سے اس لئے دیکھنا چاہیئے تاکہ ہم اس کی سچائی صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم فوٹو گرافر کی طرح حقیقت کو محض جامد طور پر پیش کر دیں۔

ادیب کا کام یہ نہیں ہے کہ خارجی حقیقتوں کو اس کے جامد تصور میں دیکھے کیونکہ ہم کو ان حقیقتوں سے واقفاتی دلچسپی نہیں۔ بلکہ اس کے سیاق سباق کی روشنی میں ہم اس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادیب اس حقیقت کو متحرک اور زندہ شکل میں اپنے ذاتی جذباتی تاثرات کے ساتھ پیش کرتا ہے تاکہ پڑھنے والا اس کا اثر قبول کرے۔ کیونکہ اس کی دلچسپی اس کے جذباتی اور حسیاتی ردِ عمل سے ہے۔ فرض کر لیجئے کوئی ادیب واٹرلو کی جنگ کا نقشہ پیش کرے اور اس میں اس واقعہ کی عکاسی تک محدود ہوگا۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اس جنگ کے تمام تاثرات کو نظر میں رکھے۔ وہ ان تاثرات کے صرف جذباتی ہی نہیں بلکہ تہذیبی، تمدنی پر غور کرے اور نہ صرف افراد بلکہ قوموں کے جذبات کے ردِ عمل کو جو اس جنگ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کر سکے گا۔ ادیب کا کام پیدائش اور اموات کے رجسٹرار مرہ کے کاموں کی ڈائری رکھنا نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی اور کے بھرپور تجربے اور واقعات کے ردِ عمل سے ہے جن سے انسان متاثر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ردِ عمل وقت اور حالات کے ساتھ بدل جائیں لیکن یہیں ہمیں ادیب کی صحیح شخصیت نظر آتی ہے۔

ادیب ذاتی مشاہدے سے مدد لیتا ہے۔ لیکن اس کے تخلیقی عمل میں مشاہدے سے زیادہ قوتِ متخیلہ اس کی مدد کرتی ہے۔ تخیل کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی تجربات میں وسعت دیتا ہے۔ مثلاً آپ سڑک پر سے گزر رہے ہوں اور کوئی فاقہ زدہ شخص آپ کو ملے اور یہ بتائے کہ "کئی روز سے ایک دانہ بھی میرے منہ میں نہیں گیا۔ بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہوں" تو فاقے کی یہ کیفیت اور اس کی شدت کو آپ بھرپور طور پر محسوس کر لیں گے، خواہ آپ نے زندگی میں کبھی ایک وقت کا فاقہ بھی نہ کیا ہو اور آپ کو فاقہ کشی کا تجربہ ہو۔ یہ دراصل تخیل کی کارفرمائی ہے اور اسی طرح تخیل ادیب کی رہبری بھی کرتا ہے۔

ادیب اپنی آنکھوں کو خوردبین کے طور پر استعمال کرتا ہے اور سچائی کا متلاشی ہے۔ گویا سمندر کی تہہ سے موتی نکالنے کا کام

۔وہ پانی کی سطح کو نہیں دیکھتا بلکہ جو موجیں زیرِ آب پیچ و تاب کھاتی
ان پر نظر رکھتا ہے۔ وہ فطرت کے رازوں کو افشا کرتا ہے۔ یہاں
ی قوتِ متخیلہ اور اس کے احساسات اس کی مدد کرتے ہیں اور ہم غالبؔ
ر ا کہہ اٹھتے ہیں۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہی عظمت تھی جس نے بڑے بڑے شاعروں سے پیغمبری کے
ض ادا کروائے ہیں اور ادب شناس کہہ اٹھے ہیں کہ "شاعری پیغمبری
ک حصہ ہے" شاعر فطرت اور حقیقت کا نباض ہوتا ہے وہ اسباب
خ دونوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہاں وہ فرد کا ہی نہیں قوموں کا
ں نظر آتا ہے۔ وہ قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں میں
رہبری کے فرائض نہیں بھولا ہے۔ ایلیا اہرن برگ نے اسی سے
ز ہو کر کہا ہے کہ "کسی ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے ادب کی
ن کرے جو ہمیشہ کے لئے ہو بلکہ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قادر
ا چاہیئے جو خواہ ایک لمحے کے لئے ہو لیکن اس لمحے کے لئے ہو
ن اس لمحے میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو"۔

ہم اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرسکتے ہیں لیکن اس حقیقت
انکار نہیں کرسکتے کہ ہم مادرِ گیتی کے بیٹے ہیں اگر ماں پر کوئی آنچ
ے تو پھر کیا زندگی بھی نچھاور کی جاسکتی ہے۔

ادیبوں اور شاعروں نے قوموں کی زندگی میں بڑے اہم
یفے ادا کئے ہیں۔ انھوں نے جہاں شیکسپیر کی طرح انسانی فطرت کی
جھی ہوئی ڈوروں کو سلجھایا ہے وہاں رومی بن کر زندگی کے آداب
سکھائے ہیں۔ اس نے جہاں ورڈسورتھ کی زبان میں نیچر کی ترجمانی
ہے، وہاں حافظ کی طرح سماجی ریاکاری کا پردہ بھی چاک کیا ہے اور
محبت و عشق کے زمزمے سنائے ہیں۔

زندگی سائنس داں کے سامنے خارجی حقیقتوں پر مشتمل ہو کر
رہ سکتی ہے۔ وہ سیاست دانوں کے لئے ایک محدود دائرے
سما سکتی ہے، وہ مورخ کے لئے گزرے ہوئے واقعات کا نام ہو سکتی
لیکن ادیب کے لئے وہ مجموعی طور پر ایک اکائی ہے۔ یہاں اس کے
ٹکڑے کر کے ایک رخ نہیں دیکھا جاتا کیونکہ زندگی کسی ایک حصہ

کا نام نہیں۔ وہ کہیں سے کاٹی نہیں جاسکتی۔ وہ عام جسم ہے جس میں سب
کچھ نظر آتا ہے اور اس کی عکاسی فن کار سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ اور ادیب
بھی ایک فن کار ہے محض عکاس نہیں۔ وہ زندگی کی عکاسی اور ترجمانی
ضرور کرتا ہے لیکن یہ عمل میکانکی نہیں ہوتا۔ یہاں اس کا اپنا زاویۂ نظر
ہوتا ہے۔ زندگی کی اپنی تفسیر ہوتی ہے۔ ادیب یا شاعر کا نقطۂ نظر محض
اس کی اپنی تخلیق نہیں ہوتا۔ اس میں اس سماج کا بھی ہاتھ ہوتا ہے
جس میں وہ رہتا ہے۔ یہاں ماضی کی قدریں بھی جھانکتی ہیں۔ ادیب
سماج سے صرف حاصل ہی نہیں کرتا وہ اسے کچھ عطا بھی کرتا ہے۔ اسے زمانہ
تخلیق کرتا ہے وہ اسے زمانے کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہی زمانے اور ادیب
کا لین دین کہلاتا ہے۔ وہ سماج سے تجربات حاصل کرسکتا ہے انھیں
اپنی شخصیت میں سموتا ہے اور پھر ان کو سماج کو واپس کرتا ہے۔ یہ واپسی
جوں کی توں نہیں ہوتی۔ یہاں محض سماج سے لیا ہوا اصل ہی واپس
نہیں ہوتا، وہ اسے مع سود کے واپس کرتا ہے اور جب اس دنیا سے
جاتا ہے تو اس کا حساب صاف ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ سماج
کا نہیں، سماج اس کا مقروض ہوتا ہے۔

کوئی ادب زندگی بغیر زندہ نہیں رہتا یعنی زندگی ادب کا
سرچشمہ ہے۔ اگر کوئی ادیب زندگی سے منہ موڑ لے تو وہ زندگی کی رحمتوں
اور برکتوں سے بے بہرہ ہو جائے گا اور اپنے آپ موت کے گھاٹ
اتر جائے گا اور ادب کہلانے کا مستحق نہ رہے گا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے
کہہ چکا ہوں کہ ادب زندگی سے اگر اثر قبول کرتا ہے تو دوسری جانب اس
پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ انگریزی نقاد ڈلیو کاس نے اپنی کتاب "ادب
اور نفسیات" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "کوئی شخص ادب کی وجہ سے زندہ
نہیں رہ سکتا لیکن ادب زندہ رہنے میں مدد ضرور کرتا ہے"۔

ادب زندگی کے قریب ترین جذبے کا اظہار ہے جارج ایلیٹ
نے مجموعی طور پر آرٹ کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ ادب کے لئے
زیادہ صحیح ہے کہ "وہ زندگی سے قریب تر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا وسیلہ
ہے جس کی مدد سے ہم کو انسانوں کے تجربے اپنی تمام تر تفصیل کے
ساتھ نظر آتے ہیں اور ہم دوسرے انسانوں سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔
ہر بڑی تصنیف اپنے مصنف کے دل اور دماغ کی پیداوار

ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو اپنی کتاب میں چھپا دیتا ہے۔ بڑے ادب کی بنیاد ذاتی تجربے پر ہوتی ہے اور ہر بڑی تصنیف اپنی عظمت کے لئے اس شخصیت کی مرہون منت ہوتی ہے جس نے اسے زندگی عطا کی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی تازگی اور اس کے نئے پن میں تصنیف کی عظمت کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ہم کالی داس، شیکسپیر، ٹیگور یا غالب کو پڑھتے ہیں اور ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی تصنیف کے پیچھے کوئی شخصیت ہے۔ ایک مصنف کی تمام کتابوں کے درمیان ایک نہ ایک بات ایسی مشترک ہوتی ہے کہ آپ اُسے پہچان سکتے ہیں کہ یہ تصنیف کس کی ہے۔ ٹیگور کی شخصیت اس کی ہر تصنیف پر منڈلاتی رہتی ہے۔ اور ہم ان کی مختلف موضوعات کی کتابوں کے اندر اُن کی شخصیت کی جلوہ فرمائی دیکھ سکتے ہیں۔

اچھے ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف کا خلوص بھی شامل ہو۔ مصنف جو بات کہے وہ خلوص کے ساتھ محسوس بھی کرے اور اس کی کیفیت سے پورے طور پر گزرے جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر کسی تصنیف میں اس کے مصنف کا خلوص شامل نہ ہو تو تصنیف کا معیار گر جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب کا تجربہ بہت وسیع ہو البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ ضروری ہے کہ اس ادیب نے جو کچھ دیکھا، سوچا، سمجھا اور محسوس کیا ہو اُسے پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پیش کرے۔

ہم ایک ادبی تخلیق کو پڑھتے ہوئے مصنف کی ذاتی زندگی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اس کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور انتہائی خلوص کے ساتھ اس کے خیالات اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی طرف اس کا زاویہ نظر کیا ہوگا اور دنیا کے تجربات نے اس پر کس طرح اثر ڈالا ہوگا اور اس طرح کا اظہار اس کی شخصیت کے ذریعے کیسے ہوا۔ ہم مصنف کو اس کی تحریروں کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح کتاب سے ہمارا پہلا ربط قائم ہوتا ہے اور پھر کتاب کے ساتھ ہی ہم مصنف سے بھی تعلق قائم کرتے ہیں اور اس کی شخصیت اس کی تصنیف اور تجربات کی روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کوئی کتاب اپنے مصنف سے علاحدہ شے نہیں ہوتی۔ وہ مصنف کا پرتو اور اس کی شخصیت کا جز ہوتی ہے۔ بعض اوقات مصنف کی شخصیت اس کی تصنیف کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی لئے ہم بڑے شاعر اور ادیبوں کی سوانح حیات پڑھتے ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے حالات معلوم کرتے ہیں تاکہ اُن کے کردار اور ان کے تجربات کی روشنی میں ان کی تصنیف کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور کتاب کی روح تک پہنچ سکیں۔

(زیر طبع کتاب "ادب کا مطالعہ" کا ایک باب)

احمد ندیم قاسمی

علاقائی ادب

ادارۂ فکر و فن میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میں اس کی چند تقاریب میں بھی شریک ہو چکا ہوں اور اس کے جاندار اور توانا مقاصد کے سبب میں نے اس کی سرگرمیوں کا باقاعدہ مطالعہ بھی کیا ہے۔ پھر میں نے اپنی زندگی کے اس حصے کے چند برس بھی ملتان، بہاولپور اور ان کے نواح میں بسر کئے ہیں جہاں ہر چیز پر بے اختیار پیار آتا ہے اور حسن کے ہر منظر کو سینے کے ساتھ بھینچ لینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو راز کی ایک بات بتاؤں کہ اس دور میں مجھے ایک اس خطۂ زمین نے مایوس نہیں کیا تھا بلکہ میرا دامن احساس و خیال رنگ رنگ کے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے سنالوں بھرے دیہی سبزازاں سمیت کھجوروں، میٹھی ملتانی بولنے والے انسانوں اور خواجہ فرید کی کافیوں سے عشق ہوا تھا۔ غیر ملتانی فنکاروں میں سے میں اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں ملتانی زبان کے تیوروں، بہناؤ اور مطالب کا شعور رکھتا ہوں۔ اور ملتانی کے خاص لہجے اور تلفظ سے گھبراتا نہیں ہوں بلکہ یوں خوش ہوتا ہوں جیسے موسیقی سن رہا ہوں۔

مگر اس سب کچھ کے باوجود میں نے اپنے قیام اور اس کے بعد بھی کافی عرصے تک محسوس کیا ہے کہ اس سرزمین نے شعر و فن بہت برائی سی طاری سے لوگ باتیں بہت پیاری کرتے ہیں مگر انھیں شعر میں نہیں ڈھالتے اپنی روزمرہ زندگی کے واقعات بڑے سلیقے سے سناتے ہیں مگر کہانیاں نہیں لکھتے۔ انھیں اظہار کا سلیقہ آتا ہے مگر ان کے ہاتھ میں قلم نہیں ہے یہ قلم ان سے کون چھین لے گیا! یا پھر کیا لاہور اور دوسرے علمی و ادبی مرکزوں میں چند خاص اہل قلم کی اجارہ داری قائم ہے جو ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خاں کے شاعروں اور ادیبوں کو پسماندہ قرار دیتے ہیں۔ اور ان نو واردوں کو دلدادگانِ فن سے متعارف و مانوس نہیں ہونے دیتے۔ میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ جب مجھے اردو کے معیاری ادبی رسالوں مثلاً ادب لطیف، سویرا اور نقوش کی ادارت کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ اس سرزمین کے لوگ کہنے نہیں مگر کھل کر نہیں کہتے۔ ان کے اندر جذبہ تو ہے مگر اس جذبے کو فن میں متشکل کرنے والی آگ نہیں ہے۔ وہ حسن و خیر کے قدر داں تو ہیں مگر ان کی یہ قدر دانی صدیوں کی بعض اخلاقی اور معاشرتی قدروں کے زندانوں میں بند ہے حالانکہ یہ قطعی ضروری نہیں ہوتا کہ جو قدر صدیوں سے قائم ہو وہ ہر دور میں درست بھی ہو۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ اس سرزمین میں جوہر قابل موجود تھا، البتہ میں اس حقیقت کا کوئی منطقی تجزیہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ جوہر قابل اس شدت کے ساتھ کیوں نہیں ابھرتا جس شدت کا ہزارہ، پشاور، سرگودھا اور جھنگ ایسے مقامات کے نوجوان اہل قلم نے مظاہرہ کیا ہے۔

تین برس پہلے جب ملتان میں ادارۂ فکر و فن کا قیام عمل میں آیا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس ادارے کے منتظمین پھلواری اگانے کے لئے ریت کے ٹیلے پر پانی ضائع کر رہے ہیں، مگر یکایک ملتان کی ادبی و فنی فضا میں چہکاریں سی سنائی دینے لگیں، یکایک

اس ویرانے میں زندگی برسوں کی گرد جھاڑ کر اٹھ بیٹھی، ملکہ اس شان سے
جیسے غالب نے قیامت قامتوں کو دیکھا تھا۔

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدنِ مضمون عالی ہے

تب میرا تجزیہ مکمل ہو گیا اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس خوابیدہ
سمندر کو محض تموج درکار ہے۔ اور یہ تموج ادارہ فکر و فن نے مہیا کر دیا
یوں تو اس ادارے سے پہلے بھی ملتان میں کئی ادبی و شعری انجمنیں تھیں
مگر جو مقاصد ادارۂ فکر و فن کے پیش نظر تھے ان تک دوسروں کی نظریا
یا تمتیں نہیں پہونچی تھیں۔ چٹان اس وقت تک تو وہ سنگ ہی رہتی
ہے جب تک سنگ تراش کا ہاتھ اس تک نہیں پہونچتا۔ پھر لکا یک
حسن تخلیق جھلکنے لگتا ہے اور چٹان، چٹان نہیں رہتی، فن پارہ بن
جاتی ہے۔

یہ ادارۂ فکر و فن ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے ملتان پر مسلط
سناٹا توڑا ہے اور پھر دھماکے سے نہیں توڑا، شعر سے، افسانے سے،
تنقید سے، موسیقی سے اور مصوری سے توڑا ہے اور مجھے یقین ہے کہ
اس جلتے جاگتے ماحول میں کتنے ہی ایسے شاعر اور ادیب ذہنی طور سے
پروان چڑھ رہے ہیں جنہیں چند برس کے بعد علم و فن کی دنیا میں اپنا
سکہ چلانا ہے اور جنہیں پاکستانی قصر ادب کی رفعت میں اضافے کرنے
ہیں۔ یہ جو آج ملتان میں لاہور، کراچی اور راولپنڈی کے سے ادب و فن
کے چرچے ہیں اور یہ جو علوم کے ملک گیر اندازے کے لئے کوئی دیانتدار
نقاد ملتان کی آواز سنے بغیر اپنا مطالعہ مکمل نہیں کر سکتا، تو میں سمجھتا ہوں
کہ اس خوشگوار تبدیلی میں ادارۂ فکر و فن کا خاصا موثر حصہ ہے۔ اور اسی لئے
یہ ادارہ مبارکباد کا بھی مستحق ہے، اور ہمت افزائی کا بھی۔

ادارۂ فکر و فن کے تینوں مقاصد ایسے ہیں کہ اگر انھیں کسی زبان
کے شعر و ادب میں سے خارج کر دیا جائے تو مجذوبانہ یاوہ گوئی کے سوا اور کچھ
بھی باقی نہیں رہتا۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق، تنقیدی شعور کی جلا اور علاقائی
ادب و ثقافت کا فروغ، تینوں کا تعلق زندگی، اس کے حسن، اس کے
ہنگامے اور اس کے بھرپور پن سے ہے۔ زندگی سے جس فنکار نے قطع
تعلق کیا اسے ہکا نو پھ کر رہ گیا۔ اس ... سے وہ حک غائب ہو گئی ... کے

بغیر بیمار اور زندگی سے نفرت دلانے والا، انفعالی اور فراری ادب پیدا
ہوتا ہے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جو زندگی اور انسانوں سے پیار کرنا سکھاتے
ان کے دم سے انسان محض اپنی ذات کے خول میں بند نہیں رہ سکتا
انسانی اور آفاقی اور کائناتی نقطہ نظر انہی مقاصد کی پیداوار ہے۔ ا
کے ساتے میں ذاتی دکھ بھی کائناتی بن جاتا ہے اور انفرادی غم بھی خیر
برکت کی قوت قرار پاتا ہے۔ یہی وہ مقاصد ہیں جنھوں نے ادب اور فن
باشعور انسانوں کا گراں بہا اثاثہ قرار دیا ہے۔

اس کے باوجود میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان مقاصد کے ڈھا
سانچے تیار کر لیے جائیں اور جب تک کوئی احساس، کوئی تصور ا
سانچے میں ڈھل کر نہ نکلے، بے معنی ٹھہرے۔ میں انسان سے خوا
دیکھنے کی آزادی چھیننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی فنکار تنہائی
روتا ہے یا دشت ناپیدا کنار میں قافلے سے کٹ جانے ہی میں اپنی عافیت
سمجھتا ہے تو اسے یہ آزادی بھی حاصل رہنی چاہیے۔ سوال صرف یہ ہے
خواب دیکھنے یا گریۂ تنہائی یا شعوری گمراہی کے عقب میں کونسا جذبہ کا
ہے۔ یہ جذبہ اس امر کا اظہار ہے کہ فنکار نے حسن و خوبی کے جو معیار مقرر
تھے وہ عام نہیں ہو رہے ہیں اور عام ہو رہے ہیں مگر ان کی رفتار
سست ہے، تو اسے رونے دیجئے، اس لئے کہ ماحول سے بے
پیدا ہونے والے انھی آنسوؤں نے انسان کو غاروں سے نکال کر ا
سے اتار کر شہروں میں بسایا ہے۔ میرا مطالبہ تو صرف یہ ہے کہ
ادیب چاہے کچھ بھی کہیں مگر ان کے اس اظہار کے عقب میں جو جذبہ
ہو وہ ادارۂ فکر و فن کے انھی مقاصد کی پیداوار ہو۔

میں ادارۂ فکر و فن کے منشور کی ایک شق "علاقائی ادب و ثقافت"
کے فروغ کے بارے میں بطور خاص کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بد
سے ہمارے ملک میں تنگ نظروں کا ایک ایسا محدود مگر غضب ناک
والا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو علاقائی زبانوں، علاقائی ثقافت اور علا
ادب کو اجتماعی نقطۂ نظر کے قطعی منافی سمجھتا ہے اور جو لوگ
علاقائی خصوصیات کا ذکر محض ضمناً بھی کر بیٹھتے ہیں انھیں
پسند، ملک دشمن اور غدار تک قرار دینے سے ادھر رکھتا ہی نہیں
جو کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی تاریخ ارتقا کا عنوان ہوتی ہے م

بنتی جارہی ہے اور اگر چندے یہی حالت رہی تو حسن و خیر اور ادب د
ری کو نظریہ پاکستان کے تحت ایک جرم قرار دینے کے مطالبے
گے۔ ثقافت و فن کے مخالفین یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں
یہ سوچنے کے اہل ہی نہیں ہیں کہ اگر ان کی مطلوبہ پابندیاں ملک
ہی جائیں تو ہم مستقبل کو ایسی نسلیں دینے کے مرتکب ہوں گے
ارث کے لحاظ سے ابتدائی انسانوں سے صرف اس حد تک مختلف
یہ کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی۔ جب انسان کے دل و دماغ میں سے
ذوق کے نقوش کو رگڑ رگڑ کر دھو دیا جائے تو باقی ایک مشین
ی جس کے سامنے غالب یا اقبال کا شعر بھی پڑھا جائے تو یہ شعر
ی طرح ٹن سے بجکر واپس پڑھنے والے کے پاس آگرے گا۔ ہمیں
ن اور تہذیب و ثقافت کو اس پستی پر اترنے سے یقیناً روکنا
ہاں فنون لطیفہ کا ہر مظہر لذت محض بن کر رہ جاتا ہے اور جہاں
ن بے تہذیبی، بد اخلاقی، عیاشی اور لفنگے پن کی طرف راغب ہوتا
ساتھ ہی ثقافت اور فن کو محض اس لئے گردن زدنی قرار دے
بعض عناصر انھیں بطور عیاشی استعمال کر رہے ہیں اسی طرح ہے
ہے جیسے علامہ اقبال کی شاعری پر محض اس لئے پابندی عائد
جائے کہ جرکین نے بھی شاعری ہی میں اپنی گندی ذہنیت کا
لیا ہے۔

ہوہری قوت ہیروشیما کی آبادی کو بھون بھی سکتی ہے اور صحراؤں
رزوں میں بھی بدل سکتی ہے۔ مگر ہیروشیما میں اس کی تباہ کاریوں کی وجہ
وہری قوت کی مذمت بے معنی ہے۔ مذمت کے اصل مستحق اس
کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ جو لوگ ثقافت
چھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انسان نے
بل میں جو اچھی، حسین اور زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے والی
تخلیق کی ہیں انہی کی عملی ہیئت ثقافت کہلاتی ہے۔ اور اس ثقافت
ازنیا انسان کے پورے ماضی اور اس کی ذہانت کو گالی دینا ہے
اور پھر علاقائی ثقافت تو ان کے نزدیک ہمہ گیر مذمت کی
ستحق ہے جو اپنے آپ کو حب وطن کے اجارہ دار سمجھتے ہیں اور جو ہر اس
ساکی اپنے ملک سے وفاداری کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں جو ان

سے ذاتی نقطۂ نظر کی کسی بھی شق کا مخالف ہے۔ اس تنگ دلی اور کم
ظرفی کا مظاہرہ آئے دن ہوتا رہتا ہے اور علم و فن کے ان اداروں کو
اس سے قطعی بددل نہیں ہونا چاہیئے جنہوں نے ثقافتی ترقی اور نکھار
کو اپنی تنظیم کا مقصد قرار دے رکھا ہے اگر کوئی شخص علاقائی زبان،
علاقائی ادب اور علاقائی ثقافت کا نام لیتا ہے تو اس کا یقیناً یہ مطلب
نہیں ہے کہ وہ قومی زبان کا دشمن ہے یا وہ ملکی ادب میں اپنی ڈھائی
اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرنا چاہتا ہے، یا اس کا یہ مطالبہ ہے کہ میرے
علاقے کی ثقافت منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ اس لئے میرا علاقہ سارے
ملک سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ملک علاقوں سے اور قومیں گروہوں سے بنتی
ہیں اور ان علاقوں کا اجتماع اور ان گروہوں کا اتحاد ان وحدتوں کی تخلیق
کرتا ہے جو ہم سب کو عزیز ہیں۔ انسانی جسم ہی کو لے لیجئے۔ انسانی چہرے
پر آنکھیں کتنی خوبصورت لگتی ہیں لیکن اگر انسان کے تمام جسم پر
آنکھیں ہی آنکھیں ہوں تو کیا یہ مارے خوف کے غش کھا جانے کا منظر
نہیں ہے؛ انسانی جسم میں ناک، منہ، آنکھوں، کانوں، ہاتھوں،
اور پیروں کے اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے منصب ہیں۔ ان سب کے
مجموعے کو انسانی جسم کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ملتان کے لوگ ملتانی
زبان اور ملتانی ثقافت کے تحفظ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا یہ مقصد نہیں
ہوتا کہ پوٹھوہاری زبان اور ثقافت کی گردن مار دو یا مکرانی زبان و ثقافت
کو غیر قانونی قرار دے ڈالو۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تمام علاقائی
زبانوں، ان کے ادب اور ان کی ثقافت کی حفاظت کرو اور انہیں بڑھاؤ
تاکہ ان سب کے اجتماع سے ملکی زبان، ملکی ادب اور ملکی ثقافت صورت
پذیر ہو اور یہ ایک ایسی ثقافت ہو جس کے ترتیب میں اس کا حسن
بھی ہو اور اس کی وحدت بھی۔ آخر ملتان کا رہنے والا خواجہ فرید کی
کافیوں کے اس پس منظر اور اس مواد کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے جس
میں وہ سانس لیتا ہے اور جو اس کے لہو میں رچا ہوا ہے اور علاقائی
ماحول کی عکاسی بھی تو دنیا بھر کی زبانوں میں ایسے ایسے شہ پارے لکھے
گئے ہیں کہ ادب کا نقاد سوچنے لگتا ہے کہ اگر اس مصنف کا اپنے ملک کے
ایک خاص علاقے کی ثقافت سے اتنا گہرا رشتہ نہ ہوتا تو انسانیت کتنے
بڑے فن پارے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی۔

البتہ میں سرزمینِ ملتان کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے اور ان کے توسط سے سارے پاکستان کے مختلف علاقوں کے آرٹسٹوں سے عرض کرونگا کہ آپ کے علاقے کی مٹی کی باس اس کی فضاؤں کا رنگ، اس کے انسانوں کے رسم و رواج، اور پورے علاقائی ادب کی گونج موجود نہ ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر آپ اردو غزل کو فارسی میں منتقل کرنا چاہیں تو آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ ہماری غزل میں مقامی رنگ نہ ہونے کے برابر ہے اور ترجمے میں سب سے بڑی مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں شاعر یا ادیب اس ملک کا باشندہ بن کر بول رہا ہوتا ہے، جہاں کا وہ رہنے والا ہے جو حضرات علاقائی ادب و ثقافت کا نام سن کر ہی بدک اٹھتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا ادب صرف اس وقت پاکستانی بنے گا جب اس میں علاقائی ادب سے استفادے کی قوت پیدا ہوگی اور جب وہ علاقائی ثقافتوں کو ملکی اور آفاقی پس منظر میں اپنائے گا۔

میری ان مختصر اور منتشر قسم کی معروضات کے پیش نظر اناؤ فکر و فن نے بہت اہم اور بنیادی فرائض اپنے ذمہ لئے ہیں، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے ان فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملتان کا یہ ادارہ نہ صرف علاقائی بلکہ ملکی ادب و ثقافت کی صورت پذیری میں ایک اساسی کردار ادا کر رہا ہے اور اسی لئے وہ سرزمین ملتان کے علاوہ ملک کے ان تمام افراد اور اداروں کی طرف سے بھرپور ہمت افزائی کا مستحق ہے جو جانتے ہیں کہ قومیں ادب، شعر فن اور ثقافت کے بغیر ایسے خاکے بن کر رہ جاتی ہیں جن میں مصور رنگ بھرنا بھول گیا ہو۔

خواجہ فرید
ریاض انور

روہی جکڑی سانوٹی

گھر آئی ساون کی بدریا سانول موڑ مہاراں
بادل گرجے بجلی چمکے رِم جھم برسے باراں
تیز ہوا اور سانورے بادل گیت خوشی کے گائیں
پیار کی پیاسی کلیاں کھل کے سارا جگ مہکائیں
رنگ میں ڈوبی بدلی سے ٹپکیں بوندیں متواری
تجھ بن لیکن کاہے لاگے ساون کی رُت پیاری
کوئل کی کوکو پر دھڑکے من برہا کا مارا
تو نے موری بات نہ پوچھی تجھ کو لاکھ پکارا
سانجھ سویرے یہ دکھیاری دکھیاں جل برسائیں
مجھ کو روتا دیکھ کے سکھیاں چنری میں مسکائیں
تیری چاہ میں یارِ پنل میں پل پل نیر بہاؤں
سوتے سوتے جاگ اٹھوں اور رو رو کے سو جاؤں
پورب کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور مست پون لہرائے
تیری راہ تکوں میں ہردم لیکن تو نہ آئے

یاور عباس

صبا چمن سے جو بیگانہ وار گذری ہے
خزاں سے بڑھ کے کڑی یہ بہار گذری ہے
ستم تو یہ ہے کہ یہ وقت آج آ ہی گیا
کہ میری بات تمہیں ناگوار گذری ہے
ہزار سایۂ تسکین و انبساط لئے
رہ خیال سے دیوار یار گذری ہے
ہزار عجز لئے لاکھ انکسار لئے
مری نگاہ مزاجوں پہ بار گذری ہے
نظر نظر کے تقاضے جدا جدا ہیں مگر
بہار دے کے فریب بہار گذری ہے
کچھ اور ہوگا جسے روز حشر کہتے ہیں
مگر۔ جو رات۔ دل بیقرار۔ گذری ہے
وہ مختصر تھی لیکن ایک عمر ہے وہ
جو زیر سایۂ دیوار یار گذری ہے
وہ ایک حالت پر اضطراب موت نہ ہو
اُمید و بیم میں جو بار بار گذری ہے
گلوں کے لب کا تبسم کسے گراں گذرا
کلی کی کم سخنی کس کو بار گذری ہے
ترا خیال تھا شاید کہ میرا حسن و شعور
بہت قریب سے ہو کر بہار گذری ہے
یہی ہے یا در بے دین عشق و سجدا گذار
ندائے فہم جسے ناگوار گذری ہے

شفقت کاظمی

میں ان کو وہ مجھکو یاد آتے
یوں پیار کا سلسلہ بڑھاتے
فرق ان کے خلوص میں نہ آتا
ہم آپ اگر بدل نہ جاتے
آواز تو دو کہاں ہو یارو
اک عمر ہوئی تمھیں بلاتے
ہم سے جو نہ ان کو ربط ہوتا
ہر روز وہ خواب میں نہ آتے
دنیا ہی کے ہو گئے ہم آخر
دنیا کے فریب کھاتے کھاتے
ہوتا کہیں اور اگر ٹھکانہ
ہم تیری گلی سے اُٹھ نہ جاتے!
شفقت انھیں میری بیکسی کا
آئے گا خیال آتے آتے

ذکاء الدین شایاں

○

جب چھڑ گئی ہے اُس نگہِ لطف ہی کی بات
کچھ دیر بھول جاؤ غمِ زندگی کی بات

اے اہلِ درد! اپنے دلوں کو سنبھالنا
آتی ہے پھر ہمارے لبوں پر کسی کی بات

ہم نے ہی دل پہ بارِ غمِ دو جہاں لئے
ہم ہی سمجھ سکے تری نازک لبی کی بات

ہیں کب سے منتظر وہ ترے لب، کہ پھر کہیں
آزردگانِ عشق سے اک سرخوشی کی بات

خونِ بہار ہوگا، تو کچھ خونِ آرزو
پھیلے گی رنگ بن کے تری سادگی کی بات

بس اپنے دل کو دیکھ کے خاموش ہوگئے
ہم کہہ سکے نہ کچھ بھی تری بے رُخی کی بات

کیا تھا ترے تبسمِ سادہ کا اک پیام!
رنگین ہوگئی ہے مری خامشی کی بات

محبوب خزاں

○

ہم آپ قیامت سے گذر کیوں نہیں جا
جینے کی شکایت ہے تو مر کیوں نہیں جا
کتراتے ہیں، بل کھاتے ہیں، گھبراتے ہیں کیوں لو
سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جا
آنکھوں میں چمک ہے تو نظر کیوں نہیں آ
پلکوں پہ گہر ہیں تو بکھر کیوں نہیں جا
اخبار میں روزانہ وہی شور ہے یع
اپنے سے یہ حالات سنور کیوں نہیں جا
یہ بات ابھی مجھکو بھی معلوم نہیں
پتھر اِدھر آتے ہیں اُدھر کیوں نہیں جا
تیری ہی طرح اب یہ ترے ہجر کے دن
جاتے نظر آتے ہیں مگر کیوں نہیں جا
اب یاد کبھی آئے تو آئینے سے پوچھو
محبوبؔ خزاں شام کو گھر کیوں نہیں جاتے

مبین الحق صدیقی مبینؔ
(اسپیکر مغربی پاکستان اسمبلی)

ہم ذوقِ نظر کو بھول چکے اے حسن کے بُستاں یاد نہ کر
پروانے جلے اور خاک ہوئے اے شمعِ شبستاں یاد نہ کر
اب پیار کے لمحے بھول بھی جا وہ بزمِ نگاراں یاد نہ کر
اک خوابِ پریشاں دیکھا تھا، وہ خوابِ پریشاں یاد نہ کر
سینے سے لگا اندھیاروں کو اور چھوڑ بھی دے مہ پاروں کو
اے صبحِ درخشاں! یاد نہ آ، اے شمعِ فروزاں یاد نہ کر
اب موسمِ گل بھی یاد نہیں، اور جشنِ طرب بھی بھول گئے
اے روحِ گلستاں! یاد نہ آ، اے جانِ بہاراں یاد نہ کر
اب درد ہی میں اک لذت ہے، اب ذوقِ فنا میں راحت ہے
اے عیسئ دوراں! یاد نہ آ، اے داورِ درماں یاد نہ کر
اب ان کی جفائیں یاد نہ کر، اب اپنی وفائیں بھول بھی جا
ہم عشق کی دنیا دیکھ چکے، اب اے غمِ جاناں یاد نہ کر
منزل سے پلٹ کر آ بھی چکے وہ چھوڑ کے ہم کو جا بھی چکے
اے رہروِ اُلفت! یاد نہ آ، اے منزلِ جاناں یاد نہ کر
جو درد محبت ہم کو ملا، وہ غم کا مداوا بن بھی گیا
کچھ اور تڑپ کو بڑھنے دے، اب درد کا درماں یاد نہ کر
اس عشق میں سب کچھ پا بھی لیا، اس عشق میں سب کچھ کھو بھی دیا
ہم جیت گئے، یا ہار گئے اے گردشِ دوراں یاد نہ کر
ہم حُسن کی باتیں بھول گئے، اب عشق کی باتیں یاد نہیں
اے عشقِ زلیخا! یاد نہ آ، اے یوسفِ کنعاں یاد نہ کر
اب ذوقِ جنوں افسردہ ہے، اب پنجۂ وحشت لرزاں ہے
اے سیرِ گلستاں! یاد نہ آ، اے فصلِ بہاراں یاد نہ کر
بے مہر! تجھے پہچان لیا، انجامِ محبت جان لیا
اے تلخئ دوراں! یاد نہ آ، اے یارِ غزل خواں یاد نہ کر
ہر غم کو یہاں اپنا ہی لیا، اس دل کو مبیںؔ سمجھا ہی لیا
جو بیت چکی، سو بیت چکی اے عمرِ گریزاں یاد نہ کر

من موہن تلخ

○

آج تو شامِ غم کے سائے ایسے اُبھرتے آتے ہیں
دور کہیں جیسے اک ساتھ کئی دن ڈوبتے جاتے ہیں

یہ تو نہیں ہے یاد ہوئی تھی بات کب اس کے آنے کی
بس اتنا ہے یاد کہیں ہم اب آتے ہیں نہ جاتے ہیں

یوں تو بہت ہے یہ بھی تعلق دل کو، پھر بھی تو یہ جان
کتنے دن کٹ جاتے ہیں پھر ہم ہی ملنے آتے ہیں

ترکِ سخن کس بات پہ ہے تجھ سے اتنا یاد آئے تو
اٹھتے بیٹھتے سو سو باتیں ہم دل میں دہراتے ہیں

خیر ان کی تو بات سمجھ میں آتی ہے جو کھوئے گئے
جن کے لیے گم ہو جاتا ہے کوئی، وہ کیا پاتے ہیں

شاید یہ بھی وہم ہو دل کا، ہم پہلے سے اچھے ہیں
بیتے دنوں کے سانحے ورنہ اب کیوں ہم کو رلاتے ہیں

جانتے ہیں ان باتوں سے جاتی رہتی ہے راہ و رسم
جانے پھر کیا بات ہے، ہم تجھ سے کیا بات چھپاتے ہیں

ہم سے کسی کو کیا ہے تعلق ہم سے بہتر جانے کون
الٹی سیدھی باتوں سے کیا ہم کو لوگ بناتے ہیں

کس نے کتنا صبر کیا یہ کیا موضوعِ سخن ہے آج
اُن کی بات کرو یارو جو غم میں بات بناتے ہیں

کیسے کیسے کاٹ رہا ہے دن کوئی سب کھل جائے
ان کے جی سے کوئی پوچھے جو ملنے سے بھی جاتے ہیں

آج مری باتوں میں یوں درد اُمڈا آتا ہے، جیسے
یاد بھری آنکھوں میں آنسو رہ رہ کر بھر آتے ہیں

تجھ سے نہیں ملتے تو یقیں اپنے ہونے کا نہیں آتا
مل کر تجھ سے اپنے ہونے کا بھی رنج اٹھاتے ہیں

خود کو ابھی پایا ہی کہاں اور یہ عالم ہے تو باز آئے
چار قدم جس سمت بھی نکلیں، خود سے جا ٹکراتے ہیں

بھول رہا ہے تجھ کو دل یا جاگ رہا ہے تیرا درد
پہروں کھوئے کھوئے اچانک ہم جو چونک سے جاتے ہیں

جس کو سخن کرنا کہتے ہیں اس کو غزل کہتے ہیں تلخ
اتنی سی ہے بات نہ جانے لوگ کہاں رہ جاتے ہیں

محمد احسن فاروقی

کاغذ کی ناؤیں

یہ بات سب میں پہلے وصی کو سوجھی۔ وہ لائبریری سے برآمدے کی محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ لڑکیوں کے کامن روم کی دیکھ رہا تھا۔ کہیں سے ایک پتہ اڑتا آیا اور اس کے سر سے نالی میں گرا۔ اس کا دھیان نالی پر گیا جو چبوترے کے نیچے بہہ رہی میں بہنے لگا اور بہتا ہوا لڑکیوں کے کامن روم کی طرف چلا۔ آج کل کچھ زیادہ پانی بہایا جا رہا تھا کیونکہ کالج کے لانوں کی ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ پتہ کچھ ہی دیر میں کامن روم کے پہنچ گیا اور جالی پر ٹھیر گیا۔ اس کا چہرہ اکدم سے دمک اٹھا۔ اس کے کچھ ساتھی سامنے لان پر بیٹھے تھے۔ وہ اسی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"ابے کیا سوچ رہا ہے یہاں ہم بھی اک دید کا ارمان لئے" پرمود نے کہا۔

"مل گئی یار" وصی نے زور سے کہا۔

"ابے کیا مل گئی۔ ہمیں بھی بتا۔ یہاں تو آ۔ سرجو نے کہا۔

وصی برآمدے سے کود کر ان کے پاس پہونچا اور بولا" اسے عمدہ ترکیب۔ بس مار دیا"

"ارے بتا تو سہی کیا ترکیب ؟ شیام نے کہا۔

"تیرے لئے سب سے اچھی تو گھونچو ہے نا۔ جب وہ سامنے ہے تو پیر کا نپنے لگتے ہیں تیرے" وصی یہ کہتا ہوا بیٹھ گیا اور پھر کہنے دیکھو یہ نالی بہہ رہی ہے نا اور یہ وہاں تک بہہ کر جاتی ہے۔"

"کہاں تک" نرائن نے کہا۔

"اب وہی کامن روم تک جس پر تیری نگاہیں ہیں اور وہاں سے زمین کے اندر چلی جاتی حوض میں کو"

"تو اس سے تو نے کیا آئیڈیا نکالا" پرمود بولا۔

"ابے خط بھیجنے کی ترکیب"

"مگر وہ بہتا ہوا زمین کے نیچے چلا جائے گا اور حوض میں ابھرے ابھرے اور...... " سرجو بولا۔

"ابے تو ہے الو جہاں نالی حوض میں جاتی ہے وہاں جالی لگی ہے"

"مگر جالی پر کاغذ پڑا ہوا کوئی کیوں اٹھائے گا"

"کاغذ واغذ نہیں۔ نہ لفافہ۔ خوبصورت سے ناؤ بنا کر۔ عمدہ صاف ٹائپ رائٹنگ پیپر پر ناؤ کے اوپر نام لکھا ہوا۔ پروین۔ سونا۔ پشپا۔ پریما"

"مگر پانی میں بھیگ کے حرف مٹ نہ جائیں گے" سرجو نے کہا۔

"ہم کاپنگ پنسل سے لکھیں گے۔ آخر کاپنگ پنسل کس دن کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کے بنانے والے کو الہام سے معلوم ہو گیا تھا کہ وصی الحسن صاحب بہادر مس پروین سرور کو خط کسی نالی کے ذریعہ روانہ کریں گے تو ایسی پنسل کی ضرورت ہوگی جس کا لکھا ہوا پانی لگنے سے چمک اٹھے اور اس لئے اس نے کاپنگ پنسل بنا ڈالی اور پھر وصی صاحب موصوف کی قیادت میں مسٹر پرمود سکسینہ۔ مسٹر بابو شیام منوہر لال اور پنڈت سرجو پرشاد اور اس کالج کے تمام طلبہ جو عشق کرنے کے اہل ہیں......

"اپنی فصاحت اور بلاغت جانے دے۔ کام فوراً" شروع

ہو جانا چاہیئے" پرمود نے کہا اور اُٹھ کر اسٹیشنری کی طرف کاغذ کا پیگ پنسل لینے گیا۔ وہ ایک گڈی کاغذوں کی اور ایک بنی ہوئی پنسل لے کر واپس آیا۔ چاروں نے خط لکھے اور ناؤیں بنائیں۔

"ناؤں پہ نام بڑے موٹے بلاک لیٹرز میں لکھے جائیں تاکہ وہ باہر نکلتے ہی اپنا نام لکھا دیکھیں نہیں تو ناؤیں دیکھ کر چلی جائیں گی" وصی نے کہا۔

"اور اپنا نام دیکھ کر بھی نہ اُٹھائیں" شیام بولا۔

"ابے تو ہے اُلو۔ اپنا نام دیکھے اور نہ اُٹھائے تو لڑکی نہیں تو کیا جانے گدھا کہیں کا"

"ٹھیک کہتے ہو یار میں نے ایک لفافہ ایک دفعہ راستے میں پھینکا تھا اس پر نام پشپا کا نام صاف لکھا تھا۔ وہ پاس گزری جھجکی مگر اُٹھا ہی لیا حالانکہ بغیر پڑھے ہوئے بیچ ناچ لکڑے ٹکڑے کر دیا" سرجو بولا۔

"ہاں اٹھانا ضروری ہے۔ نہ اٹھائے تو کوئی اور اُٹھائے گا اور پھر کیا کیا سوچے گا اور کیسے کیسے بدنام نہیں کرے گا اٹھانا پڑتا ہے یہ ایک دفعہ میں نے بھابی سے ایک اُن کی سہیلی کو کہتے سُنا...... خیر نام خوب روشن ناؤں کے دونوں طرف لکھے جائیں گے" وصی نے کہکر اپنی ناؤ پر نام لکھنا شروع کیا۔

اوروں نے بھی یہی کیا اور یکے بعد دیگرے ناؤں کی نالی میں چھوڑا ناؤیں تیزی سے بہتی ہوئی گئیں اور نالی کی جالی پر جا کر رک گئیں۔ چاروں انتظار کرتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی اسی رُخ سے آتی دکھائی دی جدھر جاتی تھی اور زینے چڑھ کر کمرے کے اندر گئی۔ کچھ ہی وقفہ کے بعد کئی اور لڑکیاں کمرے کے باہر نکلیں اور جال اور جالی کی طرف دیکھ کر پھر اندر چلی گئیں۔

"ناؤیں دیکھ لی گئیں شیوو رئیلی" وصی نے کہا "اب آگے دیکھو کیا ہوتا ہے"

موہنا اور پشپا کمرے سے باہر آئیں اور ناؤیں اُٹھا لے گئیں۔

"ڈرامے کا ایک ایکٹ ختم" پرمود بولا "مگر یار معلوم کرنا چاہیئے کہ کیا باتیں کرتی ہیں"

"یہ کیسے ممکن ہے" شیام نے کہا۔

"کل اس پر غور کیا جائے گا" وصی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"کالج ختم ہوا۔ پریا۔ موہنا اور پشپا کمرے سے باہر آئیں اور اپنی اپنی طرف چلی گئیں۔ پروین کا پتہ نہ تھا۔ مگر اس کی ناؤ بھی جالی پر نہیں تھی۔

کئی دن تک یہ ہوتا رہا۔ سب نے اطمینان ظاہر کیا کہ خط تو پہونچ رہے ہیں۔

"مگر یہ کچھ نہیں ہوا" وصی نے "دن دے ٹریفک اور یہ ہمارا تو شاید دن دے بھی نہیں"

"نہیں تیرا خط بھی پہونچ ضرور گیا ہے وہ آج کل کچھ بیمار ہے آ نہیں رہی ہے۔ مگر تیری ناؤ اٹھا لینے کے معنی یہی ہیں کہ بیدے جا کے اسے دیتی ہوں گی ضرور"

وصی نے سوچ کر کہا "ٹھیک کہتا ہے تو"

"چاروں خاموش رہے"

اب اگر نالی اُلٹی چلنے لگے تو شاید ہمارے نام کی بھی ناؤیں آئیں" سرجو نے کہا۔

"تجھے اُلٹی گنگا ہی بہانے کی سوجھتی ہے" پرمود بولا۔

وصی فکر میں ڈوبا رہا۔ اس کے دوست جو کچھ اُن کے جی میں آیا بکتے رہے۔ آخر کو وہ بولا "اس وقت دو پرابلم ہیں۔ نمبر ایک یہ معلوم کیا جائے کہ ہمارے خطوں کا ان پر کیا اثر ہوا"

شیام بولا "یہ میں معلوم کر سکتا ہوں۔ میری موسی کی لڑکی نرملا ہے ہیں اسی سے۔

"نہیں تو گدھا ہے۔ پوچھنے جائیگا اپنی موسی کے گھر اور سب معاملہ بگاڑ آئے گا" وصی نے کہا۔

"دوسرا پرابلم بتاؤ" سرجو نے پوچھا۔

دوسرا پرابلم یہ ہے آخر خط بھیجے جاتے ہیں اسی لئے کہ جواب ملیں تو اب جواب ملنا چاہیئے"

ہاں جی تو یہی چاہتا ہے مگر کیسے ہو" پرمود نے کہا۔

پھر بڑے دن کی چھٹیاں آگئیں اور ظاہر ہے کہ ناؤیں چلنا بند ہوئیں۔ مگر شیام اپنی موسی کے گھر جاتا رہا۔ اس گدھے سے نہ رہا گیا اور ایک دن نرملا سے پوچھ بیٹھا۔ "نیرا۔ تمھارے کامن روم میں کاغذ کی ناؤں کا کیا قصہ چل رہا ہے؟"

"اچھا! آئین تمھیں کیسے معلوم۔ اچھا یوں چھپے رستم ان چار میں تم بھی ہو"

"نہیں۔ مجھ سے کیا مطلب۔ خیر یہ بتا کہ تم لوگ خوب ہنس ہنس کے پڑھتی ہوگی اور کیا ہونا ہے"

نرملا نے شیام کو بہت غور سے دیکھا اور آنکھیں مٹکائیں اور بولی "اب مجھے یقین آگیا سونا کو تم ہی خط بھیجتے ہو۔ اس نے مجھے دکھایا بالکل تمہارا ہینڈ رائٹنگ ہیں کیا پہچانتی نہیں۔"

"خیر یہ بتاؤ کہ تمھارے کامن روم میں یہ ناؤں والے خط کیا ہنگامہ برپا کر رہے ہیں"

"اچھا تم بتاؤ کہ یہ خط لکھنے والے کون ہیں تو میں بھی بتاؤں کہ کیا ہوتا ہے کامن روم میں"

"میں کیا جانوں نیرا"

"سنو نا۔ ایک تو تم ہو سونا کو خط بھیجتے ہو مگر یہ سب فضول ہے۔ سونا کی ماں تم سے وواہ کر دیں گی۔ مامی سے بھی کہہ چکی ہیں اور موسی سے بھی۔ سیدھے سادھے آدمی ہو تم کیوں ان ناؤ والوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔"

"یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو نیرا"

ٹھیرو۔ سنو۔ اور دوسرے میاں وصی ہیں جینس اور ان کے خط آتے ہیں پروین کے نام وہ بھی جینیئس ہے۔ اتفاق سے جس دن سے خط آنے لگے وہ غائب ہے۔ اس کے خط بالکل ویسے کے ویسے لپٹا جمع کر رہی ہے اب چھٹی کے بعد وہ آئے گی تو اسے سب اک دم سے دیدیے جائیں گے۔ تو دو تو مجھے معلوم ہو گئے۔ اب باقی رہے دو تو ان کے نام تم بتا دو تو میں تمھیں بتاؤں کہ کیا کیا مزے آتے ہیں ان ناؤں کی کھولنے کے بعد"

"اب تمھیں دو کے نام معلوم ہیں تو باقی کے بھی معلوم ہوں گے۔ وصی کہتا ہے کہ یہ لڑکیاں سب اپنے چاہنے والوں کو جانتی ہیں۔ نام پتہ کریکٹر سب کچھ جانتی ہیں۔ آخر پریا اور لپٹا نے بھی کچھ نہ کچھ گیس کیا ہوگا۔

"پریا کے سرجو ہیں اور لپٹا کے پرمود۔ مگر یہ شبہ ہے کہ خط وہی بھیج رہے ہیں یا کوئی اور"

"لو کو تمھیں تو سب لوگوں کے نام معلوم ہیں۔ اب مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ لے اب بتاؤ کہ کیا ہوتا ہے"

سنو۔ مارجوری تو آتے ہی کہتی ہے۔ انی ہیپر بوٹ اور خالی گھنٹے ہیں کہتی ہے۔ ناؤ لو ڈیئر میل اور سب ہنستی ہیں۔ پریا اور اور لپٹا میں جھگڑا ہوتا ہے۔ اری یہ میرا ہے۔ اری یہ تیرا ہے۔ پھر ہر ایک اپنے اپنے خط پڑھتی ہے۔ سونا بیچاری بھولی بھالی لڑکی ہے۔ وہ بہت شرماتی ہے اس کا خط میں پڑھتی ہوں۔ ہر فقرے پہ ہنسی ہوتی۔ مگر تم لوگ سب ایک ہی طرح کے خط لکھتے ہو۔ بر مارجوری سچ کہتی کہ سب محبت نامے ایک ہی سے ہوتے ہیں اور پھر برنارڈ شا کے کینڈڈ ریں مارچ بنکس کا حوالہ دیتی ہے کہ وہ کہتا نہیں ہے تمھیں بھی یاد ہوگا کہ لو لیٹرز لکھنے کی بھی ایک مشین بنائی جا سکتی ہے کیونکہ سب لیٹرز ایک ہی سے ہوتے ہیں۔"

"اور تو تم لوگوں کے لئے یہ سب مذاق سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"اور مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہارا لکھنا فضول حماقت تمہاری سب بات طے ہے۔ اس سال تم دونوں پاس ہو جاؤ گے اور وواہ ہو جائے گا۔ پریا اور لپٹا کے اونچے خیالات ہیں وہ کسی بڑے آدمی کو ٹیک ہک کریں گی۔

"یہ ٹھیک کیا"

"ٹیک ہک۔ مچھلی پکڑنے کا ہک ہوتا نہیں ہے۔"

"اچھا تو تم لوگوں میں یہ ٹرم چلتا ہے ہُک کریں گی خوب ہم مچھلیاں ہیں شکار ہیں۔ تم لوگ شادی کی ماڈرن گرلز ہو رہی ہو۔ آدمی کا پیچھا کرنے والی وصی سچ کہتا ہے۔

"ہاں وصی کی تو رہ ہی گئی۔ وصی کو ہم سب جانتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پروین آ کر کیا کرتی ہے۔ بڑی مغرور بڑی مچھلی بڑی بنی ہوئی لڑکی ہے۔ دیکھیں وصی میاں کا کیا بناتی ہے"

غرض شیام نے اس قسم کے تمام معلومات حاصل کر لئے اور کالج

کھلتے ہی جب اپنے تین دوستوں کے ساتھ مل کر لان پر بیٹھا تو جھوٹ اور سچ ملا کر یوں بیان کرنے لگا "لے نرملا کو ہم سب کے نام معلوم ہیں" "تو تجھ سے منہ ہی آگیا۔ تو نے اس سے پوچھ ہی ڈالا۔ گدھے کہیں کے" وصی نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا یار۔ اب میں موسی کے گھر تو جاتا نہیں جب جاؤں کہے اچھا یہ ناویں چلائی جاتی ہیں مجھے سب معلوم ہے۔ میں ٹال جاتا۔ ایک دن کہنے لگی مجھے سب معلوم ہے کون کسے بھیجتا ہے اور تمہارے سونا کو خط میں نے پہچان لئے۔ تم سمجھتے ہو بالکل تمہارا ہینڈ رائیٹنگ ہے۔

" اور ہمارے خطوں کے بابت کچھ کہا" سرجو اور پرمود ایک ساتھ پوچھنے لگے۔

" ہاں ہاں بولی کہ پریا اور پشپا تو دیوانی ہوگئی ہیں ناؤوں کو رہی کرتی ہیں رکھ کرے جاتی ہیں۔ مارجوری ان کا مذاق بناتی ہے اور پھر وہ خود بھی ہنسنے لگی"

"لے بھائی" وصی بولا" تم سب کامیاب۔ شیو رشاٹ۔ رہے ہم۔ یہی ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے لیڈر ہی مارا جاتا ہے۔ دیکھو نا گاندھی جی نے انگریز کو نکالا مگر ان بیچارے کو کیا ملا چھ ردا لور کی گولیاں پیٹ پر" اور وہ اپنا پیٹ پکڑ کر بولا "یار مجھے جب خیال آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میرے گولیاں لگیں نا تھو رام گاڈسے کی دہی۔ ہم ہمیشہ قلم ہوئے جو جھکے سجو دنیاز میں"۔

"مگر نرملا کہتی کہ ہم سب لڑکیوں کی رائے ہے کہ تم اور پروین کو بھگوان نے ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے دونوں جینئس ہو۔

"ہاں بھگوان تو ایسے ہی بناتے رہتے ہیں مگر وہ بگاڑ دیتے ہیں اور آدور البتی شیطان وہ بنا رہنے دیں جب کی سند ہے۔ خیر ہم کو خوشی ہے تم سب کے کام بن گئے ہمارے آئیڈیا سے

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

شیام کے سوا اور سب ناویں بنا کر لائے تھے۔ تینوں ناویں نالی میں چھوڑ دی گئیں۔

پروین اس دن آگئی تھی۔ اس کے بال ہمیشہ سے زیادہ بکھرے ہوئے تھے۔ اور تیوری پر بل بڑے زور سے پڑے ہوئے تھے۔

"یار بہت غصہ معلوم ہوتی ہے" پرمود نے کہا۔

" ایسے ہی تو ادا ہے۔ اسی پر تو ہم مرتے ہیں" وصی نے کہا۔

وصی اس کے پاس سے گزرا اور السلام علیکم کہا اور اس نے آج کچھ زیادہ منہ پھیر کر وعلیکم السلام کہا۔ وصی کو پتہ نہ چل سکا کہ خط اسے ملے یا نہیں۔

دوسرے دن پرنسپل صاحب نے وصی کو بلوا بھیجا۔ وصی مسکراتا ہوا جا کر ان کے سامنے کھڑا ہوا

پرنسپل صاحب نے اپنے ڈرائر سے بھیگے ہوئے کاغذوں کا جو سوکھ گئے تھے۔ ایک پلندا نکالا اور وصی کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا

" یہ سب کاغذ کی ناویں تم نے چلائی تھیں۔

وصی خاموش رہا۔ پرنسپل مسکرا کر بولے" یہ تمہارا مائنڈس تو تو اچھی سوجھی۔ خوب تم کچھ کر کے رہو گے آگے چل کر"

وصی نے کاغذوں کے پلندے سے نظر اٹھا کر پرنسپل صاحب کو دیکھا وہ ہنس کر بولے" یہ سب ناویں چل چکیں۔ کاغذ کی ناویں تھیں میں نے لڑکیوں کا کامن روم بدل دیا ہے۔ اس ونگ میں کر دیا ہے۔ نالی وہاں سے نکلتی ہے۔ ادھر کو نہیں بہتی۔

" بہت شکریہ حضور" وصی نے بڑے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"شکریہ ؟

" جی حضور۔ آپ نے اب جوابی ناؤوں کے چلنے کا انتظام فرما دیا اس کا شکریہ "

پرنسپل خوب ہنسے اور بولے" اچھا اگر جوابی ناویں چلیں تو پھر دوسرا انتظام کیا جائے گا۔

قمر عثمانی

نغمے کی موت

صادقین کی تصاویر دیکھ کر بی آر بی کونسل سے واپس آ رہا
رات کے آٹھ بجے گیلری بند ہو گئی تھی۔ اس وقت اندازاً دس
بجے ہوں گے۔ خراماں خراماں چلتے ہوئے مختلف تصاویر کے نقوش
دماغ کے پردے پر ابھرتے اور مٹتے رہے۔ ان میں سے ایک تصویر
بے حد پسند آئی۔ ایک انتہائی بدصورت، چہرہ جیسے کسی بھوت پریت
کا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک جوان اور خوبصورت عورت
جیسے مصور نے نہایت فنکارانہ انداز سے بنایا تھا اس تصویر
علاوہ بھی صادقین کی بہت سی اچھی اچھی تصویریں نظر سے گزریں
ایک وقت میں کوئی ایک چیز ہی سب سے زیادہ پسند آتی ہے
وقت مجھے بھی صرف یہی ایک تصویر سب سے زیادہ پرکشش نظر آئی۔
خوبصورت — اور انتہائی بدصورت — جو کبھی بھلائی
نہ جا سکے۔

بے خیالی میں چلتے چلتے میں ۳۹ نمبر بس اسٹاپ کو چھوڑ کر
بس اسٹاپ پر آ پہونچا۔ ان دونوں ہی روٹ سے ہم گھر پہونچ سکتے
لیکن ۲۰ نمبر ذرا لمبا روٹ ہے۔ اور اس وقت تصویروں کی محویت
روٹ ہی کی متقاضی تھی۔ اس کے علاوہ پہلے اسٹاپ پر بھیڑ
بھی زیادہ تھی۔

کے آر ٹی سی کی نئی اور خوبصورت بس میں سوار ہونا اور پھر
کی سیٹ پر بیٹھ کر خیالات و تصورات میں کھو جانا یوں بھی دل خوش
کن ہے۔ بس میں سوار ہو کر معلوم ہوا کہ یہ آخری ٹرپ ہے۔ کیونکہ
مسافروں کی مجموعی تعداد ۱۳۔۱۴ سے زیادہ نہ تھی۔ سوار ہونے اور
اترنے کا سلسلہ ختم کر کے ہم گرو مندر پہونچے تو صرف ۶ پسنجر باقی رہ گئے تھے
بس کی آخری سیٹ سے اگلی سیٹ پر ایک کونے میں بیٹھا،
میں یہ سوچ رہا تھا کہ صادقین اپنی نوے فیصدی تصویروں میں زیادہ
تر بدصورت تصاویر ہی کیوں بناتا ہے؛ اس کی ذہنی افتاد ایسی
کیوں ہے؟ "گل جی" اور "صادقین" کے انداز میں کیا فرق ہے؛ اور
صادقین اور حمید الرحمٰن میں کہاں کہاں اختلاف ہے؛ وجہ جو کچھ بھی
ہو مگر صادقین ایک حسین و خوبصورت تصویر کے ساتھ ہی انتہائی کریہہ
صورت کیوں پیش کرتا ہے؛ اور پھر ان سب تصویروں میں جو گیلری
میں موجود تھیں مجھے صرف یہی تصویر کیوں پسند آئی؛

بس کی آخری سیٹ پر میرے پیچھے ہی تین لڑکے بیٹھے تھے
جو شاید کالج کے اسٹوڈنٹ تھے۔ وضع قطع سے ٹیڈی لائیز معلوم
ہو رہے تھے۔ شور و غل کے ساتھ ساتھ کالج کی حسین لڑکیوں کے تذکرے
اور گلو اور خشی کے ناچ پر تنقیدی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم
ہونے کو نہ آیا۔ . . . . .

بائیں طرف کن انکھیوں سے دیکھا جائے تو ان کی حرکات و
سکنات اور بات چیت کا انداز پوری طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ میں بھی ان
کی حرکتوں کو اس طرح کہ وہ محسوس نہ کر سکیں برابر دیکھ رہا تھا۔

تینوں لڑکوں میں سے دائیں طرف بیٹھا ہوا لڑکا خوبصورت اندا سے اپنے
ساتھیوں میں نسبتاً ہوشیار تھا۔ کسی خاص وقت میں بعض دفعہ کوئی چیز
دل کو یونہی بھا جاتی ہے۔ وہ لڑکا بھی مجھے اس وقت پرکشش محسوس ہوا۔
نہ تعارف —— نہ جان پہچان —— مگر پھر بھی دل اس کی طرف کھنچ رہا
تھا اس کا لباس بھی دوسرے دو لڑکوں کے مقابلے میں بہتر تھا، اور
یہ کچھ کم گو بھی واقع ہوا تھا۔ بال بھی خاص انداز سے بنائے تھے جسم
دبلا پتلا مگر جاذب نظر تھا۔ اس کے دوستوں کی طرح اس کو کسی
انداز سے بھی ٹیڈی بوائے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کو
ایک بار بھی نظر بھر کے نہ دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی تصویر میرے
دل پر نقش ہو گئی تھی۔ —— خوبصورت اور جاذب نظر لڑکا ——
بالکل صادقین کی خوبصورت تصویر کی طرح۔

پاک کالونی کو چھوڑ کر بس آگے بڑھی۔ اب مسافروں میں صرف
وہ تین لڑکے اور میں باقی رہ گئے تھے۔ کنڈکٹر ڈرائیور کے پاس بیٹھ کر
سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا۔ یہ روٹ جتنا لمبا ہے اتنی ہی زیادہ
مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ سگریٹ پینے اور ستانے کا موقع شاید
اس کو دن بھر میں اسی وقت میسر آسکا تھا۔ اس وقت نہ مسافروں
کی بھیڑ تھی نہ پولیس کا خوف۔

میں اس خوبصورت لڑکے کو کبھی نہیں بھول سکتا میں نے کن
آنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک تیز
دھار کے چاقو سے سیٹ کے گدے کی ربڑ کاٹنے میں مشغول تھا۔
دوسرے دو لڑکوں کی بلند آوازیں جو مسلسل بولے جا رہے تھے اس
حفاظت کر رہی تھیں۔ اس نے ربڑ کے تین بڑے بڑے ٹکڑے
کر ان کو اپنے پینٹ کی جیبوں میں بری طرح ٹھونس لیا۔

میں تنہا ہونے کے باعث ان کے خلاف کچھ نہ بول سکا۔

تینوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

سینٹرل کالج کا اسٹاپ آ گیا —— گاڑی روک کے۔

گاڑی روکنا جی ——

ان کی آوازوں پر ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور وہ
سیٹی بجاتے ہوئے بے فکری اور لاپروائی کے ساتھ اتر گئے
کنڈکٹر بدستور حساب کرنے میں مشغول تھا۔

وہ دونوں ٹیڈی بوائز اور وہ خوبصورت لڑکا تینوں
لگے جیسے انتہائی کریہہ صورت جانور نظروں سے دور ہو گئے
اب صادقین کی تصویر کا وہ بدصورت چہرہ پھر میری نظروں
سامنے تھا —— جیسے میں نے (Civic Sense)
سینس گیلری کے کسی ایک ہی فریم میں دونوں تصویریں دیکھی
ہوں —— خوبصورتی کے ساتھ بدصورتی —— حسن کے
بدنمائی ——

سلیم انور

تمبولا

جس طرح فرکی لانبی شاخیں وقت کے ساتھ ساتھ زمین کی سمت
تی ہیں بالکل اسی طرح بالی بھی اس کی طرف جھکتی گئی۔ وہ ایسا خوبصورت
کہ بالی جیسی لڑکی اس پر ریجھ جاتی۔ مگر دل ہی تو ہے۔ اس کا رنگ
قد میانہ تھا۔ شانے چوڑے اور سینہ کشادہ تھا۔ وہ ہر روز خاموشی
سرکل کے ہال میں داخل ہوتا اور ہمیشہ دائیں طرف دیوار کے نزدیک
پر بیٹھا کرتا تھا۔ رین بو سرکل ایک پارسی کا ذاتی ادارہ تھا
کے سیکڑوں ممبران تھے۔

شام کا دھندلکا پھیلتے ہی رین بو سرکل کا وسیع و عریض ہال تمبولہ
شوقین حضرات سے بھر جاتا۔ ہال میں ایک ہزار نشستوں کا انتظام
لوگ اس قدر تعداد میں آتے کہ منتظمین کو ایکسٹرا کرسیوں کا بندوبست
۔ ایک وقت تھا جب یہاں، تو بولتے تھے۔ ماہ دو ماہ بعد
جاتا مگر اس میں بھی معدودے چند لوگ شرکت کرتے۔ مگر جب
رکل میں ملازم ہوئی تھی رین بو سرکل کی کایا ہی پلٹ گئی تھی حقیقت
الی تھی بھی اتنی حسین کہ لوگ اسے آنکھوں میں جگہ دیتے۔ جس
یج سے کارڈبورڈ کے لمبوترے بکس میں گوٹیں ہلا ہلا کر بجاتی اور
انڈیلنے والی آواز میں نمبر اناؤنس کرتی تو لوگ گیم پیپر کے
نا بھول جاتے، اور اسے گھورتے رہتے۔ اس وقت ہال میں
شی ہوتی۔ لوگوں کے تیز تیز تنفس کی آواز کے درمیان بالی
از سنائی دیتی۔ اس خاموش فضا میں ایسا محسوس ہوتا جیسے
لوگ کسی قدیم کلدانی معبد خانے میں چلے آئے ہیں۔ جہاں سفید کپڑوں
میں لپٹی ہوئی بالی دیوی اشتر کی مانند لوگوں کے دل محبت کے نور سے
بھرتی رہتی ہے۔

کبھی کبھی ایک آدھ من چلا نمبرنگ کے دوران خواہ مخواہ "بس"
کا نعرہ لگا دیتا۔ تب گیم پیپرز چیک کرنے والا اس کے پاس پہنچ کر گیم
پیپر چیک کرتا اور جب اسے غلط پاتا تو بوگس کا اعلان کرتا۔ لوگ
"بوگی۔ بوگی" چلا کر ہال سر پر اٹھا لیتے اور بعض مرتبہ جب کسی کو انعام
ملتا تو بالی انعام کے اعلان کے ساتھ اسے مبارکباد دیتی اور انعام
یافتہ کا سینہ فخر و خوشی سے پھول جاتا۔ لیکن وہ سب سے عجیب و غریب
تھا۔ وہ خاموشی سے ہال میں داخل ہوتا، دائیں طرف دیوار کے سہارے
والی سیٹ پر بیٹھتا اور تمام وقت بڑے انہماک سے گیم پیپرز کے
خانے کاٹتا رہتا۔

ایک شام جب بالی کی آواز لوگوں کے کانوں میں شہد انڈیل
رہی تھی۔

اٹھی ایٹ . . . . . . جائنٹ اگیٹ
فائی . . . . . . پنجو۔ پنجو۔
ففٹی . . . . نیٹی جیٹی
سیونٹی سیون . . . . آل ان ہیون

تو بالی نے دیکھا وہ جلدی جلدی "یس" پیپر کے خانے کاٹ رہا تھا

پھر بالی نے ایک اور نمبر اناؤنس کیا تو اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر "یس" کی آواز لگائی۔ شاید اس کے پیپر کے تمام خانے کٹ چکے تھے۔ اور اب وہ اصولاً ایک ہزار کی رقم کا حقدار تھا۔ چیکر تیز تیز قدم رکھتا ہوا اس کے پاس پہونچا اور پیپر چیک کرنے لگا۔ ایٹی ایٹ۔ فائی۔ ففٹی اور بالی جواب میں "یس" کہتی گئی۔ اور جب چیکر نے آخری خانے کا نمبر بولا تو بالی نے "نو" کا اعلان کیا۔ وہ غلطی سے آخری خانہ بھی کاٹ گیا تھا۔ ہر طرف سے "بوگی، بوگی" کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ تب بالی نے دیکھا اس کا چہرہ لٹک گیا اور وہ اداس اداس سا سیٹ پر بیٹھا رہا۔ بالی زور زور سے کارڈ بورڈ کے بکس میں گوٹیں کو ہلا ہلا کر بجانے لگی۔۔۔

دوسری شام جب کھیل شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، تو بالی نے دیکھا وہ باہر لنگر پر ہاتھ رکھے خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی اس کے پاس آئی، ایک لمحہ وہ اس کے چہرے کو تکتی رہی، اور پھر بولی:

"کیا آپ کی کوئی چیز نیچے گر گئی ہے؟"

وہ چونک کر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا اور لبوں پر آہستہ سے زبان پھیر کر بولا" اوہ! نہیں۔ کوئی چیز نہیں"

تب وہ آہستہ سے مسکرائی "کیا آپ کا نام دریافت کر سکتی ہوں ــــ!"

"شان" اس کا مختصر سا جواب تھا۔

"کل آپ ایک پوائنٹ سے رہ گئے مجھے افسوس ہے" پھر وہ آہستہ سے اس کی طرف جھکی "آج جب میں آپ کو اشارہ دوں تو آپ "یس" کی آواز لگا دیجئے" پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی ہال میں داخل ہو گئی۔

گیم شروع ہو گیا۔ بالی نے نمبرنگ شروع کر دی، لیکن آج شان نے خلاف معمول صرف ایک گیم پیپر خریدا تھا۔ اس کے چہرے سے مترشح تھا کہ وہ بالی کی بات سے سخت الجھن میں پڑ گیا ہے۔ بالی نمبر اناؤنس کرتی رہی۔ گوٹیں بکس میں ہلا ہلا کر بجاتی رہی۔ اور جب اس نے ہونٹ سکوڑ کر ایک معنی خیز نگاہ شان پر ڈالی تو وہ ایک لمحے کے لئے تذبذب میں پڑ گیا، پھر اس نے کھڑے ہو کر "یس" کی آواز لگا دی۔ چیکر تیزی سے اس کے پاس پہونچا اور اس کے ہاتھ سے پیپر لے کر نمبر بولتا رہا اور بالی جواب میں "یس" کہتی رہی۔

شان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس کا ہاؤس صحیح نکلا پانچ سو روپے کا انعام تھا۔ لوگ رشک و حسد کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

پھر ایسا ہوا کہ بالی نے چھ ماہ کی قلیل مدت میں چار ہزار کی رقم اسے دلوا دی۔ شان کو سخت تعجب تھا کہ یہ بالی کس قدر عجیب لڑکی ہے۔ لیکن آخر کیوں وہ اس پر قدر مہربان ہے۔ کیا وہ اس سے محبت کرتی ہے یا اسے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔

ایک روز بالی اس سے بازار میں ٹکرا گئی: "ہلو شان ــ خدا کا شکر ہے کہ آج میری خواہش پوری ہو گئی"

"کیوں ــ خیریت تو ہے نا" شان نے مسکرا کر کہا۔

"یوں ہی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ آپ سے کبھی تنہائی میں ملاقات ہو" پھر وہ اسے کیفے الاسکا میں لے گئی۔ اور کافی کی چسکیوں کے درمیان مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی۔ شان خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر دفعتاً بالی نے اس سے دریافت کیا۔

"کیا آپ عادی قسم کے کھلاڑی ہیں؟"

"نہیں مس بالی" وہ جھینپ کر کچھ سوچتا رہا "میں ایک خاص مقصد سے تمبولہ کھیلنے آتا ہوں"

بالی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا وہ مقصد نہیں بتائی جا سکتی؟"

اس بار شان کچھ خاموش سا ہو گیا۔ پھر وہ کہنے لگا "میں معمولی سا کلرک ہوں، لیکن میں ایک بڑے افسر کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں، وہ بھی مجھے چاہتی ہے، ہم چاہیں تو ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر سکتے ہیں لیکن یہ بات مجھے پسند نہیں۔ میں نیکی سے تمام وہ تمام طریقے آزما چکا ہوں جو ایک شریف اور غریب انسان آزما سکتا ہے لیکن میں ہر بار ناکام رہا۔ اب میں ایک آخری طریقہ آزما رہا ہوں چاہتا ہوں کہ مجھے ۵ ہزار روپے کسی طریقے سے مل جائیں" تاکہ میں

ندی میں بار جیتنا بن سکوں، اور اس طرح ننھی کے والدین مجھے ایک ذی
حیثیت انسان کی طرح جاننے لگیں۔ اب تک میں تمہاری وساطت
سے ۴ ہزار کی رقم جمع کر چکا ہوں —— اب صرف ایک بازی کی اور
ضرورت ہے۔"

بالی نہایت خاموشی سے سن رہی تھی، اور جب شان اپنی
بات ختم کر چکا تو اس نے ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکا
سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہاں پہلے ہی ننھی چھپی بیٹھی ہے۔ پھر وہ
ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میرا خیال ہے اب ہم کو چلنا چاہیئے"
شان فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا۔ شان!
اب تم مزید رقم حاصل نہ کر سکو گے۔"

دوسری شام کو بالی نمبرا ناؤنس کر رہی تھی اور ہال میں اس
کی سریلی آواز گونج رہی تھی۔

سیونٹی سیون	آل ان سیون
نوزٹی نوز	چھکے کھومور
سکس	گیوسی اے کس

تب اس نے دیکھا شان آہستہ سے ہال میں داخل ہوا اور دائیں طرف
دیوار کے نزدیک والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کھیل چلتا رہا۔ بالی نمبرا ناؤنس کرتی رہی۔ وہ جب بھی شان
کی طرف دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنی آنکھوں میں ایک
عجیب سی یاسیت اور التجا لئے اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر بالی نے ایک بار
ہونٹ سکوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحہ شان نے کھڑے
ہو کر "یس" کا اعلان کر دیا۔

چیکر تیز تیز قدموں سے اس کے پاس پہونچا اور ٹکٹ لے کر نمبر
بولنے لگا اور بالی جواب میں "یس" کہتی رہی۔ معاً اس کی پشت سے
آواز آئی۔ "تم غلط نمبر بول رہی ہو مس بالی" تب بالی نے مڑ کر دیکھا تو سرکل
کا پارسی مالک کھڑا تھا۔

ہال میں گہرا سکوت تھا بالی مجرموں کی مانند سر جھکائے کھڑی تھی "میں
تمہیں معاف کر دیتا لیکن سرکل کے ان سیکڑوں ممبران کی وجہ سے مجبور ہوں
جن کو تم عرصے سے بیوقوف بنا رہی ہو۔"

چپراسی نے اپنے دائیں طرف دیکھا اور اسٹیج کا چوبی فرش
دو سپاہیوں کے بھاری قدموں سے لرزنے لگا۔

یوسف ظفر کا

تازہ مجموعۂ کلام

صدا بصحرا

جدید شاعروں میں یوسف ظفر کا نام بڑی اہمیت
رکھتا ہے ان کی شاعری ان تمام صحت مند تجربوں او
رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے جن سے ماضی قریب م
ہمارے ادب کو دوچار ہونا پڑا۔ وہ بنیادی طو
پر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے
ہاں ماضی کی ادبی روایات کے احترام اور جدید
رجحانات کو خوش آمدید کہنے کا شعور پایا جاتا ہے
"صدا بصحرا" تقریباً ۸۰ نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ
نظمیں ہر اعتبار سے شاعر کے فن کی نمائندہ ہیں۔
انھوں نے دوسروں کی آواز میں اپنی آواز ملا
ملانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ایک انفرادی لب و لہجہ
پیدا کیا ہے ان کے موضوعات شعر پوری زندگی کا اح
کئے ہوئے ہیں۔ نیز زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا انداز
ان کا اپنا ہے، انھوں نے غم دل کو غم دل ہی سمجھا ہے، کاسۂ گ
نہیں اور غم دہر کو غم دہر ہی جانا ہے سیاسی نعرہ بازی نہیں
یوسف ظفر کا احساس فن نہایت پختہ ہے انکی شاعری کا جمالیاتی
پہلو اردو ادب میں بعض نئی اور جاندار روایتوں کا حرف آغا
ہے انھوں نے ہیئت کے بعض نہایت خوبصورت تجربے کئے ہیں ج
کسی طرح بھی تجربہ برائے تجربہ کے ذیل میں نہیں آتے بلکہ واضح طو
پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح اظہار خیال کے دائرے کو وسیع تر کر
کی کامیاب کوشش کی گئی ہے یوسف ظفر کی شاعری میں موسیقیت یا روانی کا عنصر بھی نہیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتا

صفحات ۱۹۹ قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے

گلڈ اشاعت گھر اسٹریچن روڈ کراچی

مولانا عبدالصمد صارم الازہری

منکہ ایک مصنّف

میں ڈیڑھ سو کتابوں کا مصنّف ہوں اور میرے نام بنک میں ایک ہزار رو
ہی جمع نہیں۔ مجھ جیسے دیگر مصنّفین کا بھی یہی حال ہے۔ ایک شخص جو سو سے
زائد کا مصنف ہے۔ میں اس سے ایک دن کہنا لگا۔ ہم تو علمی کتابیں لکھتے ہیں۔
ں کیا ملتا۔ مگر آپ کے پاس تو کم از کم پچاس ہزار روپے ہوں گے۔ کہنے لگے نا
ی کی حالت آپ کی حالت سے بھی زیادہ خراب ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ ملک
شہور ناول نگار کیا کہہ رہا ہے۔ ایک اور اسی پلّہ کے ناول نگار سے میں نے
ال کیا تو وہ کہنے لگا۔ میں بھی آپ کے متعلق یہی قیاس دوڑاتا ہوں۔ اگر
متعلق میرا قیاس غلط ہے۔ تو آپ کا قیاس بھی اس جیسا ہو گا۔ کسی نے
ع پر کام کیا ہے۔ تو کسی نے دو تین صفحے پر بلکہ بعض نے الٹی صفحوں پر جو عر
ں کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ان کی کتابیں چلتی نہیں خوب چلتی ہیں مگر محنت
ر کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک پبلشر کے متعلق مجھے بالکل صحیح معلوم ہے کہ میری
قلم سے صرف میری کاوش قلم سے اس نے ایک کوٹھی بنائی اور مجھے اس
ملا۔ صرف دو ہزار روپیہ۔ وہ بھی اس طرح کہ مولانا پچاس لے جائیے پچاس
ے لاؤں گا۔ پھر اس کل نے ایسا بے کل کیا کہ مولانا کو کوٹھی کا دورہ معیاد آ گیا
پبلشر نے مجھے میری چار کتابوں کی رائلٹی پانچ روپے گیارہ آنے دی۔ یہ
ں اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں سات روپیہ رقم اس نے گیارہ پھیرے
ے کے بعد پیش کی۔ پھر میں نے اسے کئی نوٹس دیئے۔ اس نے جواب
دیئے کہ وہ جانتا ہے کہ مولانا صاحب عدالت میں نہیں جائیں

گے۔ تو برسوں عدالتوں میں کھینچے پھرنے کے بعد مجھ سے کیا خاک وصول
کر پائیں گے۔ ایک پبلشر نے اپنے ہاں صرف میری کتابوں کی فروخت سے ایک
مستقل ملازم رکھا۔ جبکہ اس نے مجھے صرف دو ہزار روپے ستر پھیروں میں تھوڑا
تھوڑا کر کے دیا۔

ایک پبلشر کو میں نے دو کتابیں رائلٹی پر دیں جو بہت چلیں مگر مجھے اس
نے صرف ایک کتاب کی رائلٹی بڑی مشکل سے چالیس روپیہ دی۔ اور دوسری
کا کچھ نہیں دیا۔ جب بھی جاتا ہوں کہتا ہے۔ مولانا آج کل دام نہیں ہیں۔ کیا
کروں۔ یہ نہیں کہتا نہ کہہ سکتا ہے کہ کتابیں نہیں بکیں۔ ایک پبلشر نے مجھے بڑی
محبت کے بعد میری کتابوں کی صرف دو دو کاپیاں دیں۔ اور ان کے متعلق بھی
مجھ سے عہد لیا کہ میں انہیں فروخت نہیں کروں گا۔ ان پبلشروں سے تنگ آ کر
میں نے اپنی چار کتابیں خود چھپوائیں اور کمیشن سیل پر کچھ کاپیاں مختلف دوکانداروں
کے ہاں رکھ آیا۔ سال بھر کے بعد گیا تو ایک نے کہا مولانا وہ جو ملازم تھا۔
آپ کی کتابیں لے گیا۔ اور بھی کتابیں چرا کر لے گیا۔ دوسرے کے ہاں
گیا تو اس نے کہا مولانا بارش ہوئی تو آپ کی کتابیں چھت کے ٹپکنے سے بالکل
ناکارہ ہو گئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں وہ کتابیں مجھے دیدو۔ میں ردّی
میں بیچ لوں گا۔ تو کہنے لگا کیا فائدہ؟ تیسرے کے ہاں گیا کہنے لگا مولانا جس
ملازم کے سامنے آپ کتابیں دے گئے تھے وہ تو مر گیا۔ میں نے کہا دوکان تو نہیں
مری؟ دکان والا تو نہیں مرا مگر پتھر میں جونک نہ لگی۔

ایک پبلشر کو میں لکھتے لکھتے تھک گیا۔ رجسٹری خطوط بھیجے بھیجے عاجز
آگیا۔ مگر خدا کے بندے نے کروٹ نہ لی۔ ایک دو پبلشر جو بڑے ایماندار تھے انہوں
نے میرا پورا پورا حساب بیباق کیا مگر مجھ سے لئے چکر لگوائے اور اتنی قسطوں
میں وہ حقیر رقم دی کہ مجھے سخت شرم محسوس ہوتی تھی۔ ایک پبلشر ہمیشہ اینٹھ کر
کرتا رہا۔ مگر کوئی وعدہ وفا نہ کیا۔ آخر میں تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک پبلشر نے
... مجھے کچھ نہ دیا تو میں نے کہا تمہیں عدالت والوں کے حوالے کرتا ہوں۔ ڈرایا اور
دھمکایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ میرے گھر آیا اور خوشامدیں کرنے لگا۔ معاف کر دو
مولانا معاف کر کے ہٹا یعنی رام معاف کرا کے ہٹا۔

یہ ہے ہمارے ملک کے مصنفین اور پبلشروں کی حالت۔ جو بھی
تصنیف و تالیف کا کام کرتا ہے شروع کرتا ہے۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں۔ ایسے
حالات میں کتابیں لکھنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیئے شاباش ہے۔ ان لوگوں کو
جو اس طرح علم و ادب کی خدمت کرتے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب کہنے لگے کہ مستشرقین یورپ نے عربی پر کتنا
قیمتی کام کیا ہے۔ ہمارے مصنفین ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ میں نے
کہا مجھے معلوم ہے کہ مستشرقین یورپ کم از کم مجھ سے زیادہ عربی نہیں جانتے
مگر ان کے سے وسائل، ان کا سا اطمینان ہمیں کہاں میسر اور پھر ان کی کتاب
جو انہیں مالی فائدہ دیتی ہے وہ ہماری کتاب کب دے سکتی ہے تو قلم کیسے
چلے اور مصنف اتنی محنت کیسے کریں۔ کبھی علمی کام کے لئے قلم اٹھاتا ہوں تو سب
سے پہلے یہ خیال دل میں آتا ہے کہ اس کے چھپنے کی کیا صورت ہو گی۔ اور اگر ہو
بھی گئی تو مجھے کیا ملے گا؟ جی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور تحقیق و کاوش کو دل نہیں
چاہتا۔ کتنے کام ذہن میں آئے، شروع کئے اور آخر قلم رکھ دیا ہمیشہ کیلئے
قلم رکھ دیا۔ اور بس۔

یہ اس مصنف کے بنک بیلنس کا حال ہے جسے اس کے گھر والے بخیل
کہتے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو کفایت شعار کہتا ہے۔ اور یہ معقول تنخواہ پاتا ہے
جس کا گزارہ تصنیف و تالیف پر نہیں ہے تنخواہ پر ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا
جنھوں نے غلطی سے اپنا ذریعہ معاش قلم کو بنایا۔ مجھے معلوم ہے ان کے ہاں
فاقے ہیں۔ جبکہ ان کے پبلشر عیش کرتے ہیں۔

کیا کبھی وہ دن آئیں گے کہ ہمارے ملک میں اہل قلم عزت کی
زندگی گزار سکیں گے۔ رائٹرز گلڈ سے کچھ توقعات ہیں مگر ابھی تک تو یہ
بھی مصنفین کی کوئی بھی مشکل حل نہیں کر سکا ہے۔ صرف یہ کہ جو پہلے بھی ا
حالات میں تھے۔ وہ اب بھی اچھی حالت میں ہیں۔ اور جو پہلے قلاش تھے
اب بھی قلاش ہیں اور اگر کسی کو کچھ فائدہ پہنچا ہے تو وہ متمول بن
ہی کر پہنچا ہے۔ پبلشروں کی تو یہ کیا خاک اصلاح کرتا۔

میں چودہ سال کی عمر سے قلم چلا رہا ہوں اور جن لوگوں نے
ساتھ یا میرے بعد کبھی قلم کے سوا کسی چیز کا سہارا لیا تھا۔ میں انہیں
ہوں کہ وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ حتیٰ کہ جوتے گانٹھنے والے بھی ہزار
ہو گئے اور پان بیچنے والے بھی دولت میں کھیلتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے ملک میں اہل علم و اہل قلم کی حالت جس کی
ایک ہلکی سی تصویر کھینچ دی ہے۔ اور یہ ہے ہمارے ملک کے پبلشر
حالت جس کا ایک ادنیٰ سا پہلو میں نے آپ کو دکھایا ہے ورنہ ان کی
اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔

بڑی مشکل ہے کہ دوست احباب اور عزیز و اقارب کتاب
جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے آپ کی فلاں کتاب پسند آئی پڑھا تھا ہمیں
دی ذرا دکھائیے تو سہی اور جب دکھائی تو لے کر چلتے بنے۔ خدا کے ف
اپنا دائرہ احباب بھی بڑا وسیع ہے۔ بعض دوست کئی اسکول میں
ہیں بعض کہیں پرنسپل ہیں۔ کہتے ہیں ہمارے اسکول کی لائبریری کے
کی کتابیں مطلوب ہیں۔ میں خوشی خوشی سب لاکر رکھ دیتا ہوں کہ
لے چلتے وقت فرما جاتے ہیں۔ یہ آپ کی طرف سے ہمارے اسکول
ہیں۔ کہیں کسی پروفیسر کا چپراسی آتا ہے کہ صاحب نے آپ کی فلاں کتاب
دوست تو کہتے ہیں۔ اچھا ذرا پڑھنے کو تو دیجیے لے گئے۔ اور دو
پوچھا تو کہہ دیا میاں میرا فلاں دوست لے گیا۔ کھو گئی کہیں
نے تو پڑھی بھی نہیں۔ ذرا ایک نسخہ اور دے دیجیے۔ لیجئے گئے تھے
بخشوانے اور الٹی نماز گلے پڑ گئی۔ کچھ دوست احباب یہ غضب
ہم سے تو کتاب مانگ کر لے گئے اور کسی کباڑی کو بیچ آئے۔ بعض
لینے کے لئے عجیب عجیب ترکیبیں کرتے ہیں۔ بعض جب یہ دیکھتے ہیں
طرح بھی کتاب دینے کے لئے تیار نہیں۔ تو جیب میں ہاتھ ڈالتے
ادا کر دیں گے۔ پھر جب لاکر سامنے رکھ دیں تو جیب کو بھول گ

ہاکروں ایک صاحب نے تو مجھ پر بڑا ہی ستم کیا کتابیں طلب کرنے لگے
کہ کتابیں میرے پبلشروں سے لیجئے۔ وہاں ملیں گی۔ میں سمجھتا تھا
ان جواب سے سمجھا چھوٹ جاؤں گا۔ کہنے لگے آپ کا اپنا پرسنل فائل تو ہوگا
لا دیجئے۔ میں مجبوراً ڈھونڈنے لگا۔ تو تین کتابیں اٹھا لایا۔ بولے آپ
ہمارے مصنف ہیں۔ آپ نے خود مروتاً مرے لئے کتابیں رکھی ہوں گی۔
لائے۔ اب میں بغیر جھانکوں شرماحضوری لاکر رکھ دیں اور ہے
لیجئے آپ پبلشر سے اور لے آئیں گے۔ یہ تو میں اپنے پاس بطور یادگار
رکھوں گا۔ عزیز اقارب کہتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے ہمارے
ہاں آپ کی یادگار نہ رہے۔ لیجئے دیکھئے آپ کو تو پبلشر مفت دیتے ہیں۔
ایک دفعہ ایک شاگرد سر ہو گیا میں نے صاف انکار کر دیا۔ بولا آپ
تو بہت ہی بخیل ہیں۔ میں آپ کا خصوصی شاگرد اور میرے پاس آپ کی کتابیں
نہ ہوں۔ بعض بے تکلف دوست تو تقاضے کرتے ہیں۔ اور کبھی مایوس نہیں
ہوتے۔ بھلا آخر ایک دن کامیاب ہو کر لوٹتے ہیں۔

یہ حالت دوستوں کی ہے۔ اور پبلشروں کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ چاہتے
ہیں کہ ہماری کتاب کا پہلا گاہک مصنف ہی ہو۔ بعض بے وقوف تو مجھ ہی پر
احسان جتاتے ہیں کہ دیکھئے ہم نے آپ کی کتاب کیسی اچھی شائع کی گویا اس
کے لئے مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اور جب وہ شکریے کے الفاظ
دہراتے ہیں تو شرماحضوری شکریہ ادا کر دیتا ہوں۔ میرے اس شکریہ
سے بعض پبلشر اپنی بے وقوفی سے کہنے لگتے ہیں۔ ہم نے آپ کو مشہور کر
دیا تو پھر مجھے شرافت کو بالائے طاق رکھ کر انکار کر دینا پڑتا ہے۔

وقار خلیل

خبرنامہ

انعامی مقابلہ کا مضمون

اردو اور بنگلہ میں کتاب بہترین ساتھی ہے "کے عنوان پر مجلس آداب کتاب (فرینڈز آف بک سوسائٹی) کی طرف سے ایک ہزار روپے کے انعامی مضمون میں شرکت کی تاریخ ۱۵ اپریل سے بڑھا کر ۱۵ جولائی ۱۹۷۳ء کر دی گئی ہے۔ کالجوں اور ہائی اسکولوں کے متعلقہ طلبا رہنمایانہ استفسارات، فارم داخلہ اور مضمون لکھنے کے لئے کاغذ، سیکرٹری مجلس آداب کتاب۔ کمرہ ۱۱ (۴۔ بی) شاہ عالم مارکیٹ (لاہور) کے پتے پر خط لکھ کر منگا سکتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو کا (۶۵۷) واں عرس

اس سال بھی دہلی میں طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی کا عرس نہایت شاندار پیمانے پر منایا گیا۔ اس موقع پر نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے ایک طویل تقریر کی جس میں امیر خسرو کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، ان کی عالمانہ اور شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی ان کی جامع صفات شخصیت کے چند در چند پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

اردو کتاب کی اشاعت۔ اور مغربی بنگال کی اعانت

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تالیف بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات کی طباعت واشاعت کے لئے حکومت مغربی بنگال نے دو ہزار روپے کی رقم منظور کی۔ یہ کتاب جون ۱۹۷۳ء تک چھپ جائیگی۔

رام پور میں، لیکچرز کا سلسلہ

۶ مارچ کے مہینے سے ہر ہفتہ صولت لائبریری میں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی طرف سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اب تک "عرب و ہند کے تعلقات قبل اسلام" اردو ڈراما تھیٹر کی تاریخ "اور میر کا مطالعہ" کے عنوانات پر بالترتیب حامد علی خاں، ڈاکٹر عبد العلیم نامی (بمبئی) اور عابد رضا بیدار تقریریں کر چکے ہیں۔

اختر الایمان کو سپاسنامہ پیش کیا گیا

۳۰ مارچ کو ایجوکیشنل کلاسیز یونین (ملازمین ہمدرد دواخانہ دہلی) کی جانب سے اردو کے مشہور شاعر اختر الایمان کو ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملنے پر سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت سید سجاد ظہیر نے کی۔ انہوں نے صدارتی تقریر میں اختر الایمان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، ان کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

جلسہ کے آخر میں مولانا قاضی سجاد حسین معاون متولی ہمدرد دواخانہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ٹیگور کے ڈرامے میں رام گوپال کی اداکاری

پچھلے دنوں برسٹل میں ٹیگور کا ڈراما "کال کوٹھری کا بادشاہ" پیش
کیا گیا۔ جس میں مشہور ہندوستانی ماہر رقص رام گوپال نے شاہ سورنا
کا پارٹ ادا کیا جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا۔
رام گوپال نے ڈرامہ میں ہندوستان کے کلاسیکی ناچ بھی پیش
کئے۔ ڈرامہ میں حصّہ لینے والوں میں زیادہ تعداد برسٹل اولڈ وک تھیٹر
اسکول کے طلبا کی تھی۔ مقامی اداکاروں کی ہدایت کاری بھی رام گوپال نے کی تھی۔

ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہے

حیدرآباد (دکن) میں وہاں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں
کا نمائندہ جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں
صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی شروع میں جلسے کے داعی سلیمان
اریب نے کہا کہ حیدرآباد میں بہت سی انجمنیں قائم ہیں۔ اور ہر انجمن ادبی
جلسے اور مشاعرے منعقد کرتی ہے۔ لیکن دراصل ہمیں ایک ایسے ادبی پلیٹ
فارم کی ضرورت ہے۔ جہاں ادب کے سنجیدہ مسائل پر گفتگو ہو۔ اور ادیبوں
کی تخلیقات کا دوستانہ ماحول میں جائزہ لیا جائے۔ بحث میں مغنی
تبسم، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، اختر حسن، حسن عسکری
عبدالرحیم الدین کمال، عائشہ رشاد، اور دیگر حاضرین نے حصّہ لیا
اور طے کیا گیا کہ ایسی نشست کم از کم مہینے میں ایک بار ضرور ہونی چاہیئے۔
جلسے میں عزیز قیسی نے اپنی دو نظمیں سنائیں۔ یوسف عرست
ساجدہ عظیم نے مضامین پڑھے۔ آخر میں عوض سعید اور لکشمی دیوی
نے افسانے سنائے۔

کم قیمت کی کتابوں کا نیا سلسلہ

حکومت برطانیہ نے ارزاں کتابوں کی اسکیم کے تحت کتابوں کی
اشاعت کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے، جس کا نام "پریکٹیکل بکس"
انگریزی زبان سیکھنے کی کم قیمت کتابوں کی طرح نئے سلسلے کی کتابیں
برطانیہ کے بڑے بڑے ناشروں کے تعاون سے شائع کی گئی ہیں۔

نئے سلسلے کی پہلی کتاب کھاتہ نویسی کے فن پر ہے۔ جو کاروباری
اشخاص اور کامرس کے طلبا کے لئے مفید ہو گی۔
ایک دوسری کتاب ٹائپ سیکھنے والوں کے لئے پٹ منز
کالج نے مرتب کی ہے۔

اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس سروجنی نائیڈو کی شخصیت اور شاعری کو خراج عقیدت

اردو مجلس حیدرآباد دکن کا ماہانہ ادبی اجلاس اتوار ۱۳ مارچ
کو شام کے ۱/۲ ۵ بجے اردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ پروفیسر ہارون
خاں شروانی ایم۔ ایل۔ سی نے جلسہ کی صدارت کی۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو
کی پندرھویں برسی کے موقع پر ان کی یاد منائی گئی۔ محترمہ منیرہ بانو کاؤس
جی نے دلچسپ اور معلوماتی مضمون پڑھا اور کہا کہ "سروجنی دیوی کو فطرت
نے بڑی فیاضی کے ساتھ زبان اور قلم دونوں پر قدرت عطا فرمائی تھی،
اور دل و دماغ دونوں کی برکتیں ان کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔ اشعار
میں سوز و گداز، روانی اور جوش اور زبان میں شستگی اور اثر بدرجہ اتم
پائے جاتے ہیں۔ معمولی سے معمولی موضوع کو ایک حسین پیرائے میں پیش کرنا
سروجنی دیوی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے" منیرہ بانو نے کہا کہ حیدرآباد
ان کے لئے ایک شہر نہیں بلکہ ایک گھرانہ تھا جس میں وہ سب کو جانتی تھیں
اور سب پر مہربانی کی نظریں رکھتی تھیں۔ اور سب کے ساتھ شفقت کا برتاؤ
کرتی تھیں۔"

جناب ہری نواس لاہوٹی نے "سروجنی نائیڈو کی شخصیت" کے زیر عنوان
دلچسپ مضمون سنایا اور بتایا کہ سروجنی دیوی اپنے زمانے کی بہت بڑی
لیڈر اور اپنی قوم کی محبوب اور اپنے رفقا کا بہت بڑا سہارا تھیں۔ ان
کا وجود ہماری تہذیب و تمدن کا ایک بیش بہا سرمایہ تھا جسے حیدرآباد
نے ہندوستان کو اور ہندوستان نے دوسرے متمدن ممالک کو دیا شاعری
ادب، سیاست اور سب سے زیادہ اپنے شخصی کردار کے دلنواز نقوش
میں سروجنی نائیڈو کی بین الاقوامی شخصیت، ہندوستانی طبقہ نسواں
کے لئے عالمگیر پیام تھی" لاہوٹی نے کہا کہ "سروجنی دیوی ہر اس
سپاہی کی ماں تھی۔ جو آزادی کے محاذ پر صبر آزما جنگ لڑنے کے لئے

سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا۔"

محفل شعر و سخن میں حکیم یوسف حسین خاں 'ابن احمد تاب' باز طاہرہ سعیدہ، قادر خلیل، تاج محمد، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، کیف رضوانی، وحید مرزا، کرن پرشاد کرن، فیض الحسن خیال، برقی یوسفی، نازحیدر اور سرور [illegible] نے اپنا کلام سنایا۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اپنی صدارتی تقریر میں سروجنی دیوی کی شخصیت کو قومی اتحاد کا ایک جامع مظہر قرار دیتے ہوئے کہا کہ "ان کے انقلابی افکار و کردار نے ہندوستان کی نئی نسل کو متاثر اور میدان عمل میں سرگرم عمل کیا"۔ پروفیسر شروانی نے اس بات پر تاسف کا اظہار کیا کہ سروجنی دیوی کا مکان جو ایک زمانے میں حیدرآباد کا جمالیاتی مرکز بنا ہوا تھا۔ آج وہ ایک کیفے میں تبدیل ہو گیا ہے"۔ ابتداء میں جناب سید محمد یونس خازن اردو مجلس نے صدر جلسہ کی گلپوشی کی جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد اردو مجلس کے شکریہ پر جلسہ نہایت کامیابی کیساتھ برخواست ہوا۔

بزم دہشت

بزم دہشت حیدرآباد (پاکستان) کا ایک خاص اجلاس بتاریخ ۵ر اپریل ۱۹۷۰ء وفا راشدی کی رہائش گاہ مقام ٹیلی گراف ورکشاپ کالونی کوٹری منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد خالد اختر نے حمد سنائی، ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل نے جو سندھی زبان کے مشہور و ممتاز شاعر و ادیب اور نقاد ہیں۔ اور ساتھ ہی اردو زبان کے قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ پندرہ سالہ عزیز الدین حقی کو بہترین قرأت اور سات سالہ خالد اختر کو بہترین نظم خوانی پر انعامات تقسیم کئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی سندھی غزل سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ صدارت حکیم اکرام حسین سیکری نے کی۔ بزم کے جنرل سکریٹری وفا راشدی نے رپورٹ پڑھی۔ رونق جو دھپوری نے اپنی ایک غزل پیش کی جو بہت پسند کی گئی۔ پھر وفا راشدی نے قابل اجمیری مرحوم سے متعلق مقالہ پڑھا۔ مولانا عبدالشکور نظامی نے نعت اور صادق دہلوی نے نظم سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اختتام پر ڈاکٹر ابراہیم خلیل نے اجلاس سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وفا راشدی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مغربی و مشرقی پاکستان کو قریب ترلانے کی غرض سے بزم دہشت کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا یہ اقدام مستحسن ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وفا صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں سندھی غزل سے جلسہ کا افتتاح کروں۔ اس قسم کے پروگرام سے باہمی اتحاد و ذہنی یکجہتی اور افہام و تفہیم کی راہ استوار ہوگی۔ نہ صرف یہ بلکہ علاقائی زبان کی ترقی اور قومی زبان کی ترویج و اشاعت میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر خلیل نے مزید کہا کہ جس طرح وفا راشدی نے سندھ کے جواں مرگ شاعر سے متعلق مقالہ پیش کیا اسی طرح ملک بھر کے ادیبوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کے شعراء و ادباء کو روشناس کراتے رہیں۔

لاہور میں عید ملاپ کی نئی طرح

عید، بقر عید اور خوشی کے دوسرے تیوہاروں پر جب سارا لاہور جشن مسرت منا رہا ہوتا ہے اس شہر میں کچھ ایسے نفوس بھی ہوتے ہیں جو اپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی اپنے تئیں اجنبی اور بھرے شہر میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان کے وہ طالب علم ہیں جو لاہور کے مختلف کالجوں میں زیر تعلیم اور ہوسٹلوں میں مقیم ہیں۔ اس بار لاہور کے بعض نوجوانوں نے مشرقی پاکستان کے اپنے ان بھائیوں کو عید کے روز اپنے گھروں پر مدعو کر کے عید ملاپ کی ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ ذیل میں اسی کی روداد پیش کی گئی ہے۔

انجینئرنگ یونیورسٹی کا ہوسٹل قریب قریب سنسان تھا۔ کہیں کہیں ے سے روشنی کی لکیر باہر نکل کر شام کی اداسی کو اور گہرا کر رہی تھی بیشتر لم عید منانے کے لئے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے یا پھر لاہور ہی ے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس چلے گئے تھے۔ ایسے میں ہوسٹل مبر ۱ پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ چاٹگام کے نوجوان طالب علم روح المتین ازہ کھولا تو باہر ایک اجنبی کو کھڑا دیکھا۔

"متین شاحب آمار نام کاجم علی"

اجنبی نے قدرے تکلف کے ساتھ لیکن شستہ بنگالی میں اپنا کراتے ہوئے کہا "امی پاکستان ریلویک شونگے۔ ایک جون بنگلہ لا سیر چھاترو۔ اما وریشیکھک مسٹر سی سی داس اما کے اپنار کا چھے ے چھین۔"

اجنبی کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ متین صاحب۔ میرا نام ہے۔ میں مغربی پاکستان ریلویز کا ملازم اور گلڈ کی بنگالی کلاس کا طالب علم ہوں استاد مسٹر سی سی داس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

کرہ میں مشرقی پاکستان کے کچھ اور طالب علم بھی موجود تھے انہوں مغربی پاکستان کے ایک بھائی کو بنگلہ میں گفتگو کرتے سنا تو ان کھل گئیں اور وہ اپنی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔

بی پاکستان ریلوے کے جواں سال ملازم کاظم علی، روح المتین ساتھی اشرف حسین کو یہ دعوت دینے گئے تھے کہ وہ اس بار عید کا دن بھائی دروازے میں کاظم علی اور ان کے گھر والوں کے ساتھ گزاریں۔

انجینئرنگ یونیورسٹی اور لاہور کے دوسرے کالجوں کے ہوسٹلوں میں مشرقی پاکستان کے بہت سے طالب علم مقیم ہیں۔ بنگالی کلاس کے استاد مسٹر سی سی داس کے پاس ان سب کے نام اور پتے موجود تھے۔ عید بقر عید اور دوسرے تیوہاروں کی چھٹیوں میں چونکہ بہت سے طالب علم اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اس لئے ہوسٹل تقریباً خالی ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ باورچی بھی رخصت ہو جاتے ہیں ان دنوں مشرقی پاکستان کے جن طلبا کو کوئی دوست اپنے یہاں نہیں بلاتا انہیں اپنے گھر سے جدائی اور تنہائی کا احساس ستانے لگتا ہے اور وہ اس ماحول میں اپنے تئیں اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مسٹر داس نے اسی خیال کے پیش نظر اپنی جماعت کے ہر اس طالب علم کو جو عید پر لاہور سے باہر نہیں جا رہا تھا مشرقی پاکستان کے دو دو طالب علموں کے نام اور پتے دیے دیئے تاکہ اگر وہ چاہیں تو انہیں اپنے گھر مدعو کر سکتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ اکٹھے عید منائیں۔ بنگلہ کلاس کے پانچ طالب علموں کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم دس بنگالی طلبا کے کمروں کے نمبر بتائے گئے تھے۔ اور اسی پتے پر بھاٹی گیٹ کے کاظم علی چاٹگام کے روح المتین اور اشرف حسین کو لینے باغبانپورہ سے انجینئرنگ یونیورسٹی ہوسٹل پہنچے تھے۔

بھاٹی گیٹ سے باغبانپورہ کا یہ ہوسٹل تقریباً چار میل دور ہے۔

لاہور اور چاٹگام کے درمیان بارہ سو میل سے زائد فاصلہ ہے۔

لیکن کاظم علی کے اس اقدام کے بعد بھاٹی گیٹ اور باغبانپورہ کا درمیانی فاصلہ تو شاید قائم رہا ہو۔ لاہور اور چاٹگام کی دوری بالکل ختم ہو گئی۔

۳ مئی کو شام کے چھ بجے انجینئرنگ یونیورسٹی ہوسٹل کے کمرے میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے دل ایک ساتھ اور ایک آہنگ پر دھڑک رہے تھے۔ یہ آہنگ اخوت یگانگت اور مذہب کے ان ابدی رشتوں نے مہیا کیا تھا جنہوں نے پاکستان کے ان دونوں حصوں کو آہنی مضبوطی سے آپس میں جکڑ رکھا ہے۔

مشرف حسین نے بتایا کہ وہ عید کے روز کسی اور جگہ مدعو ہیں چنانچہ کاظم علی نے باریسال کے ضیا الدین طارق کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اسی دوران میں بھاٹی گیٹ کے منیر احمد کومیلا کے شفیع عالم اور چاٹگام کے مسعود احمد کو اپنا مہمان بننے پر رضامند کر چکے تھے۔ فیروزا سٹریٹ بیرون شیرانوالہ گیٹ کے فتح الدین نے جیسور کے ظفر خالد اور چاٹگام کے ایک اور طالب علم شمس الحق کو مدعو کیا۔ اور اس طرح عید کے روز بھاٹی دروازے اور شیرانوالہ گیٹ میں چاٹگام جیسور اور باریسال اکٹھے ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق مغربی پاکستان کے میزبان صبح سویرے ہوسٹل پہنچ کر مشرقی پاکستان کے مہمانوں کو اپنے گھر لے گئے کاظم علی اور منیر احمد نے (موخر الذکر ایف سی کالج میں پڑھتے ہیں) اپنے مہمانوں کو ایک ہی جگہ رکھا اور منیر احمد کے مکان پر ان کی تواضع کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ہر قسم کا تکلف بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے نوجوان طلبا نے ماحول کو زیادہ گھریلو بنانے کے لئے پتلونیں اتار کر اپنے مغربی پاکستان کے بھائیوں کی دھوتیاں اور شلواریں پہن لیں اور ان سے دنیا جہاں کے موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ سید کاظم علی کے چھ سالہ بچے جوہر رضوان علی کو بھی اپنے نئے ہنس مکھ مہمان بہت پسند آئے اور اس نے فوراً ان سب کو چچا بنا لیا جوہر بھی بنگلہ کے چار پانچ جملے بول اور سمجھ سکتا ہے۔ اس نے ان تمام جملوں کو بے دریغ استعمال کیا جوہر کے چچاؤں نے اسے بار بار پیار کر کے یونیورسٹی ہوسٹل آنے کی دعوت دی تو کاظم علی ان جملوں کے بھرپور تاثر اور قوت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کاظم علی اور منیر احمد دونوں نے اپنے مہمانوں کو جنہیں وہ اب بھائی بنا چکے تھے۔ بتایا کہ وہ بنگالی زبان کس جذبے کے تحت سیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہ کام کسی مادی منفعت کے پیش نظر نہیں کر رہے اس واحد رکاوٹ کو بھی پھلانگنا چاہتے ہیں جس نے ملک کے دوسرے حصے میں ہمارے کروڑوں بھائیوں کو ہم سے دور کر رکھا ہے۔ جواب میں روح المتین نے جو لاہور میں ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے جائنٹ سکریٹری بھی ہیں انہیں اطلاع دی کہ بنگال میں لوگ زیادہ تر اردو سمجھ لیتے ہیں اور بہت سے لوگ پڑھ لکھ بھی لیتے ہیں مشرقی پاکستان کے اسکولوں میں اردو ایک اختیاری مضمون ہے۔

جہاں تک مذہب سے لگاؤ کا تعلق ہے مشرقی پاکستان کے نوجوان طلبا نے بڑے جوش سے اعلان کیا کہ ہم اسلامی قومیت کے مقابلے میں جغرافیائی حدود پر مبنی قوم پرستی کو ہیچ سمجھتے ہیں انہوں نے فخر سے کہا کہ تحریک پاکستان کے دوران جو قومی نظریہ پروان چڑھا تھا اسے مشرقی اور مغربی پاکستان کے نوجوانوں نے بدستور سینے سے لگا رکھا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد شیرانوالہ گیٹ کے افتخار الدین بھی اپنے مہمانوں کو منیر احمد کے مکان پر ہی لے آئے اور اس طرح سب نے مل کر اندرون شہر کی زندگی کا نظارہ کیا۔

اور شام کو اس وقت جبکہ گلستان فاطمہ میں شہری اور حکام ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دے رہے تھے۔ لاہور کی معاشرتی زندگی کے پروگرام اپنے عروج پر تھے اور عام لوگ دن بھر کی گہما گہمی کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ لاہور کی تنگ اور نیم تاریک گلیوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے چند نوجوان "ابا رکا ہوبے و پھر ملیں گے" "انشاء اللہ" کے الفاظ کے ساتھ عید ملاپ کی انوکھی اور دلچسپ داستان کا آخری مرحلہ طے کر رہے تھے۔

اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

لیکن اس کے بعد انہیں ایک دوسرے سے کون جدا کر

نیا ادبی انعام

تی اردو بورڈ کراچی ادارۂ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشتراک
ر مالی تعاون سے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابوں کا ایک انعامی مقابلہ منعقد
رہا ہے اس سلسلے میں حسب ذیل موضوعات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر نقد
نعامات کا اعلان کیا جاتا ہے :-

انعامات

عنوانات

انیوں کا مجموعہ (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)

رامہ (۴۵ منٹ کھیل)

یل کہانی (کل تقریباً ۵ ہزار الفاظ)

ر پاکستان (جغرافیہ پاکستان کے دلچسپ تاریخی اور جغرافیائی مقامات کا بیان مع تصاویر)

نس کے کرشمے یا دلچسپ تجربے

ہر عنوان پر مبلغ ۵۰۰ روپے کا ایک انعام پیش کیا جائیگا - کتاب صاحب کتاب کی ملکیت رہے گی۔

شرائط مقابلہ حسب ذیل ہیں،

ودات غیر مطبوعہ ہوں اور مقابلے میں شریک ہونے والے مصنف کی تحریر اور ملکیت ہوں (۲) مسودات مکمل اور قابل اشاعت ہوں (۳) زبان سادہ اور پیرایہ
د (۴) انعام پانے والی کتاب مصنف کی ملکیت رہے گی لیکن اس کی پہلی اشاعت کا حق ادارے کو حاصل ہوگا اگر ادارے نے اس کی اشاعت منظور کی
شرائط مصنف کے ساتھ علیحدہ طے کی جائیں گی (۵) انعامات اور ان سے متعلق جملہ امور کی بابت ترقی اردو بورڈ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا (۶)
ری کتابوں کے خلاصے قبول نہیں کئے جائیں گے (۷) مسودات ۳۰ جون تک حسب ذیل پتے پر پہنچ جانے چاہئیں، اس کے بعد وصول ہونے والے مسودات مقابلے
ہوں گے۔

سیکرٹری
ترقی اردو بورڈ
۶۷۲ - اردو منزل جمشید روڈ - کراچی ۵

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

تذکرہ حضرت شاہ ولی محمد چشتیؒ

مرتبہ

حکیم اکرام حسین سیکری

زیر طبع

مکتبہ اشاعت اردو۔ کوٹری (مغربی پاکستان)

ڈراکیولا

(ناول)

مصنفہ :- برام اسٹوکر

ترجمہ :- مظہر الحق علوی

قیمت :- (دو حصے) ۵ روپے

اعوان پبلیکیشنز۔ شیدی ولیج روڈ۔ لی مارکیٹ کراچی

بہار سخن

شعرائے راجستھان کا تذکرہ

از

شرف الدین یکتاؔ

(زیر طبع)

مکتبۂ اشاعت اردو۔ کوٹری (مغربی پاکستان)

زخم سفر

(پہلا مجموعہ کلام)

ساقیؔ فاروقی

(زیر طبع)

دھنک پبلشرز۔ ناظم آباد۔ کراچی

جیون درپن

(گیتوں کا مجموعہ)

نگار صہبائی

قیمت: تین روپے

دھنک پبلشرز۔ ناظم آباد۔ کراچی

ایک روپیہ
ONE
RUPEE

مطبوعات گلڈ اشاعت گھر

ناول
چلتے والا
اے حمید
قیمت ۴ روپے

لال چادر
(بنگلہ ناول)
مصنف:- سید ولی اللہ
ترجمہ:- یونس احمر
قیمت
۲ روپے

بہو بیگم
بنگلہ ناول
مصنف
پرنسپل ابراہیم خاں
ترجمہ
رفیع احمد قدوائی
زیر طبع

شاعری
ہفت کشور
جعفر طاہر
قیمت
۷ روپے

صدا بصحرا
یوسف ظفر
قیمت
۲ روپے

افسانہ
تیسری منزل
ھاجرہ مسرور
قیمت
۵ روپے ۵۰ پیسے

سورج بھی تماشائی
الطور
قیمت
۵ روپے ۵۰ پیسے

تھکے ھارے
خدیجہ مستور
قیمت
۵ روپے ۵۰ پیسے

اگر غور کیجئے تو یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں...

بڑی خدمات انجام دیتی ہیں، مثلاً برماشیل سروس اٹنڈنٹ کا خندہ پیشانی کے ساتھ آپ کی ضروریات کا پورا کرنا، تہذیب کے ساتھ ریزگاری کا واپس کرنا وغیرہ۔

ہمارے لئے بھی یہ سب بہت اہم امور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ برماشیل کے سروس اٹنڈنٹ کو ڈیلرز سروس کی مکمل تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ آپکی ضروریات کو اپنا اولین فرض سمجھے۔ لیکن یہ تو برماشیل کی خدمات کا محض ایک رخ ہے۔ اس کے علاوہ برماشیل کی اور خدمات بھی ہیں، جن میں تیل کی ان تمام اعلیٰ اشیاء کی فراہمی بھی شامل ہے جو صنعت، زراعت، صحت و ادویہ، اور وسائل حمل و نقل کے لئے ضروری ہیں۔

خدمت اپنا افتخار
برماشیل پر اعتبار

برماشیل آئل اسٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ ۔ کمپنی ممبران کی ذمہ داری محدود)

B S P—49

روپیہ ہماری معاشیات میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے
اسکی قیمت
کو برقرار رکھیے
ONE RUPEE
منظور شدہ ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰
جاری شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
ادا شدہ ۱,۰۰,۰۰,۰۰۰
زر محفوظ ۳۰,۰۰,۰۰۰
زر امانت ۳۱ر جنوری ۱۹۶۲ء تک ۲۸,۸۰,۰۰,۰۰۰
موزوں اور مستعد خدمت
روپیہ بچائیے اور
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
میں جمع کیجئے
رجسٹرڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی

ہم قلم

دورانِ خون کے
حیرت انگیز حقائق!
کیا آپ جانتے ہیں کہ:-
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
ہمدرد
ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چاٹگام

ڈیو
ٹائلٹ صابن
حسن و رعنائی کا سرچشمہ
جلد کو تر و تازہ رکھنے اور رنگ و روپ کو نکھارنے
کے لئے ڈیو صابن سب سے بہترین ہے۔
اس کے نفیس ملائم اور چکنے جھاگ تازگی اور فرحت
بخشتے ہیں۔ ہمیشہ سب سے اعلیٰ اور دیرپا
ڈیو ٹائلٹ صابن استعمال کیجئے!
DEW
TOILET SOAP
قیمت ۶۰ پیسے
ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے
اسے چمکدار پنی میں مہر بند کیا گیا ہے!
فیروز سنز
لیبارٹریز لمیٹڈ
نوشہرہ، مغربی پاکستان

جلد ۳

نمبر ۱۱

جولائی ۱۹۶۳ء

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن
ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت
ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی
ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے
منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات
ے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے
امی ہیں۔ جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے
ہیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا
نخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے
ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی حُب
وطن کی قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون
کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے کما حقہ
آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، اطمانیت
اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی
طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی
ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، جس میں سب
کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں۔ اور جہاں دولت
و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع
ہوں اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن
اور خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس
میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

قیمت ایک پرچہ ۶۲ پیسے

سالانہ —— ۶ روپے

اراکین ادارہ مصنفین سے پانچ روپیہ سالانہ

اِدارہ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

فہرست

تاریخ کا ٹیپ ریکارڈ

رزا ادیب کو آج کے سب ادبی قارئین جانتے ہیں۔ ہمیں یہاں ان کے ادبی مقام کا تعین کرنا مقصود نہیں، صرف اتنا جتانا کافی
دہ پچھلے پچیس برس سے ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت ہیں۔
وہ ایک ادبی اشاعتی ادارے سے سترہ برس منسلک رہے اور جب پچھلے سال انھوں نے ملازمت چھوڑی تو انکی تنخواہ
دسو پچیس روپے ماہوار۔
ملازمت چھوڑنے پر نہ انھیں کوئی پنشن ملی نہ گریجویٹی، نہ بونس، نہ انعام نہ مکان، نہ دکان۔ ظاہر ہے کہ ان کا ایک خاندان
ہوگا اور ان کے بچوں کو تعلیم کی ضرورت بھی ہوگی۔
شاہد احمد دہلوی کو بھی ہم سب جانتے ہیں جن کے ادبی کارنامے تو جدا، صرف یہی ایک بات کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ وہ چونتیس
سے مسلسل ماہنامہ "ساقی" نکال رہے ہیں۔ ساقی جس نے سینکڑوں بڑے ادیب ہم سے روشناس کرائے اور ایسے بھی جو آج
ہیں مگر بہت خوشحال افراد ہیں۔

یہ حضرت ہر مہینے کی ۲۸، ۲۹ تاریخ کو اپنے پورے خاندان سمیت ساقی کی کاپیوں پر ڈاک کے ٹکٹ لگاتے اور پتے لکھتے ہیں
سارا مہینہ ریڈیو پاکستان میں ایک عارضی اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے موسیقاروں کے لہجے اور تلفظ درست کرتے ہیں۔
کے معاوضے میں انھیں چار پانسو روپے مل جاتے ہیں اور جب خداوندان ریڈیو نہ چاہیں تو وہ بھی نہیں ملتے۔
ایک اور صاحب احمد ندیم قاسمی ہیں جو ایک انتہائی متین اور سنجیدہ مزاج کے مالک ہیں لیکن اپنی اور اپنے خاندان کی
کے لئے ایک روزانہ اخبار کا "سرراہے" کالم لکھتے ہیں اور شام کو اپنی بچی کھچی تخلیقی قوتیں اپنے کسی رسالے، کسی نظم یا نثر کی کتاب
کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے انھیں حسن مزاح بھی ودیعت کی ہے اور وہ اخباری دنیا کی ہاؤ ہو میں بھی اپنا
قارئین کا کام چلا لیتے ہیں، لیکن اگر انھیں کسی حد تک بھی اپنے ادب کی مناسب قیمت ملتی تو کیا وہ "روزنامہ طنز نگار" ہوتا
کرتے ہیں۔

مگر یہ تو محاورے میں صرف تین جنے ہوئے، اب اس حساب کو پاکستان کے جملہ اردو ادیبوں، بنگلہ ادیبوں اور علاقائی زبا
کے ادیبوں پر پھیلایئے تو نہ جانے شمار کہاں تک پہنچے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کیا کریں، معاشرہ ان کے لئے کیا کر رہا ہے۔ معاشرہ جس میں حکومت بھی شامل ہے۔
کہا جاتا ہے کہ یہ تو پورے ملک بلکہ آدھی دنیا کا معاشی اقتصادی اور سیاسی سوال ہے۔ اچھا مان لیا کہ ہے، لیکن یہ
پاکستانی ادیب کا بھی تو ہے جو دنیا کے ہر نظام میں یقیناً ایک عام شہری سے بہتر مراعات کا مستحق مانا جاتا ہے۔ اس کے لئے سو
یہ ہے کہ وہ ادب کا کام نہ کرے تو کیا کام کرے، کیونکہ ادیب کوئی اور کام کر کے ادیب نہیں رہ سکتا (بدقسمتی سے راقم الحروف
یہ بات اچھی طرح جانتا ہے) اور اگر وہ صرف ادب کا کام کرے تو پیٹ کیسے بھرے۔ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے متعلقین کا بھی۔

اب اگر بات بڑھائی جائے تو عام معاشی بدحالی کا مسئلہ اتنا پٹا پٹایا ہے کہ کوئی اس میں تانہ دلچسپی ہی نہیں لے گا۔ دو
چھوٹ بھیا نوکر شاہی کی ایک معقول تعداد "ہم قلم" اور پورے گلڈ کو "خطرناک اینٹی پاکستان رجحانات" کے مبلغین میں شمار کر
سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ جس کے نتائج بھی ہم بھگتیں گے اور ہمیں رونے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور ــــ اور
بات وہیں کی وہیں رہے گی۔

قومی سطح پر گلڈ نے دانشوروں کے حالات سدھارنے کے لئے ایک آدھ نیم رشتی قسم کی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن اس کر وفر اور دھ
کے باوجود

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

ایک اور جماعت ریڈیو پاکستان کے اسٹاف آرٹسٹوں کی ہے۔ جنھیں باقاعدہ یعنی پنشن کے حقوق والا ملازم نہیں رکھا جاتا بلکہ
اختیار کی رائے کے مطابق کارآمد رہنے تک گویا بالکل عارضی سطح پر تنخواہ دی جاتی ہے۔ جب کوئی مغنی آتش نفس گانے گا
گلو ہو جائے تو ریڈیو پاکستان کے کام کا نہیں رہتا۔ لہٰذا ریڈیو کی چار دیواری سے باہر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کی تنخواہ عا
پہلے ہی اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ کچھ پس انداز نہیں کر سکتا اور "دم رخصت" اسے نہ پنشن ملتی ہے نہ گریجویٹی نہ کوئی اور جمع پونج
یہی کیفیت اس "عظیم" ادیب اس ڈرامہ نویس، افسانہ نگار خوش بیان صاحب طرز اہل قلم کی ہوتی ہے جو ایک عمر ریڈیو
میں اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور اس کے ہوائی سامعین اس کی فکری عظمت، اس کے لفظی دروبست اس
بلاٹ، اس کے کرداروں سے اپنے آرام دہ صوفوں اور بستروں میں بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے دس روپے سال کے ریڈیو لائسنس
کے زور پر لطف اٹھاتے رہتے ہیں، لیکن جب اسے اس کی صلاحیتیں ختم ہو جانے یا اس کے تھک جانے یا بغیر
کمی کے صرف کسی چھوٹے یا بڑے افسر کی نگہ کرم کا شکار ہو جانے کی بنا پر محکمے سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ اپنے ہوا
کا پلندہ لئے در در گھومتا ہے اور عام بیکاروں اور فاقہ کشوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

ایک افسوسناک امر تو یہ ہے کہ حالات ایسے ہیں، لیکن دوسرا افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ اس بدقسمت جماعت کو اپنے حقو
حفاظت کرنے اور اس کے لئے منظم ہونے کا احساس اس طرح نہیں ہوا تا کہ وہ کم از کم ایک باقاعدہ اور مضبوط تنظیم ہی
تاکہ حکومت اور عوام کے سامنے اپنے مسائل اور تجویزیں جم کر اور موثر انداز میں پیش کر سکے۔

ہم نے "ہم قلم" کے اداریوں اور دوسرے ذرائع سے بھی کئی بار "اسٹاف آرٹسٹوں" کو ان کے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے
بنانے کی دعوت دی ہے اور اپنا عملی تعاون بھی پیش کیا ہے (کیونکہ بیشتر ریڈیائی ادیب ہمارے رکن ہیں) لیکن معلوم ہوتا ہے
ایک سچے پس ماندہ معاشرے کے سچے رکن بنے رہنے پر مصر ہیں، جن کا پہلا اصول بے عملی اور اپنی جیسا دیسی آدمی دعوت جم

کا مذاق اڑاتا ہے۔

اسی مہینے ایک طویل ملازمت کے بعد مشہور نعت گو اور شاعر جناب بہزاد لکھنوی ریڈیو پاکستان سے ریٹائر یعنی رخصت کر دیے
اب وہ اِدھر اُدھر خط لکھ رہے ہیں کہ ان کے لئے "کچھ" کیا جائے، پتہ نہیں ان کی شاعرانہ اہمیت کے بارے میں ناقدین اور تاریخ کی
رائے ہوگی۔ لیکن ہم نے یہ ضرور دیکھا ہے کہ ایک زمانے میں وہ بڑے بڑے مشاعرے لوٹتے تھے، بڑے بڑے لوگوں کی
ست گاہوں کی زینت بنتے تھے اور ریڈیو والے بھی انہیں سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ خیر ہم تو بہزاد لکھنوی کو ایک محنت کش
یثیت سے دیکھ رہے ہیں جسے ریڈیو پاکستان نے برسوں استعمال کر کے بغیر زادِ راہ چلتا کر دیا۔

اب تک وہ جانے کتنے بہزاد لکھنوی اور ان سے بھی جو جا بہتر دوسرے ادیب کتنے گلوکار، کتنے ڈرامہ آرٹسٹ، اپنا بہترین فن ہوائی
نے والوں اور ہوائی اڑانے والوں کی نذر کر کے بے وسیلہ، بے سہارا اور بیکار گھوم رہے ہیں یا مر کھپ چکے ہیں۔

کارکن صحافیوں کا ذکر چھیڑا جائے تو بات اور بڑھ جائے گی۔ مگر وہاں صورت حال اس حد تک بہتر ہے کہ ان میں (معدودے
کالی بھیڑوں کو چھوڑ کر) اپنے جماعتی حقوق کے لئے ایک عام بیداری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنے مالکان کرام سے کچھ نہ کچھ
لڑتے ہیں اور مزید لے کر رہیں گے، لیکن ابھی ان کی خود حفاظتی کارروائیاں بالکل ابتدائی منزل میں ہیں۔

ایسے حالات میں ہمیں اور انہیں کیا کیا کرنا چاہیے اور کیا کیا نہیں کرنا چاہیے یہ معاملہ علیحدہ سوچ بچار اور طویل المیعاد
وبہ بندی کا ہے جو ہم کسی نہ کسی حد تک کرتے ہی رہتے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ فی الحال تو ہم سب کو ایک آواز ہو کر ایک ہی لکھی زبان میں ایک بہت دلخراش اور بلند بانگ چیخ مارنی چاہیے
کم از کم ایک بار اس نقار خانے والوں کے دل دہلا دے، سنا ہے تاریخ کے پاس ایک دوسرا چالو "ٹیپ ریکارڈ" یعنی صدا بند
ہے۔ آج نہیں تو آئندہ نسلوں کے سننے والے ضرور اس مشترک چیخ کے معنی نکال لیں گے۔

جعفر طاہر کا پہلا مجموعۂ کلام

جس پر ۶۲-۱۹۶۳ء کا آدم جی انعام ملا ہے

جعفر طاہر ہماری جدید شاعری کی آبرو ہے۔ اس نے اسے ایک جوئے کم آب وشست روی کی بجائے بپھرا ہوا تھاہ اور بے کنار دریا بنایا۔ اس کی طبیعت کا بہاؤ اور طنطنہ عرب متقدمین شعراء کی یاد دلاتا ہے۔ اردو میں اس کی مثال شاذ ہی ملے گی۔ جعفر طاہر ایک مرد سپاہی ہے لیکن شاعری کو ذریعۂ عزت سمجھتا ہے۔ اسے ادب کی جاگیر وراثت میں نہیں ملی، اس نے اپنے زور قلم سے اسے فتح کیا ہے۔ وہ مجلس آرائی کی بجائے رفعت کا آدمی ہے اور اس کی دلچسپیوں کا تنوع زبانوں کی تحصیل اور کلاسیکی ادب سے لے کر موسیقی، عسکریت اور جنگلات کے علم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہفت کشور فی الواقع ایک یولیسس کا سفر ہے۔ جس میں یہ سپاہی اور شاعر

گاہ بالد چو صنوبر گاہ نالد چو رباب

قیمت:- سات روپے

گلڈ اشاعت گھر - اسٹریچن روڈ - کراچی

(داھنی طرف سے) جناب رزاق آدم جی ، صدر مملکت، جناب قدرت اللہ شہاب ،
جناب جمیل الدین عالی (کھڑے ہوئے)، پروفیسر شوکت عثمان اور جناب جعفر طاہر

صدر مملکت ، خدیجہ مستور کا ناول، آنگن ،، ملاحظہ فرما رہے ھیں ، جس پر اس
سال کا آدم جی انعام دیا گیا ۔ (تصویریں داھنی طرف سے) جناب جمیل الدین عالی
جناب قدرت اللہ شہاب ، پروفیسر شوکت عثمان ، صدر مملکت، اور خدیجہ مستور ۔

جاپانی ادیبوں کا جذبۂ خیر سگالی

Secretary General
Qudratullah Shahab

Central Secretary
Jamiluddin 'Aali

Regional Centres
LAHORE
Guild House
Montgomery Road
Phone: 64244
Grams. PAKGUILD
DACCA
Burdwan House,
Phone: 6557
Grams: PAKGUILD
KARACHI
Strachan Road,
Phone: 55554
Grams: PAKGUILD

Literary Organs
Literary Pakistan
(English Quarterly)
Hamqalam
(Urdu Monthly)
Lekhak Sangh Patrika
(Bengali Monthly)

Guild's own Publishing House
operating at
LAHORE
DACCA
KARACHI

Languages represented
URDU
BENGALI
PUNJABI
SINDHI
PUSHTU
GUJRATI
ENGLISH

Pakistan Writers' Guild
(CENTRE)

Phone: 55554 Grams: PAKGUILD

Tsuyako Miyake 三宅艶子

Rikutaro Fukuda 福田陸太郎

Mikio Hiramatsu 平松幹夫

Jun Takami 高見順
(attended at Asian Writer's Conference at Dacca 1956.)

Nobuyuki Tateno 立野信之

Shigeru Goto 五島茂

Sei Ito 伊藤整

Yoko Matsuoka 松岡洋子

Yasunari Kawabata 川端康成

جاپان کے چند ممتاز اہل قلم نے اپنے دستخطوں کی صورت میں پاکستانی ادیبوں کے لئے جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کیا ہے۔ یہ دستخط انہوں نے مرکزی معتمد جمیل الدین عالی کے قیام جاپان کے دوران دئیے تھے۔

سلسلۂ روز و شب

(گلڈ کی سرگرمیاں)

...یوم حسرت

پاکستان رائٹرز گلڈ (سب ریجن) نواب شاہ کی جانب سے ...پل اسلامیہ ہائی اسکول کے وسیع صحن میں ۱۸ مئی کو ... یوم ...رت موہانی منایا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب نادر حسین جعفری ...ر ٹریننگ کالج نے کی۔

کارروائی کا آغاز مولانا حسرت موہانی ہی کی ایک غزل ... کیا گیا۔ جسے کراچی کے ایک شاعر امداد نظامی نے ...نے مخصوص ترنم سے سنایا۔ اس کے بعد ایک اور مہمان ...عر جناب فلک الہ آبادی نے مولانا حسرت سے متعلق چند ...ات پیش کئے اور نواب شاہ سب ریجن کے کنوینر ایم ایم ...نوری اور صدر جلسہ نے مقالات پڑھے۔

یوم حسرت موہانی کے سلسلہ میں ایک غیر طرحی ...اعرہ بھی منعقد ہوا۔ جس میں مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی ...عراء نے بھی شرکت کی۔

...رنی پاکستان سے:۔ حضرت منظر

...اچی سے:۔ انور افسری شعور، امداد نظامی اور ساجد ...

...پور سے:۔ پروفیسر منظر ایوبی۔

...بدر آباد سے:۔ سلطان جمیل نسیم۔

شہداد پور سے:۔ فلک الہ آبادی اور فاضل حمیدی شریک ہوئے۔

منٹگمری (سب ریجن)

۱۶ جون کو صبح دس بجے رائٹرز گلڈ (سب ریجن) منٹگمری کا ایک ہنگامی اجلاس اراکین منٹگمری کے استعفوں پر دوبارہ غور کرنے کے لئے منعقد ہوا۔ یہ اجلاس جناب قدرت اللہ شہاب کی منٹگمری تشریف آوری کے موقع پر خود ان کی اپیل پر منعقد کیا گیا۔ سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ کی نمائندگی کے لئے جناب ریاض انور ممبر صوبائی ایگزیکٹو کمیٹی خاص طور پر ملتان سے تشریف لائے۔ اجلاس کی صدارت جناب حاجی بشیر احمد بشیر نے کی۔ جس کی تحریک جناب جعفر شیرازی نے کی تھی۔

سب ریجنل سکریٹری جناب جعفر نے ایجنڈا پیش کیا جو منٹگمری کے اراکین کا پاکستان رائٹرز گلڈ کی رکنیت سے استعفوں پر جناب قدرت اللہ شہاب کی اپیل پر دوبارہ غور کرنے کے متعلق تھا۔

جلسے میں حاضر اراکین نے متفقہ طور پر صدر جلسہ سے اس موضوع پر کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ:۔

"پاکستان رائٹرز گلڈ اس ملک کے ادیبوں اور شاعروں کے

...ق کے تحفظ اور نگرانی کے لئے قائم کیا گیا ہے، یہ کسی فرد کا
...ی ادارہ نہیں ہے۔ جناب قدرت اللہ شہاب کے خلوص
...قربانی کے نتیجے کے طور پر ایس ادارہ کا اعجاز ہے کہ ایک
...ز پر ایسے لوگ جمع ہو گئے ہیں جو علم و شعور کی دولت سے
...لا مال ہونے کے باوجود ہمیشہ منتشر رہے۔ جناب قدرت اللہ
...ا ب صاحب کی یقین دہانی کے بعد کہ اس جماعت کے معاملات
...تی نگرانی رکھی جائے گی اور ہر گوشے میں اصلاح کی جائیگی
...ب ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ اپنے آپ کو اس جماعت
...ے ساتھ وابستہ رکھیں اس خصوص میں جناب ریاض انور نے
...ن خلوص، محبت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے اس نے ہمارے
...دل کو مسخر کر لیا ہے۔

اپنے دوستوں کو میرا مشورہ ہے کہ جناب قدرت اللہ
...ہاب کی اپیل کو منظور کر لیں اور پورے خلوص کے ساتھ اس
...ارے سے تعاون کریں۔"

حاضرین نے صدر جلسہ کے خیالات سے کامل اتفاق
...ا۔ جناب ریاض انور نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "شہاب صاحب
...ے مجھے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ جب منٹگمری کے مستعفی اراکین اپنی
...ب ضابطہ میٹنگ کریں تو میں ان کی جانب سے اس میٹنگ میں
...رکت کروں اور درخواست کروں کہ وہ استعفی واپس لے لیں، میں
...پ کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور قدرت اللہ شہاب
...احب کی طرف سے ریجنل سکریٹری کی طرف سے اور اپنی طرف
...ے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ کے اس فیصلے
...ے گلڈ کو تقویت پہنچے گی اور اراکین کے مفاد کے لئے آپ جو
...ی کام کریں گے مرکزی اور صوبائی گلڈ آپ کی ہر ممکن مدد کریگی۔

جلسے میں حسب ذیل حضرات شریک تھے۔

بشیر احمد صاحب بشیر (صدر جلسہ) جناب ریاض انور (ممبر
...وبائی کمیٹی ملتان) جناب محمد احمد صاحب، جناب اشرف قدسی، جناب
...مغر شیرازی، جناب محمود اختر رضوی، جناب اے، ڈی، نسیم، جناب ناصر
...ہزاد، جناب شش ارج، عباس جناب گوہر عرش الوری اور جناب عباس اطہر۔

آدم جی انعام یافتہ ادیب کے اعزاز میں عصرانہ

آدم جی انعام یافتہ ادیب جناب شوکت عثمان کی اس خواہش
پر کہ وہ مغربی پاکستان کے ادیبوں سے ملنا چاہتے تھے ۲۱ جون ۶۳ء
کو گلڈ ہاؤس (لاہور) میں ان کے اعزاز میں ایک مختصر سا عصرانہ
ترتیب دیا گیا۔ اس تقریب میں جن ادیبوں نے شرکت کی ان کے
اسمائے گرامی یہ ہیں۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

سید اقبال عظیم — سید وقار عظیم
عبدالمجید بھٹی — احمد ندیم قاسمی
شجاع صاحب — مرزا ادیب
شاطر غزنوی — محمود اختر کیانی

احسان صاحب (نمائندہ کوہستان)

سب ریجن ملتان

پاکستان رائٹرز گلڈ ملتان سب ریجن نے ماہ جون ۶۳ء تک
۱۳ اجلاس منعقد کئے جن میں ۱۲ تنقیدی اجلاس تھے اور ایک خصوصی
تقریب تھی۔

تنقیدی اجلاس کافی معیاری تھے جن میں حاضرین کی تعداد ۲۵، ۳۰
سے کم نہ ہوتی ہوتی تھی، حاضرین میں مقامی ادیب، شاعر، اساتذہ اور
طلبہ شامل ہیں۔

گلڈ کی وجہ سے ملتان میں ادبی سرگرمیوں کو بے حد فروغ حاصل
ہوا، ہر روز شام کو دو گھنٹے کیلئے گلڈ کی لائبریری کھلتی ہے جس میں شائقین
ادب باقاعدہ تشریف لا کر گلڈ کی رونق بڑھاتے ہیں۔

اس وقت ملتان میں دو ہی ادارے تنقیدی اجلاس منعقد
کرتے ہیں ایک گلڈ دوسرا ادارہ فکر و فن۔ کسی زمانے میں لوگ گلڈ کے
نام سے بھاگتے تھے۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ گلڈ سے متعلق
ہونے پر فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔

۲۶ اپریل
صدر: قدرت نقوی
افسانہ: دلشاد قریشی
نظم: صادق منصور

۳ مئی
صدر: شفیع علوی
نظم: سید اقبال گیلانی
مقالہ: عرش صدیقی

۱۰ مئی
صدر: پروفیسر اسرار احمد
مقالہ: قدرت نقوی
غزل: کیفی جام پوری

۱۷ مئی خاص پروگرام
ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ایک شام

وزیر آغا کی شاعری	مقالہ	عرش صدیقی
" " کے انشائیے	"	افتخار حسین شاہ
" " کے ساتھ ایک ملاقات		عتیق فکری
نظمیں اور انشائیے		وزیر آغا

۲۴ مئی
صدر: پروفیسر خالق [illegible]
افسانہ: ڈاکٹر مقصود زاہدی
نظم: فرخ درانی
مقالہ: طاہر خاں

---

۳۱ مئی	صدر	پروفیسر شوکت جعفری
	نظم	عرش صدیقی
	افسانہ	سلیم اختر
۷ جون	صدر	پروفیسر فرخ درانی
	افسانہ	حنیف چوہدری
	غزل	ساغر صدیقی
۱۴ جون	صدر	جمیل الزماں
	مقالہ	تصدق رسول
	غزل	ارشد ملتانی
۲۱ جون	صدر	ابن حنیف
	غزل	عاصی کرنالی
	نظم	عرش صدیقی
۲۸ جون	صدر	عتیق شکری
	مقالہ	ابن حنیف
	غزل	حبیب انصاری

سیاہ حاشیے

ناظم حکمت

عالمی لینن امن انعام یافتہ، ترکی کے عظیم شاعر و ادیب ناظم حکمت
سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ناظم حکمت کا دنیا کے چند عظیم شاعروں اور دانشوروں میں شمار ہوتا
، ترکی کی حکومت نے انھیں ۱۳ سال نظر بند رکھا تھا۔ رہائی کے بعد
ں نے روس میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، روس ہی میں ان کا
مل ہوا۔

پچھلے سال انھیں سوویت شہریت بھی پیش کی گئی تھی۔ ان کا
ی ناول "مانکس" سوویت میگزین "زمانیا" کے شمارہ مئی میں
ئع ہوا تھا اس میں انقلابیوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس
ل کا دائرہ ترکی سے روس تک ہے۔

مولانا محمد سلیمان بدایونی

مولانا محمد سلیمان گزشتہ ماہ کی پہلی تاریخ کو مکہ معظمہ میں انتقال
ر گئے، مرحوم دینیات اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے انھوں نے ایک کتاب
بدایوں ۱۸۵۷ء لکھی تھی جو علمی حلقوں میں کافی مقبول ہوئی۔ ان کے
لی اور تحقیقی مضامین بھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں

آپ کی ایک اور اہم ترین کتاب "بدایوں ۱۸۴۸ ۹ ۶۱ء" زیورِ طبع سے
آراستہ ہو رہی تھی کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔

مولانا مرحوم کراچی کے متعدد مذہبی اور تہذیبی اداروں کے سرپرست
تھے۔ نیز جمعیت علمائے پاکستان کے ایک ممتاز رکن بھی۔

میاں راحت زاخیلی

پشتو کے مشہور شاعر و ادیب اور پرانے صحافی میاں راحت زاخیلی
کا طویل علالت کے بعد گزشتہ ماہ کے آخری ہفتے میں انتقال ہو گیا مرحوم
متعدد کتابوں کے مصنف تھے ان کی طویل نظموں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب
تھا۔ آپ آخری دنوں میں سہ ماہی "شہباز" (پشاور) کے عملۂ ادارت
میں تھے۔ آپ کے انتقال سے پشتو زبان و ادب کے لئے ایک زبردست
نقصان تصور کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسن

اردو کے مشہور عالم، مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) کے ممتاز پروفیسر
ڈاکٹر ہادی حسن کا ۲۳ مئی ۱۹۶۳ء کو انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب ۳۰ سال تک مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رہے
وہ اپنی پرکشش شخصیت اور اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کے

باعث ہندو پاکستان میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کی فارسی، اردو اور انگریزی میں متعدد تصانیف ایسی ہیں۔ جو علمی دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ہادی حسن مرحوم کی پہلی تصنیف "مطالعہ ادب فارسی" انگریزی کی ایک ایسی کتاب ہے جو بلاد یورپ میں بھی کافی پسند کی گئی، یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب مرحوم نے لندن ہی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی لندن سے واپسی کے بعد ہندوستان کی مختلف جامعات میں درس و تدریس کے ذریعہ علم و فن کی خدمت کرتے رہے، جامعہ ملیہ اور شانتی نکیتن کے بعد وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں آخر وقت تک رہے، نہ صرف تشنگان علم کی پیاس ہی بجھانے پر وہ اکتفا کرتے تھے بلکہ اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا بھی ثبوت دیتے رہے، یہ ڈاکٹر ہادی حسن ہی تھے جن کی کوششوں سے علی گڑھ یونی ورسٹی میں میڈیکل کالج کا اضافہ ہو سکا۔

ڈاکٹر ہادی حسن ایک عمدہ ادیب اور ماہر تعلیم ساتھ ساتھ، ہماری تہذیب و شائستگی کا بھی ایک عمدہ نمونہ آپ انگریزی اور فارسی میں بالکل اہل زبان کی طرح روانی تقریر کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو حکومت ایران کی طرف سے ایرانی اعزاز "نشان دانش" ملا تھا، سماجیات کے ممتاز عالم اور لسانیات کے ماہر ڈاکٹر جعفر حسن آپ کے بھائی ہیں جو یونیورسٹی (حیدرآباد (دکن) میں سماجیات کے پروفیسر حیثیت سے کارگزار ہیں۔

ڈاکٹر ہادی حسن ۳۰ ستمبر ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے، ۶۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو

آدم مچھلی شہری

دھواں

——— وہ قہوہ خانے میں آیا۔
اور ہماری میز کے کنارے بن پوچھے ہی بیٹھ گیا۔
ہم باتوں میں کھوئے ہوئے تھے ———
سوچ رہے تھے دنیا کیا ہے
کیا یہ اک اسٹیج ہے جس پر جیون کا ناٹک ہوتا ہے۔
کیا ہم اس بے نام ڈرامے کے ہیں بس فرضی کردار ———؟
اُلجھی تھی اپنی گفتار ———
اور اچانک وہ نو وارد
سگریٹ کا اک گہرا سا کش لے کر ——— اُٹھا
ہم لوگوں کو غور سے دیکھا
اور یہ کہہ کر جانے لگا ———
تم سب اتنا سوچ رہے ہو
مجھ سے پوچھو دنیا کیا ہے ———!
ہم نے سوچا بات کرے گا
لیکن اک برقی سُرعت سے وہ نو وارد جا بھی چُکا تھا
(بیرے نے تبلایا صاحب! آنے والا دیوانہ تھا)
——— اب ہم لوگ یہ سوچ رہے تھے
وہ تو خیر اک فرزانہ تھا
لیکن ہم اِس فکر کے ہاتھوں اک دن پاگل ہو جائیں گے۔
سگریٹ اور کافی کے دھوئیں میں اُڑ کر بادل ہو جائیں گے ———!!

صادق مصوّر

شکستِ شب

مرے خیال میں اب رات ڈھل چکی ہوگی
فضا میں نور کی آہٹ، یہ عنبر کی پرواز
یہ ریشمی سا اُجالا، بہار کی آواز
جہانِ کہنہ کی صورت بدل چکی ہوگی
خلاؤں میں کہیں چاندی پگھل گئی جیسے
نظر میں کھُلنے لگا پھر سے تیری زلف کا طول
مہک اُٹھے ترے رخسار میں بہار کے پھول
نسیمِ صبحِ نگاراں کہیں چلی جیسے
نگاہ محرمِ اسرار ہو چلی شاید
ڈھلک چلا ترے شانوں سے دودھیا آنچل
اُفق میں جاگ اٹھے جانے کتنے رنگ محل
زمیں پہ بارشِ انوار ہو چلی شاید
جبینِ یار پہ شعلہ مچل رہا ہوگا
نگار خانۂ جاناں میں چوڑیوں کی چھنک
وہ ہفت رنگ تجلی وہ آئینوں میں دھنک
حریمِ ناز میں اب دن نکل رہا ہوگا!

ہارفی

نیم خوابی

ں نیند سے چونکایا ہے مجھکو میری بیماری نے
بگی سے جنم لیا ہے شعور کی ناچاری نے
خس و خاشاک کی تہہ سے جھانکا ہو جنگاری نے
بھی نہیں پایا ہے غفلت پر ہشیاری نے
کھلی ہوئی ہیں آنکھیں لیکن دل جیسے بیدار نہ ہو

ے آپکو دیکھ رہا ہے بےبس پڑا ہوا کوئی
ے بدن کے پاس کھڑی ہو روح بدن سے جدا کوئی
ن ہو گئے ہیں اعضا سارے میری نہیں سنتا کوئی
ے کان میں چیخ رہا ہوں آتی نہیں صدا کوئی
آہ وہ حسرت بیداری جو خواب سے بھی دوچار نہ ہو

ری ہوئی ہے حد نظر تک فکر پریشاں کی تفسیر
صورت فتنہ ہے بلا کا ہر منظر ہے اک تعبیر
وائے اجالوں کی ویرانی ہائے اندھیروں کی تعمیر
خیال کے فوارے بنکر کشاں کشاں نظروں کے تیر
دل کی جانب مڑ جاتے ہیں جب ماحول شکار نہ ہو

ریزہ ریزہ نظارہ ہے نقشہ نقطہ نقطہ ہے
ریشہ ریشہ ہے شیرازہ وحدت پارہ پارہ ہے
کچھ موہوم لکیریں سی ہیں بے مفہوم سا خاکہ ہے
دھندا دھندا چڑھا رہا ہے بولو چہرہ کس کا ہے
لرز رہا ہوں آئینہ کی سطح کہیں ہموار نہ ہو

قمر ہاشمی

آخری سفر

میں ـــــ بنوں، کھیتوں، بستیوں سے گزرتا ہوا
آخری منزلوں کی طرف جا رہا ہوں
مجھے خود نہیں کچھ خبر
کتنے دن اور یہ دکھ بسیرا رہے
بجھتی آنکھوں میں کب تک سویرا رہے
زندگی تلخیوں سے بھرا اک سمندر رہے
جس کے کنارے
المناکیاں، رقص ابلیس کرتی ہیں اب
تازہ جھونکے ہوا کے
بدن میں چبھوتے ہیں اب سوئیاں
کیا تعلق قیام و قعود و سفر سے مرا
کوئی رشتہ نہیں زندگی کی سحر سے مرا
زندگی ـــــ جو کبھی ساز و آواز و آہنگ تھی
زندگی ـــــ جو گلوں کی مہک تھی دھنک رنگ تھی
زندگی ـــــ جو کبھی مہ وشوں کے خیالات کی
وادیٔ یاسمن پوش تھی
اب وہی زندگی
جاں گسل درد کے قافلوں کی گزرگاہ ہے
آرزو کی بلائیں یہاں آکے سب مرگئیں
اب یہاں حسرتیں چھاؤنی کرگئیں

عبدالعزیز فطرت

شبِ منوّر کی دلنوازی

(جیمی سٹوارٹ کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

پھر آج شب کچھ نہ لکھ سکوں گا کہ اک جنوں سا ہے مجھ پہ طاری
حسین سرما کا چاند دلوا نہ وار مجھ کو بلا رہا ہے
گھر اے دل بےقرار زنداں سے کم نہیں، قید کون کاٹے؟
کہ منظرِ باغ و راغ جشنِ شبِ منوّر منا رہا ہے
خزاں کی اس بے پناہ ٹھنڈی ہوا میں یہ سیل چاندنی کا
بدن ہے یخ بستہ پھر بھی میری رگوں میں خوں تلملا رہا ہے
بلا کی ہے سرد رات لیکن میں آج گھر پر نہیں رکوں گا
کہ چاند وادی کے ذرّے ذرّے کو جلوہ خانہ بنا رہا ہے
نہ رُک سکوں گا میں آج گھر میں کہ چاندنی میں کشش ہے ایسی
سفینۂ شوق و شعر دریائے نور میں غوطے کھا رہا ہے
سکوت شب میں فضا بھی جزوِ سکوتِ شب بن رہی ہے گویا
سکوت خود کھو کے حُسنِ فطرت میں نغمۂ حُسن گا رہا ہے

☆

عادل منصوری

دوہے

ہردے کا کشکول اٹھائے درد بھرے پہلو میں
ہم جوگی کا سوانگ رچا کر نگری نگری گھومیں

ندی نہانے آئے گوری کھولے لمبے بال
دیکھ کے اس کے روپ کو ندیا بھولے اپنی چال

روٹھ گئی ہے ورشا دیوی مانگے سر کا بھوگ
فصلوں کے سنگ سوکھ گئے ہیں گاؤں کے سارے لوگ

سر پر سورج جلتا ہے اور پاؤں کے نیچے ریت
پیڑ تلے ستالے گوری کوسوں دور ہے کھیت

آشاؤں سے دامن بھر لے بیت چلی ہے رات
من ہی من میں رہ جائے گی ورنہ من کی بات

مُلّاں جی کی باتیں اپنے دھیان میں کیسے آوے
بگلی خود سُسرال نہ جاوے سیانی کو سمجھاوے

سُست نکمے آوارہ بیکار ترنگی کاہل
خوکا بیائے تو کر نہیں سکتے نام رکھا ہے عادل

ن پرداز

بس کا سفر

اس اتفاق کو خدا جانے کیا کہا جائیگا کہ میں بس یا لاری کی
...ے ہمیشہ خوف کھاتا ہوں۔ زندگی میں ایسا کوئی حادثہ بھی
...ں آیا جس نے مجھے ڈرا دیا ہو' پھر بھی میری یہ کوشش ہوتی ہے۔
...سفر نہ ہی جائے تو بہتر ہے' میں نے اپنی اس کمزوری یا خوف
...نظر میں چھوڑیں مثلاً مشاعرے ہی کو لیجئے' شاعر کو کسی
...کی دعوت ملے اور وہ وسیلہ سفر کے بارے میں غور کرے؟
...ست تو بن بلائے ہی پہنچ جاتے ہیں۔ اور پھر منتظمین مشاعرہ کو
...ے کر ہی ملتے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی آمد و رفت کا کرایہ اور "نان
...ی ہی۔ پھر اس مقصد کے لئے وہ کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں؟ کچھ
...نہیں۔ لیکن صاحب ہم سے ایسا کبھی نہ ہوا۔ مشاعروں کی دعوتیں
...ی جی چاہتا ہے کہ جائیں جا کر کچھ سنیں کچھ سنائیں لیکن ذریعہ
...ملات ـــــ!! لاری یا بس ہوا' تو بیگم کی نصیحت نے ہماری
...طے کے سونے پر سہاگے کا کام کر دیا۔ اور بندھے بستر کھل گئے۔
دو مرتبہ خاطر غزنوی (جب وہ پنڈی میں تھا) کہ بڑا مشاعرے باز
۔ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ سوات
ـــــ اور مظفر آباد' سوات کا سفر بہت طویل تھا اور اس
...تے پر چلنے والی بسیں بٹ خیلہ سے لاریاں بلکہ مویشی اٹھانے والے
...ن جاتی ہیں لیکن میں اس سفر کو تھکا دینے والا نہیں کہتا' البتہ
...فرآباد کا سفر بڑا کٹھن رہا۔ بالکل فرانسیسی رانسٹور آندرے ژرید
...ول پر اثر پانے والے ناول "STRAIT IS THE GATE"
...زی خیال کی طرح۔ کہ یہ تنگ راستہ کٹھن تو ضرور تھا لیکن مظفر آباد
...مشاعرہ ہو رہا تھا وہ "نیکی نہ سہی نیکی سے فرار" بھی ہرگز نہیں تھا
۔ اگر ایسا ہوتا تو اس بس میں جو اصلاً و نسلاً لاری تھی' ہمارے
ماہر القادری اور ثاقب زیروی ایسے نیک پاک اور سید
جعفری اور نذیر شیخ ایسے بھولی بھالی شکل والے لوگ ہرگز سوار
نہ ہوتے۔

خیر صاحب' میں خدانخواستہ آپ سے کسی مشاعرے کی روئداد ہرگز عرض نہیں کر رہا۔ بلکہ مذکور اس اتفاق کا ہے جس نے بس کا سفر میری زندگی کا ایک حصہ اور وسیلہ سفر ہی نہیں وسیلۂ رزق بھی بنا دیا ہے ـــــ (آپ یاد رکھیے کہ میں نے بس ڈرائیوری یا بس کنڈیکٹری اختیار نہیں کی) میں جس دفتر میں آج کل ملازم یا "ملازم نما" ہوں۔ وہ میرے گھر سے کوئی دس گیارہ میل دور ہے۔ وہاں جانے کے لئے مجھے ہر روز علی الصبح ریڈ منی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے' یہ انتظار صرف ایک بس پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ سٹاپ بہ سٹاپ انتظار کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں دو سٹاپوں کے درمیان ہوتا ہوں اور بس کھنکاتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے۔ (اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے گھر سے دفتر سے پہنچنے کے لئے ہر روز دو بسوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور واپسی کا کیا مذکور کہ بہرحال گھر پہنچنا ہی ہوتا ہے) بہرحال جس چیز سے میں ڈرتا تھا۔ اب اس کی طلب میں رہتا ہوں بلکہ اب تو کچھ عرصے سے ایسا ہے کہ میں اس سفر سے مانوس سا ہو گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اتوار کی چھٹی بڑی بے کیفی میں بسر ہوتی ہے۔

میں نے بیگم سے ایک روز اس صورتِ حال کا ذکر کیا تو وہ اون سلائیاں ہاتھ سے چھوڑ کر میری طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے کوئی پولیس انسپکٹر کسی مشتبہ آدمی کو اقبالِ جرم پر آمادہ کرنے کے لئے منظر ہی نہیں کھنگال رہا ہو ـــــ اصل میں بیگم کے اس طرح گھورنے کی ایک وجہ بھی ہے۔ اب بات چلی ہے تو آپ سے کیا پردہ' آپ بھی سن لیجئے ـــــ

ہوا یہ کہ میٹروپول ہوٹل کے موڑ پہ سے کچھ خواتین اور کچھ بچے کبھی اس بس میں سوار ہوا کرتے ہیں جو ہمیں دفتر سے لیکر آتی ہے۔

ایک روز اودے رنگ کے برقعے میں مجھے ایک خاتون نظر پڑ گئی
جارجٹ کی دوہری نقاب اُٹھی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ایسا معلوم
ہوا جیسے کسی نے کوئی بہت خوبصورت سا شعر کہہ دیا ہو، لیکن چونکہ
میں خود (بزعم خویش ہی سہی) بہت اچھے شعر کہہ سکتا ہوں۔ اس
لئے میری نظر اُٹھی اور پلٹ آئی۔ اس وقت میری زبان پر جو لفظ
آیا وہ تھا "سبحان اللہ" اور ذہن میں جو فساد "برپا ہوا" اس کا
حاصل شاہ ہاشم کی یہ کافی تھی ؎

دلبر دیکھ ماہ وچ شیشے اوہنوں صورت نظر نہ آوے
پانی دے وچ شیشہ دیکھے آتے اپنا عکس گنوا دے
بیک دیکھ چھا کول دھریا او ہری چک چک مل جاوے
ہاشم آپ ہووے جو شیشہ اوہنوں شیشہ کون دکھاوے

اور پھر یہ آخری مصرعہ وردِ زبان ہو کر رہ گیا۔

اس روز دفتر سے واپس آ کر میں نے بیگم سے جو سب سے
پہلی بات کی وہ اسی خاتون کی تھی۔ میں نے بیگم کو بتایا کہ اُس کا
چہرہ کس قدر نکھرا ہوا، صاف اور معصوم تھا۔ اس کے لباس اور اس
کی چال ڈھال میں کتنی سادگی اور کتنا لوچ رچا بسا ہوا تھا، وہ کسی
اسکول میں پڑھاتی ہے۔

اسکول میں پڑھانے والی "خواتین" کے بارے میں ایک مرتبہ
میرے ایک دوست۔ مہربان۔ افسر۔ دوست نے کچھ باتیں
ایسی بتائی تھیں کہ اب مجھے ایسی ہر خاتون سے خواہ مخواہ ہمدردی
ہو گئی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں۔ بیچاری، بوڑھے ماں باپ کا سہارا
بن کر اپنی امنگوں کا خون کر رہی ہے کبھی خیال آتا ہے، نہ جانے اپنے
کتنے یتیم بہن بھائیوں کی کفیل ہے بعض اوقات یوں بھی سوچتا
ہوں کہ نہ جانے اس غریب پر کتنا بڑا ازدواجی حادثہ گذر چکا ہے!
یہ سب درست ہے کہ پڑھانے والی خواتین کی زندگیاں کسی نہ کسی ایسے
سے ضرور دوچار ہوتی ہیں لیکن کچھ مستثنیات بھی ہوتی ہیں میں ان کا قائل نہیں تھا۔

بیگم نے کھانا پکاتے ذرا سا سوچا (واضح رہے کہ میری بیگم سوچنے
کی مریض نہیں ہیں) اور پھر ایک ہلکی ---- اودی سی آہ کے ساتھ
ہمدردی کا ایک جملہ کہہ کر کام میں لگ گئیں۔ عام طور پر ایسے موقعوں
پر کسی "بیوی" سے اس "گریز" کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن ہمارا
ہی کچھ اور ہے ---- خیر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بیگم کو ہم پر
پورا اعتماد ہے ----!

اس واقعے پر آج کئی مہینے (سال بھی لکھ سکتا تھا) بیت
چکے ہیں۔ جارجٹ کی دوہری نقاب الٹی ہوئی اور اس کے اندر
اور پر وقار تبسم سے مہکتا چہرہ اس دوران کئی بار میری نظر سے
---- میں نے کچھ عرصہ اسے اپنی بھول بھلیوں پھر کچھ مدت تنہا
اور دو چار روز پہلے دو نوجوانوں کی "نگاہوں میں" دیکھا۔ اگلے
جب وہ بس میں بیٹھنے لگی تو وہ پہلے ہی کی طرح تنہا تھی۔ لیکن
دو نوجوانوں میں سے ایک (جو آج تیسرا روز تنہا یہاں ملتا)
اس خاتون کے اودے رنگ کے برقعے سے یوں مس ہو کر بس
مردانہ گیٹ کی طرف آیا۔ جیسے وہ اچک ہی لینا چاہتا ہو۔ لیکن
کی جھکی جھکی نظر اور رکی رکی سانس سے میں نے اندازہ کیا کہ ہو
یہ نوجوان اس خاتون سے چھیڑ چھاڑ کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسے
پر مجھے عام طور پر جوش آ جایا کرتا ہے لیکن اس روز جوش پر
غالب رہا۔ لیکن اس نوجوان کی نگرانی کافی تھی ----!

اس روز بھی گھر پہنچ کر میں نے اپنی بیگم سے ----
کہ ساتھی کہیں جسے ---- سب سے پہلی بات اسی برقعہ
خاتون کے بارے میں کی ---- اس نوجوان نے اس خا
کی ٹکٹ کے انیس [19] نئے پیسے ادا کر دئیے تھے اور وہ بالکل چپ
تھی۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا ---- میرا خون کھو
تھا ---- صرف انیس [19] پیسے ---- صرف ایک سبزی مائل ٹکٹ
---- ؟ انہیں یہ ظلم ہے ---- لیکن یہ ظلم اس نے قبول کر
تھا ---- اور میری بیگم کہہ رہی تھیں ---- معلوم نہ
کیا کہہ رہی تھیں وہ ---- ! ابھی ابھی یاد آیا تھا ----
خیر صاحب اب وہ کچھ بھی کہیں بس یہی کہتا تھا ---- کہ
بس اب بھی چل رہی ہے! لیکن اب میٹرو پول ہوٹل کے موڑ پر سے
پر کوئی سوار نہیں ہوتا ----!

ارف حجازی

یہ گزرگاہیں

(خیبر درۂ تاریخ گر)

بس سورج طلوع ہونے کی دیر تھی کہ فضا منور ہوگئی اور ذرہ ذرہ چمک
ٹا۔ ہم وردی پہنے گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے قطار میں کھڑے تھے۔ اتنے
ں کمانڈنگ آفیسر جیپ میں آگئے اور ہمارے کمپنی کمانڈر نے "سلوٹ" کا نعرہ
ند کیا۔ سب نے کھٹ سے دونوں ایڑیاں ملا کر انہیں سلامی دی پھر تھوڑی
ر کے بعد ہمیں ہی "بھتری ٹن" لاریوں میں سوار ہونے کا حکم ملا تو ہماری خوشی
کوئی حد نہ رہی۔ اس وقت میرے دل میں طرح طرح کے پرمسرت خیالات آئے
اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خیبر دیکھنے نہیں بلکہ کسی فردوس کی طرف جا رہا
ہوں۔

ہم رسالپور چھاؤنی سے درہ خیبر دیکھنے جا رہے تھے۔ دنیا کی اہم
ترین شاہراہ جس کی تاریخی اہمیت کی کوئی حد نہیں جس نے برصغیر پاک ہند
کی قومی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کیا ہے
اسی درے سے سکندر اعظم برصغیر میں داخل ہوا تھا۔ کبھی محمود
غزنوی کے لشکر جرار کے نعروں سے اس کی چٹانیں لرز اٹھی تھیں۔ اسی راستے
ظہیرالدین بابر کی وارد ہند ہوا تھا۔ اسی رہگزر سے نادر شاہ ہندوستان
یا اور ابدالی لشکر بھی اسی راہ سے گزرا تھا۔ اور نہ جانے ایسے کتنے قافلے،
کاروان اور مسافر ہوں گے جو گزرگاہ خیبر سے ہزاروں بار آئے اور چلے گئے
اور آج بھی اسی راستے سے سینکڑوں مسافر اجنبی اور دنیا کے بڑے بڑے
سیاح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

میں لاری کے ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا اور ذہن میں شاہراہ خیبر
کی عظمت جلال، شہرت اور زمانۂ ماقبل تاریخ کے ادوار سے لیکر دور حاضر
تک کے تاریخی واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی بڑے
ہشاش بشاش بیٹھے قہقہے لگا کے ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول تھے،
لیکن جب لاری کی رفتار تیز ہوگئی تو ان کی باتوں کی آواز بھی اس کے شور میں
ڈوب گئی۔ نوشہرہ سے گزر کے اب ہم سیدھی سپاٹ صدیوں بوڑھی جرنیلی
سڑک پر نکل آئے تھے جس کے ایک طرف دریائے کابل بہہ رہا تھا۔ سرحد کا
مست خرام تیز رفتار دریا جس کی پرشور لہروں سے زندگی کے ابدی نغمے پھوٹتے
ہیں۔ یہ وہی دریا تھا جسے میں وادئ مہمند میں بھی دیکھ چکا تھا۔ آخر تھوڑی
دیر میں دریا بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب چاروں طرف ارمان
انگیز نظارے تھے۔ حسین سبزہ زار اور چراگاہیں تھیں۔ اور چٹیل ٹیلے تھے۔ گیہوں
جو اور چنے کی فصلیں کھڑی جھوم رہی تھیں جہاں پٹھان کسانوں کی ٹولیاں
کام کر رہی تھیں، ان کے مویشی ہری ہری گھاس پر چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ ان
پٹھانوں کو اس طرح کام کرتے دیکھ کر پشتو لوک گیتوں کی دلکش تانیں ذہن
میں ابھر آئیں جن کے زیر و بم میں زندگی کی جست و خیز محسوس ہوتی ہے۔

ان دلفریب مناظر کو دیکھتے ہوئے ہم پشاور پہنچے پھر تھوڑی
دیر میں چھاؤنی آگئی جہاں ہماری لاریاں دم بھر کے لئے ٹھہر گئیں لیکن
ہم میں سے کسی کو بھی اترنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس لئے ہم سب
چپ چاپ بیٹھے رہے بس گھڑی دو گھڑی سانس لینے کی دیر تھی کہ ہمار
چھوٹا سا کارواں جمرود کی طرف روانہ ہوگیا اور شمال مغرب کی طرف
مڑ گئیں۔ گیارہ میل کا سفر منٹوں میں طے ہوگیا اور ہم وادئ خیبر کی
پہلی چوکی جمرود پر پہنچ گئے جہاں سیاحوں اور مسافروں کے اجازت

پیچھے جاتے ہیں یہیں ہمیں ایک چھوٹی سی ٹیکری پر ایک قلعہ نظر آیا جس کا بیشتر
حصہ مٹی کا بنا ہوا تھا۔

جمرود سے تین میل دور نکل آنے کے بعد کوہستانی سلسلے شروع ہو گئے
۔ ان پرپیچ پہاڑوں کو غور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوا جیسے دو کنگھوں
کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہو ان کا دشوار گزار پیچ و خم کچھ ایسا ہی تھا اور ہماری لاریاں ان کی تنگ راہوں میں چکر کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھی۔ اب ہمارے دائیں بائیں تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی چٹانیں نظر پڑیں۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا کہیں کہیں میلوں گزرنے کے بعد کوئی چھوٹی سی وادی آجاتی تو چند بھیڑیں بھی چرتی ہوئی دکھائی پڑ جاتیں اور ایک آدھ آدمی کی صورت بھی نظر آجاتی۔ اس کے بعد پھر وہی ہمارا قافلہ کالی کوٹھاری کی سڑک تھی جو کبھی ریلوے لائن کے متوازی آجاتی اور کبھی تاریک سرنگوں میں لاپتہ ہو جاتی اور پھر کہیں اچانک یہ ریلوے لائن ہماری سڑک کے اوپر سے یا کبھی سڑک کے نیچے سے گزر جاتی۔ ہم بڑی دیر تک ان پہاڑوں کی پر ہول بھول بھلیوں میں چکر لگائے بلندی پر جا رہے تھے۔ اور ہمارا ساتھی نواز خاں لدار جو مردان کا رہنے والا تھا بڑے مزے سے اپنی بانسری بجا رہا تھا اس نے اکتا دینے والی خاموشی میں زندگی کی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ اس کی بانسری کے میٹھے بول لاری کے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر خیبر کی متوازی چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے کھلی فضاؤں میں منتشر ہوتے یوں محسوس ہوتا جیسے ذرے ذرے سے نغمے پیدا ہو رہے ہیں پھر وہی نغمے دور آسمانوں میں گم ہو جاتے اور نواز خاں لمحہ بھر سانس لیکر پھر کوئی دوسری دھن چھیڑ دیتا۔ دوسرے ساتھی تالیاں اور چٹکیاں بجا بجا کے جھومنے لگے اور "واہ" اور "آہ" کہتے ہوئے خود بھی گنگنانے لگے۔ اس پر میرے ہمسفر گل بگیا ڑے گھنگھرو بند ہاتھوں کی دلکش تھاپیں کچھ اور ہی کیفیت پیدا کر دیتیں۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے میں کسی سرحدی گاؤں کے چھوٹے سے حجرے میں بیٹھا ہوا "مہ پارہ" کا رقص دیکھ رہا ہوں!

یونہی گاتے بجاتے ہمارا سفر بڑے مزے میں کٹ رہا تھا اور ہم تنگ اور عمیق گھاٹیوں، چھوٹی چھوٹی شاداب چراگاہوں، تیز رفتار ندیوں نالوں اور آئینہ جیسے چشموں اور کبھی کسی حصار بند گاؤں کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کبھی کوئی سبز پوش وادی سامنے آجاتی تو پھر مجھے "الف لیلیٰ" کے کسی حسین منظر کا خیال آجاتا اس چھوٹے سے حسین گوشے کو دیکھ کر میرا دل چاہتا کہ میں اپنی لاری سے اتر کر خیبر کے ان نو بہادروں سے ملوں جو اپنی بھیڑوں کو چراتے چراتے ہماری لاریوں کی طرف متوجہ ہو جاتے اور خوشی سے شور مچاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ ان آزاد مجاہدوں کے مسکراتے چہرے، تیکھے نقشے، کڑے تیور اور دلنشیں جرارت آموز ادا دیکھ کر اقبال کے شاہین بچوں کا تصور مجسم ہو کر سامنے آگیا۔ مجھے اس وقت ان کی شفیق و جری ماؤں کی تہور آفریں لوریاں یاد آگئیں۔ مجھے یاد آیا کہ سر شام ہی سے اپنے چہیتے بیٹوں کو بہادری اور وطن کی محبت کا سبق دیتے ہوئے بڑی پرسوز آواز میں لوریاں دینے لگتی ہیں۔

"آج تیری میٹھی نیند سونے کی گھڑی ہے
کل تیرے سامنے میدان سر کرنے کی گھڑی ہوگی"

اور ان جری ماؤں کی لوریاں بھی جب شام کے اندھیروں میں گونجتی ہیں تو جیسے ہر چیز میں جرارت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بچے ان لوریوں کو غور سے سنتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں مگر ماں کی محبت بھری لوری تو کچھ اور ہی سماں کھینچ دیتی ہے وہ اپنے لخت جگر کو جب لوری دیتی ہوئی یوں خطاب کرتی ہے ؂

"تیری دو موٹی آنکھیں آسمان کے ستاروں جیسی ہیں۔ تیرا گورا ماتھا شاہجہاں کے تخت کی مانند ہے دونوں پتلی پتلی باہیں ایرانی تلوار ہیں میں صدقے تیرے بیٹا!"

اور نجانے ایسی کتنی لوریاں اور گیت ہیں جن میں جادو بھرا ہے وہ جادو جو بزدل سے بزدل میں بھی جرارت ہمت اور حب الوطنی کی روح پھونک دیتا ہے۔

میں ابھی انہیں شیریں لوریوں کی فضاؤں میں گم تھا کہ نواز کی بانسری کے بول جیسے کسی گہری گھاٹی میں ڈوب گئے۔ میں نے انگڑائی لے کر باہر جھانک کر دیکھا تو دور دور تک کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ خنک ہوا کے جھونکوں سے تازگی محسوس ہونے لگی۔ تین ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھنے کے بعد ہماری لاریاں "شاہ گئی" کی چوکی پر پہنچیں یہاں سے سڑک ڈھال کی طرف اترنے لگی اور "تور خم" تک پہاڑی ڈھلانوں پر چکر لگاتی ہوئی چلی گئی۔

جیسے جیسے ہماری لاریاں "تورخم" کی طرف اتر رہی تھیں سربلند
چٹانیں بڑا حسین منظر پیش کر رہی تھیں اور دور سے یوں معلوم
ھا جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے انہیں مختلف صورتوں میں تراش
ر دیا ہے۔ ان میں سے دو چار چٹانیں ایسی بھی نظر آئیں جنہیں دیکھ
کانگ" کی سنتین کی چٹانیں یاد آگئیں۔ "اماہ" کی چٹان اور
کی چٹان کا روائتی پس منظر بڑا
ن انگیز اور ایک بڑا المیہ پیش کرتا ہے ہانگ کانگ کیا سارے
ان سے متعلق بڑے دلچسپ افسانے مشہور ہیں۔ "اماہ" کی
ور شوہر پرستی کی مثال ایسی ہے، جسے چین کی عورت کبھی نہیں
ی۔ اس بیاہی لڑکی نے اپنے پیارے شوہر کے انتظار میں (جو
گیا ہوا تھا) راہ تکتے تکتے اپنے بچے سمیت پتھر کا روپ دھار لیا
ور آج بھی آندھیوں، طوفان و باد و باراں کے باوجود وہ اسی
رخاموش، تصویر غم بنی کھڑی ہے اور اپنے شوہر کا انتظار کر رہی
۔ دنیا کے بڑے بڑے المیوں میں "اماہ" ایک ایسا زندہ جاوید کردار
، ایک چین ہی کیا دنیا کا کوئی گوشہ اسے بھلا نہیں سکتا۔ دنیا میں
انے اور کتنی پہاڑی چٹانیں، درے اور گزرگاہیں ہیں۔ جن سے
ں افسانے اور تاریخیں وابستہ ہیں۔ پھر گزرگاہ خیبر تو ہمارے
ے ایک زندہ مثال ہے وہ تو "تاریخ گر" بھی ہے ۔۔ جس کے بغیر شاید
ی تاریخ نامکمل رہ جاتی۔!"

یہ سوچ کر میں پھر وادئ خیبر کی کوہستانی بھول بھلیوں میں واپس آ
یرے ساتھی آپس میں باتیں کر رہے تھے، نواز خاں، گل بگیا ڑ نواز
چٹکی بھر کے آنکھیں بند کئے بیٹھے اونگھ رہے تھے اب ہمارے
ی آخری منزلیں طے ہو چکی تھیں بس تھوڑی دیر کا سفر اور باقی تھا
ے پھر ایک بار وادی کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا تو مجھے خیال آیا
رت تو خود اپنی مورخ ہے اور اس نے اپنی تاریخ کے بیش بہا
ے خیبر جیسی رہگذاروں، دروں اور پہاڑوں کے بے ہنگم چٹانوں میں
کھے ہیں۔ جنہیں بڑی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔"

میں انہیں چٹانوں میں محو تھا کہ ایک قلعہ نظر آیا۔ میں نے
خاں سے دریافت کیا "کیوں بھئی خان یہ کونسا قلعہ ہے؟"

"علی مسجد" نواز خاں نے ہوشیار ہو کر جواب دیا۔

"ارے علی مسجد کیا، یہ تو قلعہ ہے"

یہ سنکر نواز خاں مسکراتے ہوئے بولا "خو بائی علی مسجد قلعہ کا نام ہے بائی۔ مسجد کا نئی۔"

"خوب نام ہے"

نواز خاں پھر اونگھنے لگا۔ اب میں نے لاری سے جھانک کر دیکھا تو ہماری سڑک سے کئی سو فٹ نیچے ایک ندی بہہ رہی تھی قریب ہی ایک آب کش لگا ہوا تھا جو قریب کی چوکیوں میں آب رسانی کے کام آتا ہے۔ اس کے آگے جب ہماری لاریاں اور بڑھیں تو پھر ایک بڑا خطرناک موڑ آیا ایک طرف ندی بہہ رہی تھی اور دوسری طرف سربلند چٹان کھڑی تھی۔ یہاں سے کوہستان "عرتھاس" کی دو ہزار فٹ بلند چوٹی صاف نظر آ رہی تھی جہاں "ذکار خیل" قبائل کے ساتھ مینار بنے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف سطح مرتفع "لوگی شنواری" تھا۔ (یہ سطح مرتفع سات میل لمبی اور تین میل چوڑی ہے) جو لنڈی خانے (جسے لنڈی کوتل بھی کہتے ہیں) پر آ کے ختم ہو گئی تھی۔ لنڈی خانے میں انگریزوں کے عہد کا ایک قلعہ بھی دیکھنے میں آیا۔ پہاڑوں سے گھری ہوئی تنگ وادی میں لنڈی خانہ کی بستی ہے جہاں ایک چھوٹی سی چھاؤنی اور پہاڑ کے دامن میں ایک بازار بھی ہے یہ مقام خیبر کی ایک مشہور منڈی کی حیثیت بھی رکھتا ہے جہاں بازار لگتا ہے اور لوگ دور دراز سے اپنی ضروریات کا سامان اور مولیشی خریدتے ہیں اور اسی مقام پر ریلوے لائن بھی آ کے ختم ہو جاتی ہے۔

لنڈی خانہ سے تورخم قریب ہی ہے اب ہمارے سفر کی آخری منزل آنے والی تھی کہ لاریوں کی رفتار سست پڑ گئی اور ہم ایک کوہستانی نالے کے کنارے تھوڑی دور جانے کے بعد ٹھہر گئے۔ میں نے کھڑے ہو کے باہر دیکھا تو ہماری چاروں لاریاں اور کمانڈنگ آفیسر کی جیپ جس میں ہمارے کمپنی کمانڈر بھی سوار تھے، آگے پیچھے ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ اتنے میں حولدار میجر اتر کر جیپ کے قریب گئے اور سلوٹ کیا۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو ہمیں ڈسماؤنٹ اترنے کا حکم دیا اور ہم لوگ

دو چار کی ٹولیاں بنا کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔
اجنبی پہاڑوں کے پر پیچ مناظر جیسے آسمان سے باتیں کر رہے
ہ جس مقام پر ہم کھڑے تھے وہ ہماری سرحد کی آخری "حد" تھی جس
علامت کے لئے ایک گیٹ بھی بنا ہوا تھا اس میں لوہے کی موٹی سی زنجیر
ہوئی تھی اور سڑک روک دی گئی تھی۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ بڑی
رتک تار کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ گیٹ پر لکڑی کی تختی پر لکھا ہوا تھا
اک - افغان سرحد" اور ساتھ ہی دوسری سطر میں تحریر تھا "بغیر
سپورٹ دکھائے سرحد پار کرنا جرم ہے" (یہیں سے ڈیورنڈ)
ئن گزرتی ہے)
میں اور نواز خاں اور گل رنگیاڑ باتیں کرتے ہوئے ایک چھوٹی
چٹان پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے "رائل افغان میل" نامی
ں کھڑی تھی جس میں سے پاکستان کی ڈاک اتاری جا رہی تھی۔ نواز
ں اور گل بگیارڑ کے لئے یہ کوئی نئی جگہ نہ تھی مگر میرے لئے تو یہ اجنبی
ہ تھی۔ خیبر کی آخری سرحدی چوکی "تورخم" جہاں دو مملکتوں کی سرحدیں
ر ملتی ہیں۔ اسی مقام سے بیرونی دنیا کے لوگ اپنا کلچر لے کر برصغیر میں

داخل ہوئے تھے اور آج میں اس گزرگاہ کی صدیوں پرانی سرحد پر کھڑا
ہوا تھا۔ مسافر، سیاح کی طرح نہیں ایک وطن پرست صاحب دل انسان
کی طرح ایک سپاہی کی طرح اپنے وطن عزیز کی پاسبانی کے لئے اپنا تن
من دھن سب قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ میں بڑی دیر
تک اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ اصل رہگذر جہاں سے باہر کے حملہ
قافلے اور حملہ آور کبھی گزرتے تھے اب وہ اپنا روپ یکسر بدل چکی تھی۔
اس کی جگہ پختہ صاف و شفاف کولتار کی کالی سڑک تمازت آفتاب سے
چمک رہی تھی جسے انگریزوں نے ۱۸۷۹ء میں دوسری جنگ افغان کے
دوران بنوایا تھا اور پھر ۱۹۲۰ء میں اسے اور وسیع کر کے دوگنا چوڑا
کیا گیا تاکہ موٹروں کی آمد و رفت کے قابل بن جائے۔
تھوڑی دیر گھومنے پھرنے اور نظارہ کرنے کے بعد ہم لوگوں
نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے
اس وقت خنک ہوا کے سرسراتے جھونکے بڑا لطف دے رہے تھے او
مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جنت کی کسی سربلند
وادی میں بیٹھا ہوا آنے والے دور کے سہانے خواب دیکھ رہا ہوں

ں اسحٰق نعمانی

شبلی

شخصیت کے تین رخ

شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے
ہ نالمثنوی سے لیکر سیرت النبیؐ تک شبلی کی ہر تخلیق دیکھ جایئے
یں آپ کو ہندوستان کی تاریخ کی ہر واردات کسی نہ کسی
رت میں مل جائے گی۔ ان کی سیاسی نظمیں۔ ناموران اسلام
ے سوانح کا سلسلہ۔ علم الکلام کی از سر نو تشکیل۔ شعر العجم کی
دین، ندوہ کی تحریک اور اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی تعمیر
یں آپ کو جگہ جگہ اس بیدار شعور کی جھلک دکھائی دے گی۔
ہوں نے وقت کے تقاضوں کو پہچانا تھا اور اس کے مطابق اپنی
شخصیت کی تعمیر کی تھی۔

شبلی کی نشو و نما جاگیردارانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ ان
کے والد شہر کے سب سے اچھے وکیلوں میں شمار کئے جاتے تھے
ان کے یہاں نیل کی بہت اچھی تجارت ہوا کرتی تھی۔ اور کئی ہزار
روپیوں کی مالگذاری کی زمینداری تھی۔ خود شبلی کی ابتدائی
تربیت بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور انھیں اس زمانے کے
بہترین عالم مولانا فاروق چریاکوٹی نے تعلیم دی تھی۔ ان سب
چیزوں کے بڑے دور رس اثرات شبلی کی شخصیت میں ملتے
ہیں اور یہیں سے ہمیں شبلی کی شخصیت کے تین اہم عناصر انانیت
بور ژوائیت اور رومانویت کا سراغ ملتا ہے۔

شبلی کی انانیت بڑی غیر مصالحانہ
تھی انھوں نے زندگی میں کئی بار مات کھائی
لیکن انھوں نے ہار کبھی نہیں مانی اور ان کا جیتنے والا ان سے
جیت کر بھی فتحیاب نہ ہو سکا۔ وہ ہار کر بھی سرخرو رہے اور
ان کا جیتنے والا جیت کر بھی ان سے ہراساں رہا۔ وہ خود کو
مصیبتوں میں گھرا ہوا پا کر خوش ہوتے تھے۔ اسی لئے انکی ساری
زندگی لڑنے اور ہارنے میں گذری اور پھر بھی رجائیت کا دامن
ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ان کی ایک ٹانگ جب گولی لگنے سے
کٹ گئی۔ تو بڑے مزے میں چوٹ کی تکلیف سے میٹھے میٹھے
درد کی لذت حاصل کرنے لگے۔ اپنے ایک شاگرد کو اس کے
متعلق لکھتے ہیں "میں لکھنؤ میں اگر کوٹھے پر چڑھوں تو حضرت
ابلیس کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا" اور اکبر کو اپنی داستان
سناتے وقت وہ یوں لطف اندوز ہوتے ہیں ؎

لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

آزادی کی اس سے بڑی مثال ملنا مشکل ہے۔ خود اپنے کو تختۂ مشق بنانا آسان کام نہیں ہے اور اپنے اوپر ہنسنے کے لئے بہت بڑا دل چاہیے۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کہا ہے کہ "شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے" شبلی مسلمانوں میں پیدا ہونے والے پہلے یونانی ہوں یا نہ ہوں وہ میدان ادب کے تیمور یقیناً تھے۔ تیمور بادشاہ بے زیادہ نڈر، جری، بیباک اور جفاکش سپاہی تھا۔ وہ لڑتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ لڑائی کے لئے وہ میلوں سفر گھوڑے پر طے کر سکتا تھا اور اس کے لئے اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو سکتا ہے ایسی شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ شبلی نے اپنا مذاق بھی اڑایا تو "تیمور" کہہ کر جس کا لنگ اس کی بہادری کی علامت ہے اس سے ان کی ذہنی جبروت کا اندازہ ہوتا ہے یقیناً وہ نڈر۔ جری اور بیباک انسان تھے۔ ان کو اپنے اصولوں اور عقائد پر مکمل اعتماد تھا اور ان کی وہ تقریباً پرستش کرتے تھے۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے چاہے اچھا ہو یا برا اس کو اسکی انتہا تک پہونچا دیتے تھے۔ جذبہ کو اس انتہا پسندی کی بنا پر میں انھیں تیمور سمجھتا ہوں "عقیدہ" اور عقیدے پر "یقین" کے بغیر عظیم ادب کی تخلیق ناممکن ہے۔ شبلی کے یہاں خود اعتمادی کا سلسلہ ان کی انانیت سے ملتا ہے اسی لئے ان کی انانیت خطرناک میلانات کا شکار نہیں ہوئی۔

انانیت عظیم ادب کا ضروری جزو ہے۔ جو شخص خود کو "کمترین" "ہیچمدان" اور "خاکسار" کہے گا اس کی ساری عمر خاکساری میں ہی بیت جائے گی۔ اچھا ادب خاکساری میں خود اعتمادی سے پیدا ہوتا ہے۔ "تم" کہہ کر مخاطب کرنے والے کی بات ممکن ہے آپ کو ناگوار گذرے لیکن اس کے "اعتماد" کا معترف ہوئے بغیر آپ نہیں رہ سکتے۔ شبلی نے "تم" کا لفظ بار بار استعمال کر کے ناظرین کو کمتر نہیں سمجھا بلکہ اپنے نظریات کی ان سے تصدیق کرائی ہے۔

شبلی کے یہاں انانیت اپنے نظریات پر اعتماد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس تعلق خود ان کی ذات سے ہوتا تو وہ "نرگسیت" کے شکار ہو جاتے۔ وحید قریشی نے "حیات معاشقہ" میں بڑی دقت نظری کے ساتھ شبلی کے یہاں نرگسیت کا سراغ لگایا ہے ان کا کہنا ہے کہ "ان کی ساری زندگی ایک مستقل جد و جہد رہی جس میں فتح کم اور شکست زیادہ تھی۔ اس شکست کا شمار وہ ابتدائے حیات سے کرتے رہے اس لئے اگر ان کی نرگسیت کو ایک ٹیڑھا خط تصور کیا جائے بیجا نہ ہوگا ـــ اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے انکے تعلقات شروع ہی سے اچھے نہ تھے اور زمانہ کے ساتھ ساتھ نفرت بڑھتی چلی گئی ـــ شبلی کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی تھی، ان کے بعد باپ کی توجہ انگریزی کی طرف ہوئی اور ان کے چھوٹے بھائی کی تربیت کا طرز انگریزی ٹھہرا اس میں انھیں اپنے بھائی میں علم کے وہ آثار نظر آنے لگے جن میں علامہ کو اپنی شکست نظر آتی تھی مہدی کے ولایت جانے نے تو ان میں ایک عجیب احساس پیدا کر دیا تھا ۱۸۷۹ء میں مہدی نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا شبلی اس میں فیل ہو گئے۔ واقعات کی ان کڑیوں سے نرگسیت کو اس اعصاب زدہ ہیئت کی بنیاد پڑ گئی جو بعد میں طرح طرح ظاہر ہوئی[1]۔ لیکن اپنی کمزوریوں کے اعترافات جو جگہ جگہ شبلی نے کئے ہیں انہیں وحید قریشی نظر انداز کر گئے۔ مثلاً ان کا بیٹا خفا ہو کر گھر سے چلا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دئیے[2] باہمی اختلافات کے باوجود والد اور چھوٹے بھائی مہدی کے انتقال پر بار بار اپنے غم کا اظہار کیا[3] یا سوتیلی ماں سے والد کی زندگی میں کبھی ملنے نہیں گئے۔ لیکن والد کے انتقال کے بعد ملاقات کی[4] یا مولوی سمیع اللہ نے حبیب علی گڑھ سے الگ ہو کر الہ آباد میں بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی تو ان کی مخالفت کی لیکن منشی ...

---

[1] شبلی کی حیات معاشقہ، از ڈاکٹر وحید قریشی ص ۲۵-۲۶ [2] حیات شبلی ص ۷۷۷ [3] ملاحظہ ہو مکاتیب حصہ اول صفحہ ۹۷ و نیز "مقالات شیروانی" ص ۱۷۸ [4] ملاحظہ ہو حیات شبلی

...ہ کو تعمیر کرنے وقت ان کی خدمات کو سراہا۔ یا علی گڑھ والوں
...اختلاف کے باوجود ندوہ کی تنظیم میں ان کے تجربے سے
...اٹھایا۔ نیز ان کو اس کا افسوس رہا کہ ندوہ دارالعلوم علی گڑھ تک
...سکا [1] انگریزوں سے شدید نفرت کے باوجود انکی علمی
...ات کی نہ صرف جگہ جگہ تعریف کی بلکہ اس سے فائدہ اٹھایا [2]
...چیز کے حق میں ہوتے اسے آسمان پر پہونچا یا [3] کسی سے
...ہو جاتے یا کوئی بات مزاج کے ناموافق ہو جاتی تو سخت
...ظ میں اس کی مذمت کرتے لیکن جیسے ہی غصہ ٹھنڈا ہو جاتا
...غصہ کی لہر گزر جاتی تو اپنی سخت کلامی پر نادم ہوتے اور شخص
...متعلق سے معافی مانگ لیتے [4]

مندرجہ مثالوں کو اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ان
...کوئی اہم بات نظر نہ آئے گی۔ لیکن گہرائی میں جانے کے
...ہمیں بہت سے ایسے عناصر کا سراغ ملے گا جنھوں نے شبلی
...شخصیت کی تعمیر میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ شبلی اگر نرگسیت
...کا شکار ہوتے تو نہ تو یہ "اعتراف" کرتے اور نہ شعر العجم اور
...علم الکلام کی تخلیق۔ نرگسیت ایک ایسا نفسیاتی مرض ہے جو ذہن
...کی پراگندگی اور منفی قدروں سے غیر شعوری لگاؤ کی بنا پر
...انسان کو نہ صرف اپنی غلطیاں تسلیم کرانے سے روکتا ہے
...بلکہ ذوق لطیف کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ شبلی کو
...جب بھی اپنی رائے بدلنے کا موقع ملا (حتی کہ مذہبی خیالات
...کے بارے میں بھی) انھوں نے اپنے نظریات پر نظر ثانی کی۔ لیکن جب
...تک کسی نظریہ کو صحیح سمجھا اس پر پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ
...یقین رکھا۔ ایسا آدمی "نرگسی" ہو ہی نہیں سکتا۔ جو انانیت
...(باوجود خرابی صحت کے) سیرۃ النبیؐ کے متعلق شبلی سے یہ
...کہلوائے کہ "ہر حالت میں میں کام جاری رکھوں گا" اور اگر مر
...گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی
...کتاب دے جاؤں گا جسکی توقع کئی سو برس نہیں ہو سکتی [5]

نرگسیت میں وہ جوہر ہے جسے دکن سے لیکر شمالی و مشرقی ہندوستان
اور مشرقِ وسطیٰ کی خاک چھان کر انھوں نے حاصل کیا تھا اور
یہی وہ فاعات قوت تھی جس کے بغیر الفاروق ایک خشک
تاریخی کتاب ہوتی اور شعر العجم واقعات کی کھتونی۔

بالزک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بورژوا ماحول
کی پیداوار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ دنیا کا عظیم ترین
ناول نگار مانا جاتا ہے۔ میں نے یہاں بالزک کا نام خاص طور
پر اسلئے لیا ہے کہ بورژوا ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود
اور اس کے مزاج میں بورژوائیت کے عناصر ہونے کے باوجود
وہ خود بورژوا نہ تھا۔ اور اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا
کیونکہ اس کے ناول اس ماحول کے کھوکھلے پن کو بے نقاب
کرتے ہیں۔

شبلی کے مزاج میں بھی جاگیردارانہ نظام کی بو اور بورژوائیت
بڑی شدت کے ساتھ ملتی ہے اس سلسلے میں چند مثالیں
ملاحظہ ہوں

(۱) مولانا (شبلی) بہت نفیس مزاج تھے اور ہر کام سے ستھرے
طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔" یادایام ص ۱۲۰

(۲) مولانا لطیف غذاؤں کے عادی تھے۔ یادایام ص ۱۱۹

(۳) مولانا نہایت نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ یادایام ص ۱۱۷

(۴) یہاں سب سے زیادہ مجھ (شبلی) کو یہ بات پسند آئی
کہ تمام دوکاندار اور پیشے والے، حتی کہ قلی اور مزدور بھی نہایت
خوش وضع اور پاکیزہ لباس تھے" سفرنامہ ص ۱۵

(۵) یہاں کالجوں میں میں نے یہ بات عموماً دیکھی اور مجھ کو
بہت پسند آئی کہ مینیجر معزز رتبہ کا آدمی ہوتا ہے اور اس
کی طرز معاشرت سے عزت اور شان ظاہر ہوتی ہے" سفرنامہ ص ۵۱

(۶) سونے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس دور تک کسی سونے
والے کے خراٹے کی آواز نہ سنائی دے سونے نہیں دیتے تھے۔

---

[1] یادایام۔ از عبدالرزاق کانپوری ص ۱۳۷ [2] مثلاً خط بنام شروانی ص ۳۲ [3] یادایام ص ۱۳۷ [4] اس سلسلہ ... [5] خط بنام زہرہ فیضی (نمبر ۶ اور ۷) اور بنام محمد عمر (نمبر ۱) اور بنام مولوی سمیع (نمبر ۲۸)

باہر والوں کی نقل و حرکت ناگوار ہوتی۔ وہ ٹائم پیس رکھتے تھے اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی نیند میں خلل انداز ہوتی تھی" حیات شبلی ص ۷۸۔

لیکن ان مثالوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شبلی شعوری طور پر بورژوا تھے ان کے مزاج میں بورژوائیت اسلئے رچ بس گئی تھی کہ وہ بورژوا طبقے کے ایک فرد تھے، زندگی کے ابتدائی دور میں حسب انسان کا مزاج ماحول کے مطابق ڈھلتا ہے شبلی کے یہاں نازک مزاجی، نفاست پسندی، گندگی سے نفرت، سحر خیزی اور چائے نوشی وغیرہ عادت بن کر داخل ہو چکی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی جنید اسٹیشن سے صرف اس لئے لوٹ آئے تھے کہ پتلون کی کریز راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے ایسے ماحول کا پروردہ غیر شعوری طور پر بورژوائیت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن شبلی نے اس ماحول سے کبھی مصالحت نہیں کی۔ وقت آنے پر باپ کی مرضی کے خلاف اور ہر قسم کا آرام و آسائش چھوڑ کر حصول علم کے لئے فاقے کر کے بھی لاہور جانے کیلئے راضی ہو گئے۔ لاہور میں ان کی زندگی بڑی تنگدستی سے گذری لیکن انھوں نے اسے برداشت کیا۔ ایک بار مسعود علی ندوی صاحب کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں" افسوس ہے کہ مجھے اصولی امر میں اختلاف ہے۔ میں ۳۰ برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں۔ خوب دیکھا۔ اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے (مکتوب ۵ نومبر ۱۴ء)

اس کے علاوہ "اسلامی تاریخ کے نقائص" گنواتے وقت انھوں نے سب سے زیادہ اس بات کا گلا کیا ہے کہ "اس میں بادشاہوں اور امیروں کی خارجی زندگی کو زیادہ وقعت دی گئی ہے سوشل تمدن، انتظامی اور ذہنی جزئیات تقریباً مفقود ہیں" اپنی بورژوائی خصلتوں پر شبلی نے کبھی فخر نہیں کیا، زہرہ فیضی سے ایک خط میں اپنی مخصوص عادتوں کے بارے میں کہتے ہیں "شب کو سونے کے وقت آس پاس شور و غل نہ ہو۔ کوئی مخل نہ ہو صبح کے ۴ بجے اٹھتا ہوں، اس وقت چائے پیتا ہوں۔۔۔۔ آفتاب نکلتے نکلتے لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور کئی گھنٹے تک مسلسل مصروف رہتا ہوں۔ ان جھگڑوں اور نازک ادائیوں پر اب قابل کہاں کہ کسی کے پاس رہ سکوں، ان نازک ادائیوں کا احساس ہی فضیلت کی نشانی ہے کیونکہ بقول گست وفلا اپنی بورژوائیت سے دل برداشتہ ہونا عظمت کی دلیل ہے۔

شبلی کے یہاں چاروں طرف پھیلی ہوئی خشکی اور مذ و سماجی قید و بند کا ردعمل بڑی خوبصورتی کے ساتھ رومان کے روپ میں ابھرتا ہے رومانویت کا لفظ میں نے عام طو جو سمجھا جاتا ہے اس سے بالکل مختلف صورت میں لیا ہے۔ ا کا تعلق یونانی لفظ "رومانس" (Romance) سے ہے جس میں دیو، جن، پریاں، شہزادے، شہزادیاں، راجہ او رانیوں کا قصہ ہوتا ہے۔ جن میں ان کی محبت، جھوٹ او سچ کی جنگ اور رامش و رنگ کا خاص طور پر خیال رکھا ج ہے مغربی ادب میں ڈی اسٹائل اور روسو وغیرہ نے باقاعدہ ایک نظریہ کا روپ دیا۔ لیکن چونکہ یہ انسانی تہذ کے ابتدائی دور کا ضروری جزو رہا ہے اس لئے اسکی مختلف شکلیں ہر زبان میں ملتی ہیں۔ مختصراً رومانویت صرف عش و محبت کا نام نہیں ہے، ہر وہ جذبہ جس میں ماضی کی شا روایتوں سے پرجوش محبت، جلال و جمال کا امتزاج او بیباک جذباتیت ہو۔ رومانوی کہا جاسکتا ہے۔ شبلی کے بے پناہ سپاہیت اور خطر پسندی، قرون اولیٰ کے عربوں عقیدت اور اپنی رگوں میں راجپوت خون ہونے پر فخر، ا کے مرثیوں سے شیفتگی، فارسی ادب میں شاہنامہ سے بے رغبت، عورتوں میں مردانگی کی حمایت، غزل میں حزیں ا حافظ کا اثر، نظموں میں تلملا دینے والا طنز۔ کتابوں میں حس ترتیب اور حسن طباعت کا خاص خیال، بے اختیار خوش ہو جانے یا یک بیک مشتعل ہو جانے کی عادت۔ پیر میں لگ جانے پر چوٹ کا احساس بھی نہ ہونے اور معمولی سی کے کاٹ لینے پر بیقرار ہو جانے میں ہمیں بار بار انکے رومانو مزاج کا عکس ملتا ہے۔

یہ ذرہ عشق سے مشتعل ہو گیا۔
شعر العجم ۴ ص ۱۸۴

(۴) عشق و محبت انسان کا خمیر ہے اسلئے جہاں انسان
شق بھی ہے۔ شعر العجم ۵ ص ۲۳

(۵) ایک چائے خانے کے سامنے (مولانا شبلی نے)
رو کر ی اور کہا دیکھو چائے خانے میں جو عورت چائے
ہے وہ کشمیرن ہے اور کشمیری عورتوں میں حسن و
کے لحاظ سے جو خصوصیات تھیں اس کی تفصیل بتائی
سفر کشمیر کے دلچسپ حالات سنائے اور فرمایا کہ کشمیر میں
کی وہ افراط ہے کہ حقیقی معنی میں ایک حسین عورت کا
انتخاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس حسین کو تم آج انتخاب
گے دوسرے دن وہ انتخاب غلط ہو جائے گا۔

(یاد ایام ص ۱۱۵-۱۱۶)

حسن کا رچا ہوا اور صحیح ذوق رکھنے کے علاوہ شبلی نے
کو مولویوں اور ملاؤں کے گرگوں سے نہ صرف الگ رکھا
ان میں شامل ہونا اپنی تحقیر سمجھا۔ مولویوں اور کٹھ ملاؤں
نے جس قدر کھلم کھلا طنز کیا ہے اس قدر جوڑ اس
زمانے کا سب سے زیادہ روشن خیال طبقہ بھی کرنے کی ہمت
کرتا۔ ان کی نظم "شغل تکفیر" کٹھ ملاؤں پر ایک بھرپور وار
ہے۔ میں نے ذیل میں چند مثالیں جمع کی ہیں جن سے واضح
ہوگا کہ وہ قدامت پسندوں اور مولویوں کو کیا سمجھتے تھے اور
ان کو کس نظر ... سے دیکھتے تھے۔

(۱) خط سے معلوم ہوا کہ عربی عبارت لکھی ہے ....
اس قسم کی مہملات کرو گے۔ عربی عبارت لکھ کر اپنا دل خوش کر دگے
دوسرا حریری پیدا ہو۔ اچھا پھر نتیجہ کیا؟ مسلمانوں کو آجکل
حریری اور امرالقیس کی ضرورت ہے؟"

(خط بنام حمید الدین نمبر ۱۶)

(۲) ہم نے ان سے (یعنی مولانا حمید الدین فراہی سے)
بارہا کہا کہ اس زمانے میں جو کچھ لکھنا چاہیے ملکی زبان میں لکھا
چاہیئے۔ لیکن ان کی قدامت پرستی اردو کی طرف ان کو مائل
نہیں ہونے دیتی۔ (مقالات ص ۱۴)

(۳) اگر تم واقعی انگریزی پڑھنا چاہو ... اور اس قدر پڑھ لو
کہ اچھی طرح کتب بینی کرنے کے قابل ہو جاؤ تو تمہارے وظیفہ کا
انتظام کیا جائے اور اگر مولویانہ کاہلیت سرایت کر گئی ہے
تو کچھ اور صورت سوچی جائے۔

(خط بنام سید سلیمان ندوی نمبر ۲۲)

(۴) ندوہ کا مقصد اسلام کی حمایت اور علوم دینی کی بقا ہے
لیکن نہ اس طرح کہ جو پرانے خیال کے مولوی چاہتے ہیں۔ پس گویا
ندوہ مذہبی تعلیم کی اصلاحی صورت ہے۔

(خط بنام عطیہ نمبر ۱)

(۵) دوسرے یہ کہ سنگ بنیاد رکھنے سے جناب بیگم صاحبہ
پر پبلک کے نزدیک ذمہ داری بڑھ جائے گی۔ ان باتوں کے
ساتھ عام مخالفت اور مولویوں کی برہمی الگ۔

(خط بنام عطیہ نمبر ۳۱)

(۶) ندوہ کے لئے یہاں مولویوں کا جانا درکار ہے کسی
مشہور واعظ کو بلانا پڑے گا ... میں اس میدان کا
مرد نہیں۔" (خط بنام سید سلیمان نمبر ۹

(۷) کفر کے فتوے تیار ہو چکے ہیں، .... جلسہ کے
دن ہم فتوے الگ الگ تقسیم ہو رہے تھے .... اور
شہروں میں بھی ان کی اشاعت کرائی گئی ... اب بھوپال
میں تحریک ہے کہ سیرت کی اعانت بند ہو جائے۔ مزہ کی باتیں
ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تقدس کا دعویٰ ہے۔ مولوی دنیا
میں آتے ہیں تو ہم سے بڑھ کر دنیا دار بنتے ہیں۔

(بنام شروانی نمبر ۱۱۶)

(۸) اب کی متعصب مولویوں سے پالی لڑنی پڑی ...
یاران قدیم علی گڑھ نے طعنہ دیا۔ اور مولویوں میں لکھنؤ میں
نے کہا میں نے یہ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا۔ بہرحال یہ لوگ
نہ ہوتے تو ندوہ کی حاجت کیا تھی۔ (بنام مہدی افادی نمبر ۵۵)

عبدالرزاق کانپوری کے نام ایک خط میں تو انھوں نے بہت کھلے لفظوں میں اپنی حسن پرستی کا اظہار کیا ہے۔

"جب کتاب طبع ہو کر آجاتی ہے تو پھر تمام پچھلی باتیں بھول جاتا ہوں اور حسن پرستی مجبور کر کے نامی پریس میں کتاب چھپوا لی ہے" یادایام ص ۱۲۰

شعرالعجم میں خالص عشقیہ اشعار کی تشریح حسن خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے کوئی شخص جو حسن سے بے بہرہ ہو، کر ہی نہیں سکتا۔ ان تشریحات میں شاعر کی شخصیت کے پس پردہ خود شبلی کی شخصیت نمایاں طور پر جھلکنے لگتی ہے مثلاً ؎

(۱) لب گزیدی و من از ذوق تماشا مدہوش
با تو کیفیت ایں بادہ ندانم کہ چہ کرد

محبوب نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے تھے عاشق کو اس کیفیت نے بیتاب کر دیا اور خیال ہوا کہ کاش اس کو معشوق کے ہونٹوں پر یہ دسترس ہوتا۔ معشوق سے یہ کہتا ہے کہ جب تصور سے میرا یہ حال ہوا تو خدا جانے تجھ پر اس شراب کا کیا اثر ہوگا اور تو نے کیا لطف حاصل کیا ہوگا
شعرالعجم ۴ ص ۱۹۶

(۲) بہ تکلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ
می تواں برد بہ ہر شیوہ دل آساں از من

گفتگو اور سکوت بالکل متضاد چیزیں ہیں لیکن چونکہ معشوق کا سکوت اور گفتگو دونوں دلربا ہیں اس لئے دلربائی وصف کے لحاظ سے دونوں یکساں ہیں، اس مضمون کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اول تو تناقض چیزوں کو اثر کے لحاظ سے یکساں ثابت کیا حالانکہ مختلف چیزوں کا اثر مختلف ہونا چاہئے اس کے ساتھ "بہ ہر شیوہ" سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ تکلم اور خموشی کی تخصیص نہیں بلکہ معشوق کی جو ادا ہے دل کے چھیننے کیلئے کافی ہے۔ "آساں" کا لفظ یہ ثابت کرتا ہے کہ دل فطرۃً درد آشنا ہے کہ ہر ادا پہ فوراً لوٹ جاتا ہے۔ شعرالعجم ۴ ص ۳۷

(۳) سخت فہمائے ہیں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوہ بیجا کرتا

شعر کا مطلب ہے کہ میں معشوق کو بھولا بھالا سمجھا اس لئے میں نے اس کو چھیڑنا چاہا تو سچی شکایتیں کیں کہ اس سے ناراض یا شرمندہ نہ ہوگا لیکن وہ سمجھ گیا اور رنجیدہ ہوا۔ فرمایا اب مجھ کو افسوس ہے فقط چھیڑنا مقصود تھا اسلئے جھوٹی شکایت کرنی چاہئے تھی کہ وہ شرمندہ نہ ہوتا اور چھیڑ چھاڑ کا لطف بھی قائم رہتا۔ اس مضمون میں یہ حصے کہ میں نے اس کو چھیڑا" اور سچی شکایتیں کیں چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن مضمون کے بقیہ حصے اس کو پورا کر دیتے ہیں، یہ بات [illegible] کا ایک خاص نازک پہلو ہے اور مرزا غالب کا یہ خاص [illegible] ہے۔
شعرالعجم ۴ ص ۶۹

شبلی نے جہاں کہیں بھی حسن اور عشق کا تذکرہ کیا۔ ان کے قلم میں شوخی رفتار آجاتی ہے اور الفاظ یکے بعد دیگرے نرم و نازک پھوار کی طرح برسنے لگتے ہیں۔

(۱) اسی کا اثر ہے کہ معشوق کا سراپا تمام چمن زار ہے قد سرو ہے، بال سنبل ہیں، دہن غنچہ ہے، خط سبزہ، دانت [illegible] ہیں، ذقن سیب ہے، سینہ تختۂ سوسن ہے، کمر رگ [illegible]
شعرالعجم ۴ ص ۸۲

(۲) ایرانی خود حسین تھے، سامانیوں کے زمانے میں [illegible] خون کی آمیزش ہوئی، غلامی کے رواج نے دور دور کے ممالک کی نسلیں ایران میں لاکر جمع کر دیں۔ ان کے اختلاط سے تمام حسن دو آتشہ سہ آتشہ بن گیا ہر ملک میں کوئی خاص رنگ پسند کیا جاتا ہے لیکن ایران چونکہ تمام حسینوں کا مجموعہ [illegible] اس لئے ہر رنگ مقبول ہے اور ہر ایک کے الگ الگ [illegible] ہیں، حسن گندم گوں، حسن سبز، حسن لیموں، حسن مہتابی، صندلی۔ حسن شستہ، حسن نیم رنگ، حسن فرنگ، حسن برشتہ، حسن تنگ"
شعرالعجم ۴ ص ۱۹۳

(۳) حسن کی عالمگیری نے تمام ملک میں عشق کی آگ لگا

(۹) سنا ہے کہ آپ ندوہ کا نصاب بھروپیا کھینچ لے جانا
ہتے ہیں۔ جہاں دوسو برس پہلے تھا۔ خیر مردہ بدست زندہ۔
ی چاہے سو کیجئے۔

(بنام شاہ سلیمان پھلواری نمبر ۲۸)

(۱۰) کیا ندوہ کا یہی وعدہ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو
یہ بنائیں گے۔ بنام شروانی نمبر ۸۴

(۱۱) اشاعت الاسلام ایک ہلکا خاکہ ہے۔ میرا نصب العین
۔ عام مذہبی انجمن ہے ندوہ ہو سکتا تھا لیکن وہ مولویوں میں
نس گیا اور یہ فرقہ کبھی وسیع الخیال اور بلند ہمت نہیں ہو سکتا۔

(بنام ریاض حسن نمبر ۲۱)

(۱۲) خیام کا جبر و مقالہ یورپ میں ۵۰ برس پہلے چھاپا تھا
م کو آج ملا اور مولویوں کو شاید قیامت میں۔

(بنام مہدی افادی نمبر ۵۷)

(۱۳) ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کو کافر بنانے
ں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں جو صحابہ
افروں کو مسلمان بنانے میں کرتے تھے دوسری طرف یورپ
ی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آب حیات برسا رہا ہے۔

(مکاتیب جلد اول ص ۲۱۳)

لیکن شبلی کی رومانیت کے بارے میں اور خصوصاً ان کے
رومان کے بارے میں ہمیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے
(جیسا کہ عام طور پر لوگ ہیں) دراصل شبلی کے رومان کو ایک
اسکینڈل بنا کر پیش کیا گیا جس سے ایک مخصوص (نیم ادبی
نیم سیاسی) گروہ کا مفاد اور دوسرے گروہ کا نقصان وابستہ
تھا یہ معاملہ شخصیت کے نفسیاتی مطالعہ سے زیادہ سیاسی
تھا اس کی ابتدا "حیات جاوید" پر شبلی کی مجلسی وتاثراتی
جدوجہد سے ہوتی ہے۔ "حیات شبلی" کی اشاعت نے (جس کے
بعض حصوں سے ادب کے ایک مخصوص گروہ کو شدید
اختلاف تھا) اس اسکینڈل کو ہوا دینے میں معاون کا کام
کیا۔ امین زبیری نے نہ تو صرف "ذکر شبلی" یعنی حیات شبلی پر
تنقید لکھی بلکہ ایک کتابچہ "شبلی کی زندگی میں ایک رنگین
پہلو" اور ایک مضمون "شبلی کا جرم محبت اور سلیمان ندوی"
وغیرہ بھی لکھا۔ یہاں مجھے اس کی شکایت نہیں ہے کہ شبلی
پر بڑی سخت تنقید کی گئی ہے۔ تنقید تو خیر بہت سنجیدہ
عمل کا نام ہے شبلی پر صحیح معنوں میں تنقید بھی نہیں کی گئی
ہے بلکہ شخصیت کے چور دروازوں سے حملے کئے گئے ہیں۔
شبلی کے ادب پر سنجیدگی سے تنقید کرنے اور انکی تحریروں کو
جدید معیاروں پر جانچ کر اچھا یا برا کہنے کے بجائے حالی کے مقابلے
میں ان کا "ادبی بائیکاٹ" کیا گیا اور ان کو گھٹیا آدمی ثابت کرنے کی
کوشش کی گئی۔ جس کی ایک کڑی "شبلی کا جرم محبت" ہے، یہی
ہمارے ادب کا سب سے بڑا المیہ ہے جو شکایت (اور بجا شکایت)
"حیات شبلی" کے معترضین نے سید سلیمان مرحوم سے کی، میں
نہیں جانتا شبلی کے خلاف محاذ بنانے میں سرسید یا حالی کو کیا
فائدہ پہونچا لیکن اتنا ضرور ہے کہ شبلی کے متعلق غلط فہمیاں عام
ہو کر سند پا گئیں "شبلی کی حیات معاشقہ" انھیں غلط فہمیوں
کا نتیجہ ہے [1]

شبلی کے یہاں رومانویت کا وجود ضرور ہے لیکن ان کے
"جرم محبت" کیلئے اسے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا
"رومانویت" اور "رومان" یا "عشق" میں کافی فرق ہے اور
اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے شبلی کی خالص رندانہ فارسی
غزلوں سے ان کے مزاج کے رومانوی خمیر کا سراغ تو لگایا جا سکتا
ہے لیکن اس میں کسی مکمل پیکر کی تصویر ڈھونڈنا شاعری اور سوانح
نگاری کے بنیادی اصولوں پر ظلم کرنا ہے شبلی نے حزیں اور حافظ

[1] "شبلی کی حیات معاشقہ" کس حد تک طبع زاد ہے اس کا اندازہ امین زبیری کا کتابچہ "شبلی کی زندگی میں رنگین پہلو" اور "شبلی کا جرم محبت اور سلیمان ندوی" پڑھ کر ہو جاتا ہے ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے خوبصورت انداز بیان سے قالب کو ضرور بدل دیا ہے، لیکن امین زبیری پر خاطر خواہ اضافہ کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔

...نگ غیر شعوری طور پر اختیار کیا تھا اور اس پر فخر شعوری طور
...تعلیم کھلا کرتے تھے انھوں نے کئی جگہ حزیں اور حافظ سے
...پنے لگاؤ کا تذکرہ کیا ہے ؎

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخنوری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی میرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

یہ بات یہاں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اگر حافظ کی
...زلوں سے ان کے محبوب کا سراغ لگانے کی کوشش کی
...ئے تو شاید محمد شاہ رنگیلے کی حکایات بھی اس کے سامنے
...ند پڑ جائے، شبلی کے فارسی اشعار میں "حسن" کا
تو ضرور ملتا ہے لیکن اسکی مادی
...کل کا ثبوت یا کسی مکمل شخصیت کی پرچھائیں کہیں نہیں ملتی
...افظ کی طرح انھوں نے روایتی حسن کے تخیلی پیکر ضرور تراشے
...ں، یہ پیکر دھندلے ہیں لیکن خوبصورت اور رنگ برنگ کے
...طوط سے بنائے گئے ہیں۔ یہ تخیلی ہیں لیکن ان میں جسم حقیقی کی
...رت اور مشرقی حجاب کی جادوگری بھی ہے جو سیکڑوں نقاب
...ب پوشیدہ ہونے کے باوجود ہمیشہ آشکار رہتی ہے۔ یہ پیکر
...قیقی نہیں ہیں لیکن حقیقت سے قریب تر ضرور معلوم ہوتے ہیں
...یونکہ ان میں شاعر کے تجربات، شعور بیدار اور قوت اختراع
...ی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں۔ ان پیکروں سے شبلی نے خوش
...علیاں بھی کی ہیں لیکن اس کو بنیاد مان کر مکمل عشق کا الزام
...نہیں تھوپا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ اسے ہم شبلی کی حسن
...پسندی کیلئے ثبوت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

عشق کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا زینہ محبوب
سے والہانہ محبت کرنا ہے دوسرا اس سے انسیت تیسرا چاہت
و...آخری جنون، تمام ماخذ کی چھان بین کرنے کے بعد زیادہ
سے زیادہ پہلے اور دوسرے درجے تک شبلی کے پہونچنے کے
...بڑے ہلکے پھلکے اور مشتبہ قسم کے ثبوت ملتے ہیں لیکن اس سے
...آگے کی گنجائش کہیں نہیں نکلتی۔ یہاں ہمیں تھوڑی سی علم نفسیات
سے بھی مدد لینی پڑے گی۔

شبلی بہت زود حس اور زود اشتعال طبیعت کے مالک
تھے معمولی سا واقعہ بھی ان پر ہیجانی کیفیت طاری کر دیتا تھا، جوش کی
کیفیت ان پر ذرا سی دیر میں طاری ہو جاتی تھی۔ ایک روایت
ہے کہ جب وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو ان کے ماتھے کی رگیں کبھی
کبھی اس بری طرح پھڑکنے لگتی تھیں کہ سر پر سے ٹوپی اتر جاتی
تھی، ایسی سیمابی طبیعت کا مالک اگر عشق میں "چاہت" کا
زینہ بھی طے کر لیتا اور پھر اس میں ناکامی ہوتی تو اس کا ردعمل بھی
اتنا شدید ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف ہمیں اس متوقع "شدید
ردعمل" کی پرچھائیں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وہ یا تو ؎

یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نہیں

جیسا کہ مصرع لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں یا خود اپنے "دراز دامنی
سے "جزیرہ کی کشش میں اب کچھ شبہہ ہے" کہہ کر بات کو ٹال
گئے۔ اندرون کے خطوط کو دیکھ جائیے ان میں کہیں بھی کسی قسم کی
ذہنی پریشانی کا سراغ نہیں ملتا۔ شعر العجم ان دنوں آخری منازل میں
تھا لیکن اس میں بھی کسی اندرونی خلفشار کے بجائے "سوز دروں"
کے اضافے کا احساس ہوتا ہے، سیاسی نظموں کا ملنز جو ابتدا
میں بڑا تیکھا تھا اس وقت مدہم تھا حالانکہ نفسیاتی عمل کے
مطابق اس میں روز افزوں ترقی ہونی چاہیئے تھی۔ پھر "رقیب"
سے نفرت کرنے کے بجائے وہ فخریہ انداز میں اسکی مصوری
کی تعریف کرتے ہیں اس کے علاوہ شبلی کا اعتراف کہ "اشوہر
یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل
ہیں"

بڑے معنی خیز نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، "حسن" شبلی
کے لئے ذہنی انبساط کا ایک ذریعہ اور ان کے ذوق لطیف کی
ایک منزل ضرور تھا لیکن یہ کہنا کہ یہ منزل آخری منزل تھی یا اس
منزل تک پہونچنا ان کا نصب العین تھا سراسر غلط ہے۔ اس
حسن کا سراغ چاہے — عطیہ میں لگایا جائے یا ابوالکلام میں،
بمبئی کے چمن زاروں میں یا مدراس میں۔ جہاں "مجاز
قنطرۃ الحقیقت ہے" یہ ایک ایسے رند کی کہانی سے زیادہ

جس کو اپنی "حسن پرستی" اور "نازک ادائیوں" کے ساتھ ساتھ
سائی اور رندی میں "عالم بے عمل" ہونے کا احساس بھی
پارسائی میں رندی اور رندی میں پارسائی کی آمیزش
عالم بے عمل کا شیوہ تھا اور اسے اپنی شخصیت کے
قاب اور پوشیدہ گوشوں کا شعوری طور پر علم بھی تھا۔

ایک بار ان کی مخالفت میں جب ایک مضمون نکلا اور
ن کے جواب میں رسالہ مشرق میں مہدی افادی نے دوسرا مضمون
کھا تو انھیں لکھتے ہیں "میری نسبت جو کچھ مشرق میں نکلا نظر سے
زرا، لیکن وہی شکایت آپ سے بھی ہے دونوں تصویریں غلط
کھینچی ہیں۔"

ایک فرشتہ بناتا ہے دوسرا دیو لیکن ابھی تک تو میں
انسان ہوں، ترقی و تنزل کی وہ دونوں منزلیں ابھی آگے ہیں۔
لیکن اپنی شخصیت کے پوشیدہ گوشوں سے باخبر ہونے اور اپنے شعور
کی مضمری کی یہی وہ منزل ہے جہاں پہونچکر عام انسانوں کا سفر
ختم ہوجاتا ہے اور عہد آفریں شخصیتوں کی دیدہ وری شروع
ہوتی ہے۔

شبلی کے یہاں انانیت بھی تھی، بورژوائیت بھی اور رومانیت
بھی۔ بصیرت کی کمی کی بنا پر ان میں سے کسی کا بھی وجود بجائے
خود انسانی ذہن کو مریض بنا سکتا ہے لیکن ان میں اگر اعتدال
ہو تو بنی نوع انسان کے درد کا درمان بھی بن سکتا ہے۔ شبلی
کا یہ کارنامہ کچھ کم نہیں ہے کہ ان کے منفی اثرات سے خود کو ہمیشہ
بچائے رکھا اور یہی کارنامہ مستقبل میں انکی بقا کا باعث ہوگا۔

بودلئیر کے دیباچے

(تین غیر مطبوعہ مسودے)

بودلئیر (۹ اپریل ۱۸۲۱ء سے ۳۱ اگست ۱۸۶۷ء) کے ۱۰۶ نظموں کے مجموعے "فلاور آف ایول" (گناہ کے پھول) کا پہلا ایڈیشن ۲۵ جون ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا۔ سی سرمائے کی بنیاد پر اس کو نہ صرف اس دور کے رومانی شاعروں میں بہت بڑا مرتبہ دیا گیا بلکہ صحیح فرانسیسی شاعری کا پہلا جدید شاعر بھی اسے تسلیم کیا گیا۔ اس کے مجموعۂ نظم کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور اسی سال اگست میں اس پر فحاشی کا مقدمہ چلایا گیا جس کے فیصلے کے مطابق اس مجموعے کی چھ نظموں پر پابندی لگا دی گئی۔

اپنے اس مجموعۂ کلام پر پہلی اشاعت میں بودلئیر کا خیال ایک دیباچہ لکھنے کا بھی تھا جس کے لئے وہ برسوں سے تیاری کرتا رہا۔ مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ ۱۸۶۱ء کے دوسرے ایڈیشن کے لئے اس نے پھر نئے سرے سے دیباچے کی تیاری کی لیکن وہ اس بار بھی شائع نہ ہو سکا۔ ۱۸۶۸ء (یعنی اس کے موت کے ایک سال بعد) والے تیسرے ایڈیشن کے لئے پھر اس کا خیال ایک دیباچہ لکھنے کا تھا لیکن اس بار پھر بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ آخر عمر تک اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ ان تینوں مسودوں کی نہ صرف تاریخی اہمیت ہے بلکہ یہ بودلئیر کی نظموں کے بنیادی آہنگ کا پتہ دیتی ہیں۔ بودلئیر کا خیال تھا کہ شاعر کا کام نہ پند و نصیحت فرمانا ہے نہ پیشن گوئی کرنا نہ تشریح کرنا ہے نہ بیچ بچ کے سمجھانا بلکہ اس کا کام حقیقت اور حسن کے اظہار کرنے تک ختم ہو جاتا ہے۔

پہلا مسودہ

فرانس جہالت کے دور سے گزر رہا ہے۔ پیرس آج ایک نقطہ ہے جہاں سے حماقتوں کی شعاعیں پھیل رہی ہیں اور مولیئر اور برا نجر کے ہوتے ہوئے تو کسی کو اس کا اعتبار نہ ہوا ہوتا کہ فرانس ترقی کی راہ پر اس رفتار سے بڑھ جائے گا کہ عظیم انسان بوتود ہو گئے ہیں۔

ہو سکتا ہے میری کتاب نے کچھ بھلا کیا ہو۔ مجھے اس کا کوئی خوشی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس نے نقصان پہنچایا ہو۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔

شاعری کا مقصد۔ یہ کتاب میں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں یا بہنوں کے لئے نہیں لکھی ہے۔

ہر جرم، ہر گناہ، جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان کیلئے مجھے قصوروار ٹھہرایا گیا ہے۔ تفریح طبع کی شکل میں نفرت

مرثیہ لکھنے والوں کی مثال گندے تلچھٹ کی سی ہے
جماعت کا نہیں ہوتا۔ نہیں وہ بھی لمحاتی ہوتا۔
شیطان۔ بنیادی گناہ، آدمی بھلائی کی شکل میں۔ اگر
ڈکٹیٹر کے محبوب بن سکتے ہو، خدا میں اعتماد
رائے پیار کرنا زیادہ مشکل ہے۔ آج کل کے لوگوں
ان کو پیار کرنے کے بجائے اس پر اعتماد رکھنا
ہے۔ اس کی جھلک ہر کوئی پاتا ہے، لیکن اس پر
ئی نہیں کرتا۔
میری پسندیدہ نظمیں ایک روح۔ منظر۔ جدیدیت۔
۔ ٹیچار گرن جیراڈ تُسے میروال — ہم سب
پرچڑھ چکے ہیں یا اسکالائز ہیں۔
پریس کے شرفاء کو خوش کرنے کے لئے میں نے اس
ں گندگی کا کچھ حصہ بھی شامل کیا ہے لیکن وہ غیر
سند ثابت ہو چکے ہیں۔

امسودہ

یہ کتاب میری بیویوں، بیٹیوں یا بہنوں کے لئے
ے، میرے پڑوسیوں کی بیویوں، بیٹیوں یا بہنوں
بھی نہیں۔ یہ میں اُن پر چھوڑتا ہوں جن کے پاس
موں کے ساتھ خوبصورت زبان کو گندی کرنے کی
وجوہات بھی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خوبصورت اسلوب
عوام کی نفرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر انسانیت
کسی قسم کی بھی ہمدردی کسی قسم کا بھی جھوٹا خلوص،
سازش، کوئی بھی ہمہ گیر دکھ اس دور کے مہملات
کرنے کے لئے یا سیاہی کو خلوص اور ہمدردی کے
ملا کر دیکھنے کے لئے مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔
کچھ مشہور شاعروں نے شعری دنیا کے نسبتاً زیادہ
بھرے خطوں کو کافی پہلے سے ہی آپس میں بانٹ لیا
ہے یہ بڑا پر لطف معلوم ہوا ہے اور کافی تسلی بخش بھی،

کیونکہ "گناہ" سے "خوبصورتی" کو الگ کرنے کا کام اور بھی زیادہ
مشکل تھا یہ کتاب جو معنوی اعتبار سے بیکار ہے اور بالکل
بے داغ بھی اس کے لکھنے کی خاطر اپنا دل بہلانے اور مشکل کام کی
طرف اپنے شدید رجحان کی مشق کرنے کے علاوہ میرا اور کوئی
مقصد نہیں ہے۔

بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ یہ نظمیں نقصان پہنچا سکتی
ہیں، مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، دوسروں (بھلی
روحوں) نے کہا ہے کہ یہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور اس سے مجھے
کوئی افسوس نہیں ہوا۔ پہلوں کی دھمکی اور دوسروں کی نوازش
دونوں سے مجھے یکساں تعجب ہوا ہے کیونکہ اس سے اس بات
کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس دور نے ادب کے سارے
بنیادی مطالبوں کے پرانے سبق بھلا دیئے ہیں۔

کچھ مشہور عالموں کے ذریعے انسان کی فطرت ——
بیوقوفی کی ہمت افزائی کے باوجود۔ میں کبھی اس کا اعتبار نہیں کر
پایا تھا کہ ہمارا ملک ترقی کے راستے پر اس تیز رفتاری سے
بڑھ سکے گا۔ اس دنیا نے جہالت کی اتنی موٹی تہ اپنے اوپر
چڑھا لی ہے کہ اس وجہ سے ایک صوفی کی نفرت غصے اور
تشدد کی آخری چوٹی تک چڑھ جاتی ہے۔ لیکن ایسے چھپے
ہوئے شکھی انسان بھی ہیں جن کی کھال اتنی موٹی ہوتی ہے کہ
خاص قسم کا نشتر بھی اس کو نہیں بیندھ سکتا۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ بہت ساری تنقیدوں کا
جواب دوں، اور ساتھ ہی ساتھ اُن نہایت ہی آسان
عام سوالوں کی بھی تفصیل کروں جن کو موجودہ آزاد خیالیوں
نے بری طرح مہمل بنا رکھا ہے۔ شاعری کیا ہے؟ اس کا
مقصد کیا ہے؟ فائدہ مند، اور خوبصورت، میں کیا فرق
ہے؟" گناہ میں خوبصورت کیا ہے؟ ایک انسان میں شر اور خیال
کی مطابقت اس کی ہم آہنگی اور امید و بیم کی حالت کی ہمیشہ سے
جاری اور ساری ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں! موضوع کو مطابق اسلوب
کو ملحق کرنا، جذبے کا واہیات ہونا اور خطرے وغیرہ وغیرہ ...

لیکن آج صبح میں ایسا سودائی ہوا تھا کہ میں نے عوام کے کچھ اخبار پڑھ ڈالے۔ اچانک ہمیں فضاؤں کی وزن کی سستی میرے اوپر ٹوٹ پڑی، اور میں رُک گیا ــــ کسی کو بھی، کسی بھی طرح کی بات سمجھانے کی بیوقوفی کے بارے میں سوچ کر۔ جو جانتے ہیں وہ میری بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اور جو سمجھ نہیں سکتے یا سمجھیں گے ہی نہیں ان کے لئے کیفیتوں اور شرحوں کا انبار لگانا فضول ہی ہوگا۔

کہ ایک خاص گھڑی ہوئی گنتی کے مشق سے فنکار اس کی نسبت سے کس طرح اپنی انفرادیت بڑھا سکتا ہے۔

شاعری کس طرح وزن کے ذریعے موسیقی سے رابطہ قائم کرتی ہے، بحر کے قواعد ـــ جن کے اصول کسی بھی دنیاوی قانون کے ذریعے ثابت کئے جانے کی بہ نسبت انسانی روح میں زیادہ گہرائی تک جگہ بنائے ہوئے ہے۔

لاطینی اور انگریزی زبانوں کی طرح فرانسیسی شاعری کے پاس بھی ایک مخفی اور بے نام غنائی علم ہے۔

کس لئے کوئی بھی ایسا شاعر جو یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتا کہ ہر لفظ کے اپنے کتنے سُر اور تال ہوتے ہیں، کسی بھی طرح کے خیال کو ظاہر کرنے کے ناقابل سمجھا جاتا ہے۔

شاعرانہ شعری ٹکڑا کسی بھی الٹی سیدھی لکیر اور اوپر چڑھتی یا نیچے اترتی کھڑی لکیر کی نقل کر سکتا ہے (اور اس نقطۂ نظر سے یہ فن موسیقی اور علم ریاضی کی طرح ہی ہے)

شاعری بغیر ہانپے ہوئے جنت تک سیدھی چڑھتی چلی جا سکتی ہے یا کسی بھی بھاری وزن کی طرح تیز رفتاری سے سیدھے دوزخ میں گرتی چلی جا سکتی ہے، اور ایک کے اوپر ایک تھوپے گئے بہت سارے زاویوں کے ذریعے یہ کسی بھی دائرہ نما گھیرے کا پھیرا لگا سکتی ہے، نیم دائرہ یا کسی بھی ٹیڑھی میڑھی گھماؤ دار چیز کا بخوبی بیان کر سکتی ہے۔

تیکھے یا میٹھے خیال اور عیش و عشرت یا بہت بھیانک دکھ کے اظہار کی اپنی صلاحیت میں شاعری بھی مصوری، دستر خوان، اور حسن کاری کے فنون کی طرح ہی ہے، اور مطابقت یا اختلاف کے قاعدوں کے ذریعہ یہ کسی ایک اسم کے ساتھ کوئی بھی ایک صفت جوڑ کر اس منزل کو طے کر لیتی ہے۔

میرے اصول پر قائم رہ کر اور ہمیں سبقوں کے ذریعے میں جس علم کو سکھانے کا ذمہ لیتا ہوں، اس کے استعمال سے کیسے کوئی شخص ایسا المیہ لکھنا سیکھ سکتا ہے جس کی کسی دوسرے ناٹک سے زیادہ لے دے نہیں ہوگی، یا کیسے کوئی اتنی لمبی نظم لکھ سکتا ہے جو آج تک لکھی گئی مسلسل شاعری کی ضخیم کی طرح ہی بے مزہ ہو۔

اس انتہائی مضبوطی تک اونچا اٹھ پانا سچ مچ کا کوئی کام ہے۔ کیونکہ اپنی نہایت ہی قابل تعریف کوششوں کے باوجود اپنے معاصرین کو خوش کرنے، کہیں کہیں بے گناہ کی شان میں کھڑے ہونے، زینتِ محفل کی طرح استعمال ہوتے رہنے کے لئے کچھ نہایت ہلکی قسم کی خوشامدانہ باتیں کرنے اور اپنے کی خشکی کی تلافی کے لئے اپنی کتاب میں کچھ تھوڑی سی گندگی کرنے وغیرہ کی اپنی خواہشوں کو دبانے میں خود کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ایسے نازک عمل کے لئے پریس کے شرفا کو فراموش پا کر میں نے اپنی کتاب کے اس نئے ایڈیشن پر تک ممکن ہو سکا ایسے سارے نقوش کو مٹا دیا ہے۔

اپنے اس طریق کار کی بلندی کو پھر سے ثابت کرنے کے لئے میرا خیال ہے کہ میں جلد ہی حمد و نعت کے جشن اور کی عظمتوں کے تہوار منانے وقت اس کا استعمال کروں گا میں نے ان دونوں میں سے آج تک کسی کو کبھی نہیں جانا ـــ ٹامس گرے، لاڈ گریوا

حصہ) لانگ فیلو (دوسرا حصہ) اسٹیڈمن۔ دوجل رنگم انڈرومال انجلیس ـ وکٹر ہیوگو۔

تیسرا مسودہ

اگر نہ سمجھا جانا یا کم سمجھا جانا کوئی شہرت کی بات ہے

جھجک کے کہہ سکتا ہوں کہ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے
بار میں نے خود کو اس شہرت کے قابل ثابت کر دیا
اسے پالیا ہے۔ جو کتاب کئی بار مختلف اشاعتی ادوار میں
ت میں پیش ہوئی جنہوں نے ذلت کے ساتھ اسے نامنظور
مقدمہ چلا اور شدید پاگل پن کے گمان کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء
کے ہاتھ پیر توڑے گئے اور جو کئی خاموش برسوں میں
دھیرے زندہ ہوئی اور اس کے محض پھر سے چھپ
کے لئے جس کا سہرا میری گھٹتی دلچسپی کے سر ہے "مجلہ یہ
ادبی ماں کی یہ الٹی پیداوار" جو کئی اور تند جھونکوں سے
زندہ کی گئی، وہی آج پھر تیسری بار بیوقوف روشن
سامنا کرنے کا حوصلہ کر رہی ہے

اس کے لئے مجرم میں نہیں، بلکہ ایک ضدی ناشر ہے جس
ہے کہ اس میں عوام کی سڑی گلی دلچسپی سے مقابلہ کرنے کے لئے
قت ہے "یہ کتاب تمہاری ساری زندگی پر ایک دھبہ
گی" میرے ایک دوست نے، جو شاعر اعظم ہیں، یہ شروع
پیشین گوئی کر دی تھی اور بیچ مچ میرے ہر لبے باک اور
عمل نے بھی اس کو ثابت کر دیا ہے لیکن میں ان چند
لوگوں میں ہوں جو نفرت سے لطف لیتے ہیں اور لوگ ہیں
خود کو عزت دار محسوس کرتے ہیں۔ جاہل پسندی کے طور پر
لائی خواہش کی وجہ سے غلط جرائم کی غلطیوں کو ثابت کر لے
مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے کاغذ کی طرح پاک، پانی
طرح پرہیزگار، "کرائسٹ" کے نام پر لڑائی کے لئے دی ہوئی
کسی عورت کی طرح پاکیزہ، اور دیوتا کے سامنے چڑھائی
والی کنڑی بھیڑ کی طرح بے قصور ہوتے ہوئے بھی، جب
ایک فاحش، شرابی، منکر اور قاتل سمجھا جاتا ہے، تو میں ناخوش
ہوتا۔

میرے ناشر کی استدعا ہے کہ یہ میرے اور اس کے
لئے مفید ہوگا۔ اگر میں اس بات کو واضح کر دوں کہ میں
کتاب کیوں اور کیسے لکھی، میرے ذرائع کیا تھے اور حاصل کیا

تھا مقصد اور طریق کار کیا تھا؟ اس طرح کی مبصرانہ تشریح صرف
انھیں دماغوں کو پسند آئے گی جو علم تشبیہ و استعارہ کے غلام
ہیں ان کے لئے شاید میں بعد میں لکھوں اور دس حصوں میں شائع
کراؤں۔ لیکن دوبارہ سوچنے پر کیا یہ صاف نہیں ہو جاتا کہ اس
طرح کا کام بھی متعلق لوگوں کے لئے بالکل بیکار اور فضول ثابت
ہوگا۔ کیونکہ دماغ تو وہی ہیں جو پہلے سے جانتے ہیں یا اندازہ
لگا سکتے ہیں اور ان کے علاوہ جو ہیں، نہ تو کبھی سمجھیں گے ہی نہیں
ایک ادبی تخلیق کے سلسلے میں عوام کو سمجھانے کے سوال پر
مجھے برابر یہ خوف رہا ہے کہ میں کہیں خود مضحکہ خیز نہ بن جاؤں
ایسا کرنے میں مجھے ان بدرمینوں کے مثل بن جانے کا خوف ہے جو یہ
امید کرتے ہیں کہ قانون کے ایک ایکٹ کے ذریعہ وہ ساری فرانسیسی
قوم کو مالدار اور نیک بنا دیں گے اس کے علاوہ سب سے پہلی
اور زبردست وجہ یہ ہے کہ اس سے مجھے بے حد جھنجھلاہٹ
ہوتی ہے۔

کیا ہم بھیڑ اور تماش بینوں کو۔ پردوں کے پیچھے، لپوشاک
اور منظر نگاری کے کارخانوں میں اور اداکاروں کے کپڑے بدلنے
کے کمروں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں؟ کیا ہم ڈرامہ کھیلنے کے
وقت کی اصلاح اور اضافہ کی تشریح کرتے ہیں؟ کیا ہم انھیں
یہ بھی بتاتے ہیں کہ نیک جذبات اور ایمانداری کے ساتھ بناوٹ
اور چھل کپٹ کا کتنا حصہ ملا ہوا ہے —— یہ سب جو کہ ضروری ہوتے
ہیں اس ملاوٹ کے جسے ہم ادبی تخلیق کہتے ہیں؟ چیتھڑوں کے ڈھیر
گالوں پہ لگانے کی لالی۔ لوہے کی چرخیاں اور زنجیریں، کی ہوئی
تبدیلیاں، بری طرح کٹے پھٹے پردوں کے کاغذ، مختصر یہ کہ وہ
سب ڈراؤنی اور نفرت انگیز چیزیں جن سے مل کر ادب کا مندر
بنتا ہے —— کیا یہ سب بھی ہم انھیں دکھاتے ہیں؟

جو ہو، آج میرا موڈ، یہ سب کرنے کا نہیں ہے۔ کسی طرح
کی بھی نمائش کرنے، متحیر کرنے، تفریح کرنے یا اعتبار دلانے
کی میری بالکل خواہش نہیں ہے۔ میرے اپنے جنون ہیں اور
میرے اپنے چکر۔ میری تمنا مکمل آرام اور ابدی رات سے لطف اٹھانے

کی ہے حالانکہ میں نے شراب اور افیون سے پاگل کر دینے
والے نشے کے گیت گائے ہیں۔ لیکن میں آج محض ایک
ایسی چیز کا پیاسا ہوں جس کو اس دھرتی نے کبھی نہیں جانا ہے
اور جو صنعتی دوائیں بنانے والے بھی مجھے نہیں دے سکے ہیں؛
ایک ایسی چیز جس میں نہ زندگی ہو نہ موت، نہ ارتقا ہو نہ
زوال۔ کچھ نہ جانوں، کچھ نہ سکھاؤں، کچھ نہ چاہوں، کچھ نہ محسوس
کروں، سوؤں اور بس سوؤں ——— آج میری یہی ایک خواہش
ہے۔ قابلِ نفرت اور ذلیل مگر ساتھ ہی عزیز اور دلپسند۔

پھر بھی، چونکہ اونچی پسند والے ہمیں سکھاتے ہیں
کہ کبھی کبھی ہم خود ہی اپنی باتوں کے خلاف گواہی دینے میں
خوف نہ کھائیں، اس لئے اس گھنونی کتاب کے آخر میں سے
کچھ ایسے لوگوں کے، جن کی میں کافی عزت کرتا ہوں ہمدردی
کے سرٹیفکیٹ جمع کر دیے ہیں، تاکہ ایک غیر جانبدار پڑھنے والا
ان سے یہ نتیجہ نکال سکے کہ میں ایک دم سے بائی کاٹ کیے
جانے کے قابل نہیں ہوں، اور چونکہ کچھ لوگوں کے پیار پانے کے
قابل میں خود کو بنا سکا ہوں، اس لئے میرا دل خواہ اس کے بارے
میں کتنی ہی باتیں کہی اور لکھی گئی ہوں، شاید میرے چہرے کی
طرح بھیانک اور بدصورت" نہیں ہے۔

آخر میں، وہ مخصوص مہربانی جولاں شرفا نے نقادوں...
چونکہ جہالت بڑھتی جا رہی ہے . . . .

میں خود یہ اعلان کرتا ہوں کہ نقالی ختم ہو

جوہر میر

○

ستارہ بار کبھی، کہکشاں بنی تھی کبھی
ترے کرم کی رِدا ہم پہ یوں تنی تھی کبھی

شکن شکن ہے ترے پیرہن کا حسنِ جمال
کرن کرن میں تری گل بدامنی تھی کبھی

جبیں گے شاخِ صنوبر کا زخم کھائے ہوئے
حکایتِ قد و گیسو بھی گفتنی تھی کبھی

گڑی ہوئی ہیں نگاہیں خود اپنے دامن پہ
جھکی ہوئی ہے وہ گردن بھی جو تنی تھی کبھی

رسن بپا ہیں وہی آج کل جنھیں جوہر
عنانِ گردشِ حالات تھامنی تھی کبھی

فضا ابن فیضی

○

رہتے خاموش جفائیں سہ کے
خود ہی رسوا ہوا آنسو بہہ کے
حسن کچھ اور ہوا جاتا ہے
میرے آغوشِ طلب میں رہ کے
ہائے وہ عالمِ خلوت کہ نہ دل
چپ ہو آواز، خموشی چہکے
یوں تری یاد ہے دل میں، جیسے
دن ہو اور رات کی رانی مہکے
نہ خزاں ہے مری منزل نہ بہار
یہ تو بس موڑ ہیں میری رہ کے
سوچتی کیا ہے تری لالہ رخی
آنسوؤں کو مرے شبنم کہہ کے
غم کی نظریں ہیں ادا فہمِ بہار
زخمِ دل، پھول سے پہلے مہکے
رسمِ دیوانگی بدلے تو ذرا
ہاتھ رک جائیں گریباں بہکے

میرا فن اور بھی نکھرا ہے فضا
لب و عارض کا فسانہ کہہ کے

اختر انصاری اکبر آبادی

○

سہتے تھے ظلم ظلم کا لیکن بیاں نہ تھا
جیسے کہ بزم میں کوئی اہلِ زباں نہ تھا

ذرّے بنے ہوئے تھے ستارے جہاں ندیم
وہ بھی یہی زمیں تھی کوئی آسماں نہ تھا

شاید شباب پر تھی محبت کی زندگی
وہ زندگی کہ جب غمِ سود و زیاں نہ تھا

دیکھا تھا مسکرا کے مری سمت آپ نے
جب کائنات میں کہیں غم کا نشاں نہ تھا

رخ مل گیا ہوا کا تو ساحل پہ آلگی
کشتی کا میری ورنہ کوئی بادباں نہ تھا

مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو راہیں اداس تھیں
منزل سے دور دور کہیں کارواں نہ تھا

اختر مرے جنوں کو سمجھتا نہ تھا کوئی
دنیا میں کوئی غم کا مرے رازداں نہ تھا

افضل حسین اظہر

○

فصلِ گل آئی تو مہکار کہاں غائب ہے
تابشِ جلوۂ گلزار کہاں غائب ہے

وحشتِ دل کے یہ آثار خدا خیر کرے
رونقِ کوچہ و بازار کہاں غائب ہے

کب دعاؤں پہ بھروسہ نہ کیا تھا ہم نے
صبر کا لطف مے آثار کہاں غائب ہے

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی بہت
غم میسر ہے تو غمخوار کہاں غائب ہے

حسن کو ہے روشِ لطفِ گریزاں مرغوب
ہائے تسکینِ دلِ زار کہاں غائب ہے

آج بیتاب ہے دل عرضِ تمنا کے لئے
آج پیرایۂ اظہار کہاں غائب ہے

شکیب جلالی

○

کے درمیان سے نکلا — میں بھی کس امتحان سے نکلا

وا سے سلگ اٹھے پتّے — پھر دھواں گلستان سے نکلا

ب بھی نکلا ستارۂ امید — کہر کے درمیان سے نکلا

دنی جھانکتی ہی گلیوں میں — کوئی سایہ مکان سے نکلا

شعلہ بھر اک دھوئیں کی لکیر — اور کیا خاکدان سے نکلا

د جس آسمان میں ڈوبا — کب اسی آسمان سے نکلا

ہر جس کو آفتاب کہیں — کس ندھیرے کی کان سے نکلا

کر ہے اس نے بے وفائی کی — میں کڑے امتحان سے نکلا

لوگ دشمن ہوئے اسی کے شکیب
کام جس مہربان سے نکلا

حزیں لدھیانوی

○

جشن منائیں، بانکے ٹیڑھے، ترچھے، سندر لہری
شہر سے کر جاتا ہے اک پاگل سُن لیں سارے شہری

غم کے بادل، ناؤ شکستہ، تیز ستم کی آندھی
پیار کے ساگر میں گیرائی، پیار کی ندیا گہری

یہ غمِ جاناں، یہ غمِ دوراں، یہ غمِ دل، یہ صدمے
ہم نے ہمیشہ چوٹ کے اوپر چوٹ ہے کھائی گہری

میں دیوانہ کا کل گیتی، میں انساں کا پجاری
اللہ والوں سے کیا نسبت وہ عرشی میں دہری

اُن راہوں پہ دل والوں نے چلتے عمر گذاری
جن راہوں پہ ناچ رہے ہیں ناگ ہزاروں زہری

میں ہوں مسافر دشتِ غم کا ساتھ مرا کیا دیں گے
دھرتی کے یہ چاند ستارے اور یہ آہو شہری

ہم نے خوب حزیں دیکھی ہے دنیا کی دو رنگی
پھولوں کی اک شاخ ہے لیکن ناگن کی سی زہری

سعادت نظیر

○

شمع کتنا سوز رکھتی ہے؟ یہ پروانوں سے پوچھ!
سوختہ جانوں کا عالم سوختہ جانوں سے پوچھ!

دل کی بیتابی کا باعث دل کے ارمانوں سے پوچھ!
حال شورانگیز طوفانوں کا، طوفانوں سے پوچھ!

جابجا جوشِ جنوں کا ہے تصرّف آج بھی
موسمِ گل کی حقیقت چاک دامانوں سے پوچھ!

بات تو جب ہے کہ میرا درد تو محسوس کر
ماجرائے دل یگانوں سے نہ بیگانوں سے پوچھ!

تیری دنیا گلشنِ آباد ہے، جانِ بہار!
مجھ خزاں دیدہ کی دنیا کیا ہے؟ ویرانوں سے پوچھ!

میں بتاؤں گا تجھے مستقبلِ روشن کا راز
داستانِ ماضیہ ویران کاشانوں سے پوچھ!

تشنہ کامی کا نہیں احساس رندوں میں نظیرؔ
اور نہ یاد آئے تو لبریز پیمانوں سے پوچھ!

خمار انصاری

○

عشرت اس کی ہے جو ہر غم سے گذر آتا ہے
رات کے بعد ہی ہنگامِ سحر آتا ہے

کتنے گہرے ہیں یہ احساسِ محبت کے نقوش
یاد آتے ہو تو دل آج بھی بھر آتا ہے

درد معراجِ اثر درد فروغِ دل و جاں
درد کی آنچ سے انسان نکھر آتا ہے

ایک تاریخ کا آغاز ہوا ہے یارو،
ایک منصور سرِ دار نظر آتا ہے

سوچتے سوچتے اک بار جل اٹھتے ہیں چراغ
دیکھتے دیکھتے اک نقش ابھر آتا ہے

تیرگی نور کے سیلاب کو کیا روکے گی،
نور تو سینۂ ظلمت میں بھی در آتا ہے

یہ ترے شہر کا کیا رنگ ہے معلوم نہیں
کوئی الزام بھی ہو عشق کے سر آتا ہے

اب غمِ دل ہی نہیں ہے غمِ دنیا بھی تو ہے
اب ترا ذکر بہ اندازِ دگر آتا ہے

عزیز عجمی

بہن بھائی

"رفو! جلد تیار ہو جاؤ ورنہ میں چلا جاؤں گا۔ وہ لوگ تو کلب پر پہنچ چکے ہوں گے" ماجد نے رفعت کو دھمکی دیتے ہوئے جلد تیار ہونے کے لئے کہا۔

"بھیا! صرف پانچ منٹ اور"

پندرہ بیس منٹ ہو گئے مگر رفعت تیار ہو کر نہ آئی۔ ماجد اکتا کر اس کے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ رفعت تقریباً کپڑے پہن چکی تھی اور اب میک اپ کر رہی تھی۔

"یہ کیا تم اتنا میک اپ کرتی ہو؟" ماجد نے جھنجھلا کر کہا "مگر اس کے باوجود چڑیل کے چڑیل ہو۔ میک اپ سے حوریں تو بہرطور نہیں بن سکیں" رفعت چڑیل نہیں تھی اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی البتہ رنگ ذرا دبا ہوا تھا وہ اس کمی کو میک اپ سے تقریباً پورا کر لیتی تھی۔

"بھیا! آپ ہر وقت مذاق کرتے رہتے ہیں" رفعت نے روٹھنے کے سے انداز میں کہا۔ "اپنی طرف نہیں دیکھتے جو صبح سے کپڑوں اور میک اپ کے بل بوتے پر بائرن بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اچھا اب چلو بھی" ماجد نے رفعت کو ٹالا۔

"لیجئے میں تیار ہوں ۔۔۔ مگر" رفعت کو اپنی ٹیڈی قمیض کی پشت پر کھلی ہوئی زپ کا خیال آیا جو وہ خود نہیں بند کر سکتی تھی اس طرح قمیض کے پھٹنے کا خطرہ تھا۔ "یہ میری زپ تو بند کر دیں۔" رفعت نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔

"کیا اتنی تنگ قمیض سلوانے کا کسی ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا؟" ماجد نے زپ بند کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بھیا۔ تم بہت اچھے ہو" رفعت نے شکریہ ادا کیا۔

ماجد اور رفعت دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس قدر بے تکلف تھے جیسے دونوں بہن بھائی ہونے کی بجائے بھائی بھائی ہوں اور وہ بھی جڑواں۔ جن میں بزرگی اور برتری کی دیوار حائل نہ ہو۔ وہ گھر سے باہر بھی ایک دوسرے سے اتنی ہی بے تکلفی کے ساتھ بات کرتے تھے کہ دوسرے لوگ انھیں بہن بھائی سمجھنے کے بجائے کچھ اور سمجھتے۔ جب لوگ چلتے چلتے پلٹ کر ان کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے تو وہ دونوں ان کی غلط فہمی پر مسکرا دیتے جیسے کہہ رہے ہوں "عجیب بے وقوف لوگ ہیں"

ناشتے کی میز پر کپڑوں، ایکٹرسوں اور مس یونی ورس پر بحث کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

"اس سال کی مس یونیورس" رفعت تبصرہ کرتی "پچھلے

سال کی مس یونیورس، سے زیادہ خوبصورت ہے۔

"بالکل غلط" ماجد رفعت سے اختلاف رائے کرتا۔ "عورت کی خوبصورتی اس کی باڈی میں مضمر ہے اور اس سال کی مس یونیورس کی باڈی پچھلے سال کی مس یونیورس کی باڈی کے مقابلے میں بالکل بوگس ہے۔

"بھیا! یہ آپ کیسے کہتے ہیں۔" رفعت اپنی دلپسند مس یونیورس کی پوزیشن مضبوط بنانے کی کوشش کرتی "اگر عورت کا فیس خوبصورت نہیں تو اس کی باڈی کی خوبصورتی بیکار ہے۔ اس سال کی مس یونیورس کی آنکھیں اور ہونٹ بہت اسٹرائکنگ ہیں پھر اس کا جسم بھی بہت خوبصورت ہے۔

"بدھو! میری البم لانا ذرا" وہ نوکر کو آواز دیتا اور البم میں سے مس یونیورس نمبر ۱۶ اور نمبر ۲۶ کی فوٹو نکال کر تبصرہ کرتا۔ "ذرا اپنی مس یونیورس کی ٹانگیں دیکھیں۔ پنڈلیاں اور ران ایک جیسے ہیں، اب یہ فوٹو دیکھو، وہ اپنی دلپسند مس یونیورس کی فوٹو نکال کر کہتا۔ جسم کے حصوں میں کیا تناسب ہے خاص کر اوپر اور نیچے کے حصوں میں"

کار چلاتے وقت ماجد کسی خوبصورت چہرے کو دیکھنے لگتا تو رفعت کہتی "حضور! چلتے پھرتے لوگوں سے زیادہ نہیں اپنی زندگی عزیز ہے کہیں ایکسی ڈنٹ نہ کر دینا"

"کیا آنکھیں بند کر کے کار چلاؤں" ماجد جواب دیتا۔ "ادھر ادھر دیکھنے سے تو پتہ چلتا ہے کہ کار کس سمت سے نکالنی چاہئے۔

"آہا! کیا بات کی ہے" رفعت عورتوں کی سی تیزی سے کہتی "ادھر ادھر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کار کس طرف سے کسی لڑکی کے پیچھے لگانی چاہئے"

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماجد رفعت کو کالج سے لاتے ہوئے کسی لڑکی کا پیچھا کرنے کے لئے رفعت سے کہتا "رفو! تم ذرا یہاں انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔

رفعت ایک نامعلوم سی خوشی محسوس کرتے ہوئے کہتی "بھیا! اب آپ کو کہاں فرصت ملے گی میں ٹیکسی پر چلی جاتی ہوں"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تو ماجد سب سے پہلے متوجہ ہوتا اور ریسیور اٹھا لیتا۔

"ہیلو ——— کس کو ——— مگر وہ تو نہیں ہیں"

"آپ کہاں سے بول رہی ہیں ——— آپ اپنا نام اور ٹیلیفون نمبر بتا دیں۔ تاکہ آپ کو ٹیلیفون کر سکیں۔

رفعت دور سے چلاتی "بھیا! یہ کیا چکر چلا رہے ہیں آپ لڑکیوں سے گفتگو طویل کرنے کے لئے جھوٹ بول رہے ہیں، یہ میرا ٹیلیفون ہے مجھے کیوں نہیں بلاتے"

"ارے کیا ہے" ماجد بے نیازی سے کہتا "میں ٹیلیفون پر تمہاری سہیلی کو کھا تو نہیں جاؤں گا۔

"یہ کھانے کے لئے ہی تو دانت تیز کر رہے ہیں۔ رفعت آہستہ سے کہتی۔

بھائی کے ساتھ ایسی نوک جھونک جاری رکھنے سے رفعت کو خاص لطف آتا تھا بعض دفعہ تو وہ اس سے مذاق بھی کر لیتی تھی۔ ماجد آرام سے بیٹھا ہوتا تو رفعت اسے بتاتی "آپ کے کچھ مہمان باہر گھوم رہے ہیں شاید ہمارا گھر ڈھونڈ رہے ہیں"

ماجد باہر آ کر دیکھتا تو ارد گرد کی کوٹھیوں کی لڑکیاں سڑک پر سیر کر رہی ہوتیں۔ ماجد واپس آ کر پیار سے کہتا "جھوٹی کہیں کی ——— وہ مہمان ہیں؟"

جب ماجد کو رفعت کی سہیلیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا وہ ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ کرتا اور مشورہ دیتا "گو آپ ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے مگر آپ کا جسم بھرا ہوا ہے آپ اگر جین پہنیں تو بہت سمارٹ معلوم ہوں۔

آپ کی شکل و صورت مارلن مانرو سے ملتی جلتی ہے اور یہ اتفاق ہے کہ وہ میری محبوب ایکٹرس ہے"

آپ ورزش کیا کریں آپ کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔

ان تبصروں پر تمام لڑکیاں ہنستیں۔ جو لڑکی ذرا سنجیدہ
تی وہ اس سے مخاطب ہوتا۔ آپ کی مسکراہٹ بہت
ٹک ہے۔ آپ کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے مونالیزا کا
یاد آتا ہے۔ اس مجسمے میں مونالیزا مسکرا رہی ہے مگر پتہ
چلتا کہ مسکراہٹ آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے یا ہونٹوں
یہی بات آپ کی مسکراہٹ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

اس موقع پر رفعت تمام لڑکیوں پر فاتحانہ نظر ڈالتی
ماجد کی بہن تھی۔ وہ اس وقت ماجد کی ذات کا حصہ
تی۔ مگر دوسرے لمحے وہ اپنے آپ پر نظر ڈالتی اور مایوس
ہو جاتی۔ اس مایوسی میں وہ اپنے آپ کو آئینہ کے سامنے
س کرتی۔ اپنی مد بھری آنکھوں، رسیلے ہونٹ، کتابی
ے اور بھرے ہوئے جسم کو دیکھتی اور اس نتیجہ پر پہنچتی۔ میں
طرح بھی ان لڑکیوں سے کم خوبصورت نہیں ——— اگر
کی جگہ ——— کوئی اور ہوتا! ——— ؟

ماجد بی اے میں دو تین دفعہ فیل ہو چکا تھا اب اس کا پروگرام
جانے کا تھا تاکہ کوئی غیر ملکی ڈگری لے کر آئے۔ وہ پاسپورٹ
مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ دن بھر اس کا کام صرف
تھا کہ رفعت کو کالج سے لے آئے۔

"رفو! ماجد نے رفعت کی کلاس فیلوز پر نظر ڈالتے
ہے کہا۔ "اگر تمہاری کوئی کلاس فیلو راستے میں اترنے
ہو تو کار میں بٹھا لیا کرو۔

"آپ کو میری کلاس فیلوز سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟
ت نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" ماجد نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ کار
یک آدمی بیٹھے یا چار پٹرول تو اتنا ہی خرچ ہوتا ہے۔

رفعت نے ایک برقعہ پوش لڑکی کو آواز دے کر کار
ٹھا لیا۔ ماجد نے رفعت کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے
ت نے غلط نمبر پر ٹیلیفون کر دیا ہو۔ وہ ایک تراشیدہ
والی لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جو کھڑی ہوئی لڑکیوں
کے گروپ کو کسی کی نقلیں اتار کر ہنسا رہی تھی۔

"لڑکی تو یہ بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے" ماجد نے
لڑکی کے گورے گورے ہاتھوں اور کلائیوں پر سنہری
بالوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ "مگر ان کفن پوش
لڑکیوں میں جان نہیں ہوتی۔ ہوٹل میں بیٹھ کر بے تکلفی سے
بات نہیں کر سکتیں۔ ساتھ گھوم نہیں سکتیں" کار اسٹارٹ
کرنے سے پیشتر ماجد نے کئی دفعہ مڑ کر دیکھا تاکہ لڑکی کا چہرہ
دیکھ سکے۔ مگر لڑکی نے چہرے پر نقاب ڈال رکھی تھی
آخر اس نے کار کا آئینہ اس طرح فٹ کیا کہ اگر لڑکی نقاب
الٹے تو اس کی شکل آئینہ میں منعکس ہو لیکن ماجد کو سفید
ہاتھوں اور سیاہ برقعے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ماجد نے گھٹن
سی محسوس کرتے ہوئے کار ایک ہوٹل کے سامنے روک کر
کہا۔ آؤ ذرا کولڈ ڈرنک کر لیں۔ برقعہ پوش لڑکی نے ہوٹل میں
جانے سے پس و پیش کیا۔ مگر رفعت چند منٹ میں اسے
سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آئی۔

"یہ ہیں مس شکیلہ فورتھ ایئر سٹوڈنٹ ہمارے کالج
کے رسالے کی ایڈیٹر ہیں۔ میری بہت اچھی دوست ہیں"
مس شکیلہ نے بدستور نقاب اوڑھ رکھا تھا۔

"لیکن" ماجد نے مہذبانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
یہ تو ان کے نام کا تعارف ہوا۔ ان کی شخصیت کو تو ان کے نقاب
نے چھپا رکھا ہے۔ اصل تعارف تو انسان کا چہرہ دیکھنے
کے بعد ہوتا ہے۔

"معاف کیجئے" لڑکی نے بڑی شستہ اردو میں کہا۔
"ہمارا خاندان پردے کا سخت پابند ہے۔"

"مگر پڑھے لکھے لوگ خاندانی روایات کے پابند
نہیں ہوتے۔ خاندانی روایات کی پابندی غلامی کا دوسرا
نام ہے۔"

"لیکن تعلیم کا مقصد بے راہ روی نہیں"

"چھوڑو! مس شکیلہ۔ تم اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہوتے

ہوئے بھی دقیانوسی خیالات کی پابند ہو" رفعت نے اپنے بھائی کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اس دور میں تو بڑے بڑے گھرانوں میں پردہ کا رواج ختم ہو گیا ہے" ماجد نے ذرا نرم لہجے میں کہا "صرف دقیانوسی خیالات کے لوگ ہی اس کے پابند ہیں۔

"کچھ بھی ہو ـــــ" شکیلہ نے جان چھڑانے کیلئے دو ٹوک بات کہی "ہمارا خاندان ابھی اتنا ایڈوانسڈ نہیں ہوا"

رفعت نے کہا "چلو یونہی سہی۔ کیا آپ اپنے بھائی سے پردہ کرتی ہیں؟ یہ میرے بھائی ہیں اور آپ میری بہن ہیں آپ کو ان سے پردہ نہیں کرنا چاہیئے۔

"مگر ـــــ" شکیلہ کچھ کہتے کہتے رک گئی"

"مگر کیا؟" رفعت نے تیزی سے کہا۔ "اس کے علاوہ آپ کو اپنے پر اعتماد ہونا چاہیئے۔ کیا مرد عورت کا چہرہ دیکھ کر اسے کھا جاتا ہے۔

"وہ دیکھو ـــــ" رفعت نے شکیلہ کو احساس کمتری کا شکار کرنے کی کوشش کی۔ "وہ لوگ آپ کے برقعے کی طرف کس طرح دیکھ رہے ہیں۔

شکیلہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ واقعی کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"مس شکیلہ اس کی ایک وجہ ہے" رفعت نے نفسیاتی نکتہ بیان کیا "بے نقاب عورت کو لوگ صرف ایک دفعہ دیکھتے ہیں۔ مگر برقعہ پوش کو بار بار دیکھتے ہیں کیونکہ برقعہ عورت کو ایک معمہ بنا دیتا ہے"

"رفو! چلو کیبن میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں بہت غیر مہذب قسم کے لوگ بیٹھے ہیں" ماجد نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا اور وہ کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔

"ناؤ پلیز" رفعت نے التماس کی۔ "نقاب الٹ دیجئے۔

شکیلہ خاموش رہی۔

رفعت نے شکیلہ کی ران پر چٹکی دیتے ہوئے کہا "نقاب الٹ دو۔ آرام سے بیٹھو۔ دیکھو کتنی گرمی ہے"

شکیلہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر رفعت نے شکیلہ کے نقاب کو انگلیوں سے پکڑتے ہوئے کہا "اچھا آپ کو شرم آتی ہے تو میں الٹے دیتی ہوں اور اس نے سچ مچ اس کا نقاب الٹ دیا اور دونوں بہن بھائی زور زور سے ہنسنے لگے۔ شکیلہ متحیر نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھئے اب آپ نقاب ڈالنے کی کوشش کریں گی بیکار ہوگا۔ بھیا نے آپ کا چہرہ تو دیکھ ہی لیا ہے" رفعت نے بے تکلفی سے کہا۔

شکیلہ واقعی خوبصورت تھی۔ چہرہ پسینے سے نم ہونے کی وجہ سے اور بھی نکھر گیا تھا اور اس پر حیا کی سرخی جو نقاب الٹتے ہی رونما ہو گئی تھی سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔

ماجد نے شکیلہ کا چہرہ دیکھتے ہی کہا "اف کتنا ظلم ہے۔ اس لڑکی نے کتنے خوبصورت چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک میں اکثر ایسا ہوتا ہے جبکہ دوسرے ممالک میں ایسے خوبصورت چہرے خوبصورتی کے مقابلے کے لئے تمام دنیا کے سامنے آتے ہیں انعام حاصل کرتے ہیں اور مس یونیورس کا خطاب پاتے ہیں خوبصورت چیزیں اسلئے نہیں ہوتیں کہ انھیں چھپا کر رکھا جائے

ایسا کرنا خوبصورتی کے ساتھ سخت ظلم ہے کیٹس نے کہا ہے "خوبصورتی سچائی ہے"

ماجد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا "دراصل ہمارے ملک میں دو قسم کی عورتیں برقعہ پہنتی ہیں۔ نمبر ایک جو دقیانوسی خیالات رکھتی ہیں ـــــ اور گھروں میں چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح بند رہتی ہیں۔ نمبر دو وہ عورتیں ہیں جو برقعہ پہنتی ہیں جن کی شکل وصورت میں کوئی خامی ہو۔ ان کے برقعہ کا کام ان کی خامی کو چھپانا ہوتا ہے مگر ان کی جو چیز خوبصورت ہوتی

ان کو نہیں چھپاتیں بلکہ ان کی نمائش کرتی ہیں۔ جن کی آنکھیں خوبصورت ہوتی ہیں وہ آنکھوں پر سے نقاب ہٹائے رکھتی ہیں۔ جن لڑکیوں کے صرف گال چکنے ہوتے ہیں وہ گالوں پر سے برقعے کے بٹن کھولے رکھتی ہیں۔ کچھ لڑکیوں کے بال خوبصورت ہوتے ہیں وہ انہیں برقعے سے باہر اپنے سینے پر لٹکائے رکھتی ہیں۔ کچھ کے ہاتھ خوبصورت ہوتے ہیں وہ برقعے میں سے ہاتھ نکال کر کسی چیز سے کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی پنسل سے کبھی ——

"بھیا کتنی دیر تک اس موضوع پر لیکچر ہوگا"، رفعت نے ماجد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بس"، ماجد نے شکیلہ پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا، "میرا مطلب ہے کہ شکیلہ جیسی خوبصورت لڑکی کو برقعہ پہننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی ہر چیز خوبصورت ہے اور برقعے سے کسی چیز کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔"

ماجد کی منزل کا ایک زینہ "رفعت" نے شکیلہ کا نقاب الٹ کر طے کر دیا تھا دوسرا زینہ طے کرنے کے لئے وہ اپنا پاؤں بڑھا رہا تھا میز کے نیچے اس نے اپنا پاؤں شکیلہ کے پاؤں سے لگا دیا۔ مگر پاؤں کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس پر اس نے اپنی پنڈلی اس پاؤں کی پنڈلی سے لگا دی۔ پھر بھی اس پنڈلی کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ماجد کا دل بڑھا اور اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگاتے ہوئے اپنے آپ کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑتے ہوئے ران سے ران ملا دی اور شکیلہ کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگانے لگا۔ مگر شکیلہ پہلے کی طرح سوچ بچار کے عالم میں اداس بیٹھی ہوئی تھی، یہ بات اسے عجیب سی لگی کہ اتنی تبدیلی کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی ہے ماجد نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور ہونٹوں پر تیز مسکراہٹ جو قہقہہ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔

"پتہ نہیں"، رفعت نے اٹھتے ہوئے کہا، "میرا رومال کدھر گیا"، اور کسی کی ران ماجد کی ران سے جدا ہو گئی۔ یہ رفعت کی ران تھی شکیلہ نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹ کر میز کے نیچے سے باہر نکال رکھا تھا اس کے سامنے رفعت کی ٹانگیں تھیں۔

ماجد نے وحشیانہ نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا جیسے تمام قصور شکیلہ کا تھا اور شکیلہ نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "وہ میری بس آگئی"، اور وہ بڑی تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ رفعت نے اس کے روکنے کی کوشش کی، "سنو تو"، مگر اتنے میں وہ ہوٹل سے باہر جا چکی تھی۔

"عجیب جاہل لڑکی ہے"، رفعت نے معذرت آمیز نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بنتی ہے الو کی پٹھی"، ماجد نے جل بھن کر کہا، "کچھ دیر اور بیٹھتی تو میں اسے برقعہ پوش عورتوں کی تیسری قسم بھی بتاتا برقعہ پوشوں کی تیسری قسم وہ ہے جو ——" ماجد نے رک کر کہا، "رفو چھوڑو اس ٹاپک کو"۔

"بھیا آپ کہئے جو کہنا چاہتے ہیں"، رفعت نے غصے سے کہا اور ماجد نے غصے میں اپنا فقرہ مکمل کر دیا، "میرا مطلب ہے آج کل تمام پیشہ ور عورتیں برقعہ پہنتی ہیں۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے"، رفعت نے بھائی کی بات کی تصدیق کی۔ "وہ برقعہ پہن کر جہاں چاہیں جاتی ہیں۔ اور پھر نیک کی نیک۔"

"پکچر جانے کا موڈ تھا اس الو کی پٹھی نے تمام خراب کر دیا"، ماجد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں"، رفعت نے ماجد کو تسلی دی، "کل چلیں گے۔ اس جاہل لڑکی کے ساتھ پکچر دیکھنے میں کیا مزا آتا۔"

اگلے روز رفعت کالج کے سامنے اپنے بھائی کا تعارف اپنی سہیلیوں سے کروا رہی تھی۔

"بھیا! آپ ہیں فریدہ، آپ ہیں زہرہ، آپ ہیں معصومہ، اور آپ ہیں یاسمین، یہ تمام میری دوست ہیں، آپ سے ان کا تعارف کروانا تھا، آپ لیٹ آئے ہیں انہوں نے اپنی گاڑیاں واپس

ہی ہیں اس لئے ہم ان لوگوں کو گھر چھوڑ کر آئیں گے۔
"بہت خوب" ماجد نے چاروں لڑکیوں پر تنقیدی
الیتے ہوئے کہا۔ "مگر ان کو گھر چھوڑنے سے پہلے ان کی
ڈم کو دور کرنا چاہیے جو انھیں بہرے لیٹ ہونے کی وجہ
ہوئی ہے۔ یعنی ان لوگوں کو کولڈ ڈرنک

اجائے۔

"ماجد صاحب" معصومہ نے جھکتے ہوئے کہا "صرف
ڈرنک سے کام نہیں چلے گا"
"بالکل ٹھیک ہے" دوسری لڑکی بولی "جب یہ شکیلہ
ڈرنک کے ساتھ آئس کریم بھی آفر کرتے ہیں تو ہم نے
ور کیا ہے؟"
"اچھا" ماجد نے لفظ کو پیستے اور مسکراتے ہوئے کہا۔
لوگوں کو کل والے قصے کا پتہ چل گیا ہے"
رفعت بتاؤ تو سہی کل شکیلہ نے کیا حرکت کی" یاسمین
چھا۔
"بس یہی کہ ——" فریدہ نے جواب دیا "آئس کریم
لیا اور کولڈ ڈرنک کرنے کے بعد بغیر سلام دعا کئے ہوٹل
ھاگ کھڑی ہوئی"
"بیچاری ڈر گئی ہوگی کہ کہیں بل نہ دینا پڑے" زہرہ نے
کیا۔
ماجد کی چھوٹی سی کار راجہ اندر کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔
کے دائیں بائیں لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ لڑکیوں کے
ن اس طرح دھنسا ہوا تھا کہ کار چلانا مشکل ہو رہا تھا۔
"رفو! ماجد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے خوش ہو کر کہا۔
تمام موٹی لڑکیوں کو آگے بھیج دیا ہے۔ کار چلانا مشکل ہو رہا
علوم ہوتا ہے آج چالان ہوگا۔
یہ لوگ ایک اچھے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کولڈ ڈرنک
ہے تھے، رفعت شکیلہ کی بدحواسی اور بدتمیزی کی نقلیں اتار
ی اور ماجد لڑکیوں کی شکل و صورت کو ہر زاویہ سے دیکھ

رہا تھا اور انتخاب کر رہا تھا کہ کس لڑکی کو سینما کی دعوت دی جائے۔
جب وہ اٹھنے لگے تو ماجد نے آہستہ سے رفعت سے
پوچھا "یہ معصومہ کیسی لڑکی ہے؟"
"بہت اچھی لڑکی ہے۔ سوسائٹی میں موو کرنا جانتی ہے"
رفعت نے فخریہ کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری سہیلی شکیلہ کی طرح
ان کلچرڈ اور دقیانوسی خیالات رکھتی ہے"
"تو پھر" ماجد نے ذرا سوچ کر کہا "معصومہ کو آج پکچر پر
انوائیٹ کرنا"
"ہاں! ضرور۔ ابھی میں اس سے بات کرتی ہوں"
"دیکھو رفو! صرف معصومہ کو انوائیٹ کرنا"
"بہت اچھا" رفعت نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔
"بہت اچھا"
تمام لڑکیوں کو گھر چھوڑنے کے بعد ماجد، رفعت اور
معصومہ پکچر ہاؤس پہنچ گئے۔ یہ اونلی فار اڈلٹس کے لئے تھی
ہیں، معصومہ نے بظاہر رفعت کو مگر حقیقتاً ماجد کو مخاطب
کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہم تمام اڈلٹس ہیں، اسلئے ہمیں اس سے کوئی تعلق
نہیں ہے۔ ہمیں ٹکٹ مل جائیں گے" ماجد نے معصومہ
کے جسم کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مس معصومہ معاف
کیجئے آپ کی عمر کتنی ہے؟"
معصومہ نے معنی خیز نظروں سے ماجد کی طرف دیکھا
اور مسکرائی جیسے کہہ رہی ہے "آپ کو میرے بالغ ہونے میں
ابھی تک کوئی شک ہے۔"
"باکس میں بیٹھتے ہوئے معصومہ نے کہا" بھئی ہم تو تم
لوگوں کے درمیان میں بیٹھیں گے تاکہ دونوں سے باتیں ہو سکیں
اور وہ ماجد اور رفعت کے درمیان بیٹھ گئی۔
ماجد اور معصومہ کے درمیان آدھ فٹ کا فاصلہ تھا جب
پکچر شروع ہوئی تو ان کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ رہ گیا اور
تھوڑی دیر بعد یہ فاصلہ گھٹ کر سوتی کپڑے کی موٹائی جتنا

جب ہیرو ہیروئن کا معانقہ بوس و کنار کی حد تک
کر چکا تو ماجد نے رفعت سے کہا "رفو! انٹرول ہونے
ہے، تم جائے کا آرڈر دے آؤ ورنہ رش ہو جائے گا۔"
رفعت چائے کا آرڈر دینے کی بجائے سینما ہاؤس کی
میں کھڑی ہو کر آنے جانے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔
پندرہ منٹ بعد انٹرول ہوا اور رفعت بڑی مایوسی کے عالم
باکس میں داخل ہوئی۔ ماجد باکس سے باہر نکل چکا تھا اور
معصومہ باکس کو ڈرائنگ روم بنائے ہوئے بے تکلفی سے
پر لیٹی ہوئی تھی، معصومہ نے رفعت کو دیکھتے ہی چلا کر
"ماجد صاحب نے وقت کا بالکل غلط اندازہ لگایا تھا، انٹرول
پندرہ منٹ بعد ہوا۔"
"غلط نہیں" رفعت نے معصومہ کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالتے ہوئے کہا "بالکل ٹھیک تھا۔"
"بہت اچھی پکچر ہے" معصومہ نے موضوع بدلا "بس
خوب ایڈجسٹ کیا ہے۔"
"آپ لوگوں نے کیا ہو گا" رفعت نے تھکی ہوئی آواز
کہا "ہم تو بور ہوئے ہیں۔"
"کیوں" معصومہ نے پوچھا۔
رفعت نے "کیوں" کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔
"معصومہ تمہارا بڑا بھائی ہے؟"
"ہاں۔ ہے کیوں؟"
"کیوں کیا" رفعت نے معصومہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"ہم ان کے ساتھ پکچر دیکھیں گے۔ آپ اور بھیا تو بور کرتے
ہیں۔"

اگلے روز رفعت، معصومہ اور معصومہ کا بھائی ارشد
ہاؤس میں تھے۔ رفعت، معصومہ اور ارشد کے درمیان
ہوئی تھی۔ انٹرول سے آدھ گھنٹہ پہلے رفعت نے معصومہ
ران پر چٹکی دیتے ہوئے کہا۔ "انٹرول ہونے والا ہے چائے
کا آرڈر دے آؤ ورنہ رش ہو جائے گا۔"

انٹرول میں معصومہ نے کہا "ہم تو بور ہوئے ہیں۔"
رفعت نے جواب دیا "کل میں بھی بور ہوئی تھی، آپ
لوگوں نے کل مجھے چائے کا آرڈر دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔"
اس بورڈم کو دور کرنے کے لئے رفعت اور معصومہ
اس نتیجے پر پہنچیں کہ ماجد اور ارشد کا تعارف کرایا جائے
تاکہ کوئی بھی بور نہ ہو اور انھوں نے دوسرے دن ارشد
اور ماجد کا تعارف کروا دیا اور آئندہ اتوار کو ان کا ہاکس بے
پر جانے کا پروگرام بن گیا۔
جب یہ لوگ ہاکس بے پر اکٹھے ہوئے تو سب سے پہلے
سی بیچ ہو کر سن باتھ اور غسل کرنے کا پروگرام بنا۔ ماجد
نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔
"بھئی میں رفو کے ساتھ سیر کرنے کے لئے تو بالکل
تیار نہیں ہوں۔ یہ لڑکی بہت بور کرتی ہے۔"
ارشد نے ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اور میں
صومی (معصومہ) کے ساتھ سیر نہیں کر سکتا۔ یہ تو بور کرنے والوں
کی بادشاہ ہیں۔"
"میرا خیال ہے" ماجد نے رفعت اور معصومہ کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں لڑکیوں کو ہٹ
میں بند کر کے تالا لگا دیا جائے۔ جاتے وقت ان کو لیتے
چلیں گے۔"
اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور ماجد نے ارشد کے سامنے
تجویز پیش کی۔
"آپ رفو کو ساتھ لے جائیں۔ اگر بور کرے تو بیشک
سمندر میں پھینک دینا۔"
ارشد نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ماجد کو حق
دیا، "اگر صومی آپ کو بور کرے تو ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ
باندھ کر ذرا گہرے پانی میں چھوڑ آنا۔"
ماجد خوش تھا کہ ارشد الگ ہو گیا ہے اور ارشد خوش تھا کہ ماجد
بچھڑ گیا ہے۔ جب وہ سیر و تفریح سے واپس آئے تو دونوں نے ایک
... تو بہتر رہا" ... اس پر دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ثان حسین

ایک بچہ دو مائیں

ہندہ ڈاؤن گاڑی کے چھوٹنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی ہری
ری جا چکی تھی اور سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔ مسافر اپنے اپنے ڈبوں
کر بیٹھ چکے تھے۔ یکایک دو عورتوں میں ہاتھا پائی ہونے
ایک عورت۔ دوسری کی گود میں سے بچہ چھیننے کی کوشش
لگی اور بچے والی عورت ایک ہاتھ سے بچے کو چھاتی سے
ے دوسرے ہاتھ سے اس عورت کے ساتھ الجھتی ہوئی گاڑی
ڑھنے کی کوشش کرنے لگی

"چھوڑ۔ تجھے موت آئے۔ چھوڑ۔ گاڑی چھوٹ رہی
. . . . ."

"نہیں دوں گی۔ مر جاؤں گی تو بھی نہیں دونگی۔ . . . ."
ری نے بچے کے لئے پھر سے جھپٹتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر پہلے دونوں عورتیں آپس میں گھریلو باتیں
ہی تھیں۔ اور اب دونوں چھینا جھپٹی کر رہی تھیں۔ اس
کے لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے۔ تماشبیں اکٹھے ہونے لگے
ے کانسٹبل جو نل پر پانی پینے جا رہا تھا جھگڑا دیکھ کر
ں ہلاتا ہوا ادھر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہلا گلا مچا رہی ہو؟ اس نے ڈانٹ کر
۔ پولیس والے کو دیکھ کر دونوں عورتیں ٹھٹھک گئیں، دونوں
ہانپ رہی تھیں اور خونخوار نظروں سے ایک دوسرے کو
گھور رہی تھیں۔

دو ایک مسافروں کو گاڑی پر چڑھتا دیکھ کر بچے والی
عورت پھر گاڑی کی طرف لپکی۔ لیکن دوسری نے جھپٹ کر
اسے پکڑ لیا۔ اور اسے کھینچتی ہوئی پھر پلیٹ فارم کے بیچوں
بیچ لے آئی۔ کمزور اعضا والا کالا کلوٹا بچہ عورت کے کندھے
سے لگا سو رہا تھا۔ عورتوں کی ہاتھا پائی میں اس کی پتلی
لمبوتری گردن جھٹکا کھا کر ادھر ادھر لڑھک جاتی لیکن پھر
بھی اس کی نیند نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

"مت ہلا کرو۔ کیا بات ہے؟" کانسٹبل نے چھڑی ہلاتے
ہوئے کہا۔ اور اپنی چھڑی دونوں عورتوں کے بیچ میں ڈال کر
انھیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

جو عورت بچہ چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آنسوؤں
سے لبریز آنکھوں سے پولیس والے کی طرف دیکھا اور تڑپ کر
بولی ــــ "میرا بچہ لئے جا رہی ہے۔ میں بچہ نہیں دونگی۔"
اور پھر ایک بار وہ بچہ چھیننے کے لئے لپکی۔

"گاڑی چھوٹ رہی ہے کمبخت۔ چھوڑ مجھے!" بچے
والی عورت نے چلا کر کہا۔ اور پھر گاڑی کی طرف جانے لگی

ٹبل نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا
۔ اس کا بچہ کیوں لئے جارہی ہے؟ اس نے کڑک کر
ا۔

۔ اس کا کہاں ہے! بچہ میرا ہے۔"
۔ وہ کہتی ہے میرا ہے ـــــ بولو کس کا بچہ ہے؟"
۔ میرا ہے ـــ" دوسری۔ چھوٹی عمر کی عورت بولی۔ اور
نے ہی رو پڑی۔ روکھے بے ترتیب بالوں کے درمیان اس کا
ہ تمتا رہا تھا۔ لیکن آنکھوں میں اب بھی خوف سمایا ہوا تھا۔
اس اور پریشان سی وہ پھر بچے کی طرف بڑھی۔
کانسٹبل جلدی سے جھگڑا نپٹانا چاہتا تھا۔ بچے والی
ت سے بولا۔" بچہ اس کے حوالے کردو۔
۔ کیوں دے دوں ـــــ بچہ میرا ہے ـــ!"
۔ تیرے پیٹ سے پیدا ہوا تھا؟ ـــ"
۔ بچے والی عورت چپ ہو گئی اور گھور کر دوسری
ت کو دیکھنے لگی۔
۔ بول۔ تیرے پیٹ سے پیدا ہوا تھا؟" کانسٹبل نے
سے پوچھا۔
۔ پیٹ سے پیدا نہیں ہوا تو کیا۔ دودھ تو میں نے
یا ہے۔ پچھلے سات مہینے سے پلا رہی ہوں"
۔ دودھ پلایا ہے تو اس سے بچہ تیرا ہو گیا؟ ـــــ بچہ
بردستی لئے جارہی ہے ـــ اس؟"
۔ زبردستی کیوں لے جاؤں گی میرے اپنے بچے سلامت
یا، اسی سے پوچھ لو۔ ڈائن سامنے کھڑی ہے۔" پھر دوسری
ت کو مخاطب کر کے بولی ـــ" کلموہی بولتی کیوں نہیں۔
تجھ سے چھین کے تو نہیں لے جارہی ہوں؟ حولدار جی۔
نے خود بچے کو میری گود میں ڈالا ہے۔ یہ تو اسے چن کر گھورے
پھینکنے جارہی تھی۔ میں نے کہا لا مجھے دیدے۔ میں اسے پال
گی۔ تب سے میں اسے پال رہی ہوں۔ یہ مجھے یہاں چھوڑ کے
تھی۔ یہاں آکر مکر گئی ـــ"

کانسٹبل دوسری عورت کی طرف مڑا۔" تو نے اسے خود
ہی تو دیا تھا؟"
جوان عورت کی بڑی بڑی غضبناک آنکھیں کچھ دیر تک
دوسری عورت کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر جھک گئیں۔
۔ دیا تھا۔ پر بچہ میرا ہے۔ میں کیوں دوں۔ میں نہیں دونگی"
اور افسردہ ہو کر دوسری عورت کی طرف دیکھنے لگی۔
۔ تو نے دیا تھا تو اب کیوں واپس لینا چاہتی ہے؟
آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ایک بار اوپر کو اٹھیں اور اس کا
سارا بدن کانپ اٹھا۔
۔ یہ اسے پردیس لئے جارہی ہے . . . . ." اور یہ کہتے
کہتے وہ رو پڑی۔
۔ میں سدا تیرے پاس پڑی رہوں؟ ـــ" بچے والی عورت
باہیں پھیلا پھیلا کر ـــ آس پاس کے لوگوں کو سناتی ہوئی ریکارڈ کی
طرح بولنے لگی۔ میرے ڈیرے والے سبھی لوگ جا چکے ہیں۔
یہ مجھے چھوڑتی نہیں تھی کہتی تھی۔ دس دن اور رک جا۔ پھر چلی جانا
پانچ دن اور رک جا۔ پھر چلی جانا۔ یہی کرتے کرتے مہینہ ہو گیا۔
میں یہاں کیسے پڑی رہوں؟ آج گاڑی چلنے لگی تو کلموہی مکر
رہی ہے۔"
۔ یہ تیرے رشتے کی ہے؟" کانسٹبل نے پوچھا۔
۔ رشتے کی کیوں ہو گی جی؟ وہ کاٹھیاواڑ کی ہے۔ ہم پنجابے
ہیں ـــ"
۔ تو گاڑی میں کہاں جارہی ہے؟"
۔ بھیم پور"
۔ وہاں کیا ہے؟ ـــ"
۔ ہم پنجابے ہیں۔ حولدار جی۔ پہلے ہمارے لوگوں نے
یہاں زمین لی تھی۔ پورے دو سال ہل چلایا ہے۔ اب ہمیں
بھیم پور میں زمین ملی ہے۔ ہمارے سبھی لوگ چلے گئے ہیں۔ یہ
یہ مجھے چھوڑتی ہی نہیں۔
۔ کانسٹبل تذبذب میں پڑ گیا۔ ایک لمحے چن کر پھینکدیا۔

دوسری نے دودھ پلا کر بڑا کیا۔ بچہ کس کا ہوا؟

"تیرا گھر گھاٹ کوئی نہیں ہے۔ جو اپنا بچہ اسے دیدیا؟ تو رہتی کہاں ہے؟" کانسٹیبل نے بچے کی ماں سے پوچھا۔

"یہ کہاں رہے گی جی۔ پل کے پاس جو پھونس کے جھونپڑے ہیں۔ یہ وہیں رہتی ہے۔ ہم بھی وہیں پر رہتے تھے۔ یہ میری پڑوسن ہے جی۔ مزدوری کرتی ہے۔ اس کی تو نال بھی میں نے کاٹی تھی۔" بچہ کی ماں ایک ٹک بچہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ سُن ہی نہیں رہی ہے۔

"اس کا گھر والا کہاں ہے؟"

"اس کا گھر والا کوئی نہیں جی۔ یہ تو مردوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے۔ کوئی اسے بساتا نہیں۔ اس کا گھر والا ہوتا تو یہ بچے کو جن کر پھینکنے کیوں جاتی؟"

اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی۔

بھیڑ میں سے لوگ چھنٹ کر اپنے اپنے ڈبے کی طرف جانے لگے۔ بنجارن بھی ڈبے کی طرف مڑی۔ بچے کی ماں نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

"مت جا۔ مت لے جا میرے بچے کو۔ مت لے جا!"

کچھ لوگوں کو ترس آیا۔ کانسٹیبل نے رعب دار آواز سے آگے بڑھ کر بنجارن سے کہا۔ "بچہ واپس دے دے۔ اگر ماں بچہ نہیں دینا چاہتی۔ تو تو اسے نہیں لے جا سکتی۔" کانسٹیبل کی آواز میں حکم تھا۔ بنجارن کو اس انصاف کی امید نہیں تھی۔ وہ سٹ پٹا گئی۔ "میں کیوں دے دوں جی! اپنے بچے کو بھی کوئی دیتا ہے؟ کس کو دیدوں؟ اس کا گھر ہے۔ نہ گھاٹ . . . . . "

"گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ جلدی کرو۔ بچہ ماں کے حوالے کرو ورنہ حوالات میں دیدوں گا۔" کانسٹیبل نے اب کی بار کڑک کر کہا۔

عورت گھبرا گئی اور بوکھلائی سی آس پاس کھڑے لوگوں کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر دوسری عورت کی طرف دیکھتے ہوئے چلا کر بولی "حرام زادی۔ کتیا۔ یہاں آکر مکر گئی لے لے غیرت نے سنبھال۔ پھر کہنا دودھ پلانے کو۔ زہر ملا لوں گی، اسے اور تجھے بھی، سات مہینے . . . . بک اپنے بچہ کا پیٹ کاٹ کر اسے دودھ پلایا ہے . . . . " اور جھٹک کر بچہ اس ہاتھوں میں دیدیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ماں نے بچہ چھاتی سے لگایا۔ بچے کے ملتے ہی و مامتا کی ماری رونے لگی۔ عجیب تماشا تھا دونوں عورتیں جا رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ دو ایک ہی بچہ کی ماں تھیں۔ بے گھر لوگوں کو نہ ہنسنے کی تمیز ہے نہ رونے کی۔ اور فساد کی جڑ دبلا پتلا بچہ اب بھی منھ بھینچے سو رہا تھا۔

بنجارن گالیاں بکتی روتی، بڑبڑاتی گاڑی میں چڑھ گ

"تمہیں تمہارا بچہ مل گیا ہے۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ فو" کانسٹیبل نے سوتے بچے کی پیٹ پر چھڑی کی نو رکھتے ہوئے۔ دھمکا کر کہا۔ "فوراً چلی جاؤ یہاں سے!"

بچے کو چھاتی سے چمٹا کے، ماں پیچھے کو ہٹ گئی۔ بھ منتشر ہو گئی۔ ڈبے کے دروازے میں کھڑی بنجارن اب چلائے جا رہی تھی۔

"حرامزادی۔ تو نے اسے جنتے ہی کیوں نہیں مار حب مار ڈالے گی تب ہی میرے دل کو چین ملیگا۔ ناس پیٹ بچے نے گود پہچان رکھی تھی یا تو اس لئے یا جوالدار بید کی نوک لگنے سے بچہ جاگ گیا۔ اور اپنی ننھی ننھی مٹھ سے پہلے تو اپنی ناک ملنے لگا۔ پھر آنکھیں۔ تھوڑی دیر بعد اپنی مٹھی منہ میں لے جا کر اسے چوسنے لگا۔ عورت ذ سی پیچھے ہٹ گئی اور پلیٹ فارم کی دیوار کے ساتھ ح کھڑی ہو گئی۔

بچہ دودھ کے دھوکے میں اپنی مٹھی چوستا رہا۔ دودھ ملتا نہ دیکھ کر جاگ گیا۔ اور دونوں ٹانگیں زور ز سے پٹک کر رونے لگا۔ ماں نے اسے دائیں کندھے

یائیں کندھے سے لگا لیا۔ لیکن بچہ اور بھی زور زور سے
ے لگا۔

ماں پریشان ہوگئی۔ کبھی بچہ کو لیک کروٹ اٹھاتی کبھی
ری، کبھی دائیں کندھے پر اس کا سر رکھتی کبھی بائیں پر"
بچہ کا رونا سن کر ڈبہ کے دروازے میں کھڑی بنجارن
لانے لگی ـــ "مار ڈال تو اسے مار ڈال تو اسے مار ڈال!
یٹی۔ اسے زہر کیوں نہیں دیدیتی! دوپہر سے اس کے
دودھ کی بوند نہیں گئی۔ بچہ روئیگا نہیں؟ . . . . "
کانسٹبل جھڑی ہلاتا وہاں سے جا چکا تھا۔ دو ایک ـــ
کو چھوڑ کر ڈبہ کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ دور ـــ
ہری جھنڈی ہلا رہا تھا۔
گارڈ نے سیٹی دی۔ گویا چلنے کا اعلان کیا۔
بہتر روئے جا رہا تھا۔ ماں نے اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی
ب سے مونگ پھلی کے کچھ دانے نکالے اور بچہ کے منہ
میں ٹھونسنے لگی۔

"ناس پیٹی۔ یہ کیا اس کے منہ میں ڈال رہی ہے! بچے کو
مار ڈالے گی! کنجڑی . . . ـــ !"
اس نے گھوم کر پہلے ایک چھوٹا سا ٹین کا بکس اور پھر چھوٹی
سی گٹھری پلیٹ فارم پر پھینکی اور بڑبڑاتی گالیاں بکتی ہوئی گاڑی سے
اتر آئی۔ "حرامزادی میری گاڑی چھڑا دی تجھے موت آئے۔"
گاڑی نکل گئی۔ ایک ایک کر کے قلی اسٹیشن کے باہر چلے گئے پلیٹ فارم
پر خاموشی چھا گئی۔ کانسٹبل گشت پر دور پلیٹ فارم کے دوسرے سرے تک
پہنچ چکا تھا۔ لیکن جب چھڑی جھلاتا وہ واپس لوٹا تو پلیٹ فارم
کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر وہی دونوں عورتیں بیٹھی
نظر آرہی تھیں۔ بنجارن اپنی گود میں بچے کو لٹائے آنچل کی اوٹ
میں دودھ پلا رہی تھی اور پاس بیٹھی بچے کی ماں دھیرے
دھیرے اپنے لاڈلے کے بال سہلا رہی تھی۔

خبرنامہ

لبا کیلئے بین الاقوامی ادبی مقابلے

نیدرلینڈ کے ثقافتی سرگرمیوں کے بین الاقوامی ادارے
طلباء کے لئے بین الاقوامی ادبی مقابلے کا اعلان کیا ہے جس میں
ن فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانی زبان کی تخلیقات پیش کرنے کی
زت ہوگی۔ ایک طالب مقابلے میں پانچ نظمیں اور تین مختصر
بیان بھیج سکتا ہے۔

لایا کی قومی زبان - ملائی

ملایا کی زبان و ادب کی ایجنسی کے ڈائرکٹر سید نصیر بن
عیل نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۶۷ء تک ملائی زبان ملک کی قومی
ن بن جائے گی۔ یہ فیصلہ چھ سال قبل کیا گیا تھا۔ جب ملایا
آزادی ملی تھی۔

ضامین سرسید

سرسید احمد خاں مرحوم کے مضامین اور مقالات چودہ[۱۴]
لد میں لاہور کے ترقی ادب کے بورڈ نے شائع کرنیکا فیصلہ
ہے اب تک دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

زمانہ ماقبل تاریخ کے تہذیبی آثار

سابق صوبہ سرحد کے ضلع مردان میں مشہور محقق ڈاکٹر دانی
کی نگرانی میں سنگھاؤ کے غار کی حال ہی میں جو کھدائی ہوئی ہے
اس میں زمانہ ماقبل تاریخ کے چار مختلف ادوار کے مختلف تہذیبی
آثار برآمد ہوئے ہیں۔ اس پر تحقیق ہو رہی ہے اور امید کی جا رہی
ہے کہ شاید دنیا میں سب سے قدیم اور نا معلوم تہذیب منظر
عام پر آسکے گی۔

امریکہ کی دریائی یونی ورسٹی

دریائی یونی ورسٹی دراصل ۱۲۵۷۴ ٹن وزنی ایک جہاز ہے
جیا علی تعلیم کا دریائی سفر کرنے والا ایک ادارہ ہے۔ یہ جہاز کیلیفورنیا
کے ایک صنعت کار اور اسپرنگ فیلڈ کالج نے مشترکہ طور پر تیار
کیا ہے۔ امریکہ سے اسی سال ماہ نومبر میں یہ جہاز سفر پر روانہ ہوگا
اس میں پانچسو طالب علم اور ۳۵ اساتذہ ہوں گے۔ جہاز جبتک
سفر میں رہے گا، طالب علموں کے درس جاری رہیں گے، جب
کسی بندرگاہ پر ٹھہرے گا طالب علموں کو تجربہ حاصل کرنے اور معلو
مات میں اضافہ کرنے کے لئے شہر میں گھمایا جائے گا وہ اس ملک

حکاری افسروں سیاسی لیڈروں، مذہبی عالموں فنی ماہرین
بگروں سے ملاقات کرکے تبادلہ خیال کریں گے۔ یہ وفد یائی
سٹی لزبن، کنفیز، ٹیلز۔ اسکندریہ، پورٹ سعید
سنگاپور، بینکاک، ہانگ کانگ اور ہو نولولو کی سیر بھی ہو
کرے گی۔

ترقی اردو کی ڈکشنری کو دہلی کے ایک پبلشر نے
اجازت چھاپ دیا۔ جمیل الدین عالی کا احتجاجی بیان

دہلی کے ایک پبلشر کے آزادانہ انجمن ترقی اردو کی پندرہ سو
ت پر مشتمل مشہور اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کو چھاپ
ے۔ مسٹر دتا کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ ڈکشنری مدن موہن پرنٹنگ
لنپت رائے روڈ لاہور سے شائع کی ہے۔ حالانکہ یہ سراسر
ہے۔ ڈکشنری دہلی سے بالکل نئے ہندوستانی کھرے کاغذ
ت سی خرابیوں کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ بہر حال قابل ذکر
۔ انجمن ترقی اردو اس ڈکشنری کو اپنے پریس میں درآمد شدہ
لے کاغذ پر چھاپ رہی ہے۔ کاغذ کی درآمد کے لئے حال ہی میں
یوب نے ۷۴ ہزار روپے کا لائسنس منظور کیا تھا۔ ایڈیٹروں کا
ڈکشنری پر کام میں مصروف ہے۔ اس اثنا میں بھارتی پبلشر
ں ڈکشنری کو ناجائز طریقے پر چھاپ کر بیرونی ممالک میں انجمن
سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فروخت کرنا شروع کر دیا ہے انجمن
اردو کے سیکرٹری مسٹر جمیل الدین عالی نے بھارتی پبلشر کے اس
ی مذمت کرتے ہوئے اسے کاپی رائٹ کے بین الاقوامی
ن کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا
ڈکشنری کا بھارتی اڈیشن ہماری ڈکشنری کی چھوٹے سائز کے کاغذ
ڈ پر نقل ہے۔ دراصل ہم کو ہمارے کاروبار اور مقبولیت سے
م کرنے کی یہ ایک کوشش ہے۔ انھوں نے آگے چل کر کہا کہ
ال پہلے بھارتی مصنف کرشن چندر نے ساہیتیہ گلڈ کو لاہور
ب پبلشر کے خلاف شکایت لکھی تھی جس پر گلڈ نے فوراً انفرمیشن
کے مغربی پاکستان کے گورنر سے رجوع کیا تھا اور گورنر نے
خلاف ورزی کرنے والے پاکستانی پبلشر کے خلاف سخت قانونی کارروائی
کی تھی۔ لہٰذا مسٹر عالی نے امید ظاہر کی ہے کہ بھارتی حکومت بھی
پبلشر مذکور کے خلاف ایسا ہی قدم اٹھائے گی۔

عالی صاحب نے متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی ایک سیلر ڈکشنری کے اس
اڈیشن کو درآمد کر کے فروخت کرنے کی کوشش کریگا اس کے خلاف
انجمن قانونی چارہ جوئی کرے گی۔ انجمن نے کسٹم کے حکام سے بھی درخواست
کی ہے کہ اس ڈکشنری کی پاکستان میں درآمد کی اجازت نہ دیں۔ آخر
میں جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ اگر بھارتی حکومت اس پر کچھ توجہ
نہیں کرتی تو کم سے کم بھارتی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس جعلسازی
کی کھل کر مذمت کریں، پاکستانی ادیبوں نے ہمیشہ بھارتی ادیبوں
کے مفاد کا زبانی اور عملی ثبوت دیا ہے۔

انجمن نے بھارتی وزیر تعلیم مسٹر ہمایوں کبیر کو ایک احتجاجی خط
لکھا ہے۔

مرزا غالب کے مکان کی فروخت

دہلی کے ایک ممتاز انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے اپنے صفحہ پر بہت
نمایاں طور سے یہ خبر شائع کی ہے کہ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے مداحین
کو یہ معلوم ہو کر بہت دکھ ہوا کہ کسٹوڈین متروکہ املاک نے یہاں گلی قاسم
جان بلند بلی ماران میں مرزا غالب کا مکان فروخت کر دیا ہے وزیر ثقافت
امور مسٹر ہمایوں کبیر نے کہا ہم اس مکان کو محفوظ عمارت قرار نہیں دے سکتے
تھے نہ ہی ہر چیز کو محفوظ کر سکتے ہیں غالباً وزیر موصوف کا اشارہ اس
حقیقت کی طرف تھا کہ مرزا غالب کم از کم چار مکانات میں رہتے تھے بہر نوع
گلی قاسم جان کا مکان بہت مشہور رہا اسلئے کہ غالب نے اس مکان میں
کئی سال گزارے تھے اور اپنی شاعری میں بھی اس مکان کا ذکر کیا تھا مرزا
غالب کے ایک پرستار نے رانچی سے لکھا ہے کہ کیا ایک عظیم قومی شاعر
کی یاد کو تازہ رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ ایک اور مداح نے لکھا ہے کہ پانچ برس پہلے
میں حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ غالب کو زندہ جاوید رکھا جائے گا
لیکن کیا اس کا یہی طریقہ ہے کہ مرزا غالب کے مکان کو فروخت
کر دیا جائے۔ بزم غالب کے ایک عہدیدار نے کہا کہ اگر حکومت کو مرزا غالب کا

مکان فروخت کرنا ہی تھا تو وہ بزم کو مزید فنڈ جمع کرنے کا موقع دیتی کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اس مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ اس وجہ سے کیا تھا کہ یہ مکان پرانے شہر کی ایک چھوٹی گلی میں ہے اور وہاں گھنی آبادی ہے اس مکان کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ مرزا غالب کے عقیدت مندوں کو وہاں تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے ادھر مرزا غالب کے مداحوں نے اس دلیل کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اگر حکومت صرف اس وجہ سے مرزا غالب کے مکان کا تحفظ نہیں کرنا چاہتی کہ وہ تنگ گلی میں ہے تو گویا وہ مرزا غالب کی شاعری کے ان حصوں سے بے تعلقی کا اظہار کر دیا جاتا ہے جن میں ان مصائب تلا کا ذکر ہے جو اس عظیم شاعر کو گھیرے ہوئے تھے ادھر محکمہ آثار قدیمہ نے بتایا کہ نظام الدین میں مزار غالب کا تحفظ کیا جائیگا تاہم جس علاقہ میں یہ مزار واقع ہے اسے خوبصورت بنانے کا کوئی منصوبہ ابھی تک نہیں بنایا گیا ہے مرزا غالب کے مداحوں کا بیان ہے کہ مزار کا تحفظ کافی نہیں ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ تاریخی اعتبار سے وہ مکان زیادہ اہمیت رکھتا ہے جہاں مرزا غالب رہتے تھے۔

ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں

تاریخ جمالیات

نصیر احمد ناصر

جلد اول	۱۵ روپے

جلد دوم	۱۶ روپے

ناشر ——— مجلس ترقی ادب لاہور

تغزّل

مجموعہ غزلیات

ظہیر کاشمیری

قیمت	۵ روپے

ناشر ——— نیا ادارہ لاہور

مفکر مہران

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات

اور شاعری پر تفصیلی کتاب

اختر انصاری اکبر آبادی

ناشر

محکمۂ اطلاعات حیدر آباد ریک ۱

دیواریں

حمید کاشمیری

زیر طبع

ناشر ——— مشتاق بک ڈپو۔ کراچی

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ

(حالات و تاریخ)

کلیم اختر

قیمت	۶ روپے ۷۵ پیسے

ناشر	سندھ ساگر اکادمی۔ سیہور

شخصیتیں

مشہور شخصیتوں کے سوانحی خاکے

عبدالقدیر اشک

قیمت	۳ روپے ۲۵ پیسے

ناشر

ادارۂ ادبیات نو۔ لاہور

دشتِ جنوں

(مجموعۂ کلام)

شاعر لکھنوی

زیرِ طبع

ناشر — ادبیات پاکستان۔ ناظم آباد۔ کراچی

چاندنی کے سائے

(مجموعۂ کلام)

قمر ہاشمی

زیرِ طبع

ناشر — ادبیات پاکستان۔ ناظم آبا

میرے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان

سفرنامہ

صہبا لکھنوی

قیمت — چار روپے

ناشر — مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

منتخب تحریریں

مرتبہ

تاج سعید — جوہر میر

قیمت: — ا روپیہ ۵۰ پیسے

ناشر — مکتبۂ فنکار۔ سرکی گیٹ پشا

تنہائی کا سفر

(ناول)

جوہر میر

قیمت ۳ روپے ۷۵ پیسے

ناشر مکتبۂ فنکار۔ سرکی گیٹ پشاور

معارج الدین

المعروف

اسلام اور سائنس

پروفیسر سید نواب علی

قیمت چار روپے ۷۵ پیسے

ناشر مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ

انجمن ترقی اردو کی کتابیں

قاموس الکتب (جلد اول) مذہبیات سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی مکمل فہرست صفحات (۱۴۰۰) سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۴۰ روپے

داستان زبان اردو ڈاکٹر شوکت سبزواری قیمت ۵ روپے

جیتا جاگتا اندلس کے مشہور فلسفی ابن طفیل کی تصنیف حیٔ بن یقظان کا ترجمہ از ڈاکٹر محمد یوسف۔ قیمت تین روپے ۵۰ پیسے

ملا نصرتی ملک الشعرا بیجاپور، بابائے اردو۔ قیمت ۵ روپے

اردو تنقید کا ارتقا ڈاکٹر عبادت بریلوی قیمت

مہ و انجم مارٹن ڈیوڈسن کی کتاب کا ترجمہ از نثار الحق صدیقی۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

خیالات عزیز عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری ڈاکٹر لطیف حسین ادیب۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

قدیم اردو بابائے اردو قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

مضامین سلیم (تین جلدوں میں) وحید الدین سلیم کے نایاب مضامین کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے ۵۰ پیسے

رومیو جیولیٹ شیکسپیئر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ از عزیز احمد۔ قیمت ۵ روپے

فاؤسٹ گوئٹے کا شاہکار کا منظوم ترجمہ از مولوی عبد القیوم باقی مرحوم۔ قیمت پانچ روپے

مرحوم دہلی کالج بابائے اردو قیمت ۴ روپے

داس کیپٹال (حصہ اول) کارل مارکس کی عہد آفرین کتاب کا ترجمہ از سید محمد تقی قیمت ۷ روپے ۵۰ پیسے

فن شاعری ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ مع ترجمہ از عزیز احمد قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

اردو تھیٹر (جلد اول) از ڈاکٹر عبد العلیم نامی قیمت سات روپے

" " (جلد دوم) " " " " "

" " (جلد سوم) " " " " "

مقالات گارساں دتاسی (حصہ اول) دس روپے

خطبات گارساں دتاسی (حصہ اول) مقدمہ مولوی عبد الحق قیمت دس روپے

" " (حصہ دوم) " " " "

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ۔ کراچی ۱

روپیہ بچائیے اور

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ

میں جمع کیجئے

رجسٹرڈ آفس میکلوڈ روڈ کراچی

ڈیو
ٹائلٹ صابن
لطیف اور مُعطّر
ڈیو ٹائلٹ صابن کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو نے بیشتر خواتین و حضرات کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ اسکے لطیف اور چکنے جھاگ آپکی جلد کو ریشم کی طرح ملائم اور صاف ستھرا رکھنے کے علاوہ دیرپا تازگی اور فرحت بخشتے ہیں۔ آپ بھی ڈیو ٹائلٹ صابن آزمائیے۔
DEW
TOILET SOAP
قیمت ٦٠ پیسے
ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے
اسے چمکدار پنی میں بھر بند کیا گیا ہے!
f
فیروز سنز
لیبارٹریز لیمٹڈ
نوشہرہ، مغربی پاکستان

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو
ردطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش
انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم
حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح
متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے بحیثیت ادیب کے
اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی
ادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی
جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے
اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے
ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان
زید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے
س فرض سے جو صداقت کی عکاسی حُسن
ن کی قدروں کی نشوونما بین الاقوامی اخوت
تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات
قیام سے متعلق ہے۔ کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت
دہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار
ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی
پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرہ کی
کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے
ار اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت، اقتدار
انی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں اسی لئے
سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ
ریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس
میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

جلد ۳ نمبر ۱۲

اگست ۱۹۶۳ء

قیمت ایک پرچہ ۶۲ پیسے
سالانہ ۶ روپے
اراکین ادارۂ مصنفین سے پانچ روپیہ سالانہ

ادارۂ مصنفین پاکستان
(پاکستان رائٹرز گلڈ)
اسٹریچن روڈ کراچی

فہرست

طابع، ناشر اور مدیر جمیل الدین عالی نے انجمن پریس کراچی میں چھپوا کر ادارۂ مصنفین پاکستان کراچی سے شائع کیا۔

یہ شرمناک رجحانات

کچھ عرصے سے اردو روزناموں اور ماہناموں کے مزاج میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس ہونے لگی ہے۔ روزناموں میں مشہور
یوں کے کالم نظر آنے لگے ہیں۔ اب تک یہ روزنامے ادیبوں سے ایک آدھ مزاحیہ کالم لکھوا لیا کرتے تھے یا شعبۂ ادب (میگزین سیکشن)
کے جمعے یا اتوار کے اخبار چھاپتے تھے۔ اس میں دو چار سنجیدہ قسم کے مضامین نظر آجاتے تھے لیکن اب علاوہ ازیں کئی روزناموں کا مستقل
ادبیات ہو گیا ہے۔ سب سے زیادہ تبدیلی کراچی کے روزناموں میں پیدا ہوئی ہے ان کا خبری حصہ جیسا بھی ہو لیکن اب اخبارات سنجیدہ
مات اور عمدہ مضامین سے پُر ہوتے ہیں۔ مالکان اخبارات عوام کے مزاج شناس ہوتے ہیں۔ انھوں نے بالآخر یہ محسوس کر لیا کہ پڑھنے
سنسنی خیزی، اسکینڈل بازی اور الزام و افترا سے تنگ آگئے ہیں اور اب معقول سنجیدہ اور اچھا مواد چاہتے ہیں۔ اس سے ایک اتفاقی
چند ادیبوں کو بھی کچھ پیسے اور یہ حلقۂ ادبیت بڑھتا ہی جاتا ہے۔

لیکن ——— دوسری طرف بعض ادبی رسائل کے مضمون نگاروں نے "زرد جرنلزم" کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ انھوں نے
ین کے بارے میں، افترا، الزامات، سوقیانہ پن اور پگڑی اچھالنے کی تمام حرکتیں اختیار کر لی ہیں۔ اس سے یقیناً ان جرائد کی اشاعت
و مہینہ بڑھ گئی ہوگی۔ کیونکہ جن کے بارے میں افواہیں، اسکینڈل اور غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھی جاتی ہیں وہ اور ان کے حلقہ ہائے ارادت
ان پرچوں کو بُرا کہتے ہیں مگر ——— کچھ تو کہتے ہیں۔ شاید اس کا جواز یہ پرچے اس طرح پیش کرتے ہوں کہ بھئی کچھ ہنگامہ تو ہو رہا ہے
بات کا اعلان کرتے ہیں کہ لوگوں کے پاس ادبی ذخیرہ کچھ نہیں رہا۔ اس لئے اب یہی غنیمت ہے کہ ڈھاکے، لاہور، کراچی کے ادبی
ل تصنیف کر کے شائع کئے جائیں۔ ان جرائد کے نام نہاد نامہ نگاروں نے قلمی نام رکھ لئے ہیں اور اپنے اپنے شہروں سے
کے ... جھوٹے اور بیہودہ باتیں لکھ کر بھیجتے ہیں جو مدیران گرامی نہایت فخر سے شائع کرتے ہیں اور مہینے کے آخر میں اپنے بڑھتے
کاروبار کا جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ شکر ہے ادب کسی نہ کسی طرح تجارتی فائدہ تو پہنچا رہا ہے۔

ان ادبی نامہ نگاروں کی روش تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات خود ادب کی بازی ہار کر بیٹھ چکے تھے۔ شاید ان میں کوئی
لا ادیب نہیں ہے جسے اپنی حیثیت عرفی کا احساس ہو۔ نہ کوئی اہل دل ہے جسے ادب کا نام لینے والے دکھی لوگوں کی عزت و آبرو
بلکہ چند بدمذاق، غیر ذمہ دار اور ناشائستہ پسند ہر شہر میں ہوتے ہیں جنھیں ثقہ لوگ منہ نہیں لگاتے۔ پہلے وہ کافی ہاؤسوں، ٹی ہاؤسوں
براہ بالا اور مشہور معاصرین کو برا بھلا کہتے پھرتے تھے اب انھیں ادبی جرائد کی نامہ نگاری مل گئی ہے تو انھوں نے اپنے احساس کمتری
ناہمی بے چارگی کے مشترکہ طوفان میں سب کو لپیٹ لیا ہے۔ اب صرف اتنا باقی رہ گیا ہے کہ ادیبوں کی ماؤں بہنوں، بیویوں، بیٹیوں کے

نام لے کر اسکینڈل پھیلائے جائیں ویسے اس کا آغاز تو ہو ہی گیا ہے۔

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

کیا آزادیٔ اظہار کے یہی معنی ہیں کہ جس کے پاس ایک پرچہ ہو وہ ہر ادیب کی عزت خراب کرنے کا حقدار ہو جائے۔ ہر جریدے کے پاس صحافتی گریز کی گنجائش ہوتی ہے۔ نامہ نگاروں کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر میدان سے ہٹ جانے کا محض بہانہ ہوتا ہے۔ مقدمہ بازی کے لئے اپنے کاروباری ادارے کے ذرائع ہوتے ہیں، ادیب بے چارہ دن بھر روزی کے چکر میں مبتلا رہتا ہے اس میں مارنے مرنے کی طاقت اور فرصت کہاں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پڑھے لکھے لوگوں نے اپنے رہے سہے تھیئے بھی چھوڑ دیئے ہیں جو کبھی دو چار لوگوں سے ہنس بول لیتے تھے اب ان میں بھی راہ و رسم کم ہوتی جا رہی ہے۔ کیا خبر کون نامہ نگار کہاں سے کون سی بات سن کر اسے کس پیرائے میں خبرنامہ بنادے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب میں ادبی اختلافات ہمیشہ رہتے ہیں، لیکن اب تک روایت یہ تھی کہ لکھنے والے اپنے نام سے مضامین یا خطوط میں ادبی معاملات پیا اپنا نقطہ نظر واضح دیا کرتے تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ہر شہر کی ادبی شخصیتوں کے ذاتی حالات کے بارے میں توڑ مروڑ کر خبریں تیار کی جائیں اور انھیں "نامہ نگار" کے نام سے "موقر" جریدوں میں شائع کر دیا جائے، یہ روش ادب میں ایک ایسے فتنے کی ابتدا ہے جس کو اگر فوراً نہ روکا گیا تو ہماری رہی سہی ایشیائی ثقافتوں کے چہرے مسخ کر دیگا اس طرح ہماری تمام ادبی شخصیتوں اور اکابر و مشاہیر کی سخت حوصلہ شکنی ہو رہی ہے یہ "نامہ نگار" لوگ اپنے پرانے اور نئے بغض و عناد کی بنا پر جس کے لئے جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مدیران کرام ان کی رپورٹیں بجنسہٖ چھاپ دیتے ہیں۔

گلڈ اس معاملے میں خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا، سب سے پہلے ہم متعلقہ مدیران جرائد سے درخواست کریں گے کہ وہ اس فتنے کو مزید ہوا نہ دیں۔ یہ درخواست ہم ان سے انتہائی خلوص اور دردمندی سے کر رہے ہیں، ادب کے نام پر جس کی سربلندی یقیناً انھیں عزیز ہوگی، اپنے اخلاق کی بنا پر جس میں بزرگوں کی تکریم ایک جزو لاینفک ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی مذہبی اقدار کے نام پر جن میں افترا، افواہ اور بدگوئی گناہِ کبیرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ بات سنجیدہ ہے اور سنجیدہ ہی رہنا چاہئیے۔ آج کل "ہم قلم" پابندی سے نہیں نکل رہا ہے جس کے کچھ تنظیمی اسباب تھے۔ لیکن اب وقت پر اور مسلسل نکلے گا اور کوشش کریگا کہ اس شر پسندی کا سدِ باب ہو جائے۔ ہم اپنی کوششوں کو جو پاکستانی ادب اور ادیب کی توقیر بڑھانے کے لئے جاری ہیں اس طرح رسوا ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور اگر کوئی ان الفاظ کو یہ سمجھ کر پورے ملک کے دانشورانہ وقار کو مجروح کرنا چاہتا ہے تو ہم بھی حاضر ہیں۔ خواہ لوگ خود ہمارے بارے میں گندہ ذہنی پر اتر آئیں۔

گلڈ کے مرکزی دفتر میں ایسے بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں پوچھا گیا ہے کہ اس "شرپلو" کے بارے میں گلڈ کا کیا رویہ ہے اور کیا وہ ان اکابر ادبا کی مدد کرے گا جن کو نامہ نگاران مذکور ہدفِ ستم بنائے ہوئے ہیں۔

گلڈ کے مرکزی دفتر کی ہدایت پر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ صرف اکابر و مشاہیر ہی نہیں بلکہ جو ادیب بھی ازالۂ حیثیت عرفی کے سلسلے میں ایسے جرائد کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہے۔ اس کے لئے گلڈ کے قانونی مشیروں کی خدمات بغیر معاوضہ حاضر ہیں اور عدالتی اخراجات بھی گلڈ ادا کرے گا۔ اس معاملے میں کسی ادیب کو اپنی مصروفیات یا مالی حالات

کی بنا پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔

دو سال پہلے ایک نہایت طاقتور اور دولت مند رسالے نے ادیبوں کا حق تصنیف غصب کرنے کی روش اختیار کر رکھی تھی اور لوگ طوالت کے ڈر سے عدالت میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن دو باہمت ادیبوں نے گلڈ کی رفاقت میں عدالت سے رجوع کیا، مقدمہ چلا اور عدالت نے مدیر صاحب کو سزا دی جس کے بعد انھیں یا کسی اور کو جرأت نہ ہوئی کہ بغیر اجازت کسی کی تصنیف شائع کرے۔

ہم اپنے اراکین کو مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں جب کبھی بھی اپنی حیثیت عرفی مجروح ہونے کا احساس ہو، وہ فوراً مقامی یا مرکزی دفتر سے قانونی مشورے اور عدالتی کارروائی کے لئے رجوع کریں۔

ہم دوسرے جرائد سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ہمارے معاشرے میں ادیب ایک مقدس اور قابل تکریم سرمایہ ہیں، جو غیر ذمہ دار عناصر ان کی عزت و ناموس کے درپے ہیں ان کی سرکوبی میں کسی رو رعایت کی ضرورت نہیں۔ معاملہ "ہم قلم" کا نہیں کیونکہ اب تک "ہم قلم" ایسے حملوں سے محفوظ رہا ہے، لیکن یہ معاملہ ہماری تمام جماعت کا ہے، ادیبوں کی جماعت کا، ادیب جو ادب تخلیق کرتے ہیں، ادب کا جو کسی بھی معاشرے کا اعلیٰ ترین ورثہ ہوتا ہے۔

شوکت صدیقی

سیاہ حاشیہ

۱۶ جولائی کی شام ملک کے مشہور و ممتاز شاعر ادیب سہارنپوری نیول اسپتال کراچی میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم پاکستانی بحریہ کے دفتر میں مہتمم کتب خانہ تھے۔ ڈیڑھ ماہ سے وہ علیل اور نیول اسپتال میں زیر علاج تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز نغمہ طراز تھے۔ قیام پاکستان سے قبل وہ اردو کے مشہور شاعروں میں گنے جانے لگے، مشاعروں میں وہ اپنا کافی رنگ جما دیتے تھے۔ ان کا کلام سادگی و پرکاری کے زیور سے آراستہ ہوتا تھا۔

وہ جتنے مشہور شاعر تھے۔ اتنے ہی مخلص اور بے ریا انسان بھی تھے، وضعداری اور ہماری تہذیب و شائستگی کا زندہ نمونہ تھے۔

ادیب سہارنپوری کا ایک مجموعۂ کلام "رنگ و آہنگ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

سلسلۂ روز و شب
گلڈ کی سرگرمیاں

واضح نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی

رائٹرز گلڈ کے دفتر میں بنگلہ زبان کی کلاس کے طلباء سے جناب گردیزی کا خطاب

لاہور ۱۷ جولائی. صوبائی وزیر محنت و سماجی بہبود سید احمد نواز گردیزی نے آج یہاں کہا کہ ہم ایک واضح مقصد کو سامنے رکھے بغیر ترقی نہیں کر سکتے، بد قسمتی سے ہمارے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔ آپ آج شام رائٹرز گلڈ کے دفتر میں بنگالی کلاس کے طلبا اور مہمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ سید احمد نواز گردیزی نے کہا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اتحاد کا واحد ذریعہ اسلام ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مغربی پاکستان کے لوگ بنگالی زبان سیکھیں اور مشرقی پاکستان کے لوگ ہماری زبان سیکھیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کا ایک طبقہ بہت امیر اور دوسرا بہت غریب ہے زبان کی اہمیت اور اس قسم کے دوسرے معاملات پر غور کرنے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ مجموعی طور پر ہمارے سامنے کوئی لائحہ عمل اور مقصد نہیں ہے آپ نے کہا کہ ایک مقصد کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

ملک کی مختلف زبانیں سیکھنی چاہئیں۔

جناب گردیزی نے مزید کہا کہ یہ بات باعث شرم ہے کہ ہم مشرقی پاکستان میں جا کر اپنے بھائیوں سے انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں آپ نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں پاکستان کے مختلف علاقوں کی زبانیں سیکھنی چاہئیں تاکہ اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے اور ایک قومی ذہن تیار ہو سکے، آپ نے مزید کہا کہ مغربی پاکستان میں بنگالی زبان سکھانے کا انتظام قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی ہونا چاہئے تھا آپ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ رائٹرز گلڈ نے بنگالی زبان سکھانے کا انتظام کیا ہے اور حکومت پر سبقت لے گئی ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر یہ کام حکومت کا تھا آپ نے بنگالی سیکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر پاکستان کے دونوں حصوں کی زبان اردو بن جاتی تو پھر بھی ہمیں بنگالی سیکھنی چاہئے تھی۔

وزیر موصوف نے مزید کہا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی بہت مخلص ہیں لیکن بعض لوگ اپنی لیڈری چمکانے کے لئے مختلف

نعرے لگا کر ملک کے دونوں حصوں میں فضا خراب کرنے پہ تلے ہیں در پہ نہیں سمجھتے کہ اس سے ملک کو نقصان پہنچے گا۔ آپ نے کہا میں خود بھی بنگالی سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور سوشل ویلفیر کونسل کی طرف سے بنگالی کلاس کو کچھ گرانٹ دلوانے کی کوشش بھی کروں گا نیز وزیر تعلیم سے بھی درخواست کروں گا کہ حکومتی سطح پر بنگالی سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ اس اجتماع سے بنگالی کلاس کے طلباء نے پاکستان بنگالی اور اردو بنگالی اور پنجابی کے موضوع بنگالی میں مضامین پڑھے۔ اور قاضی نذرالاسلام کی چند نظمیں بھی پڑھ کر سنائیں۔ بنگالی کلاس کے استاد مسٹر سی۔ سی۔ داس اور گلڈ کے سیکرٹری جناب قتیل شفائی نے وزیر موصوف کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کیا

رائٹرز گلڈ کی بنگلہ کلاس

بنگلہ اور پنجابی الفاظ کی مشابہت

ایک واضح اور روشن تحریر

یہ بڑی ہمت افزا اور جان بخش تقریب تھی۔ رائٹرز گلڈ کے دفتر کے سامنے والے وسیع میدان پر اتوار کی صبح کو ہونے والی۔ دعائیں عام قسم کی بارش کا گیلا پن موجود تھا اور جگہ جگہ کیچڑ کی کیاریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے نئے نئے ٹکڑے جمع ہو کر جھکتے رہے تھے تقریب بڑی مختصر تھی۔ یہی کوئی ساٹھ ستر مہمان ہوں گے جو کرسیوں پر جیسے باہر سے لاکر رکھ دیئے گئے تھے کرسی صدارت پر وزیر محنت و سماجی بہبود جناب علی نواز گردیزی اپنے مخصوص لاتعلق انداز میں بیٹھے تھے۔ نیم وا آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے ان کے پہلو میں گلڈ کے ریجنل سیکرٹری اور اردو کے ممتاز شاعر جناب قتیل شفائی اپنے چہرے پہ مستقل مسکراہٹ کی نقاب ڈالے بیٹھے تھے یکایک یہ جامد تصویر حرکت میں آگئی۔ رائٹرز گلڈ کی بنگالی کلاس کے بانی ہیڈ ماسٹر اور چپڑاسی جناب سی۔ سی۔ داس نے اپنی مخصوص بنگالی انگریزی میں مہمان خصوصی کا استقبال کیا اور اپنے ایک شاگرد کو خطبہ استقبالیہ پڑھنے کیلئے کہا۔ مسٹر سی سی داس مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو ذہنی طور پر قریب کر دینا ان کی زندگی کا مشن ہے اسی مشن کی تکمیل کے لئے انھوں نے مغربی پاکستان والوں کو بنگلہ زبان بولنا پڑھنا اور لکھنا سکھانے کی مبارک اور یقیناً قابل صد ستائش تحریک شروع کر رکھی ہے، اس سے قبل موصوف نے متعدد سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے کہا کہ انھیں بنگالی کلاس جاری کرنے کے لئے سہولتیں مہیا کی جائیں۔ لیکن کئی سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری مصلحتیں ہر بار آڑے آتی رہیں اور کام شروع نہ کیا جا سکا۔ آخر رائٹرز گلڈ نے اس اہم کام میں مسٹر سی سی داس کی اعانت کی گلڈ کا کوئی رکن یا عہدہ دار بنگلہ نہیں سکھنا لیکن یہ کلاس شروع کر کے گلڈ نے اپنے گزشتہ کئی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اس سیشن میں پڑھنے لکھنے کی کلاس میں انیس اور صرف بولنے کی کلاس میں اکیس طلباء ہیں مسٹر داس کا کہنا ہے کہ اگر آدمی باقاعدگی سے کلاس میں آتا رہے تو وہ تین مہینے میں بنگلہ بول سکتا ہے اور چار مہینے میں اس زبان میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اندرون بھاٹی دروازہ لاہور کا ٹھیٹھ پنجابی نوجوان ڈائس پر آیا اور اس نے بنگلہ زبان میں خطبہ استقبالیہ پڑھنا شروع کیا۔ میں اپنی دوسری قومی زبان کے سلسلہ میں گونگا اور بہرہ ہوں۔ اس لئے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنا بیٹھا رہا۔ البتہ میری نگاہیں بنگالی مہمانوں کے چہروں سے نہیں ہٹیں جو اگلی صفوں میں بیٹھے تھے۔ ان سلگے بیضوی چہروں پر طمانیت اور مسرت کی کتنی عجیب روشنیاں تھیں۔ میں نے ان روشنیوں میں زمین کے اکھڑا میل کو سمٹ کر ایک نکتہ بنتے دیکھا۔ بھاٹی کے نوجوان نے مغربی پاکستان کے معزز وزیر کی خدمت میں سپاسنامہ پیش نہیں کیا تو مشرقی پاکستان کو ایسی آواز میں پکارا جس کی گونج دریاؤں کی اس حسین زمین میں یقیناً دور دور تک سنائی دے گی۔ ان کے بعد سات سالہ بچی فوزیہ نے ایک بنگالی لوک گیت سنایا اور مسٹر داس نے اعلان کیا کہ ایک صاحب بانسری سنائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ سیون اپ بلائی جائے گی جو کمپنی نے اس موقع پر مہمانوں کی ضیافت کے لئے مفت مہیا کی ہے بانسری کی آواز اس مشروب میں غرق ہو گئی اور ناظم علی پنجابی

ور بنگلہ الفاظ اور محاوروں میں مشابہت کے موضوع پر مقالہ پڑھنے
کے لئے تشریف لائے، انھوں نے ڈیڑھ دو صفحوں میں بتایا کہ سامعین
س مشابہت کو دیکھ کر بہت حیران ہوں گے چنانچہ جب انھوں نے
نجابی اور بنگلہ الفاظ کی مشابہت بیان کی تو ہم سب نہایت برخورداری
سے حیران ہوئے، اگر آپ بھی حیران ہونا پسند کریں تو عرض ہے کہ پنجابی
کے "ڈب مر" کے محاورے کو بنگلہ میں ڈوب مور۔ پھنتی کو پھوتوا
ملدی کو جولدی، راکھی کرنا کو رو کھا کورا اور کھل کے بول کو کھولے
بولو کہتے ہیں۔ اردو مصدر لانا کی جگہ بنگلہ میں آنا بولا جاتا ہے وغیرہ
برصغیر کی اکثر پراکرت زبانیں ایک دوسرے سے قریب ہیں اسلئے
بعض الفاظ کی مشابہت حیرت انگیز ہوتی ہے صاحب مضمون نے بڑی
محنت سے یہ قیمتی مقالہ تحریر فرمایا تھا۔ بھائی دروانے والے
لب علم نے قاضی نذر الاسلام کا ایک گیت سنایا اور کاظم علی ایک دفعہ
پھر تشریف لائے انھوں نے اس کا منظوم ترجمہ کیا تھا بنگالی زبان
سے ناواقفیت کی وجہ سے ترجمہ کے متعلق رائے نہیں دی جا سکتی
لیکن جو نظم پیش ہوئی وہ یقیناً قابل داد تھی ایک دوسرے طالبعلم
نے اردو اور بنگلہ کے محاورے پیش کئے ان کے الفاظ میں بنگالی
محاورے اردو محاوروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ایک برقعہ پوش
خاتون جو سات بچوں کی والدہ ہیں اس کلاس کی قابل فخر طالبہ ہیں۔
انھوں نے بنگلہ میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا مضمون پڑھا اور آخر میں
مغربی پاکستان کے وزیر سماجی بہبود نے آنگ آنگ کر بنگلہ میں لکھی
مختصر سی تقریر پڑھی جو غالباً انھیں اردو میں لکھ کر دی گئی تھی قتیل شفائی
نے اعلان کیا کہ گردیزی صاحب بھی اس کلاس کے طالب علم بن رہے ہیں
گردیزی صاحب نے اس کی تردید ضروری نہیں سمجھی اور خوشگوار محفل
خوشگوار انداز میں ختم ہو گئی۔

لیکن یہ محفل ختم نہیں ہوئی۔ اس کا آغاز ہوا ہے آپ کو یاد
ہوگا کہ آج سے تیس برس قبل پاکستان نام کا ملک دنیا کے نقشے
پر موجود نہ تھا۔ چند لوگ اس کے متعلق سنجی طور پر سوچا کرتے
تھے، اور باقی کی دنیا ان چند لوگوں کو خبطی سمجھ کر ہنسا کرتی تھی ان
ہنسنے والوں کو ۱۹۴۷ء میں معلوم ہوا کہ چند خبطیوں کا یہ خواب پوری
قوم کی آرزو بن چکا ہے اور ۱۹۴۷ء میں دنیا کا نقشہ پرچم ستارہ
و ہلال کے لئے جگہ پیدا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دنیا کے افلاطون اس
بات پر متفق تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا جغرافیائی فاصلہ
لسانی بعد، اور تمدنی فرق اس ملک کو کبھی مستحکم نہ ہونے دیگا، داخلی
اور خارجی طور پر اس سطحی فرق کو استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کیگئی
لیکن جس طرح ۱۹۴۷ء کے بعد سے عوام نے اس ملک کو بنانے کا
تہیہ کر لیا تھا بالکل اسی طرح اور اسی شہر لاہور میں اس کے استحکام
کی پہلی اینٹ عوام کے ہاتھوں رکھی گئی ہے۔ رائٹرز گلڈ کا یہ فخر
ابد الآباد تک قائم رہے گا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک دوسرے
سے قریب تر لے آنے والی اہم ترین تحریک کا آغاز اس لان میں
ہوا۔ یہ مختصر تقریب میرے نزدیک اس ملک کے انتہائی تابناک
مستقبل کا صفحہ اول ہے، اس تقریب میں شامل ہونے والے
مشرقی اور مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی چمکتی پیشانیوں پر یہ بات
بڑے واضح اور جلی حروف میں لکھی ہوئی موجود تھی۔ اگر کوئی اس کو
نہیں پڑھ سکا تو غلطی اس کی ہے۔

اعلان

مغربی پاکستان رکین کی مجلس عاملہ کے ۳۰ مئی کے اجلاس میں
یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جن اراکین کے ذمے ایک سال سے زیادہ
عرصے کا چندہ بقایا ہے ان سے درخواست کی جائے کہ وہ
دو ماہ کے اندر واجبات ادا کر دیں ورنہ ان کی رکنیت منسوخ
ہو جائے گی۔ عاملہ کے فیصلے کے مطابق جون کے دوسرے
ہفتے اراکین کی خدمت میں یہ اطلاع بھیجدی تھی، یہ میعاد
اگست کے دوسرے ہفتے ختم ہو جاتی ہے لیکن اراکین کی سہولت
کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وصولی کی آخری تاریخ ۵ ستمبر
تک بڑھا دی جائے۔ چنانچہ اب واجبات ۵ ستمبر تک
ادا کئے جا سکتے ہیں۔

قتیل شفائی
ریجنل سیکرٹری

سب ریجن سکھر

ادارۂ مصنفین پاکستان کے ذیلی حلقے سکھر کے اراکین نے جناب جی، یزدانی ملک صاحب کمشنر خیرپور ڈویژن کے ساتھ ۲۲ جون کو ایک شام منائی۔ اس موقع پر شہر کے معززین و علم دوست حضرات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

جلسے کی صدارت شیخ ایاز نے کی، جلسے کے آغاز میں ذیلی حلقے کی طرف سے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے موصوف کا تعارف کرایا، اس کے بعد گلڈ کے قیام، اس کی سرگرمیوں اور آئندہ منصوبوں پر روشنی ڈالی گئی، سکھر سب ریجن کی اس رپورٹ کے کچھ حصے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

گلڈ کے قیام و عمل سے پہلے بھی سکھر، خیرپور اور اس ڈویژن کے دوسرے شہروں میں کئی ادبی انجمنیں موجود تھیں۔ جو اپنے طور پر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہتی تھیں ان انجمنوں میں سے کچھ نے بڑے پیمانے پر ایسے ادبی اجتماعات بھی کئے جن کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گلڈ کے ذیلی حلقے کے علاوہ اب بھی چند ایسی ادبی تنظیمیں موجود ہیں جو بڑی خوش اسلوبی سے شعر و ادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

جہاں تک گلڈ کے اس سب ریجن کی ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ بنیادی طور پر پاکستان رائٹرز گلڈ اہل قلم کی ایک ٹریڈ یونین ہے جس کے بنیادی مقاصد میں سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اہل قلم کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسی آسانیاں فراہم کی جائیں کہ وہ آسودہ تر اور بہتر طور پر اپنے علمی و ادبی فرائض کی بجا آوری کر سکیں۔

اہل قلم کے متعدد مسائل کو حل کرنے کے لئے گلڈ نے اب تک جو کچھ کیا اس کا تفصیلی ذکر نہ اس وقت کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ پاکستان کے تمام اہل قلم میں یگانگت و اتحاد کی فضا پیدا کرنا، مستحق اور معذور ادیبوں کو مالی امداد بہم پہنچانا۔ تصنیفی و تخلیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کیلئے آدم جی ادبی انعام، داؤد ادبی انعام اور ریجنل ادبی انعاموں کا انتظام کرنا، گلڈ پبلشنگ ہاؤس کا قائم ہونا، بڑے شہروں میں گلڈ ہاؤس کا بندوبست کرنا، پاکستانی ادب کو دوسرے ممالک میں روشناس کرانا، رائٹرز کالونی کی تعمیر میں ہاتھ بٹانا اور حقوق تصانیف کے تحفظ کے سلسلے میں ہر ممکن کوشش کرنا، چند ایسے بڑے کام ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سکھر سب ریجن کا دائرہ عمل اپنے محدود وسائل کی وجہ سے کچھ زیادہ وسیع نہ ہو سکا۔ پھر بھی ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گلڈ کے تمام سب ریجنوں میں کام کے اعتبار سے اس کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

سکھر سب ریجن کے زیر اہتمام پچھلے چار سال میں جن چھوٹے بڑے ادبی اجتماعات کا انعقاد ہم نے کیا ان کی مجموعی تعداد معہ اس ادبی اجتماع کے اٹھائیس تک پہنچتی ہے۔ ان اجتماعات میں گلڈ کے جن بہی خواہوں اور نامورانِ ادب نے شرکت کی ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، جناب قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی، وقار عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی، صوفی تبسم، ڈاکٹر فقیر محمد، غلام عباس، شور علیگ، کوی غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر مسعود حسین، مولانا غلام محمد گرامی، سید محبوب العالم، احسن احمد اشک، ناصر کاظمی، عبدالکریم گدائی، ہاجرہ مسرور، طفیل احمد جمالی، صلاح الدین احمد، ظہور نظر، اختر انصاری، مہر و بارہ بنکوی، عبدالستار پیرس، رسا، صہبا لکھنوی، ریاض انور، حمایت علی شاعر، منظر ایوبی، عرش صدیقی، شبنم رومانی، حبیب کیفوی، خالد علیگ، سحر انصاری، جون ایلیا، نظر حیدری، اختر سکندر ردی اور عثمان عرفانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سب سے بڑے ادبی اجتماع کا انعقاد ہم نے رائٹرز کنونشن کے طور پر جنوری ۱۹۶۱ء میں کیا تھا۔ اس کے دو روزہ اجتماع میں نہ صرف مغربی پاکستان کے ممتاز اہل قلم شریک ہوئے تھے بلکہ مشر

پاکستان کے کچھ بنگالی اور اردو زبان کے قابلِ قدر نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ہم نے محدود پیمانے پر سب رنگین کا دارالاشاعت قائم کیا جس کی پہلی پیش کش ماروی کے دلیس میں وادیٔ مہران کی عمومی کہانیوں کے مجموعے کی صورت میں منظرِ عام پر آئی اس کتاب کے بعد سے اب تک ہم نے چھ کتابیں اور شائع کی ہیں جن کے نام ریگزار کے موتی (SUKKUR Post & present) بھیجی سنجھ پاتال جا بائے اردو وادیٔ مہران میں سیاسی انکار اور گھڑی گھڑی مکھ کھاؤ ہیں۔

اشاعتی کاموں کے سلسلے میں ہمیں لطیف اکیڈمی سے پانچ سو روپیہ، سکھر میونسپلٹی سے ایک ہزار روپے اور مرکزی گلڈ سے ڈھائی ہزار روپیہ کی امدادی رقومات ملیں۔

ہمیں امید ہے کہ نئے اشاعتی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سالِ رواں میں نہ صرف سکھر میونسپلٹی سے معقول مالی امداد مل سکے گی بلکہ ضلع کونسل اور ڈویژنل کونسل کے اربابِ بست وکشاد بھی گرانقدر مالی امداد سے ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

سالِ رواں کے لئے اشاعتی منصوبے میں پانچ کتابیں شامل ہیں ہم چاہتے ہیں کہ سندھی ادب کی ایک تاریخ اردو میں ترتیب دی جائے اور اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ سندھی میں لکھی جائے ان دونوں کاموں کے لئے ہم عنقریب ایک ایسے ادارہ تحریر کی تشکیل کر رہے ہیں جس میں اردو سندھی کے موقر ترین اہلِ قلم شامل ہوں گے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ سکھر سے ایک ایسے ماہنامے کا اجرا کیا جائے جس میں اردو اور سندھی دونوں زبانوں کی ادبی تخلیقات پیش کی جائیں۔ لیکن ہمارے اس شہر میں اشاعتی کاموں کے سلسلے میں جہاں اور بہت سی دشواریاں ہیں وہاں ایک سب سے بڑی دشواری کسی اچھے پریس کی عدم موجودگی ہے۔

معزز ناصر کلیم کے مالک مدیر نے جو ہماری عاملہ کے رکن بھی ہیں اب سے ایک سال پہلے یہ وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی ان کے پریس کی تنصیب ہو جائے گی وہ ایک سال تک سب رنگین کی تمام کتابیں اپنے پریس میں بغیر کسی معاوضے کے چھپوا کر دیں گے لیکن اب تک شاید انھیں وہ آسانیاں فراہم نہ ہو سکیں جو ایک اچھے پریس کے قیام و عمل کے لئے ضروری ہیں۔

اشاعتی کاموں کے علاوہ ہمارے تعمیری منصوبوں میں چند اور منصوبے بھی ہیں جن کی طرف ہم آپ کی ہمدردانہ توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ پچھلے دو سال سے ہم اس کوشش میں ہیں کہ گلڈ ہاؤس کے لئے ہمیں کوئی ایسی عمارت مل جائے جس میں ہم سب رنگین کا دفتر، دارالاشاعت، کتب خانہ اور ایک مہمان خانے کا بندوبست کر سکیں۔ اس سلسلے میں ہم نے سکھر میونسپلٹی سے ایک ایسی عمارت کی درخواست کی تھی جو قیامِ پاکستان سے پہلے اسی قسم کے مشاغل کے لئے استعمال کی جاتی تھی لیکن یہ پرانی وضع کی عمارت عرصے سے بیکار پڑی ہوئی ہے اور اس کی شکستگی دن بدن بڑھتی جاتی ہے، اگر اس عمارت پر سردست دو تین ہزار روپے صرف کر دیئے جائیں تو اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس کو گلڈ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

ہمارے منصوبوں میں ایک اہم منصوبہ رائٹرز کالونی کا بھی ہے اس منصوبے کے تحت ہم ان اہلِ قلم کو رہائشی سہولت بہم پہنچانا چاہتے ہیں جن کی مستقل آبادکاری کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں خیرپور ڈویژن کے قریب قریب تمام شہروں میں عموماً اور سکھر میں خصوصاً بڑی سازگار ادبی فضا پائی جاتی ہے اس کا سب سے خوشگوار اور خوش آئند تاثر یہ ہے کہ یہاں اردو اور سندھی کے اہلِ قلم نے بغیر کسی قسم کے لسانی تعصبات کے بڑے خلوص و محبت سے اجتماعی تنظیم اور مشترکہ مفادات کے لئے انتھک جد و جہد کی ہے۔ اس جد و جہد میں گلڈ کا یہ سب رنگین بھی نمایاں طور پر حصہ لیتا رہا ہے۔ ہمیں ایک طرف اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کا خیال ہے اور دوسری طرف سندھی زبان و ادب کی صحت مندانہ اقدار بھی عزیز ہیں جن کا تعلق ہمارے قومی مزاج سے بہت گہرا ہے۔

ہم شعوری طور پر یہ کوشش کرتے رہے ہیں اور انشاءاللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ ان دونوں زبانوں کے اہل قلم ایک دوسرے کی جاندار ادبی اقدار کو اپنائیں۔ اس طرح اردو زبان وادب کا ذخیرہ بھی نئے نئے ادبی تجربوں سے مالامال ہوگا اور سندھی زبان وادب کے تہذیبی ورثہ میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔

یہ رودداد حسب ذیل اراکین گلڈ کی طرف سے پیش کی گئی۔

شیخ عبدالرزاق راز	حسن حمیدی (رکن مرکزی عاملہ)
مہر الٰہی شمسی	مبارک حسین سرور
رشید کیفی	آفاق صدیقی (اعزازی سیکرٹری)

سب ریجن سیالکوٹ

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کا آٹھواں ماہانہ ادبی اجتماع ۲۹ جون کی شام کے چھ بجے مسلم ہائی اسکول میں زیر صدارت علامہ شبیر طہرانی منعقد ہوا۔ سابقہ اجلاس کی کارروائی پڑھی گئی اور منظور ہوئی۔ منظور احمد کیفی نے ملک کے مایۂ ناز مزاح نگار حضرت شوکت تھانوی اور مقتدر شاعر جناب اثر صہبائی کی وفاتِ حسرت آیات پر قرارداد تعزیت پیش کی جسے متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

احسان ظہیر نے اصولی تنقید کے عنوان سے ایک پُرمغز مقالہ پڑھا مقالہ میں لفظ تنقید کی ان تعریفات کا جائزہ لیا گیا۔ جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں دانشوروں نے کیں۔ ان تعریفات کی روشنی سے مقالہ نگار کی اپنی رائے میں تنقید کا مقصد کسی فن پارے کے محاسن وعیوب کو وانشگاف کرنا ہے۔ تنقید کی ضرورت پر فاضل مضمون نگار نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ تنقید سے نہ صرف ادب میں فنکار اور اس کے فن کا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنے میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔

اسلوب تنقید پر مقالہ نگار کا خیال تھا کہ نقاد کو ذاتیات سے بالاتر ہو کر خالص فنی نقطۂ نگاہ سے کسی ادب پارے کا جائزہ لینا چاہئے ورنہ تنقید تنقیصِ محض یا توصیفِ محض ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ادبی دھڑے بندیوں سے پرہیز لازم ہے، احسان ظہیر صاحب کے مقالہ کو پسند کیا گیا۔

ان کے بعد گلڈ کے ممبر محمد ظہیر نے تنقید اور نقاد کے متعلق جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے خیالات پیش کئے گوئٹے کے نزدیک تنقید نقاد کی خامیوں، کوتاہیوں اور ناکامیوں کے ردِعمل کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے خیالات میں جب کوئی شخص اپنی نااہلیت کی وجہ سے شہرت اور عظمت کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں ایک عظیم شاعر یا ادیب اپنی فنی صلاحیتوں کی بدولت گامزن نظر آتا ہے تو وہ اس کی تخلیقات میں عیوب ونقائص کی بے جا اور بے محل نشان دہی سے اپنے لئے سستی شہرت کے سامان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظہیر صاحب گوئٹے کی ایک نظم کا جو اس نے نقاد کے عنوان سے کہی تھی منظوم اردو ترجمہ پیش کیا۔ جو بیحد دلچسپ اور کامیاب تھا۔ مضمون کی کامیابی پر ظہیر صاحب کو خوب داد دی گئی۔

ظہیر صاحب کے بعد پروفیسر امین اللہ وثیر نے بغیر عنوان مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ موضوع تو تنقید تھا لیکن اس مختصر مگر جامع مقالے میں تنقید کے اتنے پہلوؤں کا احاطہ کیا تھا کہ اسے ایک عنوان سے منسوب کرنا واقعی مشکل تھا۔ پروفیسر صاحب نے دنیا بھر کے عظیم ترین ادیبوں اور شاعروں کے خیالات کو اس خوبصورتی سے اس مقالے میں جمع کیا تھا کہ مقالہ رنگ برنگ پھولوں کا حسین وجمیل گلدستہ معلوم ہوتا تھا مقالہ کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جہاں مقالہ نگار نے تنقید کے اسلوب اور اصول پر بحث کی تھی۔ وثیر صاحب کی رائے میں تنقید کرنے بیشتر نقاد کو ادب کی اس صنف پر پورا پورا عبور حاصل ہونا چاہئے جس صنف پر زیرِ تنقید فن پارے کا تعلق ہو۔ مثلاً کسی شعر پر تنقید کرنے اور اس کی خوبیوں اور برائیاں نکالنے کے لئے خود بھی شاعر ہونا ضروری ہے اور شعری ادب پر پورا پورا ملکہ حاصل ہونا چاہئے ورنہ نقاد کو کسی فنکار کے متعلق اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر اس کی تخلیق کا جائزہ لینا چاہئے ورنہ تنقید کا مقصد

ہی زینت ہوجاتا ہے مقالہ تخلیق و تجسس کا شاہکار تھا جس پر
جی کھول کر داد دی گئی۔ نمازِ مغرب کے وقفہ کے بعد ایک محفلِ
مشاعرہ منعقد ہوا۔

جس میں افضل مرزا، رفیق ارشد، احسان ظہیر، سرور
انبالوی، آثم فردوسی، مجید احمد تاثیر، تاب اسلم۔ محمد ظہیر اصغر
سودائی اور صدر مشاعرہ حکیم شجر طہرانی صاحب نے اپنا اپنا
کلام سنایا۔

اُن شعرائے کرام کے جو اشعار ذہن میں محفوظ ہیں
پیشِ خدمت ہیں۔

افضل مرزا:-

صاحب ہوش ہو دیوانہ ہو سودائی ہو
ہر کوئی بزم میں شہرت کا تمنائی ہے

جام رہ رہ کے لرزتا ہے مرے ہاتھوں میں
کیا کوئی شیخ پسِ پردہ تماشائی ہے

رفیق ارشد:-

حالِ دل یار کا پیکانِ نظر ہی جانے
زخم کس پردے میں ہے درد کہاں ہوتا ہے

نقش رہتی ہے نگاہوں میں تمہاری صورت
نام تو آٹھوں پہر وردِ زباں ہوتا ہے

احسان ظہیر:-

ہم نے تو دن شباب کے یوں ہی گنوا دیئے
جیسے کہ چند حرفِ غلط تھے مٹا دیئے

جب داستانِ فراق کی محفل میں ہو چکی
کچھ اہلِ بزم رو دیئے کچھ مسکرا دیئے

آثم فردوسی:-

آئینۂ خیال میں جلوہ نما ہوا
جو چاند تھا نگاہ سے اب تک چھپا ہوا
تو چاندنی کا روپ ہے یا نغمۂ بہار
اکثر میں سو گیا ہوں یہی سوچتا ہوا
تجھ سے بچھڑ کے اب بھی یہی سوچتا ہوں میں
شائد نہ آسکے تجھے کوئی حادثہ ہوا

محمد ظہیر ایڈووکیٹ:-

اے نامہ بردارِ صبا رفتار جا
اور کہہ دے اہلِ انگلستان سے
اپنے راشن کا کریں وہ انتظام
آ رہی ہے بھوک پاکستان سے

سرور انبالوی:-

جس شہر کی فضا کو دیا ہم نے رنگ و بو
اُس شہر میں وفا کی ہے اب جستجو غلط
اُس کی نوازشوں کی تو حد ہی نہیں کوئی
کر بیٹھے ہم ہی روزِ ازل آرزو غلط
تلخی بڑھے گی اور بھی شیریں کلام سے
سینے کے زخم باتوں سے ہوں گے رفو غلط

مجید احمد تاثیر:-

دن کو دامانِ محبت میں یوں امید کے پھول
شام کو جشنِ تمنا میں بہاراں کر دیں
جام جتنے بھی ہیں سب تشنہ لبوں کو دے کر
کام جتنے بھی ہیں دشوار سب آساں کر دیں
نغمۂ عیش چھڑے تان پہ زنجیروں کی
حاکمِ وقت اگر داخلِ زنداں کر دیں

تابش اسلم۔

اک نقطے میں ہی تری دید کا پیاسا نہ رہا
کون تھا شہر کی گلیوں میں جو پیاسا نہ رہا
محفلِ شب میں جیالوں کے پجاری تھے بہت
صبح نکلی تو کوئی دیکھنے والا نہ رہا
لوگ کل تک مرے ملنے کو ترس جاتے تھے
ہائے اس شہر میں کوئی بھی تنہا سا نہ رہا

اصغر سودائی:۔

نہیں معلوم کہ ہم کس کو صدا دیتے ہیں
اُن کی آواز میں آواز ملا دیتے ہیں
ہاتھ اس طرح اٹھاتے ہیں بے جرم و خطا
کوئی پوچھے تو کہیں ہم تو دعا دیتے ہیں
عقل کے تار یہ نغمات نہ چھیڑیں تو یہ لوگ
کسی دیوانے کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

حکیم شجر طہرانی:۔

تم ایک بار نہیں سو پچاس بار سنو
تمہیں بتاؤ مگر بار بار کس سے کہوں
طویل تر ہے تری داستانِ زلفِ طویل
مگر میں طولِ شبِ انتظار کس سے کہوں
کوئی تو عمر کے لمحات مختصر کر دے
نہیں یہ موت کو بھی اختیار کس سے کہوں

(منظور احمد بھٹی)

بنگالی زبان میں سوہنی مہینوال

۱۲ جولائی کی شام کو راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ بنگالی کے صدر پروفیسر بدل الرشید نے رائٹرز گلڈ ہوٹل ملتان میں ایک استقبالیہ دعوت میں سوہنی مہینوال کا بنگالی و انگریزی میں ترجمہ پیش کیا۔ پروفیسر بدل الرشید نے جو مشرقی پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے بھٹ شاہ کی تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا تھا بنگالی میں نظمیں پڑھیں اور ان کا انگریزی ترجمہ سنایا ان بنگالی نظموں کا اردو ترجمہ پروفیسر فرخ درانی اور ایک مقامی صحافی مسٹر شبیر حسین اختر نے پڑھا۔ روزنامہ "امروز" کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر و رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے رکن مسٹر مسعود اشعر نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان سے یہ مصنفین مغربی پاکستان تشریف لائے ہیں وہ ملتان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی رونق افروز ہیں۔ یہاں کے مصنفین کو ان کی تصانیف اور کلام سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے آپ نے کہا بنگالی کے مشہور شاعر مسٹر جسیم الدین بھی ایک مرتبہ یہاں تشریف لائے تھے۔

ادیب کے انتقال پر گلڈ کا اظہارِ تعزیت

کراچی۔ ادارہ مصنفین پاکستان (رائٹرز گلڈ) حلقہ کراچی مجلس عاملہ کے ایک خصوصی اجلاس میں ہر دلعزیز شاعر جناب ادیب سہارنپوری کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا مجلس عاملہ نے مرحوم غزل گو کے پسماندگان کے لئے مبلغ ایک ہزار روپیہ بھی منظور کیا۔

مسعود اشعر

کھولو من کے دوار

"پاکستان رائٹرز گلڈ کی سب سے بڑی قومی خدمت یہ ہے کہ اس کے اراکین نے ملک کے دونوں حصوں کو ایک کر دیا ہے"

ان الفاظ کے ساتھ مسٹر جمیل الزماں نے بنگالی زبان کے شاعر و ادیب پروفیسر نبل الرشید کا استقبال کیا۔ وہ سب ریجن ملتان کی استقبالیہ تقریب میں صدارتی تقریر کر رہے تھے۔

اور یہ بات بھی سچ ہے۔ ملتان کے لوگ بھلا کب یہ تصور کر سکتے تھے کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے شاعر و ادیب قسم کے لوگ کبھی ملتان آنے کے متعلق بھی سوچیں گے۔ مغربی پاکستان کی سیر کے لئے آنے والے بنگالی مہمان کراچی سے لاہور یا زیادہ سے زیادہ پنڈی اور پشاور دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ملتان ان کے تخیل میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ مقامی گلڈ کے مالیاتی سیکرٹری نے کہا۔

"رائٹرز گلڈ نے ملتان کو بھی پاکستان کے دوسرے ادبی مرکزوں کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ آج ملتان کو اتنی وقعت حاصل ہو گئی ہے کہ مشرقی پاکستان کے ادیب ملتان کے ادیبوں سے ملنے اور ملتان دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔"

پہلے ملتان میں دیکھنے کی چیزیں یہاں کے تاریخی مقامات اور کھانے کی چیز آم تھے۔ لیکن گلڈ کی بدولت اب یہاں کی سوغات میں دو چیزوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک حاجی حمید الدین اور دوسرے گلڈ ہاؤس (میں نے لفظ "بدولت" کا استعمال گلڈ کے ساتھ کیا ہے حالانکہ مجھے یہ لفظ حاجی حمید الدین کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے تھا کہ گلڈ ہوٹل کی رونق انہیں کے دم سے ہے) حاجی صاحب اپنی اسا طیری شخصیت اور روایتی مہمان نوازی سے ہر آنے والے کا دل موہ لیتے ہیں اور جب مہمان واپس جاتا ہے تو یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو خواہ یاد رکھے یا نہ رکھے حاجی صاحب کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔

پروفیسر نبل الرشید کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اور میں یہ الفاظ انتہائی حسد اور جلن کے جذبات کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی گفتگوؤں کی سجت کے بعد پروفیسر صاحب کو صرف اتنا متاثر کیا کہ وہ ملتان کے ادیبوں کو بھی کراچی اور لاہور کے انٹلکچوئل کے برابر سمجھنے پر تیار ہو گئے لیکن حاجی صاحب پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ چلتے چلتے بھی یہی کہتے رہے۔

"میں حاجی صاحب پر بہت لکھوں گا"

اور جب تک ملتان میں رہے کم سے کم مجھے یہ کہہ کہہ کر احساس کمتری میں مبتلا کرتے رہے کہ "حاجی صاحب بہت اچھا آدمی ہے"

نبل الرشید مشرقی پاکستان کے دوسرے شاعر تھے جو ملتان آئے تھے ان سے پہلے جسیم الدین یہاں آئے تھے اور نہ صرف وہ ملتان کے ادیبوں اور شاعروں کو بنگالی ادب کی طرف رغبت

دلاگئے تھے بلکہ خود بھی یہاں کے لوک گیتوں اور لوک سنگیت سے خاصے متاثر ہو کر گئے تھے۔ جسیم الدین کے بعد بذل الرشید کا ملتان آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ لیکن ہم ملتان میں رہنے والے جو یہاں گرمی کے مارے اپریل سے ستمبر تک اسمٰعیل میرٹھی کو پڑھتے رہتے ہیں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی قسمت کا مارا جولائی میں بھی ملتان آسکتا ہے۔ اس لئے جب ۸ جولائی کی صبح کو حاجی صاحب نے مجھے یہ اطلاع دی کہ مشرقی پاکستان کے ایک شاعر ٹیکاٹیک دوپہری میں ملتان تشریف لا رہے ہیں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"لو مارے گئے"

اس زمانہ میں ملتان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ آموں کے سوا یہاں کوئی دلکشی برقرار نہیں رہتی۔ کالج بند ہوتے ہیں گویا یہاں کے دانشوروں کا "معتدبہ" حصہ (جنھیں اپنے انتظار حسین منفعلات کے اسناد کہتے ہیں) لاہور کی "پہاڑیوں" کی طرف نکل جاتا ہے یہی حال جلسوں کے حاضرین طلبہ کا ہوتا ہے اب رہ جاتے ہیں بے چارے صحافت یا وکالت پیشہ لوگ تو دوسرے پیشے والے ادب ذوق افراد کے ساتھ مل کر بھی ان کی تعداد کم ہی رہتی ہے۔ مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ مقامی گلڈ کے سیکرٹری عرش صدیقی بھی اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ لاہور جا چکے تھے اس لئے پروفیسر صاحب کی آؤ بھگت کون کرے گا۔ لیکن خدا سلامت رکھے اپنے بھائی انور کو جن کی موجودگی میں جہاں بہت سے مسئلے پیدا ہوتے ہیں وہاں آسانی سے سلجھ بھی جاتے ہیں۔ ریاض انور آدمی کم اور بھوت زیادہ ہے۔ جب وہ کسی کام میں جٹ جائے تو گرمی وری اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔ میں نے اسٹیشن پر رشید صاحب کی خالص بنگالی مسکراہٹ سے پہچان کر ان کا استقبال کیا اور پھر ریاض انور کے سپرد کر دیا۔ ریاض انور نے پروفیسر صاحب کو مقامی دانشوروں سے ملانے اور تاریخی مقامات کی سیر کرانے کی مہم رات کے دس بجے تک سر کر لی۔ ملتان میں بھی دانشوروں نے اپنا ایک "راندے دو" بنا رکھا ہے جیسے خان

کیفے ٹیریا کہتے ہیں۔ وہاں رات کے دس بجے تک یہ بحث ہوتی رہتی ہے کہ بنگالی اور اردو میں جو نئی شاعری ہو رہی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز۔ اردو کے پرانے قاری کی طرح بذل الرشید صاحب کو بھی اپنے نئے شاعروں سے یہ شکایت تھی کہ ان کی شاعری سے موسیقی کا عنصر غائب ہوگیا ہے جس کی وجہ سے مٹھاس باقی نہ رہی۔ بے چارے اردو والے یہی سمجھتے تھے کہ بنگالی شاعری کے لیے موسیقی لازمی چیز ہے کہ وہاں کا ہر شاعر اچھا گانے والا بھی ہوتا ہے۔ لیکن رشید صاحب نے یہ انکشاف کرکے بڑا مایوس کیا کہ نئے شاعروں کو گانا بھی نہیں آتا۔ پھر شاعری میں موسیقی کی ضرورت پر گرماگرم بحث ہوتی رہتی، پتہ نہیں اپنے پروفیسر صاحب کو نوجوانوں کی بات نے قائل کیا یا نہیں۔ البتہ دوسرے دن جب حاجی صاحب اپنے مہمان کے طفیل مجھے بھی ملتان سے ۷۵ میل دور ایک سبزگاہ "پنجند" لے کر گئے تو راستے میں رشید صاحب نے جی بھر کے گانے سنائے اور ایسے سنائے کہ میں بھی اپنی بھدی اور بھونڈی آواز کے ساتھ ان کے سُر میں سُر ملانے پر مجبور ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ حاجی صاحب اپنے مہمان کی اتنی خاطر مدارات کرتے ہیں کہ جب تک وہ خود ہی بس نہ کر دے اس وقت تک ان کی مہمان نوازی جاری رہتی ہے جسیم الدین کو . . . گائیں دیکھنے کا شوق تھا اس لئے وہ ملتان سے باہر گائیں دیکھنے گئے جہاں شاید انھیں گایوں سے زیادہ کالی کالی بھینسیں دیکھنے کو ملی ہوں گی جسیم الدین کو جہاں گائے سے رغبت ہے بذل الرشید کو سوہنی مہینوال سے محبت ہے یہ تو معلوم نہیں ہو کہ جسیم الدین نے گائے پر کتنی نظمیں لکھی ہیں البتہ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بذل الرشید صاحب نے سوہنی مہینوال کی داستان کو بنگالی میں منظوم ڈرامہ بنا دیا ہے جب انھیں پتہ چلا کہ سوہنی کا چناب ملتان کے لبوں کو چھوتا ہوا ابھی گزرتا ہے تو دریائے کے لئے بیتاب ہوگئے۔ حاجی صاحب نے فوراً ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا اور دوسرے دن صبح سویرے چناب کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہماری خوش قسمتی سے اس سوٹ پر کہیں سے بھولے بھٹکے

بھی آگئے تھے۔ جنہوں نے حاجی صاحب کی مہمان نوازی کو اور بھی بھیرکیا اور چناب کے کنارے بیٹھے بیٹھے انھوں نے حکم صادر کیا کہ اپنے مہمان کو اس علاقہ کی خوبصورت ترین جگہ پنجند بھی دکھائی جائے بذل الرشید صاحب کو تو مسافت کا علم نہیں تھا اس لئے وہ تیار ہوگئے ہم بذل الرشید صاحب کی وجہ سے راضی ہوگئے لیکن جب کار میں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ سے زیادہ گذر گیا اور پنجند کا نام و نشان بھی نظر نہیں آیا تو رشید صاحب پر تکان سوار ہوئی پہلے تو انھوں نے دو تین مرتبہ پہلو بدلے پھر ٹانگیں آگے پیچھے کیں اس کے بعد میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں انھیں دیکھ کر بیوقوفوں کی طرح مسکرا دیا (اور کر بھی کیا سکتا تھا) مگر رشید صاحب کی مسکراہٹ اور پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے گنگنانا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا شاید اپنی بوریت دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر دوسرے ہی لمحہ انھوں نے اپنی باریک اور میٹھی آواز میں سچ مچ گانا شروع کر دیا جب میں ان کے گانے سے دلچسپی کا اظہار کیا تو وہ خاموش ہوگئے تھوڑی دیر میری طرف خاموشی سے دیکھتے رہے پھر اپنے گیت کے چند مصرعے تحت اللفظ میں سنا کر میری ہندی دانی کا امتحان لیا (بدقسمتی سے میں ان سے کہہ چکا تھا کہ ہندی جاننے والا آسانی سے بنگالی سیکھ سکتا ہے۔ اور میں ٹوٹی پھوٹی ہندی جانتا ہوں) جب میں نے ان کے ایک آدھ مصرعے کے معنی بتانے کی کوشش کی تو اتنے خوش ہوئے کہ پھر آدھے گھنٹے تک گانے سناتے رہے پہلے اپنے اور ٹیگور اور پھر نذرالاسلام کے بہت سے گیت سنا ڈالے، اس کے بعد نذرل گیتی اور رابندر سنگیت کا فرق بتانا شروع کر دیا یہ فرق بھی چونکہ باقاعدہ ترنم کے ساتھ بتایا جا رہا تھا اس لئے حاجی صاحب کو بھی لطف آگیا اور انھوں نے بھی بار بار سنانے کی فرمائش کی۔ پھر ہم دونوں نے مل کر قومی ترانہ گایا۔ یہی ایک گیت ایسا تھا جسے ہم دونوں مل کر گا سکتے تھے۔

پنجند — پانچ دریاؤں کا سنگم۔ ایسی جگہ واقع ہے جہاں پہنچکر انسان اپنے آپ کو کم سے کم ملتان یا بہاولپور کے علاقہ میں محسوس نہیں کرتا دریا کے کنارے دور دور تک سفیدے اور شیشم کی قطاریں اور صاف ستھری ٹھنڈی سڑک، اس سڑک پر پہنچ کر جان میں جان آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ رشید صاحب کا موڈ بھی ٹھیک ہوگیا ہے (اگرچہ انھوں نے اسکی وجہ یہ بیان کی کہ گانے کے بعد عام طور پر ان کا موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے) ریسٹ ہاؤس کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں دریا کے کنارے ہی نہ گذارنا پڑے۔ مگر بھلا ہو ایگزیکٹو انجینئر صاحب کا جب انھیں بتایا کہ مشرقی پاکستان سے ایک مہمان آئے ہیں تو انھوں نے فوراً ایک کمرہ کھلوا دیا (پتہ نہیں ان انجینئر صاحب کا کیا نام ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی نام ہو انھیں میرا سلام پہنچے) خوب آم کھائے، اتنے کھائے کہ بقول حاجی صاحب کے منہ بھر گیا، بذل الرشید صاحب کا خیال تھا کہ آم مشرقی پاکستان میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر ملتان کے آم کھا کر انھوں نے اپنے یہاں کے آموں کو آم ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

(بذل الرشید صاحب ! - کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ سخت شرمندہ ہوں۔ آپ نے گھر لے جانے کے لئے صرف تین آم مانگے تھے اور میں آپ کی روانگی کے وقت یاد نہیں رکھ سکا۔

شام کو گلڈ ہاؤس میں رشید صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب تھی اس لئے ڈھائی بجے دوپہر ہی وہاں سے بھاگنا پڑا اور راستے میں ہماری شامت آئی۔ آسمان سے بادل غائب ہو چکے تھے اور ملتان کا "تاریخی سورج" حسب روایت سوا نیزے تو نہیں ڈیڑھ نیزہ پر ضرور کھڑا تھا۔ ہم تو اب ملتانی ہوگئے ہیں اسلئے رشید صاحب کا دل بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی گپیں مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ رشید صاحب کو گرمی نے اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ اب وہ گا کر بھی اپنی تکان نہیں اتار سکتے۔ مجھے اس بات کا احساس مظفر گڑھ جا کر ہوا جب رشید صاحب نے پہلے دو گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور پھر برف کا ایک بڑا سا ڈلا اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا اور برف کا یہ ٹکڑا جب تک ان کے سر سے گردن اور گردن سے سینے تک گھومتا رہا پنجا

کی تفریح کا مزہ ہمیں شام کے جلسے میں گیا۔ جب رشید صاحب نے حاضرین کو صرف اپنا ڈرامہ سوہنی مہینوال اور ایک گیت سنا کر ٹرخا دیا۔ حاضرین چاہتے تھے کہ ان سے بنگالی ادب کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ لیکن رشید صاحب کے پاس وقت کا بہانہ تھا۔ ملتان کے ادیب بہت تیز واقع ہوئے ہیں رات ہی رات میں فرخ درانی اور شبیر حسن اختر نے رشید صاحب کے ایک گیت اور منظوم ڈرامے کے ایک منظر کا ترجمہ کر لیا تھا۔ شبیر حسن نے اس گیت کا ترجمہ سنایا جس پر ۱۹۶۱ء میں رشید صاحب کو پہلا انعام ملا تھا۔ اور فرخ درانی نے ان کے منظوم ڈرامہ سوہنی مہینوال کے آخری منظر کا ترجمہ پڑھا۔

جسیم الدین کی طرح بدل الرشید بھی بہت جلدی واپس چلے گئے لیکن ان کی آمد نے یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پیدا کر دیا کہ بنگلہ بھی اپنی زبان ہے کیوں نہ تھوڑی سی محنت کر کے اسے سیکھ لیا جائے۔ لاہور میں تو گلڈ نے بنگالی کی کلاسیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن اگر ایک دو بنگالی شاعر اور ملتان آ گئے تو یہ بھی بنگلہ سیکھنے کا شوق عملی شکل اختیار کر جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب جو مشرقی پاکستان کا مہمان ملتان آئے وہ ہم لوگوں سے بنگلہ ہی میں باتیں کرے۔

سیماب اکبرآبادی

ایک مثلّث

کیا چارۂ مصیبتِ شام و سحر کریں حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں
آخر ہم ایک حال میں کب تک بسر کریں

تائید میں ہے حسنِ جواں کی خدائے حسن فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن
آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں

اب یہ تعیّنات ہیں تیری قسم فضول جب تُو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں!

جائز ہے آہ و نالہ، نہ یارائے صبر ہے اے اقتضائے ضبط یہ ضد ہے کہ جبر ہے؟!
کیا آنکھ ہم بحدِ فزہ بھی نہ تر کریں

ممکن نہیں کہ اُن کے تغافل پہ ہو اثر انجام اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر
پھر کیوں ہمارے حال کی اُن کو خبر کریں

پھر خلوتِ جمال میں جلوے سنور چکے فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گزر چکے
شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

پردے تمام اٹھ گئے تا حدِّ جلوہ گاہ اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

تم نے تو دل حجاب سے محفوظ کر لیا تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں

نقص و کمالِ بیشِ نظر خود ہیں بے حساب سیماب ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں

سلام مچھلی شہری

میرے گھر کا چراغ کہتا ہے

میں بھی اک شاعر بنوں گا ماں! یہ وعدہ ہے مرا
دیکھ لینا میرا کیسا گیت کیسا راگ ہے
میرے بربط میں کنول ہیں اشک ہیں یا آگ ہے
تم بھی ابا سے ہو برہم اور میں بھی ہوں خفا
پھر بھی اک دن میں یہ دنیا کو بتاؤں گا ذرا
آج کا شاعر پریشاں اور بیچارہ تھا کیوں
آج کا شاعر شرابی اور آوارہ تھا کیوں — ؟
— ماں! بہت بدلا سا ہوگا میرا عہد زرفشاں
واقعی انساں کے قدموں میں ہوگی کہکشاں
وقتِ گل افشاں کو تیزی سے رواں ہونے تو دو
ماں! ذرا تم اپنے "انور" کو جواں ہونے تو دو
میں دکھاؤں گا کہ یہ دنیا ہی ہے خلدِ بریں
اور میرے دور کا انساں ہے معبودِ زمیں — !
— ہاں دعا کرنا نہ ابھرے میرا جوشِ انتقام
یہ نہ سوچوں مر گئے کیوں۔ کس طرح ابا "سلام"
ورنہ آن جانا سا اک طوفان ہوگا ساتھ میں
ساز کے بدلے کوئی شے اور ہوگی ہاتھ میں — !
میں جو یوں بدلا تو میرا خواب گم ہو جائے گا
بادلوں میں اک نیا مہتاب گم ہو جائے گا
میرے بچے بھی کہیں گے ان کا کیسا باپ ہے
یہ تصورِ صبحِ تازہ کے لئے اک پاپ ہے — ؟!

ریاض انور

لمحوں کی موت

سال چلا، دم توڑتے لمحے دھند کی چادر اوڑھے
ماضی کی معصوم تمناؤں کا بوجھ اٹھائے
آنکھوں میں آنیوالی خوشبوں کے دیپ جلائے
گزر رہے ہیں آدھی رات کی سونی راہ گذر سے
دکھ کے ایوانوں سے گزریں یاد کی سرد ہوائیں
کتنے پھول سے چہرے من کے آنگن میں مسکائے
کتنے سپنے آنسو بن کر پلکوں پر لہرائے
اجلی صبحیں، روشن شامیں رہ رہ کے تڑپائیں
گھومتی صدیوں کے گرداب میں ڈولے دل کی ناؤ
دیواروں پر کانپ رہے ہیں ڈھلتی رات کے سائے
مدھم سُر کی لہروں پر مخمور بدن لہرائے
دیوانو! کیوں چپ بیٹھے ہو کوئی بات سناؤ
جانےوالے کا دکھ کیسا اک جائے اک جائے
اک لمحے کی موت سے دوجا لمحہ جیون پائے
جیسے اک کونپل پھوٹے اور اک پتا گر جائے

ساجدہ زیدی

تجدید

یوں سرنگوں ایاغِ مسرت ہیں دیر سے
پتھرا گئی ہو جیسے کسی دلربا کی آنکھ
خالی ہیں جام، سرد ہے میخانۂ حیات
بجھنے لگے ہیں بزمِ تمنا کے سب چراغ
آؤ دلوں کے داغ جلائیں تمام رات
آؤ متاعِ ہجر سے طوفاں نئے اٹھائیں
ناکامیوں سے کرلیں مئے جستجو کشید
محرومیوں سے شوق کے پھر بام و در سجائیں
یہ محتسب کا خوف، یہ زنجیرِ ظاہری
پگھلا دیں اس کو موجِ تنفس کی آنچ سے
راہِ وفا میں کچھ بھی نہ ہو سدِ راہِ شوق
نظروں میں لے کے ساعتِ دیدار کی کرن
آؤ طلوعِ مہر کا ساماں بہم کریں

آؤ ربابِ حسن و مسرت کے ساز پر
چھیڑیں فضا میں نغمۂ آزادیٔ نظر
تزئینِ محفلِ دل و جان و نظر کریں
ہر سانس اپنا وقفِ نگارِ سحر کریں
کشتیٔ دل کو شوق کے دھارے پہ ڈال ک
دیکھیں کوئی حیات کا ساحل ہے یا نہ
عہدِ وفا کے ہاتھ میں جامِ امید
ہو تشنگی کے ہاتھ میں مینائے آ
آؤ جگر کے خون سے تعمیرِ نو کریں
آؤ نئے سرے سے کوئی جستجو کریں
پھوٹے کرن امید کی ایامِ سخت سے
ابھرے مہِ تمام در و بامِ سخت سے

فارا شدی

وادئ مہران کا جواں مرگ شاعر

قابل اجمیری

میں ۱۹۵۱ء میں حیدرآباد آیا تھا۔ انھیں دنوں سب سے پہلے جس شاعر کے اخلاق اور کلام سے متاثر ہوا وہ قابل اجمیری تھے کسے معلوم تھا کہ آج سے گیارہ سال پیشتر وادئ مہران کے جس جواں سال خوش فکر وانسان دوست شاعر کی پرخلوص ملاقات سے روحانی مسرت حاصل کی تھی آج اس کی روح فرسا جواں مرگی کے صدمۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑیگا۔

فیض احمد فیض نے شاعری کے متعلق کہا تھا۔ "شاعری جذباتی تجربات کو الفاظ کے ذریعہ دوسروں تک پہچانے کا نام ہے اور اس کی پہلی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ اسے پڑھ کر ہم ایک خاص جذباتی ذہنیت محسوس کریں۔" قابل اجمیری کی شاعری کے متعلق میرے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ قابل نے جواں سالی میں فکر وفن کا ایک ایسا نرالا محل سجا لیا تھا جو یقیناً قابل رشک تھا اس عمر میں اس کے کلام میں وہ بات نمایاں ہوگئی تھی جو سالہا سال کی مشق وریاضت کے بعد مشکل پیدا ہوتی ہے، کلام میں پاکیزگی، تخیل میں تنوع اور جذبات میں شدت حیرت انگیز حد تک پائی جاتی ہے انگریزی ادب کے ایک مشہور فنکار میکالے کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے کہ "شاعری ایک فن ہے جس میں الفاظ سے وہی کام لیا جاتا ہے جو نقاش رنگوں سے لیتا ہے۔ لیکن یہ فن اکتسابی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ شاعری فنون لطیفہ میں سے ایک لطیف ترین فن ہے جس کا مادّہ قدرت کی طرف سے انسان کو عطا ہوتا ہے۔ قدرت جس کو چاہتی ہے فن شعر گوئی سے نوازتی ہے۔ یہی وہ قدرتی فن ہے جو قابل کا انفرادی رنگ ہے اور یہ رنگ اسے اپنے ہم عصر شعراء میں ممیز کرتا ہے۔

اصل نام عبدالرحیم۔ تخلص قابل ۱۹۲۹ء میں اجمیر شریف کی مقدس سرزمین میں آنکھ کھولی تھی اور وہیں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں، عربی، فارسی واردو کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم عثمانیہ اجمیر میں حاصل کی، اس کے پاس یونیورسٹی کی کوئی سند نہیں تھی لیکن معراج شاعری کے لئے درسگاہی سند کی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ شاعر کا سب سے بڑا استاد قدرت اور سب سے بڑی تعلیم مطالعۂ فطرت ہے اسی لئے اسے تلمیذ ربانی کہتے ہیں۔ بقول شبلی "علوم کا مرکز اس کی شاعری ہے اور مصورِ فطرت ولیم ورڈز ورتھ کے الفاظ میں "اس کی شاعری سارے علوم وفنون کی جان اور اس کا لطیف ترین جوہر ہے" قابل کی شاعری پر یہ اقوال صادق آتے ہیں جن کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تیرہ سال کی عمر سے اسے ذوقِ سخن

تھا تاحیات باضابطہ شعر کہنا اور صرف شعر کہنا اس کے لئے سکون قلبی اور حاصل زندگی تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے فرمایا تھا "شاعری کے لئے سیاہی بازار سے نہیں ملتی بلکہ یہ شاعر کے خون جگر میں پائی جاتی ہے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ واقعی قابل نے ریاض سخن کو ہی نہیں گلستان حیات کو بھی اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ جہاں سوسن نے اس شاعری کے چمن کو گل بوٹوں سے سجایا وہاں غزل کے باغ کو بھی گلہائے رنگا رنگ سے سدا بہار بنا دیا۔ "شعرستان" (تذکرہ شعرائے پاکستان) میں ایک جگہ قابل نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرتے ہوئے اپنے نظریۂ شاعری کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے ۔۔ "اصناف سخن میں غزل کو زیادہ طبعی اور وسیع سمجھتا ہوں لیکن اسے محض عورت سے باتیں کرنے تک محدود رکھنے کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک غزل میں زندگی کے اہم سے اہم مسائل کا حل بھی مشکل نہیں۔ لیکن اس سے نظم کی اہمیت اور ضرورت کم نہیں ہوتی وہ بھی ایک بہتر اور مستقل صنف ہے جسے زندہ اور ترقی پذیر رہنا چاہئے ادب برائے زندگی کی تقسیم خلوص اور تنوع کے لئے مضر ہے"۔ قابل کا یہ نظریہ اس کی شاعری میں جابجا جھلکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ قابل نے جو کچھ محسوس کیا وہی کہا اس کا کلام ایک ایسا خوشنما روح افزا سدا بہار باغ ہے جو طرح طرح کے پھولوں سے مزین اور جس کا گوشہ گوشہ حسین ورنگین سبزہ زاروں سے آراستہ ہے گویا۔ ع

دامانِ باغبان وکفِ گلفروش ہے

حالانکہ اس کی داخلی زندگی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ۔ ع

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اس لئے کہ وہ نہایت مفلسی، ناداری، بیچارگی اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزارتا رہا جیسے۔ ع

گریباں میں کچھ ہے نہ دامن میں کچھ ہے

اور اس کا کلام اس کی کربناک زندگی کا شاہد ہے۔ کون نہیں جانتا کہ قابل کی ذات حسرت و یاس کا مجسمہ اور اس کی زندگی غم والم کی ایک عبرت ناک تصویر تھی۔ اس کی اندوہ ناکی اور بے چارگی میں قدرت کا ستم اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دق کا مریض تھا اور مسلسل تیس سال تک موت وحیات کے دوراہے پر کھڑا جینے کا متمنی اور موت سے فرار کا خواہاں رہا۔ لیکن اس کے باوجود یہ اسی کا جگر تھا کہ بے حد خوش مزاج اور زندہ دل انسان، اور انسان دوست شخص تھا جیسے موجودہ زندگی سے قطعی مطمئن ومسرور ہو۔ شاید اس کے پس منظر یہ احساس پنہاں تھا اور صحیح احساس تھا کہ ؎

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو میری ضرورت ہے

کئی سال پیشتر ایک عیسائی خاتون "سیما" کی حیثیت سے قابل کی ازدواجی زندگی میں داخل ہوئی اور شریک سفر رہ کر دکھ پائی اس کے بے مثال اور لائق احترام ایثار وخدمت نے شاعر کی زندگی میں نور کی چادر تو بچھا دی لیکن موت کی تاریکی دور کرنے کے لئے کہیں روشنی نہ لا سکی۔

بات دراصل یہ تھی کہ قابل اپنا سفینۂ غم خود اپنے ہاتھوں کھینا چاہتا تھا اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب زندگی کے پتوار ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو قید حیات وبند غم سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی غالباً انہیں دنوں کے لئے غم کے بحر بیکراں میں ڈوب کر مرنے والے نے کہا تھا ؎

کیوں ہو گراں کہ عمر سبک گام ہی تو ہے
مٹ جائے گا کبھی غم ایام ہی تو ہے

قابل اجمیری کا ایک رخ غم جاناں ہے تو دوسرا غم دوراں لیکن کا غم میر اور فانی کا غم نہیں جو زندگی سے فرار اور حیات سے دور لق ودق صحرا میں لے جائے جہاں کا ذرہ ذرہ گور وکفن کا تصور لے آئے بلکہ قابل کے نزدیک غم والم، راحت ومسرت کا پیش خیمہ اس کے نزدیک غم عارضی ووقتی جذبے کا نام ہے جو انسان کو موت سے دور اور زندگی سے قریب لے جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ "شخصیت مسلسل جدوجہد کی حالت میں انسان کا سب سے بڑا کمال ہے جو شے شخصیت کو مسلسل جدوجہد کی طرف مائل کرتی ہے وہ ہمیں بقائے دوام کے حصول

دیتی ہے"۔ علامہ اقبال کا اشارہ اس خودی کی طرف ہے جو انسان کو جینے کی اعلیٰ قدریں سکھاتی ہے اور یہی صفت زندگی کا بہترین فلسفہ ہے اس خیال کو ایک شعر میں یوں پیش کیا گیا ہے ؎

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا جنون و افسانہ

نطشے اور اقبال کی طرح قابل کے نزدیک بھی زندگی ایک مقصد، مسلسل حرکت، پیہم جدوجہد اور تڑپ کا نام ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

فلسفۂ زندگی کے متعلق قابل کے اشعار ہیں ؎

زندگی طوفاں ہے دریا میں رہ موجوں سے کھیل
اپنی کشتی کو نہ بارِ خاطرِ ساحل بنا

شام و سحر سے بے خبر دشت و چمن سے بے نیاز
جوشِ نمو میں چل پڑا نکہتِ گل کا کارواں

ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

قابل کی شاعری میں جہاں زندگی کی تڑپ ہے وہاں روحانی کیفیت اور روحانی تسکین کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے ؎

لطفِ صبحِ نشاط مجھ سے پوچھ
میں نے شامِ الم گزاری ہے

مجبور ہے شبنم رونے پر ہنسنے کا اسے مقدور نہیں
ہم اپنی خوشی سے روتے ہیں شبنم کی طرح مجبور نہیں

کہاں تک مجھ سے ہمدردی کہاں تک میری غمخواری
ہزاروں غم ہیں انجانے ستارو تم تو سو جاؤ

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

غمِ حیات کی افسردگی نہیں جاتی
نہ جانے کون سا غم تشنۂ بیاں ہے ابھی

جو اشعار واردات قلبی کے ترجمان نہیں ان میں عجیب حلاوت کی دنیا بسی ہوئی ہے وہ احساسات جو واردات قلبی کی پیداوار ہیں صرف قابل کا حصہ ہیں، کیونکہ اس نے عشق بھی کیا، اور مفلسی کی زندگی بھی گزاری۔ عشق و مفلسی کا یہ تصادم کیف و کم کے لطیف امتزاج کا حامل ہے اس لئے کہ بقول حافظ شیرازی ؎ ع

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

خوشبوئے انتظار سے مہکی ہوئی ہے رات
قابل نہ جانے کس کو بلاتی ہے چاندنی

اہلِ ساحل اس کی گہرائی کا اندازہ کریں
جو سفینہ تندیِ طوفاں ہو کے طوفاں ہو گیا

آ جائیے کہ پاس کے سائے نہ پھیل جائیں
امیدِ آفتابِ لبِ بام ہی تو ہے

ہجر میں اک کمی سی پاتا ہوں
چاند پر بھی نقاب ہوتا ہے

بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں
تم کوئی آسرا نہ دے جانا

خود اس کی زندگی اب اس سے برہم ہوتی جاتی ہے
تمہیں ہوگا کبھی پاسِ خاطرِ قابل تو کیا ہوگا

کوئی احسان کر کے قابل پہ
دوستی کی سزا نہ دے جانا

جفا پر اے نگاہِ ناز شرما یا نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں احسان جتلایا نہیں کرتے

تضاد شاعری کی ایک فنی خصوصیت ہے۔ قدماء کے علاوہ اساتذہ حال مثلاً وحشت، جگر، فانی، حسرت وغیرہ کے ہاں اسکی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔ ہماری نئی پود کے شعراء شاذ و نادر ہی اس فن کو خوبی سے نبھا سکتے ہیں۔ لیکن قابل کے ہاں تضاد کا رنگ بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے جو اس کی شاعری کا خاص جوہر ہے یہ تضاد صرف خیال ہی میں نہیں بلکہ زبان و بیان میں بھی خاص تنوع اور جدت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ رنگ بھی قابل کے حسن تغزل کا خاصہ ہے

نفس نفس تھا قیامت نفس نفس ہے سکوں
غم تمام سے پہلے غم تمام کے بعد

مجھی پہ اتنی توجہ مجھی سے اتنا گریز
مرے سلام سے پہلے مرے سلام کے بعد

ہر انقلاب مبارک، ہر انقلاب عذاب
شکستِ جام سے پہلے شکستِ جام کے بعد

آج ہی شکوۂ بیداد کا آیا تھا خیال
آج ہی تیری مدارات بہت یاد آئی

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تم ہنس رہے ہو، میں مسکرایا تو کیا کرو گے

مجھے تو اس درجہ وقتِ رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو
مگر کچھ اپنے لئے بھی سوچا، میں یاد آیا تو کیا کرو گے

ابھی تو تنقید ہو رہی ہے مرے مذاقِ جنوں پہ لیکن
تمہاری زلفوں کی برہمی کا سوال آیا تو کیا کرو گے

قابل کی نظمیں دورِ قدیم سے لیکر حالاتِ حاضرہ تک کے ہر موضوع پر ملتی ہیں۔ نظموں کا تجزیہ کرنے کے لئے درجنوں صفحات کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ نظموں سے قطع نظر خود اس کی غزلوں میں ایک ایک شعر اتنا ہمہ گیر، معنی خیز اور مضمون آفریں ہے کہ نظموں کے اشعار سے بھی زیادہ کامیاب اور وسیع تر ہے سیاست، مذہب، انقلاب، زندگی، حادثات، غرض اہم سے اہم نکات کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے ایک ایک شعر کی جامعیت پوری پوری نظموں پر بھاری ہے۔ اس کی غزلیں جہاں حسن وعشق، شباب و رباب اور رومان و محبت کا حسین وجمیل گلدستہ ہے وہاں خیالات کی بلندی، احساسات کی گہرائی، جذبات کی لامتناہی، اسلوب بیان کی شگفتگی، زبان کی روانی، بندش کی چستی الفاظ ومحاورات کا برمحل استعمال اس کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

قابل کا ایک مختصر مجموعۂ کلام "قابل کے ستلو شعر" کے نام سے اس کی زندگی ہی میں دوبار شائع ہو چکا تھا اس میں حضرت جگر کا تعارف شامل ہے۔ جگر کی یہ رائے قابل کی شاعرانہ عظمت کے لئے سندِ آخر کا حکم رکھتی ہے "ان کے اشعار ان کے مزاج اور ان کی طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہی بنیادی خصوصیت شاعر کے لئے نہایت اہم اور لازمہ ہے۔ پہلی بار جب ان کا کلام خود انہیں کی زبانی سُنا تو حقیقتاً بہت متاثر ہوا۔ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان بھی شگفتہ، پاکیزہ، شعریت اور تغزل کا حامل۔"

اب مذکورہ بالا رائے کی روشنی میں رنگِ تغزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساغر چھوا بھی ہو تو مرے ہاتھ ٹوٹ جائیں
ناصح میں کیا کروں وہ نظر سے پلا گئے

حریمِ ناز کے پردے الٹ تو سکتے ہیں
مگر نگاہ بھی رکھتی ہے جراتِ دیدار

شرابِ ناب ہی سے ہوش اڑ جاتے ہیں انساں کے
ترا کیفِ نظر بھی ہو گیا شامل تو کیا ہوگا

تیرا اندازِ تغافل ہے جنوں میں آج کل
چاک کر لیتا ہوں دامن اور خبر ہوتی نہیں

حسن ہی حسن جلوے ہی جلوے
صرف احساس کی ضرورت ہے

رکا رکا سا تبسم جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقہ بیگانگی کہاں ... گیا...

کسی کی زلف پریشاں کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

جہاں میں آج اندھیروں کا بول بالا ہے
ہم آستیں میں ستارے چھپائے پھرتے ہیں

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

قابل کی شاعری کو مجموعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک عشقیہ اور دوسرے انقلابی، و سیاسی۔ حالانکہ اس کی اکثر غزلیں حسن وعشق، بادہ وجام، مینا وصہبا، وارداتِ قلبی، حادثا

زندگی کے ساتھ ساتھ انقلاب و سیاست کی حسین و جمیل مرقع ہوتی ہیں بالفاظ دیگر شعلہ بھی ہیں، شبنم بھی، پھول بھی ہیں کانٹے بھی، سیاسی قسم کے اشعار میں انقلابی شاعری کے ایسے عناصر مدرجہ اتم موجود ہیں جن کے ذریعہ انقلاب زمانہ اور سیاست حاضرہ کے بڑے بڑے نکات بتائے گئے ہیں اور اہم سے اہم مسائل کی طرف اشارے ہیں۔

ہمارا دورِ غلامی ختم ہو چکا ہے لیکن خواجگی و بندگی سرمایہ داری و مفلسی، اعلیٰ و ادنیٰ، آسمان و زمین کی کشمکش ہنوز جاری ہے۔ آزادی نے سرمایہ داری کے ہاتھوں بہت سے نئے حربے دے دیئے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اخلاق و انسانیت کی دیواریں بیدردی سے توڑی جا رہی ہیں، اور مظلومی، بیکسی و مجبوری کے سائے بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ شاہراہ حیات پہلے سے زیادہ تیرہ و تاریک اور ہولناک ہے انسانی زندگی عجیب کس مپرسی اور دلسوزی کے عالم میں سانس لے رہی ہے عوام پہلے سے زیادہ بے چارگیوں کا شکار ہیں لیکن مظلوموں بیکسوں اور مجبوروں کو اپنی محرومی، مجبوری و بیچارگی کا احساس ہو چکا ہے قابل نے بڑی خوبی سے اس حقیقت کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس کی نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ صرف حسنِ تغزل کا شہسوار ہی نہیں بلکہ انقلابی شعروں کا خالق بھی ہے ؎

چاہتا ہے نظمِ محفل اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

ہائے اس کارواں کی مایوسی
جس کو خود رہبروں نے لوٹ لیا
اب کہاں اضطرابِ ناکامی
اعتبارِ اثر نے لوٹ لیا

ابھی تو راہرو گرمِ سفر ہیں شوقِ منزل میں
مگر جب سامنے آ جائیگی منزل تو کیا ہوگا

ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

وہی اضطرابِ فراق ہے وہی اشتیاقِ وصال ہے
تری جستجو میں جو حال تھا تجھے پا کے بھی وہی حال ہے

مرا حال آج زبوں ہے کیوں مرا درد آج فزوں ہے کیوں
مرے مہرباں مرے چارہ گر تری آبرو کا سوال ہے

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جس میں خونِ جگر شریک نہ ہو
میرے نزدیک وہ بہار نہیں

میتھو آرنلڈ نے کہا تھا کہ "شاعر زندگی کی مختصر تنقید ہے" قابل کی شاعری بھی اس کی زندگی کی تنقید بن کر رہ گئی۔

آج آنکھیں اشکبار اور دل سوگوار ہیں یہ کہتے ہوئے کہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے اردو کے جواں سال شاعر کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ آج اس کے بغیر ہماری محفل سونی سونی اور وادیٔ مہران کی فضا اداس اداس ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایک انسان دوست فنکار کی دائمی جدائی سے ہماری ادبی دنیا میں جو کمی پیدا ہوئی ہے وہ مدتوں پوری نہ ہو سکے گی ؎

زندۂ جاوید ماند ہر کہ نکونام زیست
کز عقبش ذکرِ خیر زندہ کند نام را

انجمن ترقی اردو کی نئی کتابیں

قاموس الکتب (جلد اول) مذہبیات سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی مکمل فہرست صفحات (۱۴۰۰) سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۴۰ روپے

داستان زبان اردو ڈاکٹر شوکت سبزواری قیمت ۵ روپے

جیتا جاگتا اندلس کے مشہور فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حیّ بن یقظان" کا ترجمہ از ڈاکٹر محمد یوسف قیمت تین روپے ۵۰ پیسے

ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور — بابائے اردو قیمت ۵ روپے

اردو تنقید کا ارتقا ڈاکٹر عبادت بریلوی قیمت

مہ و انجم مارٹن ڈیویڈسن کی کتاب کا ترجمہ از ثناء الحق صدیقی۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

خیالات عزیزی عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری ڈاکٹر لطیف حسین ادیب۔ قیمت ۶ روپے ۵۰ پیسے

قدیم اردو بابائے اردو قیمت پانچ روپے

مضامین سلیم (تین جلدوں میں) وحید الدین سلیم کے نایاب مضامین کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے ۵۰ پیسے

رومیو جیولیٹ شیکسپیئر کے ڈرامہ کا منظوم ترجمہ از عزیز احمد قیمت ۵ روپے

فاؤسٹ گوئٹے کا شاہکار کا منظوم ترجمہ از مولوی عبدالقیوم باقی مرحوم۔ قیمت ۵ روپے

مرحوم دہلی کالج بابائے اردو قیمت ۴ روپے

داس کیپٹال (حصہ اول) کارل مارکس کی عہد آفریں کتاب کا ترجمہ از سید محمد تقی قیمت ۷ روپے ۵۰ پیسے

فن شاعری ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ مع ترجمہ از عزیز احمد قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

اردو تھیٹر (جلد اول) از ڈاکٹر عبدالعلیم نامی قیمت سات روپے
(جلد دوم) " " " "
(جلد سوم) " " " "

مقالات گارساں دتاسی (حصہ اول) (دس روپے)

خطبات گارساں دتاسی (حصہ اول) مقدمہ مولوی عبدالحق قیمت دس روپے
(حصہ دوم) " " "

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ۔ کراچی

چیسٹر فسٹیول

محمد ایوب اولیا (لندن)

انکل وانیا

UNCLE VANYA

لندن سے ۶۲ میل دور چیسٹر نامی گاؤں ہے۔ وہاں سر لارنس اولیویئر کے زیر نگرانی چیسٹر فسٹیول تھیٹر میں چیسٹر فسٹیول کا افتتاح ۲۷ جون کو ہو چکا ہے۔ پہلا کھیل جارج برنارڈ شا کا "St. Joan" تھا دوسرا چیخوف کا "انکل وانیا" اور تیسرا جان آرڈن کا "دی ورک ہاؤس ڈنکی" تھا۔ انکل وانیا پر تبصرہ حاضر ہے۔

چیخوف روس کا بلند ترین ڈراما نگار مانا جاتا ہے۔ عام نقادوں کی رائے ہے کہ وہ روسی زبان میں جو کچھ لکھ گیا اس کا بہت کم حصہ انگریزی ترجموں میں آتا ہے۔ اس کے قلم کی بہت ساری خوبیاں ترجمے میں آ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود انگریزی سٹیج برسوں سے چیخوف کی نگارشات سے مستفید ہو رہا ہے۔ اس نے روسی معاشرے کی بہت سچی تصویریں بنائی ہیں۔ اس کے کردار عام زندگی کے باسی ہیں۔ وہ لوگوں کی نکبت و افلاس کو ہمدردی اور دکھ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ ان کی محرومیوں، حسرتوں، مصائب و آلام، غم ہائے پنہانی گردشِ روزگار کا بڑا اچھا مصور ہے۔ وہ دل کے ان تاروں کو جا چھیڑتا ہے جو واقعی کسی مہربان ہاتھ کے لمس سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، اور یہ مسیحا نفسی اس کے تمام ڈراموں کا خاصہ ہے۔ THREE SISTERS کھیل اس کی بہترین مثال ہے۔

"انکل وانیا" کے کردار اپنی مایوسیوں، پریشانیوں، دکھوں اور بندشوں پر جھلاتے ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں۔ محبت کے جادو کو لفظوں کا لباس پہناتے ہیں ــــ نفرت کے دیوکو بول کے کوڑوں سے مارتے ہیں۔

بوڑھا پروفیسر (میکس آڈرین) معذور اور بیمار ہے۔ اس نے زندگی کے ۲۵ سال اگرچہ آرٹ کے متعلق لکھتے اور پڑھاتے گزارے ہیں۔ بایں ہمہ وہ آرٹ کے متعلق مطلق نہیں جانتا ــــ کرسی پر بیٹھا بڑی اچھی بات کہتا ہے۔ "جن لوگوں کے سامنے اور حقیقی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہوتا وہ سرابوں کے سہارے جینا شروع کر دیتے ہیں" ــــ پروفیسر کی خوبصورت اور جوان بیوی ایل بینا (روزمیری ہیرس) سخت بیزاری کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی ہر حرکت سے اس کی یہ بیزاری مترشح ہے، پھر بھی وہ خاوند کی اطاعت گزار اور باعصمت ہے۔ وہ پروفیسر کی ذہانت اور علم و فضل کی مداح تھی اور اس کے واسطے جوانی اور خوبصورتی کی بھینٹ چڑھا رہی ہے ــــ پروفیسر کی پہلی بیوی سے بیٹی سونیا (جون پلاؤٹ) بھی جوان ہے۔ اس کے دل میں محبت اور پیار کے جذبے ڈاکٹر آسٹروف (سر لارنس اولیویئر) کے لئے پیدا ہوئے ہیں، مگر

اس کی فطری پاکیزگی ان جذبات کو خفیہ رکھتی ہے ـــ آخر تاکیے
ـــ ایک دن وہ اپنی سوتیلی ماں ال بینا سے کہتی ہے "اس نے
مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا..... اس کی روح اور دل مجھ سے
ابھی تک کوسوں دور ہیں۔ اس کے باوجود میں اس قدر کیوں
خوش ہوں؟!ـــ" سونیا کا ماموں وانیا، سر مائیکل ریڈگریو،
اس معصوم دوشیزہ کے دکھ کو جان لیتا ہے وہ اپنی مرحوم بہن
کی اس نشانی کے لئے کڑھتا ہے۔ اور شراب میں جا تسکین
پاتا ہے۔ وہ پروفیسر کی دوسری بیوی ال بینا پر فدا ہے۔ اس
کا اظہار بھی کرتا ہے مگر وہ امانت میں خیانت کرنے پر مائل
نہیں ہوتی۔ "انکل وانیا" اس پر پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اس کی
ساری زندگی اپنی بھانجی اور بہنوئی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے
اس نے اپنے لئے کچھ بھی نہیں سوچا ـــ ایک روز وہ پھولوں کا گلدستہ
پروفیسر کی بیوی کے لئے لے کر آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ڈاکٹر
آسٹروف، جس سے اس کی بھانجی پیار کرتی ہے، پروفیسر کی
بیوی کا بوسہ لے رہا ہے جسے وہ اپنی محبوبہ سمجھتا ہے ـــ یہ سب
حملے اس کی موجودہ حالت پر ضرب کاری محسوس ہوتے ہیں اور
آخر جب پروفیسر اس کی بھانجی سے ناانصافی کرنے لگتا ہے
تو وہ چلا کر احتجاج کرتا ہے ـــ میرے پاس ذہن تھا، اہلیت
تھی، جوانی تھی، ذوق تھا ـــ میں شوپنہار بن سکتا تھا۔
لیکن تیری خاطر ان سب چیزوں کی قربانی دی گیا اس لئے کہ تو یہ
سلوک کرے گا ـــ اسے اب احساس ہوتا ہے، زندگی
تو گزر گزر بھی گئی۔ اور وہ کچھ کر نہیں پایا ـــ جب زیادہ ہی
ماحول ابتر ہونے لگتا ہے تو ٹیلیگر (الیوس کین) جس کی بیوی مدت
ہوئی بھاگ گئی تھی اور گردشِ زمانہ نے اس کو مفلس بنا دیا ہے
GUITAR پر مدھم، مدھر اور پرسکون سروں سے ماحول کو
خوشگوار بنا دیتا ہے ـــ آخر پروفیسر اور اس کی بیوی انکل
وانیا سے اجازت لے کر چلے جاتے ہیں اور ڈاکٹر کی بگھی کی گھنٹیاں
بھی سنائی دیتی ہیں ـــ انکل وانیا اور اس کی بھانجی اکیلے
اسٹیج پر رہ جاتے ہیں ـــ وہ حساب کی کتابوں میں پھر کھو جاتا ہے اور
بھانجی سونیا سے کہتا ہے۔

"اب ہم پھر اسی طرح زندگی گزاریں گے۔ جس طرح ہم
رہتے تھے ـــ ہم آٹھ بجے ناشتہ کریں گے، ایک
چاشت اور شام کو عشائیے کے لئے بیٹھ جائیں گے ـــ ہر
اسی طرح ہوگی جس طرح ہونی چاہئے ـــ دوسرے
لوگوں کی طرح ـــ عیسائیوں کی مانند!

فنِ اداکاری کے لحاظ سے سر مائیکل ریڈگریو کی ادا
بے پناہ ہے۔ بڑی جاندار ہے اور حقیقت سے مملو ہے
کی بچگانہ حرکات، چلتے چلتے لڑکھڑانا ـــ باتیں کرتے کر
ہاتھ کے اشارے سے کسی چیز کی وضاحت کی بے سود کوش
ـــ یہ سب باتیں اس کو بلند ترین مقام پر فائز کرتی ہ
میری دانست میں وہ بڑا سچا اداکار ہے۔

سر لارنس اولیویئر کی پرشکوہ آواز اب بھی میرے کا
میں گونج رہی ہے اس کے کھرے ہونے کا مردانہ انداز بڑا
ہے۔ جون پلورائٹ نے اپنا مشکل کردار بڑی مہارت سے
ہے اور بڑے فنکارانہ انداز سے! اگرچہ اس کی آواز میں
پختگی نہیں آئی ـــ روز میری ہیرس نے بیزاری کو بڑے
طریقے سے پیش کیا ہے ـــ گھٹے گھٹے ماحول کی طر
کی گھٹی گھٹی اداکاری لاجواب ہے۔

تر انصاری دہلوی

سینہ خوں سے بھرا ہوا میرا
اُف یہ بدمست مے کدہ میرا!

نارسائی پہ ناز ہے جس کو
ہائے وہ شوقِ نارسا میرا!

عشق کو منہ دکھاؤں گا کیونکر
ہجر میں رنگ اڑ گیا میرا

دلِ غم دیدہ پر خدا کی مار!
سینہ آہوں سے چھل گیا میرا

باد کے تند و تیز جھونکوں سے
آج ہر داغ جل اٹھا میرا

یادِ ماضی عذاب ہے یارب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

منتِ چرخ سے بری ہوں میں
نہ ہوا جیتے جی بھلا میرا

ہے بڑا شغل زندگی اختر
پوچھتے کیا ہو مشغلہ میرا

نشور واحدی

حُسن کو دیکھا ہے اکثر تو نے عریانی پسند
فطرتِ ہر شاخِ تازہ ہے گل افشانی پسند

کتنے آئینے لگائے ہیں خیالِ دوست نے
دل میں اک تصویر ہے ہر لمحہ حیرانی پسند

ہو مسرت یا الم، لیکن نیا ہو سلسلہ
داستاں کوئی ہو اُنکو تازہ عنوانی پسند

اک کلی وہ بھی محبت کی ہوئی آخر قبول
اُس قبائے تنگ کو ہے تنگ دامانی پسند

گوشۂ صحرا میں ہوں آوارۂ کوئے خیال
گُل میں رہکر نکہتِ گُل بھی پریشانی پسند

اشک کے قطرے رہے نایاب آنکھوں میں مگر
خون میرا ایک مدت سے ہے ارزانی پسند

جانبِ ہوش و خرد کب ہے محبت کا جھکاؤ
دل وہی دل ہے جو ہو ہر لحظہ نادانی پسند

وصل میں یہ مضطرب اور ہجر میں وہ مطمئن
جنت و دوزخ بھی ہے اے دوست انسانی پسند

ہے غزل گوئی نشور اک زندگانی کا گداز
شاعری خونِ جگر دینا زباں دانی پسند

عابد حشری

○

دل کا سودا کرنے نکلے ہیں محبت آشنا
دیکھیں اس بازار میں ہوں کتنے قیمت آشنا

کون اب یہ بات ارباب گلستاں کو بتائے
وہ جو گلشن میں نہیں وہ بھی ہیں نکہت آشنا

صرف صحرا تک ہے کیوں محدود ہو رقص جنوں
شہر میں بھی کم نہیں یارانِ وحشت آشنا

اِک جہاں نکلا حریفِ حلقۂ دار و رسن
ہم تو سمجھے تھے ہمیں ہیں زُلف و قامت آشنا

زندگی میں بھی حسینوں کے سے کچھ انداز ہیں
حسبِ فطرت اجنبی حسبِ ضرورت آشنا

کیوں ہو اے حشری ادائے کم نگاہی کا گلہ
یہ بھی کیا کم ہے کہ ہیں کچھ لوگ صورت آشنا

سید محمود رضوی

○

رقصِ بہار تھا کہ وہ عکسِ نگار تھا
صحنِ چمن میں آج کوئی جلوہ بار تھا
سمجھا ہے گردِ راہ جسے تم نے رہرو
کیا جانو تم کسی کا وہ مُشتِ غبار تھا
آتی تھی بوئے خونِ جگر حرف حرف سے
ہاتھوں میں میرے خامۂ حسرت نگار تھا
آخر متاعِ درد بھی جو ہار کر اٹھا
اک میں بساطِ عشق پہ وہ بد قمار تھا
وہ شورشیں وہ عہدِ جوانی وہ ولولے
اس نامرادِ دل پہ کسے اختیار تھا
کِس کِس سے اک تعلقِ خاطر نہ تھا مگر
دم ساز تھا تو بس اَلمِ روزگار تھا
رضوی دیارِ گُل میں بہاراں ہمیں سے تھی
نخلِ مراد اپنا ہی بے برگ و بار تھا

خمار انصاری

یہ اور بات کہ وہ بے رخی سے ملتا ہے
مگر قرارِ دل وجاں اسی سے ملتا ہے

ملے وہ آج مگر اتنی بے نیازی سے
کہ جیسے کوئی کسی اجنبی سے ملتا ہے

مرے جنوں کا ذرا احترام کرلے دوست
ترا پتہ مری دیوانگی سے ملتا ہے

بہار میں تری رعنائیوں کی ہے تصویر
خزاں کا رنگ مری زندگی سے ملتا ہے

وہ غم کہ جس کو غمِ عشق لوگ کہتے ہیں
دل و نگاہ کی شائستگی سے ملتا ہے

وہ میرے پیار کا ساتھی وہ میرے غم کا رفیق
اب اس کے بعد کہیں دل کسی سے ملتا ہے

ترے کرم کا نشاں تیری رحمتوں کا سراغ
مری حیات کی تر دامنی سے ملتا ہے

یہ تیرہ بخت ستارے نہیں سحر کی دلیل
ثبوتِ صبح تو خورشید ہی سے ملتا ہے

جو سوچئے تو غمِ دل کا سلسلہ بھی خمار
کہیں ضرور غمِ زندگی سے ملتا ہے

خاور نگرامی

منزل پہ پہونچنے کیلئے راہ کو ڈھونڈو
رہزن کو نہیں رہبر آگاہ کو ڈھونڈو

دل کیلئے لازم ہے نگاہوں کی سفارش
سورج کے تقرب کیلئے ماہ کو ڈھونڈو

سیکھو کسی مجذوب سے آدابِ خرابات
مستی میں کسی ساقیٔ ذیجاہ کو ڈھونڈو

جسموں کے علاوہ جو کرے دل پہ حکومت
اس عہد میں اک ایسے شہنشاہ کو ڈھونڈو

فرصت ہو تو پہلو میں کرو جستجوئے ذات
اے ڈھونڈنے والو دلِ آگاہ کو ڈھونڈو

اللہ نے اپنے لئے انسان کو ڈھونڈا
تم صورتِ انسان میں اللہ کو ڈھونڈو

مل جائے گا کرتا ہوا تبلیغ محبت
میخانے میں تم خاورِ گمراہ کو ڈھونڈو

شیدہ سلیم سیمیں

○

لوہ جلوہ شعلے بھڑکے، چلمن چلمن آگ لگی
ہرِ تصور میں وہ آئے ، دامن دامن آگ لگی

خارِ مغیلاں کی کاوش سے صحرا صحرا پھول پڑے
حرارت شعلۂ گل کے صدقے گلشن گلشن آگ لگی

ثم تقاضا، عارضِ رنگیں کے طوفان بے پایاں
دی وادی پھر ٹکرائے ، ایمن ایمن آگ لگی

حسنِ ازل کی چشم مروت ایوانوں پر ارزاں تھی
مسکن مسکن بجلی چمکی ، خرمن خرمن آگ لگی

ماگن رت نے دامنِ گل سے پونچھا بہتے اشکوں کو
دمیں ڈوبے کا تنکا نکلا، ساون ساون آگ لگی

شوخ گلابی کرنیں یوں پہلے کبل پر اتری تھیں
آس کے زندانوں میں شاید روزن روزن آگ لگی

ہیرہنِ دل، بخیہ گروں کو یوں تفویض ہوا سیمیں
ٹکا ٹکا درد بڑھا، اور سوزن سوزن آگ لگی

انوار انجم

○

کانٹوں میں گل کا، لو میں صبا کا مزاج تھا
ہاں اسکے شہر میں کبھی یہ بھی رواج تھا

یہ سر، جو آج بار ہے خود میرے دوش پر
اس پر بھی کل کسی کی رفاقت کا تاج تھا

کس سے کہیں اسی دلِ بے نور میں کبھی
خوابوں کی سلطنت تھی ستاروں کا راج تھا

تو چاہتا تو کونسی دیوار روکتی
میرے لئے تو تو ہی خدا تھا، سماج تھا

اب تو متاعِ جانِ حزیں نذر کر چکے
اب کیا جو کوئی اور بھی غم کا علاج تھا

یا میری آنکھ ہی تھی طلسمات کی اسیر
یا اس کے نقش ہی میں عجب امتزاج تھا

اُس بارگاہِ حسن کی تکریم کی قسم
انجم غمِ حیات تو دل کا خراج تھا

حسن سعید

بنگلہ نمبر ۲۰

ماڈل ٹاؤن کے بنگلہ نمبر ۲۰ کے مالک قاضی انور تھے۔ وہ خود ہی
یں رہتے تھے لیکن موصوف کے صبح سویرے دفتر نکل جانے
شام کو گھر واپس لوٹنے سے ہی اس جگہ کے آباد ہونے کا پتہ
تھا۔ وہ بھی اگر کوئی انھیں اس سے باہر نکلتے یا اندر داخل ہوتے
دلبا منحنی دھان پان وجود، خوش شکل، خوش گفتار مدہم
نرم رفتار گردن میں خفیف سا خم۔ قاضی صاحب قدرے آگے
کر چلتے۔ ڈرے ڈرے، سہمے سہمے سے۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی
جب دو تین بتیاں اکھٹی جلتی دکھائی دیتیں تو یہ ان کی فیملی کی موجودگی
کا اعلان ہوتا۔ ورنہ یہ گھر خالی ڈھنڈار پڑا رہتا، اس کی تراشیدہ
باڑھوں پر امر بیل نے مچھلی پکڑنے کا جال سا بن دیا تھا اور
ریت شدہ در و دیوار مستحکم وحشت و بیابانی کا نقشہ پیش کرتے قیام
ان سے یہ گھر اسی حال میں رہا . . . . قاضی صاحب پانی پت کے
تھے۔ قیام پاکستان سے قبل دہلی میں انکم ٹیکس کی وکالت کرتے
بڑی محنت اور دیانتداری اور شب و روز کام کرنے کی بدولت
انھوں نے اپنے لئے کچھ مقام پیدا کر لیا تھا اور اس کے ساتھ چند
مکانات بھی کھڑے کر لئے تھے۔ خوش قسمتی سے قیام پاکستان
ہند بننے سے پہلے ہی لاہور میں انھوں نے وہاں کے ایک متمول شرنارتھی
مذکورہ بنگلہ سے اپنی جائداد کا تبادلہ کر لیا تھا۔ رہی پانی پت میں
صاحب کی آبائی جائداد، وہ اتنی در خور اعتنا نہ تھی کہ اس کے لئے
کسی قسم کی بھاگ دوڑ کی جاتی۔ موصوف کے خویش و اقارب گو کراچی
ہجرت کر گئے تھے لیکن قاضی صاحب کو ہی لاہور میں سکونت پذیر
ہونا پڑا۔ خواجہ الطاف حسین حالی (جن سے قاضی صاحب کو خاص
عقیدت تھی) کے یہاں کچھ عرصہ رہنے کے باعث اور بعد ازاں
اپنی زندگی کی ساری کمائی کا بنگلہ نمبر ۲۰ کے ہیں سمٹ آنے کی بنا پر
اب تو قاضی صاحب کو ہر صورت زندگی کے باقی دن یہیں گزارنے تھے
چھ کنال میں پھیلی ہوئی، کوئی پندرہ کمروں پر مشتمل اس کوٹھی کا بیٹھے
سے ان کے قبضے میں آجانا جبکہ لاکھوں کو برسوں سر چھپانے کے لئے
بھی جگہ میسر نہ آتی تھی قاضی صاحب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے
کم نہ تھا۔ اس پر انھوں نے تہ دل سے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ایسے
حالات میں وہ کسی کو بحیثیت کرائے دار رکھ کر خواہ مخواہ کی مصیبت
مول نہ لینا چاہتے تھے۔ "جب حالات معمول پر آجائیں گے تو دیکھا جائیگا"
انھوں نے سوچا تھا۔ ان کے پاس بیوی کو کھلانے کے لئے اور اپنے لئے
چار پیسے موجود تھے جو وہ دہلی سے بچا کر لے آئے تھے۔ انھوں نے یوں تو
یہ رقم اپنے دونوں لڑکوں کی شادی کے لئے محفوظ کر رکھی تھی، ویسے
وہ ان کی طرف سے سرخرو تھے چونکہ وہ دونوں فارغ التحصیل ہو کر اپنے
پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے . . . . . . بڑا لڑکا آڈیٹنگ کا امتحان
پاس کر کے، چند ماہ ایک پرائیویٹ فرم میں تربیت حاصل کرنے کے دوران
کلکتے میں ایک مسلمان سیٹھ کی کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس کی شادی ہندوستان

کے بڑے بڑے شہروں تک پھیلی ہوئی تھیں — بمبئی، دہلی، مدراس، کلکتہ اور ڈھاکہ — چھوٹا لڑکا فوج میں ملازم ہو گیا تھا۔ بٹوارے کے وقت یہ دونوں اپنے باپ کی جائیداد کے انتقال سے بھی پہلے نامعلوم اسباب میں پاکستان میں تعینات ہو گئے تھے۔ ہر دو صورتوں میں ان کا شروع ہی سے اپنے باپ سے دور رہنا ایک ناگزیر حقیقت تھی۔ اس کا دوسرا سبب ان کی والدہ تھی۔

قاضی صاحب بعض اوقات جب اپنی نجی زندگی کے اس پہلو پر غور کرتے تو ان کی آنکھیں بھر آتیں — کہ ان کی اولاد ہوتے ہوئے ان سے دور رہی — اپنی ماں کی طرح! وہ یوں کہ قاضی صاحب سے شادی ہونے کے بعد وہ سال میں کم از کم چھ مہینے اپنے میکے گذارتی۔ وہ دہلی کے ایک ممتاز خاندان کی بیٹی تھی، ایسے لوگ جو اپنے کا ناطہ امیر تیمور سے ملاتے تھے۔ ان کے شجرۂ نسب سے ان کا یہ دعوے کافی حد تک سچ ثابت ہوتا تھا۔ اور تو اور، نواب امین الدولہ کو دہلی کا ہر بدلہ جانتا تھا موصوف کو (جو بعد ازاں قاضی صاحب کے "مرحوم دادا خسر کہلائے") قاضی صاحب کا خاندان شرافت اور نیکنامی کے باعث بہت پسند آیا تھا۔

جن دنوں قاضی صاحب کی شادی ہوئی وہ وکالت کے آخری سال میں پڑھتے تھے۔ بلا کان حساب کتاب کے امتحانات نہ صرف پاس کرنے بلکہ ان میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے موجب اس ہونہار برووا کے بانی بیت میں ڈنکے بج گئے تھے۔ ایسے لڑکے کا نواب امین الدولہ کی پوتی سے بیاہا جانا بظاہر ایک نیک فال تھی، خاص طور پر اول الذکر کے سسرال کے لئے جس کے لڑکے آئے دن اپنی بیویوں پر نت نئی سوت لا بٹھاتے ہیں۔ قاضی صاحب کے سسرال کو انھیں گھر داماد بنانے کی تمنا تھی لیکن موصوف کی خاندانی خودداری اور اپنی روزی خود کما لینے کی صلاحیت اور اہلیت نے یہ خواہش خرمندۂ تعبیر نہ ہونے دی۔ اس سے ان کی بیوی کو بڑی ٹھیس لگی، جیسے اس کے شوہر نے ہندوستان کا عمامہ گرا دیا ہو۔ یوں بھی اُسے اپنے سسرال کی گرمی پسند نہ آئی — جیسے اس گھر میں کوئی صورت نہ ہو حتیٰ کہ دو بچے ہونے پر بھی وہ سسرال سے گھل مل نہ سکی۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے طرز عمل میں ایک عجیب تبدیلی

واقعہ ہوئی کہ وہ اپنی ماں کو اپنے ہاں بلا کر مہینوں اپنے نواسوں کی دیکھ بھال کے لئے اپنے پاس رکھتی۔

اس طرح جوں جوں ان کے سائے تلے وہ دو بچے بڑے ہو گئے۔ قاضی صاحب نہ صرف ان کے تئے بلکہ ان کی ماں کے لئے بھی اجنبی سے ہوتے چلے گئے۔ اس کے نتیجے میں قاضی صاحب کے دل میں ایک خواہش شدید کسک بن کر اٹھنے لگی۔ کاش ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی۔ لیکن ان کی یہ مراد پوری نہ ہوئی۔ اور جب ان کے لڑکے جوان ہو کر برسر روزگار ہو گئے تو ان کی ماں یکے بعد دیگرے ان کے پاس رہنے لگی... مدراس ہو یا دہلی۔ بمبئی ہو یا کلکتہ؛ وہ جہاں جاتے وہ ان کے ساتھ۔

"بچوں کی کڑی نگرانی کرنا والدین کا فرض اولین ہے — باپ ہو کو روزی کمانے کے دھندوں سے ہی فرصت نہیں مل سکتی آج کل تو لاہوں کے زمانے گئے — اس لئے یہ کام، بچوں کی دیکھ بھال، ماں ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑی سی کوتاہی یا غفلت سے بچے کے بہک جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ آج کل موئے منڈ اسے ہیلما ر اور مخلوط تعلیم نویس، اللہ رحم کرے، چنگاری کا کام کرتے ہیں" — بیگم قاضی کہا کرتی۔

"ہاں بیگم، خواہ شوہر بیوی کے فراق میں سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو" قاضی صاحب جواب دیتے۔

"جب ان مردوں نے اپنی بیویوں سے عشق لڑانا شروع کیا، ہماری سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا!" بیگم نے بپھر کر کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو آپ اس غریب خانہ میں کیوں تشریف لائی تھیں بیگم؟" قاضی صاحب نے اپنے مخصوص لطیف مزاحیہ انداز میں کہا۔ ان پر جب کبھی ایسا موڈ طاری ہوتا تو ان کے باریک ہونٹ اور بھی باریک ہو جاتے اور شریف آنکھوں میں ایک دزدیدہ شرارت مچل پڑتی۔

"بلیئے"۔ "مجھے ایسے چونچلے پسند نہیں!" بیگم بڑے تحکمانہ انداز اشتعالی طور سے ہوا میں بانہ سے تلوار سا وار کرتے ہوئے کہتی۔

بیگم قاضی تو جیسے بچے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتی تھی۔ الٰہی معلوم نہ جانے اس کے بطن سے دو بچے کیسے پیدا ہو گئے! اس کا ایسا لہجہ سن کر قاضی صاحب کے چہرے پر شگفتگی کہیں سے ایک گئی!

ڈا چلا جاتا۔ وہ نظریں تو بے نیام تلوار کی مانند تھیں، گردن قطب مینا
طرح اٹھی ہوئی، چال سپاہیانہ، چہرہ دھوپ ایسا چمکتا جس کی
بعض اوقات قاضی صاحب بھی تاب نہ لا سکتے۔ وہ ایک آدھ بار کنکھیو
ے عجیب بھرپور انداز میں بیگم کو دیکھتے۔ پھر سر پر ٹوپی رکھ لیتے اور
ندھے اچکا کر اپنے کمرے کی جانب لپکتے جہاں وہ اگلے روز کے پیش
نے والے مقدمات کے مطالعے میں کھو جاتے۔ ورنہ مسدس حالی پڑھنے
ئے۔ شاید دہلی کا پانی ہی کچھ ایسا تھا۔ اگر یہ نہیں تو مٹی تو ضرور تھی جس سے
بیگم قاضی کا خمیر اٹھا تھا!

چنانچہ جب لاہور ہجرت کرنے کا وقت آیا تو قاضی صاحب کو
ڑا یہ خیال پیدا ہوا، دیکھیں اب بیگم کا طرزِ عمل بدلتا ہے کہ نہیں۔ لیکن
یہاں آکر اس "کمبخت" کا پانی بھی اسے راس نہ آیا۔ "پیتے ہی نفخ پیدا
کر دیتا ہے۔ نری گیس ہے گیس!"

"بڑھاپے کی کہانی سے تو بدرجہا بہتر ہے،" قاضی صاحب نے
ذرا سے تلملا کر کہا۔ یہ اشارہ بیگم کو تو تیر کی مانند لگا۔ یہ ان کے بڑے لڑکے
طرف تھا۔ جب سے اس کا تبادلہ ڈھاکے ہوا تھا۔ بیگم قاضی اس کے
ہو جاتی تھی۔

یہ سن کر بیگم قاضی ایک ثانیہ کے لئے تو روانسی گئی، پھر وہ سنبھلی اور
اس کا چہرہ غصے سے تانبا ہو گیا۔ لیکن قاضی صاحب نے جیسے اپنا جملہ
مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہتی ہو ننھی بیگم" قاضی صاحب نے اپنی بیوی
کی پرانی چھیڑ پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا۔

"ننھی! ننھی!!! کیا بک رہے ہیں آپ!"

"—— ہوں - بک رہا ہوں، تیس برس سے بک رہا ہوں"

"میرا مطلب ہے — آپ کو نہ ہی تو ڈھاکہ پسند ہے نہ ہی ——
کوٹھی —— وہاں ان کے چھوٹے لڑکے کا نیا نیا تبادلہ ہوا تھا۔

"...... م - م ...... میری - پسند اور ناپسند کا تو کبھی سوال
ہی پیدا نہیں ہوا - یہ گھر ہوٹل ہے - اس میں آپ جب بھی آکر
رہنا چاہیں رہ سکتی ہیں! —— ساری کوٹھی آپ کے لئے خالی رہتی ہے"

"بس جاؤں بھاڑ میں۔ کوٹھی جہنم میں۔ خالی رہتی ہے کیا میرے
لئے! اوہ ہوں۔ آپ نے یہاں کون سے ہاتھی باندھنے ہیں!"

"...... ایک سفید ہاتھی —— کیا کم ہے!"

"...... سفید ہاتھی —— تو میں اب سفید ہاتھی ہو گئی - جو
ایک عورت کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا —— وہ ہاتھی —— سفید ہاتھی!
بیگم کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی۔ اور اس کے منہ سے غصے کے
مارے آگے کوئی فقرہ نہ نکل سکا۔

"ایسا شخص یہاں سے دفان ہو سکتا ہے"

"...... وہ ...... آپ کیوں ہوں۔ ہم ہی یہاں سے دفع
ہو جائیں گے۔ بالکل! —"

"بیگم۔ کیا کہہ رہی ہو —— میں تو خود ——!"

"ہوں۔ کیا کہہ رہی ہوں۔ کہ میں سفید ہاتھی ہوں، تمہاری کوئی
لاکھوں کی جائداد چاٹ گئی ہوں ...... کہتے ہوئے بیگم تھر تھر کانپنے
لگی اور اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر بگولے کی مانند اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

"شائستہ! شائستہ!! بیگم!" قاضی صاحب نے اس کا اصلی
نام لے کر ندامت بھرے انداز میں اس کے پیچھے جاتے ہوئے
کہا تاکہ اچانک پیدا شدہ غلط فہمی میں اپنی صفائی پیش کر سکے۔ لیکن وہ
جونہی اس کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچے اس نے کواڑ زور
سے بند کر دیئے۔

"سنو۔ سنو۔ سنو شائستہ! سنو تو۔ کیا مجھے تم پر۔ ک۔ ک
کوئی —— حق نہیں۔ میں تمہارے بچوں کا باپ ہوں"

قاضی صاحب نے گھگھیا کر دروازے سے لگتے ہوئے کہا۔
پر یہ سوال تو جیسے دروازہ بند کرنے سے پیدا شدہ دھماکے سے
گرتے ہوئے ساتھ کے پلستر کی مانند فرش پر گر پڑا۔ اس کا یہ رویہ بالکل
خلاف معمول تھا۔ کیونکہ جب اس کا پارہ چڑھتا تو وہ ایک گھنٹے میں
اتر جاتا۔ وہ یوں دروازہ کبھی بند نہ کرتی، منہ پھاڑ، بڑبڑ کرتی چیزوں
کو ادھر ادھر پٹخنے لگتی —— لیکن ایسی کیفیت میں اس کے منہ سے
نکلا ہوا ہر لفظ پتھر پر لکیر کی مانند ہوتا۔ اب کے بھی ایسا ہی ہوا۔
لیکن دو گھنٹے بعد نہیں۔ بلکہ کھڑے کھڑے —— اس نے تو پل جھپکنے
میں اپنی خادمہ کے ذریعے یہ پیغام بھجوا کر بس شام کی گاڑی سے

کوئٹہ جا رہی ہوں۔

"اب سعید یا تمہی اس بیل خانے میں کبھی اپنا قدم نہیں رکھے گا"
بیگم نے جاتے ہوئے کہا۔

اُسے روکنا بے سود تھا۔ قاضی صاحب کو معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا ہے۔ . . . . . وہ تقریباً آٹھ ماہ بعد لوٹا کہ سے لاہور، شوہر کو ملنے آئی تھی۔" صرف دو دن کے لئے گیا!— بس اتنا — مختصر قیام کرنا — تھا — !" قاضی صاحب نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر ایک دم ایک ذی فہم دبیر خند کھنڈ گیا — یہ مسئلہ کوئی نیا تھوڑا تھا۔ تیس برس پہلے سے جب ان کی شادی ہوئی تھی۔ یہ موجود تھا اس کا حل نہ صرف اس کی بیوی بلکہ کسی حد تک اس کے بچوں کے پاس تھا۔ بشرطیکہ انھیں بھی کبھی باپ کے جذبات کا خیال ہوتا — لاکھوں روپے کے مقدمے جیت لینے والا وکیل اپنے مقدمے کی آخری بازی تک ہار چلا تھا۔

اس رات وہ اپنے کمرے کی بتی خلافِ معمول بجھا کر دفتر کے کام کو ہاتھ لگائے بغیر بستر پر لیٹ گئے . . . . . تمام رات کروٹ پہ کروٹ لیتے کٹی۔ صبح ان کی آنکھیں سوجی سوجی سی دکھائی دیتی تھیں . . . . کاش اس وقت گھر میں شور شرابا ہوتا — بچوں کی آوازیں — بہوؤں کی آوازیں۔ بیٹوں کی آوازیں۔

"دادا ابا"

"دادا جان"

"اکبر مجھے مارتا ہے"

"مجھے گھوڑا لا دو"

"بیٹا ضد نہ کرو۔ دودھ پی لو۔ پھر شہر سے نیا کھلونا لا دونگا۔"

"ابا جان۔ آج شام نمائش پہ جانا ہے"

"کل لوٹو کی سالگرہ ہے"

"قاضی صاحب سے بات کرو"

"ممّا بابا مجھے ان سے یہ بات کرتے شرم آتی ہے"

— قاضی صاحب کے ذہن میں عجیب جانی انجانی، آوازوں کا آرکیسٹرا سا بج اٹھا۔ جیسے لے، خاکے، تصویریں، آواز، شور!

"ناشتہ کر لیجئے، میاں۔ دفتر سے دیر ہو رہی ہے"
تو بیگم کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"نہیں۔ نہیں" اس نے تو زندگی بھر کبھی ایسے پیار بھرے لہجے میں ان سے بات نہ کی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ سر جھٹک کر بستر سے اٹھ بیٹھے۔ پھر انھیں چند منحوس آوازیں سنائی دیں۔ کائیں۔ کائیں۔ کاں۔ کاں۔ میاؤں۔ میاؤں۔ میاں جی" اندر کمرہ صاف کر لوں؟"

"بیگم کہاں ہیں — ؟ بھنگن نے قاضی صاحب کے کمرے کے اندر جھانک کر پوچھا۔

"چلی گئی ہیں — چلی —" قاضی صاحب کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

"چلی گئیں! — بھنگن نے جیسے یقین نہ کرتے ہوئے تعجب لہجے میں جواب دیا۔

"آ جائیں گی — آ — فکر نہ کرو۔ ایک ضروری کام پڑ رات کوئٹے سے ہمارے لڑکے کا تار آیا تھا —" قاضی صاحب۔ جھوٹ بولتے ہوئے بھنگن سے کہا۔

" — میاں پھر اکیلے رہ گئے — بڑی کٹھور ہے بیگم"
بھنگن نے افسوسناک لہجے میں دبے الفاظ میں کہا۔

سارے کمرے اچھی طرح سے صاف کر دو۔ جمعدارنی!۔ قاضی صاحب نے اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے یکدم کہا۔

"ساری کوٹھی میاں جی! جمعدارنی نے حیرت زدہ لہجے پوچھا۔ چونکہ جب سے قاضی صاحب نے اس کوٹھی میں رہائش اختیار کی تھی اس کے زیادہ سے زیادہ تین چار کمرے ہی استعمال ہوئے تھے۔ وہ بھی جب چند روز کے لئے کچھ مہمان ان میں آ رہے تھے، ورنہ قاضی صاحب ان بند کمروں کو سال میں ایک آدھ بار صرف یہ دیکھنے کے لئے کھلواتے کہ آیا کہیں سے ٹپکنے نہیں لگے۔

"کام زیادہ ہوگا۔ ایک آدھ آدمی مدد کے لئے اور لے آؤ۔ . . . اس کے پیسے تمہیں الگ شام کو ہی مل جائیں گے"
قاضی صاحب نے بھنگن کو مزید ہدایت کرتے ہوئے کہا اور خود سیدھے اپنے دفتر جانے کی بجائے اخبار کے دفتر کی طرف چل دیے۔

انھوں نے بنگلہ نمبر ۲ کے۔ کو آباد کرنے کا اب وہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا جس سے وہ ہمیشہ اس خیال سے کتراتے رہے کہ اس میں کسی روز ان کی بیوی بچے، اولاد اور پوتے پوتیاں آکر رہیں گے۔ انھوں نے دو تین کمرے اپنے استعمال کے لئے رکھ کر باقی کو ٹھی کو کرائے پر اٹھا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ "میری زندگی کی کمائی۔ اسے آباد کرنا چاہیئے اس میں رونق ہونی چاہیئے۔ اچھے لوگوں کی رونق۔ ایسے لوگ مل جائیں گے تمام کرایہ دار ایک ایسے تو نہیں ہونے کہ کرایہ دیئے بغیر ڈٹے رہیں۔ جب اس کے لئے تقاضا کیا جائے تو مرنے مارنے پر اتر آئیں یا ان کو بے دخل کرنے کے لئے یا ان سے کرایہ وصول کرنے کے لئے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے۔ بروں کے ساتھ اچھے بھی تو — ہونے ہوں گے۔ ہوتے ہیں!
قاضی صاحب نے اپنے بنگلے کا اشتہار دیتے ہوئے سوچا۔

قاضی صاحب نے دیکھتے دیکھتے بنگلہ ۲ کے۔ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کا کرائے پر خالی ہونے کا اشتہار پڑھ کر حاجتمند اس پر پروانوں کی مانند ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے کئی مالک مکان کی عائد کردہ سال کا پیشگی ادا کرنے کی شرط بھی پوری کرنے کو تیار تھے۔ بلکہ چند ایک تو دو برس کا ایڈوانس دینے کو تیار تھے۔ شروع شروع میں امیدوار کرایے داروں کو دیکھ کر اور انھیں کوٹھی دکھاتے وقت قاضی صاحب کو ایک ناگفتہ بہ دھچکا سا لگا۔ انھیں ملے بغیر۔ انٹرویو کئے بغیر انھیں ان کے بارے میں اطمینان بھی تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ بلکہ انھوں نے تو مزید پیش بندی کے لئے امیدواروں کا انتخاب کرنے کا مسئلہ ایک ہفتے تک اٹھا دیا۔ اس عرصہ میں وہ اپنی من پسند کے امیدواروں کے حسب نسب، ان کی ساکھ، ذریعہ آمدنی اور شرافت کے بارے میں اپنے طور پر تصدیق بھی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار پانچ روز کی دوڑ بھاگ کے بعد انھوں نے چھ سات ہونے والے کرائے داروں میں سے دو کا انتخاب کر لیا ایک تو گورنمنٹ میں ملازم تھا فسٹ کلاس گزیٹیڈ آفیسر دوسرا کسی ولایتی فرم کا اسسٹنٹ منیجر تھا۔ ان دونوں کی خاص باعث رونق اولاد تھی اول الذکر کے چھ بچے تھے دوسرے کے چار نوکر چاکر الگ۔

ان میں سے ایک کو کرایہ ادا کر کے قبضہ لینے کی اطلاع ٹیلیفون پر دیکر اور دوسرے کو خط کے ذریعہ ہاں کر کے قاضی صاحب سکون کا سانس لے کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ادھیڑ عمر عورت عجیب پریشان کن فرمائش لے کر آ ٹپکی۔

"مجھے سر چھپانے کے لئے صرف ایک کمرہ دیدو۔ اگر کمرہ نہیں تو کوارٹر ہی سے کام چل جائیگا۔ اس کا منہ مانگا کرایہ دوں گی — یہ دیکھئے — انکار کر کے میرا دل نہ توڑیے۔" کہتے ہوئے عورت نے بھیک مانگنے کے انداز میں اپنے دوپٹے کا پلو قاضی صاحب کے آگے پھیلا دیا۔" پھر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔
"قسمت نے یہ بھی دن دکھانے تھے۔ کہ اس حالت میں آدمی غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرے۔ اکیلی عورت کہاں جائے آخر۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی آسرا نہیں۔ آخر کب تک یوں بھٹکتی پھروں گی۔ وہ نہ ہی مرنے۔ نہیں —" ملاقاتی یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس وقت قاضی صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے انھوں نے ساری دنیا کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ کی ایک جنبش سے یہ ریت کے ٹیلے کی مانند زمین پر گر کر پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن کوٹھی کرائے پر دینے کے بعد ان کے پاس صرف اپنی رہائش کے لئے دو تین کمرے باقی رہ گئے تھے۔
"اگر سال چھ مہینے نہیں تو صرف چند ہفتوں کے لئے اس دکھیا کو کہیں سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ دیدیجئے۔ میں برآمدے

میں یا سیڑھیوں پر ہی پڑی رہوں گی۔ عورت نے آنسو پونچھے بغیر قاضی صاحب کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔ اور جب انھوں نے کوئی پانچ منٹ بعد اس کی طرف بڑے بڑے آنسو بہاتے ہوئے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو انھیں ان سیاہ بھنوروں ایسی آنکھوں میں اپنے ہی کمروں کے دروازے کھلے نظر آئے۔ ایسی عورت سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔

۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ——

۔ انکار کر کے میرا دل نہ توڑیئے۔ دو تین ماہ کے لئے ایک آدھ کوارٹر دے دیجئے۔ اگر انکار کیا تو میری لاش یہاں سے نکلے گی" "مجھے امید نہ تھی کہ آپ اتنے —— سنگدل ہوں گے۔"

عورت نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ قاضی صاحب پر ایک ثانیے کے لئے ہو گیا۔ "اگر میں کار میں آتی تو آپ مجھے ساری کوٹھی کرائے پر دینے کے لئے تیار ہو جاتے!" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اور کرسی پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی

"آپ شام کو تشریف لے آیئے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا"

شام کو قاضی صاحب نے اس عورت کو اپنے کرائے کی بجائے مہمان کے طور پر اپنے ایک کمرے میں ٹھہرا لیا۔

کوئی چھ ماہ بعد وہی مہمان عورت قاضی صاحب کے ہمراہ ان کی دوسری بیوی کی حیثیت سے باہر سیر کو نکلی تو لوگوں نے کہا

"اُسے بھی آخر شوہر مل گیا"

"بڑی مدت سے تلاش میں تھی"

"ایک نے چھوڑا دوسرے نے کر لیا"

"لیکن قاضی صاحب نہیں چھوڑیں گے"

"کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہ بے دخل کئے گئے"

"دوسرے شریفوں کی طرح رہی تو راج کرے گی یہ

قاضی بھی تو بڑا دکھی تھا!"

* * *

آثم میرزا

سنگِ راہ

کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سکون کی دولت پہ کوئی شبخون مار رہا ہے۔ اور جب یہ احساس شدت اختیار کر جاتا تو ان جانے خوف کے تحت وہ سلطانہ کو بھینچ لیتا تھا یوں اس سے پیار کا اظہار کرنے لگتا تھا۔ جیسے اس کی تشنگی انتہا کو پہنچ گئی ہو اور پھر تھکے تھکے سانس لیتے ہوئے نڈھال سا ہو کر جب وہ سلطانہ کے بھرپور شباب کا جائزہ لیتا تو احساس برتری کا خوش رنگ پھریرا اسے سرنگوں ہوتا دکھائی دینے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا کہ سلطانہ کو بازوؤں پہ اٹھا کر کسی ایسے گل پوش جزیرے میں لے جائے جہاں ابھی تک کسی انسان کا قدم نہ پڑا ہو ــــ یہ ایک ایسی خواہش تھی جو اس کے پیار کے جذبوں میں نئی کیفیت پیدا کر رہی تھی جس نے کئی خدشات کو جنم دیا تھا اور یہ سب مل کر ایک چبھن بنتے جا رہے تھے۔ اور وہ اپنے سینے میں اسے یوں پھیلتے محسوس کر رہا تھا جیسے تپتی ہوئی فضا میں بگولے چکر کھا رہے ہوں ــــ سلطانہ کو حاصل کر کے اس نے خود کو برادری کا سب سے خوش قسمت نوجوان سمجھا تھا اور پھر شہر میں گھومتے ہوئے۔ دفتر میں دوستوں کے ساتھ معاشقوں کے قصے سنتے ہوئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ برادری کے علاوہ شہر کے سارے علاقوں میں اس سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت نہیں ہے۔ محلہ میں وہ ایک متین کم گو نوجوان مشہور تھا۔ اس کی اس فطرت کو سبھی اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کسی نے آج تک اس سے کوئی برا مذاق نہ کیا تھا گالی نہ دی تھی۔ اور وہ بھی یوں ہر ایک کا احترام کرتا تھا۔ جیسے کوئی نازیبا حرکت کے سرزد ہونے سے اسکی زندگی کی ساری حرارت چھن جائے گی۔ دفتر کے ماحول میں البتہ وہ دوستوں کے مذاق میں شامل ہو جاتا تھا۔ اس ماحول میں اس کی سنجیدگی کا خول اتر جاتا تھا۔

محلہ میں کسی نے اس کی شادی کے بعد بھی اس سے ایسی گفتگو نہ کی تھی جس کا موضوع حسن کی حشر سامانی ہو، رومان کی چاشنی ہو، جذبات کو بے کل بنانے والی گر گراہٹ ہو، دفتر میں ضرور اس کو موضوع بحث بنایا گیا تھا وہ خود بھی چاہتا تھا۔ کہ ہر کوئی اس سے حسن کی رفعتوں کا ذکر کرتا ہے۔ محلے کے نوجوانوں کو وہ ایسی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جیسے ان کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ سلطانہ سے شادی کے بعد تو محلہ میں سے گزرتے ہوئے وہ ان جانے نشے سے سرشار ہو جاتا تھا۔ دفتر کے دوست کسی عورت کی تعریف کرتے ہوئے جب مبالغہ کی حد سے بھی گزر جاتے تو پھر بھی وہ محسوس کرتا جیسے

ان کی باتوں کا جادو سلطانہ کی گرد کو بھی نہیں چھو سکا، سلطانہ حسن کا ایسا انمول شاہکار تھی کہ غنی کے خیال کے مطابق اس کی تعریف الفاظ میں بیان ہی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا۔ اور اس کے حواس پر سرور کی گہری دھند چھا جاتی ہے، اس کی حرکات میں والہانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ یوں سانس لینے لگتا جیسے پھولوں کے ڈھیر پہ لیٹا ہو۔ ان کی ساری خوشبو، سارا رنگ۔ سارا حسن اپنے خون میں تحلیل کر لینا چاہتا ہو، برتری کا یہی احساس تھا جو سلطانہ سے وابستگی میں ہر لمحہ اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ شہر کے ہر آدمی کی وقعت کو گھٹا رہا تھا اس کی چال میں تمکنت اور چہرے پر وقار پیدا کر رہا تھا۔ انہی دنوں اسے ایک ٹیوشن مل گئی تھی، محلّہ کا چوہدری اس کی شرافت کا معتقد تھا، اس کے ایک دوست کو اپنے بچوں کیلئے ایک ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ چوہدری نے غنی کی سفارش کر دی۔ اور غنی نے اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ سلطانہ کی حسین جوانی کے احترام کی خاطر وہ بہت محتاط رہنے کے باوجود زیادہ رقم نہ بچا سکتا تھا۔ اب زیادہ نہ سہی ٹیوشن کی رقم خرچ کرنے میں تو اسے آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ سلطانہ سادگی پسند تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کا حسن کسی میک اپ کا محتاج نہیں — آرائش کے سامان کے بغیر ہی وہ دلوں کو تسخیر کرنے کی پوری قوت رکھتی ہے — شاید یہی وجہ تھی۔ کہ وہ غنی کی اس معاملہ میں حوصلہ افزائی نہ کرتی تھی۔ وہ دبے لفظوں میں اسے پیسہ بچانے کی تلقین کیا کرتی تھی — مگر غنی کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس عمر میں سلطانہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی اختیار کر لے۔ اور چوہدری کے دوست کے گھر میں تو اس کی خواہشات کے سمندر میں جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ محمود اور مسعود کو پڑھاتے ہوئے جب ڈرائنگ روم کی دیدہ زیب اشیا پر نظریں گھماتا تو تشنگی کا احساس شدت اختیار کرنے لگتا۔ وہ یوں الجھن سی محسوس کرتا۔ جیسے اس کے سامنے ٹھنڈے میٹھے شربت کا گلاس پڑا ہو۔ اس میں اتنی سکت نہ ہو کہ ہاتھ بڑھا کر گلاس پکڑ لے، آنکھیں نیم وا کر کے وہ یوں محسوس کرتا جیسے سلطانہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہو اور اس کا پیار کائنات کی وسعتوں پہ محیط ہو رہا ہو۔ صوفے کی نرم سطح پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سرشاری کے بوجھ سے دب جاتا تھا — اور جب دونوں لڑکوں میں سے کوئی اس کا گھٹنا ہلا کر پوچھتا، "ماسٹر جی۔ اس سوال کا جواب منفی ہے یا مثبت؟" — "اس لفظ کو فقرے میں کیسے استعمال کریں؟" — "اس پیرے کی سلیس نثر کیا بنے گی؟" — تو غنی یوں چونک پڑتا تھا جیسے اس کے ہاتھ سے چینی کی خوبصورت گڑیا گر کر ٹوٹ گئی ہو — قالین پر نظریں گھماتے ہوئے وہ بے چین تڑپ کے ساتھ رنگین کرچیاں تلاش کرنے لگتا۔ اور پھر گہرا سانس بھر کر صوفے کی پشت پر کمر ٹکا دیتا۔ یہ کیفیت تو پڑھاتے وقت ہوتی تھی۔ اور جس دن سعیدہ کو دو چار بار دروازے کے آگے سے گزرتے دیکھ لیتا تو اس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی، جیسے کوئی ہوئی دیوار کو ہتھیلیوں پر روک رہا ہو سعیدہ، دونوں بھائیوں سے بڑی تھی۔ جوانی کی سرحد کو چھوتے ہوئے بھی اس میں الہڑ اور تیکھاپن کا معمولی سا عکس بھی نظر نہ آتا تھا، اس کا رنگ گندمی تھا۔ بچپن میں وہ چیچک کا شکار ہو گئی تھی، داغ گہرے اور نمایاں تھے، دس گیارہ سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ کی زد میں آگئی جس سے دائیں آنکھ پر اثر پڑا اور سر کے بال جھڑ گئے، چہرے پر پاؤڈر اور لپ اسٹک کی تہیں جما کر اور تھوڑے سے بالوں میں لمبا موباف ڈال کر اس کی شکل مضحکہ خیز بن جاتی تھی، احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر زرق برق لباس پہنے رہتی پھر اس کی طرف دیکھ کر جذبات میں ہلچل پیدا ہونے کی بجائے برف کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی — اور غنی کی سوچ میں بھنور پڑنے لگتے تھے۔ "کاش! یہ میک اپ کا سامان اور قیمتی لباس سلطانہ کو میسر آ جائیں — جسے ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ ان سے محروم ہے، اور جو اس کی اہل نہیں، اس کے پاس اس کی فراوانی یہ کیسا قانون ہے! یہ کیسی اجارہ داری ہے — کاش! مجھ میں اتنی قدرت پیدا ہو جائے۔ کہ سعیدہ سے یہ سب کچھ چھین کر سلطانہ کی جھولی میں ڈال سکوں — کاش!" — اور یہ خیال برمے کی مانند اس کے ذہن کو چھیدتا چلا جاتا مگر آ کر دن مظلوم

بسی بے چارگی کے ساتھ سلطانہ کا جائزہ لیتا ـــــ اور ماں کو موجود نہ پا کر کبھی تو وہ یوں سلطانہ سے لپٹ جاتا تھا۔ جیسے کم مائگی کا احساس شعلوں کی لمبی زبانوں کی مانند اسے بھسم کئے جا رہا ہو۔ سلطانہ کو اس وقت اس کی حرکات سے وحشت معلوم ہوتی تھی وہ بری طرح کسمساتی تھی، بازوؤں کا حلقہ توڑنے کی کوشش کرتی تھی اور پھر نڈھال ہو کر تھکے تھکے سانس لینے لگتی تھی ـــــ

اس کا پیار دھیرے دھیرے پہلے تو ہوس کا رنگ اختیار کرتا گیا بغیر کسی تغیر کو محسوس کرائے، پرسکون سطح کے نیچے پلنے والے طوفان کی طرح ـــ اور پھر اس پر ایک خوفناک رنگ غالب آنے لگا تھا۔ اور ہوس اور قوت ابھی تک پیار کے لبادے ہی میں لپٹے ہوئے تھے اسلئے اسے کسی تغیر پر اچنبھہ نہ ہوا تھا۔ سلطانہ کو حاصل کر کے اور سعیدہ کو احساس کمتری میں مبتلا دیکھ کر اس پر جو ایک سرشاری کی کیفیت طاری رہتی تھی وہ مبہم جھٹکوں سے منتشر ہو رہی تھی پہلا جھٹکا اس وقت لگا تھا۔ جب دفتر سے چھٹی کے بعد گھر کی طرف آرہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تیز شعاعوں میں جھلسا دینے والی آگ تھی۔ گلی سے چند قدم پیچھے پنواڑی کی دکان پر وہ رک گیا چھجے کے نیچے کچھ سکون سا ملا۔ ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بج رہا تھا۔ پنواڑی سے ملحقہ باربر شاپ میں چند آدمی پنکھے کے نیچے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس نے پنواڑی سے برف خریدی اور ایک چبھتی ہوئی آواز نے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا ـــــ ایک قہقہہ بلند ہوا ـــ پھر ایک کھنکتی ہوئی آواز ابھری "ارے یار ـ رہنے بھی دو اس شرافت کو ـــ میں نے ان آنکھوں سے خود سلطانہ کو چوہدری کے بڑے لڑکے کے ساتھ اشارے کرتے دیکھا ہے ـــ" غنی نے جارحانی ردعمل کو پیشانی کے آگے کر کے باربر شاپ میں جھانکا ـــ منا سبزی فروش کہہ رہا تھا ـــ "آج کل کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ پیار تو ایک کاروبار بن گیا ہے۔ جس عورت کو اپنے حسن کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ اس کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے ـــ" فیروز تین گرہ مونچھوں پر انگلیاں پھیر کر بولا۔ "حسن والے بڑے جلاد ہوتے ہیں۔ مال کسی کا کھاتے ہیں اور پیار کسی سے کرتے ہیں"

غنی زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اس کے کان ـــــ سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس کے دل کو کوئی مٹھی میں لے کر بھینچنے لگا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی برف پانی بنتی جا رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گلی میں داخل ہو گیا۔ سلطانہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی معمول کے مطابق ابھی اس نے کھانا نہ کھایا تھا۔ غنی اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی کسی بات سے فریب کی بو نہ آئی تھی، کسی حرکت سے دوغلے پن کی جھلک دکھائی نہ دی تھی۔ غنی خود کو سمجھانے لگا ـ "وہ سب بے وقوف ہیں ـــ کسی اور عورت کا ذکر کر رہے ہوں گے ـــ سلطانہ صرف ـــ ایک ہی عورت کا تو نام نہیں ـ یہ ایسی نہیں ہو سکتی ـ" دوپہر کے بعد وہ گھر سے نکلا۔ تو چوہدری کی حویلی کی طرف دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حویلی کی کسی کھڑکی پر کوئی سایہ نظر نہ آیا تھا ـــ پھر بھی غنی ایک الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دن سعیدہ چار یا پانچ بار دروازہ کے آگے سے گذری تھی۔ دو تین بار کسی چیز کی تلاش میں ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ اور غنی کا خیال گھڑی کی طرف لگا رہا تھا۔ ریشم اور میک اپ کی چبھن نے دل میں وہم کی کونپل پر کوئی دباؤ نہ ڈالا تھا۔ واپسی کے وقت بازار میں سے گذرتے ہوئے وہ راہگیروں کی حرکات کا جائزہ لینے لگا۔ برقع پوش عورتیں نقاب اٹھائے پاس سے گزرتیں۔ تو لوگوں کی بھوکی نظروں کے دائرے بھی پھیلنے سکڑنے لگتے ہر اچھی صورت کو نئے نئے نام دیئے جاتے۔ جذباتی گیتوں کا محور بنا لیا جاتا۔ اور غنی کو بھی بھڑکیلے میک اپ کی نمایاں جھلک نے ایک دو بار جذباتی بنا دیا تھا ـــــ گھر میں داخل ہو کر اس نے سلطانہ کے متبسم چہرے پر نظر ڈالی، اور وہ اسے مشتبہ سا دکھائی دیا، سوتے وقت سلطانہ سے پیار بھری باتیں کرتے ہوئے اسے ان لوگوں سے نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی جو حسن کو رسوا کرنے کی سازش کرتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کی چاہت میں اسے کوئی کمی نظر نہ آئی تھی ـــــ اور وہ مطمئن سا ہو گیا تھا ـــــ دوسرا جھٹکا اسے دفتر کے ایک خوش پوش کلرک کی

ننھی باتوں نے لگایا تھا۔ کینٹین میں بیٹھے ہوئے وہ دوسروں سے
کہہ رہا تھا۔ حسنہ واقعی ایسا شاہکار ہے جسے دیکھ کر مصور کی
برسوں کی تشنگی دور ہو جائے۔ شاعر کے تخیل کی انتہا اسے کہہ
سکتے ہیں۔ مگر جتنی وہ حسین ہے اتنی ہی دل کی میلی ہے —
اسے ایسا شوہر ملا تھا جس نے زندگی کی ساری متاع اس پر
قربان کردی تھی۔ لیکن۔ اس کے انگ انگ میں تو پارہ بھرا ہوا ہے
ایک مرکز پر ٹھہرنا وہ اپنی فطرت کے خلاف سمجھتی ہے۔ اپنے سامنے
وہ دنیا کو جھکانے میں کسی معیار کو پیش نظر نہیں رکھتی۔ کل اسے
ایک اوباش رئیس زادے کے ساتھ سینما ہال میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا
کاش! وہ اپنے آپ کو یوں سستا ثابت نہ کرے —"

غنی کا ذہن پھر کھولنے لگا تھا۔ اس کے خون کی گردش
تیز ہو گئی تھی۔ اس سطحی مطالعہ نے اسے یہ تک سوچنے کی مہلت
نہ دی تھی۔ کہ اگر ایسی ہر بات کو اپنے سے منسوب کر لیا جائے۔
تو زندگی کسی قدم پر بھی نہ مسکرا سکے — اس شام وہ یوں سلطانہ
کی نشست و برخواست کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ جیسے ابھی کوئی سانحہ
جنم لینے والا ہے۔ کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر کوئی ان جانا چہرہ جھانکتا
ہوا نظر آتا۔ جب وہ سہمے ہوئے انداز سے کھڑکیوں کے پردے
اٹھا اٹھا کر گلی کا جائزہ لیتا — تو کسی کو موجود نہ پا کر بھی اسے شک
گذرتا کہ کوئی کہیں چھپ گیا ہے آس پاس کے مکانوں کی دیواروں
پر اس کی نظریں پھیلتی ہوئی جب منڈیروں اور ممٹیوں پر
تڑپنے لگتیں تو اس کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبنے لگتا تھا —
اور تیسرا پہر کا لڑکوں کو پڑھاتے ہوئے لگا تھا۔ سعیدہ نے
اپنی چند سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا تھا غنی ڈرائنگ روم
میں دروازہ کے مقابل بیٹھا ہوا تھا۔ جو لڑکی بھی آتی دروازہ کا
پردہ سرکا کر اندر جھانکتی اور جلدی سے پردہ گرا کر سیڑھیوں
کی طرف بھاگ جاتی۔ غنی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ محمود کو اوپر
بلا لیا گیا۔ مسعود چند منٹ تو غنی کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے
بولا "ماسٹر جی آپ کے لئے چائے لاؤں؟ —" — "نہیں
بھئی اس گرمی میں چائے نہیں پی جائے گی —" ہم تو پیتے

ہیں آپ بھی پی لیں —" غنی کا جواب سنے بغیر وہ باہر نکل گیا —
غنی دیوار پر آویزاں ایک بڑی تصویر کی طرف یوں دیکھنے لگا
جیسے وہ لٹے ہوئے قافلہ کا زخمی مسافر ہو۔ تصویر میں گلاب
کے سرخ پھول پر بھنورے منڈلا رہے تھے — اسے کمرہ کی
ہر چیز سے دہشت ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد مسعود اس کے لئے
چائے لے آیا۔ پلیٹ میں سموسے اور پیسٹری کے ٹکڑے قرینے
سے رکھے ہوئے تھے۔ غنی کا جی کچھ بھی کھانے کو نہ چاہ رہا تھا
مسعود اسے مجبور کرنے لگا — "ماسٹر جی کھائیے نا — یہ سموسے
باجی نے خود بنائے ہیں۔ وہ کہتی تھی ماسٹر جی کو سب کھلانا —
"ہوں — کیا کہا! —" باجی نے اپنی سہیلیوں سے آپ کی بہت
تعریف کی ہے —" — "کیوں! —" اور پھر اسے اپنے
اس سوال پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ اس کی سوچ میں گرہیں
پڑنے لگیں — "سعیدہ نے میری کیوں تعریف کی ہے!
وہ تو مڈل پاس کرنے کے بعد تعلیم سے فارغ ہو گئی ہے — مزید
تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ اسکول میں جلی کٹی باتیں سننے
سے وہ گھر پر پڑے رہنا بہتر سمجھتی ہے احساس کمتری نے اسے
عام محفلوں میں شریک ہونے سے روک دیا ہے۔ چند سہیلیاں
ہیں جن کے گھر ہو آیا کرتی ہے۔ یا وہ سب کبھی آ دھمکتی ہیں . . .
مجھ سے ان سب کا کیا تعلق! — مسعود اور محمود تعریف کریں
الگ بات ہے" مسعود نے اس کا گھٹنہ ہلا کر سوچ کے بھنور
سے نکال لیا — "ماسٹر جی — آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں
سموسہ کھائیے نا؟ —" "ہوں — آں — سموسہ — بڑا مزیدار
بنا ہے —" — "آپ نے ابھی کھایا بھی نہیں —" مسعود
ہنس پڑا — اور غنی نے خجالت محسوس کرتے ہوئے سموسہ
پکڑ لیا — اس شام گھر پر آ کر جب وہ چھت پر ٹہلنے لگا۔
اسے یوں دکھائی دیا۔ جیسے سلطانہ مہک آپ کئے ریشمی جوڑا
پہنے بال شانوں پر بکھرائے چھت پر کھڑی مسکرا رہی ہو
اور آس پاس کے نوجوان لڑکے اس پر ناشتان جوڑ رہے ہوں (?)
پھول پھینک رہے ہوں — اور پیار بھرے گیت گا رہے

ہوں...... — اس کی مٹھیاں غصے سے کس گئیں۔ سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا۔ اور ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے سے منظر بدل گیا۔ اب اسے چھت پر سعیدہ کھڑی نظر آئی۔ قیمتی لباس زیب تن کئے، زیورات سے آراستہ، مسحور کن میک اپ کئے ہوئے۔ مگر آس پاس کے نوجوانوں میں سے کوئی بھی نہ جھانک رہا ہو۔ منڈیریں سونی ہوں، بستیں ویران ہوں۔ لکڑی کے جنگلے پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے نیچے جھانکا۔ اس کی امی دھلے ہوئے کپڑے پہنے صحن میں کھڑی کہہ رہی تھی — "بیٹی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے —" پھر اس نے غنی کو آواز دی — "بیٹا نیچے آ کر کھانا کھا لے، ہم ماسٹر نیاز علی کے گھر جا رہی ہیں — آج اس کی لڑکی کا تیل ہے نا۔ تیرا انتظار کرتے ہوئے ہمیں دیر ہو گئی ہے —" سلطانہ کمرہ سے باہر نکلی اسے سنگھار کئے دیکھ کر غنی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سلطانہ نے اوپر نظر اٹھائی۔ اور غنی کے سامنے بجلی کے کوندے مچلنے لگے — وہ جلدی سے نیچے اتر آیا — اس کی ماں نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ غنی پیٹ کی بھوک کے بجائے جذبات کی گھٹن دور کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں بعد اس نے سلطانہ کو اس خمار آلود انداز میں دیکھا تھا — اس کی حسرتوں کے ویرانے میں جیسے پھول مسکرانے لگے — ماں کی موجودگی کا خیال نہ آتا۔ تو وہ اسی وقت سلطانہ کو دبوچ لیتا۔ وہ دونوں چلی گئیں۔ اور غنی کے حلق میں نوالے اٹکنے لگے۔ ماسٹر نیاز علی اس کے مرحوم باپ کے گہرے دوستوں میں سے تھا اور اس کے ہاں جانا ضروری تھا۔ مگر اب تو غنی کے لئے سلطانہ کا یوں بن سنور کر باہر نکلنا تشویشناک بن گیا تھا — "نہ جانے وہاں کتنے مرد ہوں گے — نیاز علی کے دونوں لڑکے بھی تو جوان ہیں۔ ایسی تقریبات پر کسی سے پردہ بھی تو نہیں کیا جاتا — اور اگر ان میں سے کسی نے —" وہ آگے نہ سوچ سکا۔ اس کے ذہن کے تار تھرتھرانے لگے — وہ سلطانہ کے انتظار میں بھٹکتا رہا — بہت دیر بعد وہ آئی۔ اور آتے ہی لباس اتار کر معمولی لباس پہن لیا۔ غنی کا خیال تھا کہ ماں کے چھت پر چلے جانے تک سلطانہ اسی ریشمی لباس میں سجی رہے گی۔ اور وہ اس کے لباس کو شکن آلود کر کے بے خود ہو جائے گا۔ مگر ایسی کوئی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ غنی کو سلطانہ کی اس حرکت پر طیش آ گیا — "وہ بناؤ سنگھار دوسروں کے لئے کیا گیا تھا" "مجبوری تھی — دوسری جگہ جو جانا تھا —" "دوسروں کے لئے اتنا اہتمام — اور اپنوں کے لئے رونی صورت" — "میں تو وہی کام کرتی ہوں جس سے آپ کی عزت بنی رہے" — "کیوں نہیں — تمہاری وجہ ہی سے تو لوگ مجھے جانتے ہیں —" "آپ کے سامنے بھلا میری کیا حقیقت ہے —" "تمہاری حیثیت تو ایسی ہے جیسے کانٹے کے نزدیک گلاب کے پھول کی ہو" "چھوڑیئے بھی ایسی باتوں کو — آؤ اوپر چلیں —" "ڈر لگتا ہے؟" — "مجھے کیوں ڈر لگنے لگا" — "گھبرا تو رہی ہو — جیسے چوری پکڑی گئی ہو —" "چوری! — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" — "وہی کچھ جو تم سننا نہیں چاہتیں —" "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا —" "بہت دنوں کے بعد میری طبیعت کا خیال آیا ہے" — "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" — "تمہارے دل کا حال معلوم کرنا چاہتا ہوں" — "میری کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں ہے" — "پہلے میرا یہی خیال تھا" "اب مجھ میں کیا نقص پیدا ہو گیا ہے؟" — "کاش! تم یہ سوال اپنے آپ سے پوچھتیں" "آپ خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہیں۔ آئیے نا۔ اوپر چلیں، پسینے سے برا حال ہو رہا ہے" سلطانہ نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ غنی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور سلطانہ اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر تھی۔ وہ اس کو کھینچتے ہوئے سیڑھیوں تک آ گئی — "دروازہ بند کر آئیں۔ اف گرمی سے سانس گھٹ رہا ہے —" غنی کے جذبات کا دھارا پیار کے بجائے ہو کر نفرت کی پگڈنڈی پر آ گیا تھا — "بدمعاش — مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں بے پناہ اس کے حسن کی گرمی کی بدولت اس کے فریب کو نظر انداز کر دوں گا۔

بے غیرت میرے پاس آنے سے پہلے عذاب ہو جاتی ہے۔ اور دوسروں کو اپنا جوبن دکھانے سے ذرا بھی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔

کوئی اور موقع ہوتا — تو شاید وہ اس طرح نہ سوچتا۔ کیونکہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو زندگی میں تغیر پیدا کر دے۔ عورتیں عموماً تقریبات پر ایسے لباس پہن کر ہی شامل ہوتی ہیں۔ جس سے ان کے وقار میں اضافہ ہو۔ اور جب کے پاس چند جوڑے کپڑوں کے ہوں۔ وہ تو جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ مگر غنی تو اس مسئلے پر نئے زاویہ سے غور کر رہا تھا — اس دن کے بعد سلطانہ سے اس کا کھچاؤ بڑھتا گیا۔ وہ کرید کرید کر اسکے غیر شائستہ برتاؤ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی — اور غنی طنز کے تیر چلا دیتا تھا۔

ایک دن وہ لڑکوں کو پڑھانے کے لئے گیا تو محلّہ کا چوہدری اپنے دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا حقہ کے کش لگا رہا تھا۔ غنی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ لڑکوں کو سبق پڑھاتے ہوئے اس کے کان چوہدری اور اس کے دوست کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ چوہدری نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "میں خود اس فکر میں ہوں۔ کہ سعیدہ کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا مل جائے — آج بھی سعیدہ کو دیکھنے کے لئے عورتیں آئی تھیں — اپنی طرف سے تو ہم پورا یقین دلاتے ہیں کہ جہیز میں کسی چیز کی کمی نہ ہوگی — مگر — سب ہی اچھی صورت کو بھی جہیز میں شامل کرنا چاہتی ہیں —"

"وقت ہی ایسا آگیا ہے — بہرحال میں اب اپنی سرگرمیاں تیز کر دوں گا —" غنی کو سعیدہ پر ترس آنے لگا اور اسکے ساتھ ہی اس میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! سعیدہ جیسی بیوی اسے مل جاتی اور وہ یوں ذہنی خلفشار کا شکار نہ ہوتا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ گھر کی طرف آ رہا تھا۔ کہ راستہ میں محلے کے چوہدری سے ملاقات ہوگئی — غنی نے خود ہی سعیدہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ "چوہدری جی — سعیدہ اگر بدصورت ہے تو اس میں اس غریب کا کیا قصور ہے" — "یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ مگر دنیا بڑی ظالم ہے —" — "یہ بھی تو ایک طرح کی نیکی ہی ہے۔ بہت کم لوگ تمہاری طرح سوچتے ہیں۔ تم بھی کوشش کرنا — اگر کوئی غریب لڑکا مل جائے تو —" — "غریبی امیری کا سوال نہیں۔ لڑکا شریف ہو۔ قدر کرنی جانتا ہو —" سلطانہ کی وجہ میری عزت خطرے میں پڑ گئی ہے —" چوہدری اسے متحیر نظروں سے دیکھنے لگا — غنی نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا — "میں اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہوں — میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا — سچ!" — چوہدری کی باچھیں کھل گئیں۔ اور غنی یوں آگے بڑھ جیسے راستہ کے پتھر کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا ہو — اپنی بزدلی کو اس نے نیکی کا کفن پہنا دیا تھا۔

انوار علیگی

ڈھکوسلہ

آج جمعرات تھی

اور ہر جمعرات کی طرح ڈگری شاہ کے مزار پر آج بھی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں عورتیں بھی تھیں مرد بھی تھے۔

عورتوں میں ــــ جوان لڑکیاں بھی تھیں برقعے والیاں بھی، ساری والیاں بھی، دھوتی والیاں بھی اور طوائفیں بھی تھیں آوارہ بھی تھیں، بیباک بھی تھیں، شریف بھی تھیں۔

مردوں میں ــــ جوان بھی تھے، بڈھے بھی، بچے بھی، رکشا والے بھی، کلرک بھی، بھاری جیبوں والے بھی، غنڈے بھی، دادا بھی تھے، جیب کترے بھی تھے ہیرو بھی تھے نقشے باز بھی تھے۔

کون ایسا تھا جو یہاں موجود نہ تھا۔

کوئی فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو کوئی چادر یا بتاشے چڑھانے کوئی منت ماننے آیا تھا تو کوئی تاک جھانک کرنے۔

اس وقت ڈگری شاہ کے مزار کی رونق عروج پر تھی سب اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

کچھ غنڈے اور بے فکرے، اس تنگ پل پر کھڑے تھے اور بار بار اپنے ہاتھ کسی لڑکی کے جسم سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ فقرے چست کر رہے تھے۔ کچھ معنی خیز انداز میں کھانس رہے تھے۔

حالانکہ پُل کے نصف میں ہی پولیس چوکی تھی اور نیچے ڈگری شاہ کا مزار۔

مزار کے سامنے کچھ ہیرو قسم کے لڑکے کھڑے تھے جو بال سنوار سنوار کر لڑکیوں کو گھور رہے تھے ــــ کچھ بچے بھی تھے جو مزار سے نکلنے والے ہر شخص سے مکھیوں کی طرح چمٹ جاتے تھے اور بتاشے لیکر ہی ہٹتے تھے۔ کسی عورت کے ہاتھ میں بتاشے دیکھ کر کبھی جوان بھی اُن میں شامل ہو جاتے تھے۔

مزار کے اندر کچھ جوان لڑکیاں دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں اور نقاب کھولے باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

ان کی مائیں یہ دعائیں کر رہی تھیں۔

اے ڈگری شاہ۔ میری لڑکی پر اپنا سایہ رکھنا۔ اسکو نیک راہ پر چلانا بدی سے بچانا اور اس کی جلدی سے کہیں شادی کرانا۔

کچھ طوائفیں یہ دعا کر رہی تھیں۔

"اگر میرے گاہکوں میں اضافہ ہو گیا تو میں ایک ریشم کی چادر چڑھاؤں گی"

ایک دھوتی پوش، ادھیڑ عمر عورت ڈگری شاہ کے پیر دبا رہی تھی۔

کئی عورتیں اور مرد اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کب یہ ہٹے اور کب ہم پیر دبائیں۔ مگر عورت تھی کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کبھی قبر کے اس کونے

کر کبھی دوسرے کونے کو چادر کے اوپر سے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی وہ پیر دباتی رہی۔

ڈگری شاہ کی تھکن دور ہوتی گئی

اور پیر دبانے والیوں کے گروہ میں اضافہ ہوتا گیا۔

اے مائی اٹھو نا —— دوسروں کو بھی موقع دو۔

آخر مزار کے ایک نگراں کو یہ طریقہ دیکھ کر صبر نہ ہو سکا۔ اس لئے ٹوک ہی دیا۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ گئی

اس کے اٹھتے ہی کئی عورتیں قبر پر ٹوٹ پڑیں وہ پیر دبانے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ انھیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا

ان عورتوں کے درمیان ایک مرد پھنسا ہوا تھا جو بڑے مزے سے پیر دبا رہا تھا۔

ایک کونے میں مزار کا خادم بیٹھا تھا جو بتاشوں پر جلد جلد فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

چند سیکنڈ اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے —— خدا جانے وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا یا گالیاں دیکر آدھے بتاشے واپس کر رہا تھا، آدھے بتاشے وہ فاتحہ پڑھنے کی اُجرت لے رہا تھا۔

اچانک ایک کار مزار کے سامنے آکر رکی۔

اور اس میں سے ایک شخص اترا —— بھرے بھرے چہرے پر کالی داڑھی، سر پہ عمامہ، کانوں میں بڑے بڑے بالے، جسم پر مخملی جبہ۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتے۔

ان سب چیزوں نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

لوگوں نے مزار کا دروازہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر کھڑے ہو گئے ان کے درمیان ایک تنگ راستہ بن گیا جس سے وہ گذرنے لگا

"یہ کون ہیں"

کہانی نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"یہ میاں ہیں"

اس نے سرگوشی کی۔

میاں تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔

کہانی کار نے مذاق کیا۔

"شش —— ایسا نہ کہو یہ بڑے پہنچے ہوئے میاں ہیں۔

اچھا!

کہانی کار نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں —— انھوں نے ہی تو ڈگری شاہ کا اتنا اچھا مزار بنوایا ہے۔

"ہم"

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

اور یہی ہر سال یہاں عرس کراتے ہیں

وہ بغیر کچھ جواب دیئے آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ مزار کے اندر کیا کر رہا ہے

کہانی کار نے جالیوں میں سے اندر جھانکا وہ حیران رہ گیا اس نے دیکھا کہ وہ شخص سجدے میں پڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی روتا رہا۔ پھر اٹھا آنسو پونچھا اور دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور چند سیکنڈ بعد اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے، وہ باہر کی طرف بڑھا۔

اُسے باہر آتا دیکھ کر لوگوں نے پھر اس کے لئے جگہ چھوڑ دی ایک تنگ راستہ کار تک بن گیا۔

کار میں بیٹھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی دوسرا آدمی بھی اس کے بغل میں آ بیٹھا ہے۔

مگر وہ خاموش رہا۔

کار اسٹارٹ ہوئی۔

◆ ◆ ◆

"ہم آٹھ سال بعد مل رہے ہیں۔

آخر کہانی کار نے خاموشی کے دل میں چھرا گھونپا۔

ہاں۔

مختصر سا جواب ملا۔

"تو تم مجھے پہچان گئے۔

"ہاں ــــ اپنے جگری دوست کو کون بھول سکتا ہے"

"یہ سب کیا ڈھکوسلہ ہے۔

"کونسا ڈھکوسلہ"

"یہ ڈگری شاہ"

"ڈگری شاہ ایک بزرگ تھے"

"تمہارا ان سے کیا تعلق تھا؟

میں ان کا مرید تھا"

"پھر"

وہ انتقال فرما گئے

"اور تم نے مزار بنوا دیا"

"ہاں"

"تم کیا کرتے ہو"

"کچھ نہیں ــــ اپنے پیر کی یاد میں کھویا رہتا ہوں"

"کیا تمہارے نام کوئی لاٹری کھلی تھی"

"نہیں"

"پھر یہ بہترین لباس اور کار کہاں سے آئی"

"یہ سب ڈگری شاہ کی دین ہے"

"تم جھوٹ بولتے ہو ــــ سچ سچ بتاؤ"

سچ سچ بتاؤں؟ ــــ جھوٹ پسند نہیں کرتے کیا؟"

"مجھے جھوٹ سے نفرت ہے"

"حالانکہ تمہاری کہانیوں میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا"

"میری کہانیوں کے پیچھے نہ پڑو ــــ اصلی بات بتاؤ۔

"تو تم اصلی بات سننا چاہتے ہو"

"ہُم"

"سنو"

کار نے ایک طویل موڑ لیا اور پھر سیدھی چلنے لگی۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہے ہی کہ بی اے میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا"

"ہاں مجھے یاد ہے"

"بی اے کرنے کے بعد کیونکہ میرے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ آگے تعلیم جاری رکھتا ــــ اس لئے میں نے نوکری کے لئے درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں، مگر کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے دفتروں میں چکر کاٹنے شروع کر دیئے چپلیں گھس گئیں۔ مگر نوکری نہ ملی۔

اس غم میں میری ماں کا انتقال ہو گیا اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا، اپنے شہر کو چھوڑا، دوسرے شہروں کی خاک چھانتا پھرا لیکن نوکری نہ ملی، شاید میری قسمت میں خدا نوکری کا خانہ پر کرنا بھول گیا تھا۔

کئی دفعہ سوچا خودکشی کر لوں۔ کئی دفعہ خیال آیا بھیک مانگنے لگوں، مگر یہ دونوں ذلیل کام تھے، ایک خدا کی نظر میں اور دوسرا دنیا کی نگاہ میں۔

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ سوچنے کے انداز میں اس نے انگلیوں کو پیشانی پر رگڑا اور پھر بولا۔

ایک دن میں پل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں ایک ترکیب کوندی، ترکیب بڑی شاندار تھی، میں نے اتنی اچھی ترکیب پر اپنے دماغ کی مالش کرائی اور اسی رات سے اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔

دوسرے دن جب لوگوں نے پل کے نیچے ایک قبر بنی دیکھی تو حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں رات کو پل سے گذر رہا تھا کہ نیچے ایک بزرگ نظر آئے وہ اوپر سے نیچے تک سفید لباس میں لپٹے ہوئے تھے اور سفید داڑھی تھی چہرے پر نور تھا۔ میں نے کوئی جن وِن جان کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا ابھی دس قدم نہ چلا پایا تھا کہ کسی نے میری بانہیں تھام لیں آنکھیں کھولیں تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی سامنے وہی بزرگ کھڑے تھے۔

"تم میرا ایک کام کرو گے"

"کیسا کام"

میں کانپ گیا۔

"دیکھو — میری قبر بنٹ گئی ہے — تم اس پر مٹی چڑھا سکتے ہو"

"کہاں ہے آپ کی قبر"

"وہ نیچے جہاں میں ابھی کھڑا تھا"

"جی — چڑھا دوں گا"

"ایک بات اور — میری قبر پر ہر جمعرات کو روشنی کیا کرنا"

میں کچھ بھی کہہ پایا تھا کہ وہ غائب ہو گئے

یہ خبر کسی فلمی اشتہار کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی — لوگ ہر جمعرات کو چراغ جلانے آنے لگے۔ پھر پھول چڑھنے لگے چادریں چڑھنے لگیں اور لوگ منت ماننے لگے۔

میں نے اپنا چولا بدلا۔ چہرے پر داڑھی رکھی اور دن رات مزار پر رہنے لگا۔ مزار پر آئے ہوئے بتاشوں اور چادروں کو فروخت کر دیتا۔ کھانے کے پیسے نکال کر سارا روپیہ مزار کی بناوٹ اور سجاوٹ میں لگا دیتا۔

دو سال کے اندر ہی میں نے مزار کو بہت خوبصورت بنا دیا۔ مزار کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ آمدنی بھی بڑھنے لگی۔ میں نے مزار کے چاروں کونوں میں ڈبے رکھوا دیئے جن میں لوگوں نے پیسے ڈالنے شروع کر دیئے۔

"اب مجھے اس مزار سے پانچسو روپئے مہینے کی آمدنی ہے۔

"یعنی مہینے میں دو ہزار"

"ہوں"

"ایک بات اور بتاؤ"

"پوچھو"

"تم نے اس مزار کو ڈگری شاہ کا نام کیوں دیا"

"اس لئے کہ اس میں میری بی اے کی ڈگری دفن ہے"

"کار روکو"

کہانی کار چیخا۔

"کیوں؟"

"میں اتروں گا"

"کوٹھی نہیں دیکھو گے"

کار رکی۔

کہانی کار اتر کر بھاگا۔

گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات

حسنِ طباعت، تزئین اور موضوع کے اعتبار سے دنیائے اردو میں کافی پسند کی گئی ہیں۔

آپ اپنی اوّلین فرصت میں کارڈ لکھ کر ہم سے مکمل فہرست طلب کیجئے

کتب فروشوں کو خاص رعائت دی جائے گی

منیجر:- گلڈ اشاعت گھر — ادارہ مصنفین پاکستان

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

یر غوری

کھمبا نوچے.....

اس نے انتہائی رازدارانہ انداز میں کاؤنٹر پر جھک کر کہا۔

۔ دیکھ لینا بابو۔ "پتلی کمریا" ان مردانہ ہاتوں میں ہوگی —

ہت جلد"

میں نے اسے دیکھا اور مسکرا کر رہ گیا۔

بلی اور چھیچھڑا — !

وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

اس نے دونوں ہاتھوں کو یوں ایک دوسرے میں جوڑ لیا

یسے ان کے درمیان "پتلی کمریا" آگئی ہو۔

میں نے ایک بار پھر مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اور وہ ناراض سا ہو کر چلا گیا۔

ساڑھے بارہ بج رہے تھے "پتلی کمریا" کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

"پتلی کمریا" کسی انگریزی فلم کا نام معلوم ہوتا ہے جس

ں "بی بی" بھی کام کر رہی ہو۔ اس کی عمر ہوگی۔ یہی تین چار کم بیس، اور

یں سے زیادہ اس کے عاشق تھے اس کی کمر واقعی اتنی پتلی تھی کہ

رنگ دلربائی یہ پتلی کبھی کبھی بے کمری نظر آتی تھی۔ اس لحاظ سے

اس کے عاشقوں نے اس کا نام "پتلی کمریا" رکھ دیا تھا۔ اسی محلے میں

رہنے والے ایک مشہور وکیل آفتاب احمد کی وہ اکلوتی صاحبزادی

تھیں۔ پتلی کمریا جس کا اصلی نام زرینہ آفتاب تھا بڑی خوبصورت

لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غیر ملکی لڑکی نظر آتی تھی ایک بار دیکھ

دوسری بار دیکھنے کی ہوس باقی رہتی تھی۔

جہاں تک پسند کا تعلق ہے وہ مجھے اس حد تک بھاتی تھی کہ

۔ دیکھ لیتے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں"

نگاہوں کی عبادت کے علاوہ نہ میں نے مزید خواہش کی اور نہ چاہا۔

کبھی کبھی جب ان کا نوکر کسی کام سے چلا جاتا تو وہ مجبوراً

میری دوکان سے سودا لینے آجاتی تو میرے برابر طلبا کی ہوٹل

میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل دھڑک اٹھتے۔

آہیں، سسکیاں، قہقہے، آوازے۔ اور پھر اس بادۂ

نیم رس قسم کی دختر سیمیں بدن کا چہرہ یوں سرخ ہو جاتا کہ مجھے بلغتیا

سرخ ساٹن کا خیال آجاتا تھا۔

ابھی میں اسی الجھاوے میں تھا کہ وہ کئی لڑکیوں کے ہمراہ

سامنے سے گزر گئی۔

ایک لمحے کے لئے شور اٹھا ڈوب گیا۔

میں پھر کسی تشبیہ کے فراق میں گم ہونے والا تھا کہ ایک گاہک

سودا لینے آگیا۔ میں اپنے فرائض منصبی میں اتنا گم ہوا کہ اپنے پڑوسی

دین محمد کے اس دعوے کو بھی بھول گیا۔

۔ "پتلی کمریا" ان مردانہ ہاتھوں میں ہوگی۔ بہت جلد"

دین محمد میرا پڑوسی تھا اس کے اور میرے درمیان مٹی کی ایک کچی دیوار حائل تھی جس میں جا بجا سوراخ تھے، دین محمد اکثر کیا روزانہ مجھے مل جاتا تھا اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پرچھائیوں کی گرد مجھے دعا سلام سے آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی مگر بات گئے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو اور کبھی کبھی سرگوشیاں کانوں میں یوں داخل ہوتیں کہ بے چین کر دیتی تھیں اور کرتی رہتی تھیں۔

اس دن صبح میں نے دکان کھولی تو وہ حسب معمول گنگناتا ہوا سینے سے لگائے گزر گئی۔

"کاروان بادۂ نیم رس سے لئے"

اور میں حسب معمول گاہکوں سے نمٹ رہا تھا کہ کوئی بارہ بجے دین محمد آگیا۔ اس کا چہرہ بتلا رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کر کے آ رہا ہے۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر پرچھائیوں کی گرد چاندنی سی دھند بن گئی تھی

آتے ہی اس نے حسب معمول کاؤنٹر پہ دونوں ہاتھ ٹکائے اور سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔

"بابو۔ دیکھ مار لیا نہ ہاتھ، آج شام تتلی کر یا ان مردانہ ہاتھوں میں ہوگی دیکھ لینا"

"میں کیا دیکھ لوں گا"

میں نے چڑانے کے انداز میں کہا،

"یار تم بھی جلتے ہو استاد"

آج حضرت بے تکلفی پہ آمادہ تھے مجھے ایک حماقت انگیز قسم کی ہنسی آگئی۔ یہ حضرت جو پچھلے پورے سیزن کے مطابق اشیاء فروخت کرتے تھے، "ندینہ آفتاب" جیسی پڑھی لکھی گھرانے کی روشنی کو تاریکی بنانا چاہتے تھے۔

"بھائی میرا مقصد ہے جالک ہو"

میں نے آ لا ہز کہا۔

"ہاں اب بات جمی نا"

اس کے دانت یوں باہر نکل آئے جیسے شریر بچہ جگر چاک ہوگیا۔

میرا ایک دوست ہے اسے وہ اپنا پیٹنے والا دلشاد ہے، اور استاد وہ اس سے لگی ہوئی ہے،

اس نے ساتھ ساتھ ایک انکشاف بھی کیا۔

"وہ دلشاد آج شام اسے فردوس سینما میں آخری شو پر لا رہا ہے تم بھی آ جانا ٹکٹ کے پیسے میں دوں گا"

اس نے تفصیل سے دعوت دی۔ اور میں گردن ہلا کر رہ گیا وہ خوش و خرم یہ خوشخبری سنا کر چلا گیا۔

میں کافی دیر تک اس اول جلول دین محمد کے متعلق سوچتا رہا۔ اگر یہ بات سچ تھی تو "ندینہ آفتاب" اف تتلی کر یا کے لفظ کو بھی رونا ضروری تھا۔

شام دکان بند کر کے میں گھر آیا کھانا وغیرہ کھا کر حسب معمول دوستوں میں آ گیا کافی رات گئے واپسی ہوئی۔

جب میں بستر پہ لیٹنے لگا تو حسب معمول کانوں میں سرگوشیاں در آئیں۔

"ارے ادھر آ مری تتلی کر یا"

یہ اول جلول دین محمد کی آواز تھی۔

اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔

"ارے میری کمر تو چھوڑ"

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کمر کیا تھی کمرہ تھی کمرہ

میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکا۔ ایک قہقہہ ان سرگوشیوں کی موت بن گیا۔

خبرنامہ

انجمن ترقی اردو (ہند)

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے ہم قلم میں اشاعت کی غرض سے حسب ذیل رپورٹ ارسال کی ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کا قیام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا۔ علامہ شبلی نعمانی اس کے پہلے سیکرٹری تھے ۱۹۱۲ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے انجمن کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت انجمن ایک علیحدہ اور آزاد ادارہ بنی اور اس کا دائرہ عمل وسیع ہونا شروع ہوا۔ پہلے انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد میں تھا پھر ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں دہلی منتقل کردیا، ۴۷ء میں انجمن ایک نازک دور سے گذری، دریا گنج دلی میں انجمن کا صدر دفتر اور اس کا قیمتی کتب خانہ دہلی کے فسادات کی زد میں آگیا۔ کچھ لٹ اور لٹ بھی گئے۔ مگر مولانا آزاد کی مدد سے بیشتر چیزیں محفوظ کرلی گئیں پاکستان اور ہندوستان کی انجمنیں علیحدہ کردی گئیں انجمن کے پہلے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پہلے جنرل سیکرٹری قاضی محمد عبدالغفار رہے ۱۹۴۹ء میں انجمن کا صدر دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل ہوا ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو قاضی محمد عبدالغفار کا انتقال ہوگیا اور اس وقت سے اب تک آل احمد سرور (پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی) جنرل سیکرٹری کا کام انجام دے رہے ہیں، ۵۷ء میں کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی انجمن کے صدر منتخب ہوئے، اب جولائی ۱۹۶۲ء سے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر ہیں۔

مقاصد۔

انجمن کے مقاصد میں سے اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی و حفاظت حقوق اردو، اردو داں طبقہ میں اس کے تحت انجمن کی سرگرمیاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) انجمن کی صوبائی و مقامی شاخیں۔

اس وقت تک چودہ صوبائی شاخیں اور ۳۵۰ مقامی شاخیں تمام ہندوستان میں ہیں۔ یہ شاخیں اپنے جلسے کرتی رہتی ہیں۔ اور اردو والوں کی مشکلات کو عوام و ریاستی حکومتوں کے نوٹس میں لاتی ہیں۔ صدر دفتر اردو دوستوں کے مطالبات مرکزی حکومت اور لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے نوٹس میں لاتا رہتا ہے حسب ضرورت کل ہند اردو کانفرنس منعقد کرتا ہے اور ہر ممکن طریقہ سے اردو کی خدمت کرتا ہے۔

(۲) ایک ہفتہ وار اردو اخبار "ہماری زبان" جاری کیا ہے جس میں صرف اردو زبان وادب سے متعلق مضامین اور شاخوں کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔

(۳) ایک سہ ماہی رسالہ اردو ادب جاری ہے اس میں صرف تحقیقی و تنقیدی مقالے اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔

(۴) انجمن معیاری کتب اردو میں شائع کرتی ہے اس میں تحقیقی مضامین کلام شعرا و تراجم شامل ہیں اس وقت تک تقریباً سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں انیس کتابیں پریس میں ہیں اور [illegible] کتابیں پریس میں جائیں گی۔

ایک بک ڈپو بھی قائم ہے جو انجمن کی مطبوعات اور دوسرے ناشروں کی مطبوعات پبلک اور کتب خانوں کو سپلائی کرتا ہے گذشتہ سال اس کی آمدنی ۲۲۵۸۰ روپیہ ہوئی بک ڈپو صرف معیاری کتابیں ہی سپلائی کرتا ہے۔

(۵) اردو لغت۔ انجمن نے ایک جامع اردو لغت تیار کرنے کا بھی پروگرام بنایا ہے۔ مالی دقتوں کی وجہ سے کام کی رفتار سست ہے پھر بھی تقریباً ....۵ کارڈ تیار ہو چکے ہیں۔

(۶) انجمن کا ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اردو فارسی عربی اور انگریزی کی دس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں ان میں ۱۵۰۰ مخطوطات بھی شامل ہیں۔ لائبریری میں گذشتہ سال اردو کے ۱۴ روزنامے ۶۵ ہفتہ وار اور ۷۰ رسالے ہماری زبان اور اردو ادب کے تبادلے میں آئے۔ اس کتب خانہ سے کئی ریسرچ اسکالرس مستفیض ہوئے ہیں۔ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست تیار کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے

(۷) اردو کی کتابیں ریویو کے لئے بھی آتی ہیں گذشتہ سال ۵۵ کتابیں موصول ہوئیں۔

(۸) ادبی حلقہ۔ یہ حلقہ اردو ادب میں ذوق اور دلچسپی بڑھانے کے لئے قائم کیا گیا ہے ہر رکن تیس روپیہ فیس رکنیت دینے پر اخبار، رسالہ اور ۲۵ روپیہ کی مطبوعات انجمن سے لے سکتا ہے اس وقت تک کل ۱۵۰ رکن بن چکے ہیں۔

اس رپورٹ کے ساتھ انجمن نے اپنی مطبوعات کی جو فہرست [illegible] کی ہے مختلف علوم و فنون پر ان کی تعداد (۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء) [illegible] (۹۰) ہے اور زیر طبع کتابیں (۸) ہیں۔

پاکستانی ادیب کے اعزاز میں ادبی نشست

موجودہ ادبی مسائل پر بصیرت افروز مذاکرہ

ممتاز پاکستانی ناقد اور محقق ڈاکٹر احراز نقوی کی لکھنؤ میں آمد کے موقع پر ۹ جولائی کو لکھنؤ کے ادیبوں کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کی گئی۔

اس موقع پر ڈاکٹر احراز نقوی نے اردو کے موجودہ مسائل اور رجحانات کے بارے میں فکر انگیز خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سامعین کی جانب سے پوچھے جانے والے مختلف سوالات کے جواب دیئے۔

پروگرام کے مطابق نشست کے دوسرے دور میں جسٹس پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اپنے کلام اور فن کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

اس ادبی نشست میں ڈاکٹر احراز نقوی، پنڈت آنند نرائن ملّا، رام لعل۔ احمد جمال پاشا۔ مسیح الحسن رضوی، عابد سہیل، آفتاب اختر، عبد العلیم، احمد ابراہیم علوی، صدیق اشرف، ببر راجا، شمیم احمد جائسی، لطیف صدیقی، عثمان غنی۔ محمد عصمت پاشا، ستیش بترہ، مسز ستیش بترہ، اور مسز ببر راجا نے شرکت کی۔

ترقی اردو بورڈ کراچی

ترقی اردو بورڈ نے اپنی ضخیم تاریخی لغت کی پہلی جلد مرتب کر لی ہے، دوسری جلد کے تقریباً ایک چوتھائی حصے کی تشریح نگاری بھی کی جا چکی ہے اس کے علاوہ باقی ماندہ تمام جلدوں کے لئے الفاظ و اسناد کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ اس ذخیرے میں تقریباً چھ لاکھ کارڈ شامل ہیں یعنی چھ لاکھ کے قریب مثالیں الفاظ و محاورات کے استعمال کی جمع ہو گئی ہیں اس سلسلے میں تقریباً [illegible] ہزار کتابوں سے مدد لی گئی ہے مزید جستجو اور ماخذ الفاظ و اسناد کے لئے مزید کتابوں کا مطالعہ جاری ہے مطالعہ کتب اور اخذ الفاظ کی مہم میں اب تک مستقل عملے کے علاوہ ۲۰۰ سے زائد بیرونی امدا[illegible]

سے کام لیا جا چکا ہے جن میں سے اکثر اصحاب نے نیم انفرادی طور پر اور بہت کم اصحاب نے انفرادی طور پر کام کیا۔ ترتیب لغت کے علاوہ بورڈ نے حکومت کی اجازت سے بہت محدود پیمانے پر نایاب یا کمیاب کتابوں کی اشاعت کا کام بھی سنبھالا ہے، اس سلسلے کی تازہ ترین مطبوعات میں "رسوم دہلی" از مولوی سید احمد مولف "فرہنگ آصفیہ" (مرتبہ یوسف بخاری) اور مولانا آزاد کی درسی کتابوں کا سلسلہ (اردو کی پہلی تاریخی کتاب) شامل ہے "خاور نامہ رستمی" بیجاپوری مرتبہ جاوید حسین شیخ اور دیوان زادہ حاتم مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی طباعت کے لئے تیار ہیں، اسکے علاوہ فرانسیسی کے ذریعہ اردو سیکھنے کے لئے اردو فرینچ پرائمر مرتبہ پروفیسر رحمت علی (پیرس یونیورسٹی) اس وقت زیر طباعت ہے۔

لغت کی انفرادی مجلس ادارت کا اجلاس ۲۸ جون سے ۵ جولائی ۱۹۶۲ء تک منعقد ہوا جس میں مقامی ارکان کے علاوہ ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں اور پروفیسر طاہر فاروقی نے شرکت کی۔ ایک اور دہ روزہ اجلاس ۱۴ جولائی سے منعقد ہو رہا ہے۔

برطانیہ کا پہلا اردو روزنامہ

برمنگھم کے اردو ہفت روزہ اخبار "ایشیا" کے منتظمین نے اعلان کیا ہے کہ عنقریب برمنگھم سے "ایشیا" نام کا ایک اردو روزنامہ شائع ہونے لگے گا۔

مجاز پر ناول

اردو کی مشہور خاتون ادیب رضیہ سجاد ظہیر، اسرار الحق مجاز کی زندگی پر ایک ناول لکھ رہی ہیں ناول کا نام "دیوانہ مر گیا" ہے موصوفہ مجاز کی زندگی کے صحیح حالات فراہم کر رہی ہیں، چنانچہ اسی سلسلے میں وہ رانچی کے پاگل خانے گئی ہیں کہ یہاں مجاز دیوانگی کے دنوں میں زیر علاج تھے۔ یہاں وہ مجاز کی "کیس ہسٹری" کا مطالعہ کریں گی۔

کراچی میں بنگالی زبان کی تعلیم

کراچی میں نذرل اکیڈمی نے بنگالی زبان سکھانے کے لئے ابتدائی درس و تدریس شروع کر دی ہے۔

اردو ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" کی منظوری

اردو کے مرکزی ترقیاتی بورڈ لاہور نے دو ہزار ایسے بنیادی الفاظ جمع کئے ہیں جن کے مطالعے سے ہر شخص اردو میں آسانی سے اظہار خیال کر سکے گا ان الفاظ کی اشاعت اردو کے فروغ کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوئس فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر کراچی پہونچے

ڈائرکٹر سوئس فاؤنڈیشن برائے فنی تعاون مسٹر فرینڈ ریل نے کراچی پہونچنے کے بعد سائنسی اور صنعتی تحقیقات کی پاکستانی کونسل کے چیرمین ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے ملاقات کی اور کراچی میں اوزان و آلات کی باقاعدگی کے ایک تربیتی مرکز کے قیام کے سلسلہ میں ایک معاہدہ کے مسودہ کو آخری شکل دینے کے امور پر بات چیت کی جس پر سوئس فاؤنڈیشن اور پاکستان کی مذکورہ تحقیقاتی کونسل کی جانب سے دستخط کئے جائیں گے واضح ہے کہ مذکورہ تربیتی مرکز جو فاؤنڈیشن اور کونسل کے اشتراک سے قائم کیا جائے گا کونسل کی مرکزی لیبوریٹری واقع کنٹری کلب روڈ پر تعمیر کرنا طے ہوا ہے۔ معاہدہ کے بعد سوئس فاؤنڈیشن متعلقہ ساز و سامان اور فنی مشورے دے گی۔ یہ منصوبہ تقریباً ۲۲ لاکھ روپے سے مکمل ہوگا۔ تحقیقاتی کونسل عمارتوں ورک شاپ اور اسٹاف کی فراہمی کی ذمہ دار ہوگی اور تکمیل کے بعد تربیتی مرکز طلباء کو سائنسی آلات کی مرمت اور ساخت کی تربیت دیگا اس میں دونوں بازو سے طلباء لئے جائیں گے اور مشرقی پاکستانیوں کو مفت رہائش اور دیگر رہائشی الاؤنس بھی دئے جائیں گے۔

ایک اعلان

مصنفین کے لئے انعامات

مجلس ترقی ادب لاہور نے طے کیا ہے کہ ۱۹۶۱ء اور
۱۹۶۲ء (یعنی جنوری ۱۹۶۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء تک اور
جنوری ۱۹۶۲ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۲ء تک) کی مطبوعات
تصنیفات و تالیفات پر مصنفین کو بہ تفصیل ذیل انعامات دیئے
جائیں۔

۱۔ معاشیات، سیاسیات اور فلسفہ کے موضوع پر ایسی علمی کتابیں
جن میں ادبی رنگ بھی موجود ہو بہترین تصنیف
پر ایک انعام ——— ۲۰۰۰/- روپے
۲۔ پاکستان کی تاریخ، آثار اور فنون لطیفہ پر بہترین تصنیف
پر ایک انعام ——— ۲۰۰۰/-
۳۔ ادبی تحقیق و تذکرہ نگاری (بہترین تصنیف پر
انعام ——— ۲۰۰۰/-

شرط یہ ہے کہ تصانیف و تالیفات ابتذال اور عریانی
سے پاک ہوں اور حب وطن کے منافی نہ ہوں۔ انعام اسی صورت
میں دیا جائے گا کہ بورڈ کتاب یا مضمون کو متوقع معیار کے
مطابق پائے۔ ناشر مصنف یا مدیر ۳۱ اگست ۱۹۶۳ء تک
متعلقہ موضوعات پر مطبوعہ کتابوں کے پانچ پانچ نسخے
ڈائرکٹر صاحب مجلس ترقی ادب ۲ نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ لاہور کے نام پر رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دیں۔

سید امتیاز علی تاج
ڈائرکٹر مجلس ترقی ادب

ہم قلم

کے

ایک سال کی مجلد

جلدیں

آپ ہم سے صرف
پانچ روپے میں منگا سکتے ہیں
ایک پوسٹ کارڈ لکھئے۔ اور
ہم آپ کو بذریعہ وی پی آپ کی
مطلوبہ جلدیں ارسال کریں گے

مینیجر ہم قلم

ہماری مطبوعات

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
فصیل شب	(ڈرامے)	میرزا ادیب	قیمت ۴ روپے ۰۰
چائے والا	(ناول)	اے حمید	قیمت ۴ روپے
لال چادر	(ناول)	سید ولی اللہ	؍ ۲ روپے ۵۰ پیسے
بہو بیگم	(ناول)	پرنسپل ابراہیم خاں	زیر طبع
ہفت کشور	(شاعری)	جعفر طاہر	؍ ۷ روپے
صدا بصحرا	(شاعری)	یوسف ظفر	؍ ۴ روپے ۵۰ پیسے
جاگتے جزیرے	(شاعری)	احسن احمد اشک	؍ ۲ روپے ۵۰ پیسے
سہ آتشہ	(شاعری)	میرا جی	(زیر طبع)
راشد کی نظمیں	(شاعری)	ن۔م۔ راشد	؍
تھکے ہارے	(افسانے)	خدیجہ مستور	؍ ۵ روپے ۵۰ پیسے
تیسری منزل	(افسانے)	ہاجرہ مسرور	؍ ۵ روپے ۵۰ پیسے
سورج بھی تماشائی	(افسانے)	انور	؍ ۵ روپے ۵۰ پیسے
اردو میں سوانح نگاری	(تنقید)	ڈاکٹر سید شاہ علی	؍ ۷ روپے ۰۰
ہاڑے	(پنجابی شاعری)	سائیں فیروز	؍ ۳ روپے ۵۰ پیسے
پونر پری آکاس	(سندھی شاعری)	شیخ ایاز	؍ ۸ روپے ۲۵ پیسے
پنجابی لوک کہانیاں		شفیع عقیل	؍ ۴ روپے ۵۰ پیسے

گلڈ اشاعت گھر

اسٹریچن روڈ، کراچی-۴